خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
ماهنامه
سسپنس ڈائجسٹ
نومبر 2022
قیمت 150 روپے
بانی
معراج رسول

سسپنس ڈائجسٹ

MEMBER APNS

CPNE

مدیرِ اعلیٰ

عذرا رسول

مدیرہ

یمنیٰ احمد

نائب مدیر

اطہر حسین

مینجر اشتہارات

محمد شہزاد خان

0333-2256789

سرکولیشن مینجر

سید منیر حسین

0333-3285269

جلد 51 • شمارہ 11 نومبر 2022 • زرِ سالانہ 2000 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 150 روپے •

خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

انشائیہ

لبِ مہران

جون ایلیا

لبِ مہرانِ مہربان اس بار یہ میری تیسری یا چوتھی شام ہے۔ میں نے لبِ مہرانِ مہربان اپنی نوجوانی اور جوانی کی کتنی ہی حسین ترین اور سنگین ترین شامیں گزاری ہیں۔ جذبوں کی سرشاری اور رتہ داری اور آرزوؤں کی تشنہ کامی اور شکستہ حالی کے کتنے ہی دور بسر کیے ہیں۔

میں نے کسی بھی دریا کے ساحلوں پر خوابوں اور سرابوں کے اتنے سکھ نہیں پائے اور اتنے دکھ نہیں اٹھائے جتنے سکھ اور دکھ مہران کے ساحلوں پر پائے ہیں اور اٹھائے ہیں۔ جانے کیوں اس بار میں نے یہاں وہ حالت خیزی اور کیفیت انگیزی نہیں پائی جو میرے خیال کو سیراب اور شاداب کیا کرتی تھی اور ہاں میرے ملال کو بھی...... ملال کو بھی......؟

ہاں ملال کو بھی۔ خیال ہی نہیں ملال بھی سیرابی اور شادابی چاہتا ہے۔ ہے کچھ یوں کہ احساسِ ذات کی ساری حالتیں رسد چاہتی ہیں۔ اندر اور باہر کی رسد۔ سو خیال ہو یا ملال دونوں کو اندر اور باہر کی رسد چاہیے۔ اس بار لبِ مہران میری نسل کے وہ قلندر اور وہ شوریدہ سر میرے ساتھ نہیں ہیں جو اپنے لبوں پر سندھی اور اردو شاعری کے سُروں کو آباد کر کے میرے ساتھ رقص کیا کرتے تھے۔ ہم یہاں کتنی دھوم مچایا کرتے تھے۔ ہم پر یہاں کیا کیا حالتیں طاری ہوتی تھیں اور کیا کیا عالم گزرتے تھے۔ اپنا ایک شعر یاد آیا۔

دکھائیں کیا تمہیں داغوں کی لالہ انگیزی
گزر گئیں وہ بہاریں وہ فصل ہی نہ رہی

میرے امروہے کے ایک بزرگ غلام ہمدانی مصحفی نے کہا ہے۔

بادِ ایامِ بےقراریِ دل
وہ بھی یارب عجب زمانہ تھا

عجب زمانہ تھا۔ ہم اپنی حالتوں اور اپنے عالموں میں مشتاقی اور مہجوری اور حضوری اور دوری کے کتنے ہی معرکے سر کیا کرتے تھے۔ سرکشی اور سرشوری کی اک عجب ماجرا پروری تھی جو ہمیں لحہ لحہ پُرحال رکھتی تھی۔ ہم شوقِ انقلاب میں ہر مزاحم سے جا ٹکرایا کرتے تھے۔ کوئی نہیں تھا جو ہمارے شعلہ زن نعروں کو دبا سکتا اور ہمارے ہونٹوں کے انگاروں کو بجھا سکتا۔ مگر اب ہمارے شعلۂ زن نعرے سیاست کی سنگینی نے دبا دیے ہیں۔ ہمارے ہونٹوں کے انگارے راکھ کر دیے گئے ہیں اور ہم ہیں کہ ہمیں اپنے زیاں اور اپنے زوال کا کوئی غم نہیں ہے۔

کوئی غم نہیں ہے! جون ایلیا یہ کیوں نہیں کہتے کہ کوئی احساس نہیں ہے۔

ہاں 'یاد دلانے والے' تو نے مجھے صحیح بات یاد دلائی۔ ہاں، ہمیں اپنے زیاں اور زوال کا کوئی احساس نہیں ہے۔ حسن حمیدی تو زیرِ خاک سوتے ہیں۔ میں کراچی کی طرف رخ کر کے کہتا ہوں کہ اے شیخ قبیلہ، اے شیخ ایاز! ہمیں اپنے زیاں اور زوال کا کوئی احساس نہیں ہے۔ کوئی بھی احساس۔ ہم اب وہ نہیں رہے جو تھے۔ ہمیں ایک دوسرے سے کاٹ دیا گیا ہے۔ ہمیں بانٹ دیا گیا ہے۔

مہران بہہ رہا ہے، لبِ مہران کی شام بہہ رہی ہے اور میں اداس ہوں اور بہت پُر احساس ہوں۔ مجھے سرِ شام ایک شعر بہت یاد آتا ہے، جو میرے افسانہ آفریں بھائی معراج رسول کے شہر میں کہا گیا تھا۔

رخ پہ گیسو ہوا سے ہلتے ہیں
چلیے اب دونوں وقت ملتے ہیں

کراچی، لاہور، دلی اور لکھنؤ کے شاعرو! اگر تم شام پر ایسا حالت انگیز شعر کہہ دو تو قبلہ و کعبہ میاں باوا میر تقی میر کی قسم میں شعر کہنا چھوڑ دوں......

خیال آفریں شام کا مہران بہہ رہا ہے۔ ماضی سے مستقبل کی طرف، اپنے منبع سے اپنی منزل کی طرف۔ اور میں اپنی ایک خاص حالتِ انس کے ساتھ اس کی خدمت میں کورنش بجالاتا ہوں اور تاریخ اور وقت میں ایک گہرا سانس لیتا ہوں۔ اور پھر مجھے اچانک یہ احساس ہوا ہے کہ سندھی بولنے والا ایک ذہین اور شائستہ نوجوان مانی سنجرانی جو اردو میں شعر کہتا ہے، میرے ساتھ ہے اور میں ایک عجیب بات محسوس کر رہا ہوں۔ اور وہ یہ کہ جیسے مہران، گنگا اور جمنا کی وادی میں بہہ رہا ہے۔ یا جیسے گنگا اور جمنا دونوں بہ یک وقت مہران کی وادی میں بہہ رہے ہیں۔

اور اے مانی سنجرانی! تو لبِ مہران میری ایک خاص بات سن اور اپنا سر دھن۔ اور وہ بات یہ ہے کہ مہران کو سنسکرت میں سندھو کہا گیا ہے، یونانی میں سنتھوس اور لاطینی میں سنڈس۔ ہم پاکستانی اور ہندوستانی پنجاب، کشمیر، ہریانے، دلی، اتر پردیش اور بہار سے سندھ کی طرف ہجرت کرنے والے شمالی سرزمینوں سے تعلق رکھتے ہیں اور سندھو ہمارا سب سے عظیم اور قدیم پیش رو ہے جو شمال سے نکل کر یہاں آیا ہے۔ وہ تبت کی برفانی چٹانوں سے نکلا اور اس نے سندھ کی مثلث نما شالی سرزمین کو اپنی تہذیب پرور گزرگاہ بنایا۔ وہ بھی ہجرت زدہ ہے اور ہم اور تم بھی ہجرت زدہ ہیں۔ مانی! تم سامیوں کی سرزمین سے بلوچستان آئے تھے اور وہاں سے سندھ آگئے اور میں سامیوں کی سرزمین سے روانہ ہو کر پنجاب کے علاقے میں آیا اور وہاں سے وادی گنگ و جمن کی طرف چلا گیا اور وہاں سے یہاں آگیا۔ جو جہاں بھی ہے وہ کہیں اور سے ہجرت کر کے آیا ہے۔ مگر سندھو کی ہجرت ہر لحہ جاری ہے۔ آؤ ہم سب اس ہجرت کو اپنا رشتہ بنالیں، تاریخ اور زمانوں میں پھلنے پھولنے والا رشتہ۔

آپ کے خط

عزیزانِ من!
السلام علیکم!
نومبر 2022ء کا سسپنس آپ کی دلچسپی کا سامان لیے حاضر ہے۔ گزشتہ دنوں جشن عید میلاد النبی ﷺ بڑے جوش و خروش اور عقیدت و احترام سے منایا گیا۔ مساجد، عمارات اور گھروں کو روشن قمقموں سے سجایا گیا۔ گلی گلی آپ سرکار محمد ﷺ کی آمد کے سبب درود کی آواز گونجتی رہی، سبحان اللہ۔ خواہش ہے کہ یہ جوش، ولولہ...... یہ پیار و یگانگت اور امتِ مسلمہ ہونے کا حق ادا کرنے کا سلسلہ تمام عمر چلتا رہے۔ آپ ﷺ کی تعلیمات اور آمد کے مقاصد...... تمام عالم اسلام کو انسانیت سے محبت کا درس دیتے ہیں...... ایک دوسرے کی تکالیف کو بڑھانے کا نہیں بلکہ ختم کرنے کا احساس دلاتے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانانِ عالم کو دل کی سچی محبت و عقیدت کے ساتھ آپ ﷺ کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے، الٰہی آمین۔ ابھی ملکی حالات سیلاب زدگان کی بدحالی کے سبب زیادہ سنبھل نہیں سکے ہیں۔ تباہی آتی تو ایک ساتھ ہے مگر جاتی رفتہ رفتہ ہے۔ ابھی تو وبائی امراض کی جنگ اور نقل مکانی کے سبب بھوک و افلاس کے طوفان کا سامنا کرنا باقی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ جلد از جلد ہمارے ملک کو ان تمام مسائل سے نکال دے گا، ان شاء اللہ۔ سیلاب کی وجہ سے مہنگائی کی بڑھتی آندھی نے ہر آنکھ میں نمی پھیلا دی ہے مگر ذمے داران کے دل میں فی الحال کوئی درد جاگتا محسوس نہیں ہوتا جبکہ دوسری جانب کورونا کی جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ڈینگی وائرس نے ایک بار پھر شدت سے حملہ کر دیا ہے اور جانے کتنی اموات اس بیماری کی وجہ سے ہو چکی ہیں۔ بدقسمتی سے مناسب علاج معالجے کی سہولت سے عوام ہمیشہ کی طرح اب بھی دور اور مجبور ہیں۔ اپنے تئیں جس کا جتنا بس چل سکتا ہے، وہ چلا رہا ہے...... گویا یہ عوام آج بھی آس و امید کے بیچ منجدھار میں پھنسی ہوئی ہے۔ بہرحال ہم بھی ہمیشہ کی طرح نیک دعاؤں اور اچھی امیدوں کے ساتھ بات کو یہیں ٹھہراتے ہیں اور کچھ خبر لیتے ہیں اپنی دلچسپ محفل کی...... تو پھر چلیے جناب۔

✠ ناہید یوسف کا تبصرہ اسلام آباد سے۔ ”سسپنس اسٹال پر دیکھا تو جھٹ منگوالیا۔ سب سے پہلے بات ہو جائے موجودہ حالات کی جو کہ دن بہ دن گڑبڑ کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ حکومت و اپوزیشن کی رسا کشی، ملک مشکلات سے دوچار ہے۔ سیلاب کی تباہ کاری جو تھی، سو تھی، ابھی تک سیلاب زدگان کی دادرسی ممکن نہ ہو سکی۔ بہت سے لوگ اب بھی امداد کے منتظر ہیں۔ ادھر کراچی میں بچوں کا اغوا اور ان کا ہولناک قتل...... رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔ ان کے اعضا کی اسمگلنگ اور لڑکیوں کا اغوا...... یہ کون بے حس و بے ضمیر لوگ ہیں جو انتہائی سفاک، اور مکروہ عمل کر رہے ہیں۔ اربابِ اختیار کیوں خاموش ہیں؟ ایسے لوگوں کو عبرت کا نشان بنا دینا چاہیے۔ تمام سیاست دانوں و قانون نافذ کرنے والے اداروں کو اس پر ایکشن لینا چاہیے اور اس پر سنجیدگی سے نوٹس لیتے ہوئے کارروائی کرنا چاہیے۔ نہ جانے کتنے گھروں کے چراغ بجھا دیے ان سفاک لوگوں نے اور وہ بھی نہایت اذیت ناک طریقے سے۔ اللہ پاک سب کو محفوظ رکھے اور ہم پر رحم فرمائے۔ جانے ہم لوگ کیوں ظلم کے خلاف نہیں بولتے۔ یقیناً ہم بھی کہیں نہ کہیں مجرم ہیں جو سب خاموشی سے سہہ رہے ہیں۔ اللہ پاک ہم سب کو حق کے لیے آواز اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ سب سے پہلے اے آر راجپوت کی ”عشق وسناں“ پڑھی۔ تیمور کی جرأت و بہادری پر مبنی داستان بہت اچھی لگی مگر کہانی کو جلدی میں ختم کر دیا گیا۔ تھوڑا اور تفصیلی لکھی جا سکتی تھی۔ تشنگی رہ گئی۔ بہرحال کہانی بہت جاندار تھی۔ ویلڈن اے آر راجپوت۔ دوسرے نمبر پر ”شہ زور“ پڑھی۔ معاذ کو دشمنوں نے گھیر لیا اور دورانِ منتقلی حادثے

کے بعد وہ نئے لوگوں کی قید میں ہیں۔ ان سے نہایت کڑی پوچھ تاچھ بھی جاری ہے۔ آگے دیکھیے کیسے بچت کی راہ نکلتی ہے۔ کہانی نہایت تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ ادھر لالہ عیسیٰ بھی زندہ ہے اور غضب ناک انداز میں انٹری ماری ہے۔ اس کا نشانہ میڈم ایکس ہے اور اسی لیے لالہ نے حامد کو اغوا کروا کر اس سے معلومات لینا شروع کردی ہیں۔ ادھر سجل کی حالت بھی ٹھیک نہیں اور دماغ میں رسولی کے باعث اس کا کسی اچھی جگہ علاج ہونا ضروری ہے۔ معاذ قید میں بھی اس کے علاج کے لیے کوشش میں مصروف ہے۔ میڈم ایکس کو بھی رپورٹ ملتی ہے کہ اصغر کے کام کرنے کے انداز میں لالہ کی جھلک ہے۔ وہ اس خبر پر چونک جاتی ہے۔ آگے جانے کیا ہونے والا ہے۔ یہ تو اگلی قسط کے آنے پر پتا چلے گا۔ بہت خوب اسما قادری صاحبہ۔ عائشہ نصیر کی ''احسان'' اچھی کہانی تھی۔ لیوی کو اپنے انکل کے جرم کے بارے میں بتانا مہنگا پڑ گیا اور انکل ارل نے اسے پھنسا کر اس کے ہاتھوں قتل کروا ڈالا اور قتل کے بارے میں نہ بتا کر اس پر احسان کیا۔ بہت خوب۔ ''زنگار'' میں مرزا امجد صاحب نے بے گناہ کو سزا سے بچایا۔ عیوق بخاری کی ''توانا معذور'' بہت اچھی کہانی تھی۔ صحیح کہتے ہیں کہ کسی کو اس کی معذوری کی وجہ سے کمتر نہیں سمجھنا چاہیے۔ بعض دفعہ معذور انسان وہ کام کر جاتا ہے جو صحت مند نہیں کر سکتا۔ ٹام اور روزی کا مسٹر جارج کو ٹوکنا کام کر گیا پھر بینک ڈکیتی کے دوران ڈاکوؤں کے مضحکہ خیز انداز پر جارج نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ضرور کچھ کر کے دکھائے گا اور اس نے ڈاکوؤں کو پکڑوا دیا۔ فاطمہ حسام کی ''تماشا گاہ'' ٹھیک رہی۔ ''جنگ باز'' اسی ڈگر پر گامزن ہے اور سہراب ابھی تک کوئی خاص لائحہ عمل طے نہیں کر پایا ہے۔ کہانی میں ایکشن بھرپور ہے مگر کہانی ہمارے حساب سے کچھ خاص موڑ پر نہیں آئی ہے حالانکہ 8 اقساط ہو چکی ہیں۔ شاید بھٹی صاحب اگلی اقساط میں کچھ نیا لے کر آئیں۔ یہ ہماری ذاتی رائے ہے، سب کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ انجم فاروق کی ''ڈبے کا راز'' سادہ سی کہانی تھی۔ ٹھیک رہی۔ ضیا تسنیم بلگرامی ''مہدی سوڈانی'' کی داستانِ حیات لے کر آئیں۔ اچھی جا رہی ہے۔ جزاک اللہ۔ شبینہ گل کی ''ابتلا'' مختصر مگر اچھی تحریر تھی۔ نشور ہادی کی ''یلان بی'' کچھ خاص نہ لگی۔ کہانی میں تیزی اور ایکشن کی کمی لگی۔ خالد شیخ طاہری کی ''آخری قتل'' زبردست کہانی تھی۔ بار بینک پیشہ ور قاتل تھا مگر اس نے منشیات فروش رینڈی کو اس کے انجام تک پہنچا کر غلاظت بھری جرائم پیشہ زندگی کو خیر باد کہہ دیا اور شریفانہ زندگی کا آغاز کیا۔ محفل شعر و سخن بھی اچھی تھی۔ مجموعی طور پر رسالہ بہترین رہا۔''

✠ روبینہ اشعر کی کراچی سے آمد۔ ''ماہ اکتوبر کا شمارہ کافی لیٹ ملا، اس کی وجہ شاید سیلابی صورتِ حال سے آمد و رفت کا محدود ہو جانا تھا۔ بہر حال مارکیٹ میں پرچہ دیکھ کر ساری کوفت دور ہوئی۔ ٹائٹل اچھا لگا۔ کہانیوں کی فہرست پر ایک سرسری نگاہ دوڑاتے ہوئے جون ایلیا کے پُرمغز انشائیے سے مستفید ہوئے اور پھر ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی ''جنگ باز'' پڑھی۔ کہانی اپنے پورے سسپنس اور نت نئے موڑ کے ساتھ جاری ہے۔ کہانی میں ہر ماہ کچھ نیا پڑھنے کو مل رہا ہے جس کے باعث کہانی میں دلچسپی برقرار ہے۔ تاریخ کے جھروکوں سے اے آر راجپوت کی کہانی ''عشق وسنان'' عشق کی دلگداز داستان اور دہشت انگیز واقعات پر مبنی اس ماہ کی بہترین کہانی تھی۔ تخت و تاج پر بیٹھنے والے شاہوں کے عشق کی خوشبو جگہ جگہ بکھری پڑی ہے۔ ان کے دل کا گداز اور محبوب کے آگے ان کی بے بسی دل میں عجیب سا سوز پیدا کر دیتی ہے، ویلڈن۔ زندگی کے ایک موڑ پر تائب ہونے والے ایک شقی القلب قاتل کا قصہ خالد شیخ طاہری کی کہانی ''آخری قتل'' میں پڑھنے کو ملا۔ کہانی اچھی لگی۔ عائشہ نصیر کی کہانی ''احسان'' بھی پسند آئی۔ اداکاری کرتے کرتے حقیقی قاتل کا روپ دھارنے والے نوجوان کی روداد اچھی رہی۔ مرزا امجد بیگ کی ''زنگار'' ہمیشہ کی طرح بہترین لگی۔ بیگ صاحب کی کڑی جرح کے باعث مجرم اپنے انجام کو پہنچے۔ انتقام کی آگ واقعتاً بہت ہلاکت خیز ہوتی ہے۔ یہ زنگار کے مانند انسان کی سوچ کے ساتھ چپک کر رہ جاتی ہے اور جلد ہی اس کے ذہن کو زہریلا زنگ آلود بنا دیتی ہے۔ عیوق بخاری کی ''توانا معذور'' میں دنیا کی نظروں میں محض بوجھ بن جانے والے انسان کا حیران کن حوصلہ پڑھنے اور دیکھنے کو ملا۔ کہانی اچھی تھی۔ فاطمہ حسام کی کہانی ''تماشا گاہ'' بھی اچھی رہی۔ وہ جوڑا جس نے زندگی کی دھوپ چھاؤں کے کئی سال ایک ساتھ گزار دیے، جانے کیسے ایک دوسرے کے لیے

بوجھ بنتے چلے گئے۔ انجم فاروق ساحلی کی ''ڈبے کا راز'' کچھ خاص نہیں لگی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر ''مہدی سوڈانی'' میں انیسویں صدی کے آٹھویں عشرے کی شخصیت مہدی سوڈانی کے حالات زندگی پڑھنے کو ملے۔ اچھی تحریر تھی۔ رزق اور نصیب کے مابین پُرفکر اور عبرت اثر معرکہ آرائی کا احوال شبیہ گل کی تحریر ''ابتلا'' میں پڑھنے کو ملا۔ اچھی تحریر تھی۔ مکروفریب کے جال میں پھنسنے والی حسینہ کے عجیب وغریب انتقام کی کہانی نشور ہادی کی تحریر ''پلان بی'' میں پڑھنے کو ملی۔ تحریر پسند آئی۔ محفل شعروسخن میں اشعار کا انتخاب بھی خوب رہا۔ کترنیں بھی پسند آئیں۔ مجموعی طور پر ماہ اکتوبر کا پرچہ بہترین رہا۔''

✠ مہتاب احمد حیدرآباد سے چلے آرہے ہیں۔ ''اس ماہ کا سسپنس ہاتھوں میں آیا تو ٹائٹل حسینہ کے خوبرو چہرے کو دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیے مبہوت ہوگئے۔ ساتھ میں گلاب کا پھول۔ مصور نے کیا خوب امتزاج پیدا کیا ہے۔ ٹائٹل زبردست تھا۔ اس کے بعد فہرست پر نگاہ دوڑائی اور ذہن میں کہانیوں کو ترتیب دیا کہ پہلے کون کون سی کہانیاں پڑھنی ہیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے صرف اتنی گزارش کریں گے کہ کچھ عرصے سے فہرست میں طاہر مغل کا نام نظر نہیں آرہا۔ برائے مہربانی ان کی کوئی کہانی شائع کریں کیونکہ لوگ انہیں پڑھنا چاہتے ہیں۔ ان کی کہانی میں کچھ جادو سا اثر ہوتا ہے کہ پڑھنے والا ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالتا ہے اور خود کو کہانی کا کردار ہی سمجھتا ہے۔ سب سے پہلے ''شہ زور'' پڑھی۔ زبردست جارہی ہے۔ معاذ کی مشکلات کئی گنا بڑھ گئی ہیں۔ سونیا نے بھی تنظیم سے بغاوت کردی ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اس کے بعد ''جنگ باز'' پر پہنچے۔ کہانی میں ایکشن تو ہے لیکن کہانی وہ مزہ نہیں دے رہی جو ایک سلسلے وار کہانی کا خاصہ ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے آگے چل کر کہانی مضبوط ہوجائے۔ پھر پہنچے نشور ہادی کی ''پلان بی'' پر۔ کہانی ٹھیک لگی۔ اتنا مزہ نہ آیا پڑھ کر۔ چھوٹی کہانیوں میں توانا معذور، احسان، آخری قتل عمدہ کہانیاں تھیں۔ مرزا امجد بیگ کی ''زنگار'' اچھی تحریر تھی۔ اے آر راجپوت کی ''عشق وسناں'' پڑھ کر تاریخ سے آگاہی ہوئی۔ عمدہ انداز تھا۔ ویلڈن۔ کترنیں اچھی لگیں۔ محفل شعروسخن نے بھی محظوظ کیا۔ مجموعی طور پر رسالہ عمدہ تھا۔''

✠ ملک وحید کا مختصر خط کراچی سے۔ ''ماہ اکتوبر کا شمارہ کافی لیٹ ملا۔ ٹائٹل اچھا لگا۔ سب سے پہلے جون ایلیا کا انشائیہ پڑھا۔ اچھا لگا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی ''جنگ باز'' سسپنس اور مار دھاڑ سے بھرپور واقعات کے ساتھ جاری ہے۔ آگے دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ اے آر راجپوت کی کہانی ''عشق وسناں'' تاریخ کے آئینے میں لکھی گئی اچھی تحریر تھی۔ خالد شیخ طاہری کی کہانی ''آخری قتل'' بھی پسند آئی۔ عائشہ نصیر کی کہانی ''احسان'' کچھ خاص نہیں لگی۔ مرزا امجد بیگ کی ''زنگار'' بہترین کہانی تھی۔ عیوق بخاری کی ''توانا معذور'' پسند آئی۔ فاطمہ حسام کی تحریر ''تماشا گاہ'' بہترین رہی۔ انجم فاروق ساحلی کی ''ڈبے کا راز'' اچھی تحریر تھی، پسند آئی۔ ضیا تسنیم بلگرامی کی تحریر ''مہدی سوڈانی'' اچھی تحریر تھی۔ شبیہ گل کی تحریر ''ابتلا'' کچھ خاص نہیں لگی۔ نشور ہادی کی تحریر ''پلان بی'' اچھی کہانی تھی۔ پسند آئی۔ محفل شعروسخن میں اشعار کا انتخاب بہترین رہا۔''

✠ امجد اقبال خان کی خوشی ساہیوال سے۔ ''یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ تقریباً تمام مختصر کہانیاں عمدہ ہیں۔ معیاری مختصر کہانیوں کے انتخاب کے لیے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ سلسلہ وار کہانیوں میں ''شہ زور'' بہتر جارہی ہے۔ اگرچہ یہ کہانی بے تحاشا اتار چڑھاؤ کا شکار رہی ہے اور کئی دفعہ اس نے مایوس بھی کیا ہے مگر اچھی بات یہ ہے کہ یہ کہانی لڑکھڑا کر پھر سنبھل جاتی ہے۔ جہاں تک بات ہے ''جنگ باز'' کی تو، سوری ٹو سے...... یہ کہانی پہلی قسط ہی سے مایوس کررہی ہے۔ انتہائی بورنگ اور فضول کہانی ہے۔ اس لیے آئندہ ماہ سے اس کہانی کو نہ پڑھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ تاریخی کہانی اس بار بھی منفرد ہے۔ مشورہ ہے کہ تاریخی کہانیاں صرف ایک ہی لکھاری سے ہر ماہ لکھوانے کے بجائے مختلف اہل قلم سے لکھوائیں۔ جیسا کہ اس ماہ لکھوائی گئی ہے۔ مزاح ناپید ہوچکا ہے سسپنس سے۔ اس کے لیے بھی کچھ کریں۔''

✽ نامعلوم مقام سے ابراہیم مجید گزشتہ سے گزشتہ شمارے پر دلچسپ تبصرہ لے کر حاضر ہوئے ہیں۔ ”ستمبر کا ماہنامہ بروقت موصول ہوا۔ بے حد خوشی ہوئی۔ اس دفعہ سرورق پر بلوری آنکھیں اور حجاب۔ کیا خوب امتزاج ہے۔ جون ایلیا بہت دردمند اور سچ لکھتے ہیں۔ پتھریلی، کھردری جگہ پر خوبصورت الفاظ۔ یہ سب تو اپنی جگہ مگر اس وقت تو یہ عذاب جو سیلاب کی شکل میں آیا ہے، بہت مشکل وقت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ میری ناراضگی کی نشانی یہ ہے کہ موسم کے ذریعے دیتا ہوں۔ بے وقت موسم، خشک سالی کا سیلاب، یہ عذاب الٰہی ہے لیکن امیر حکمران مصیبت میں ملک سے باہر ٹھکانا ڈھونڈ لیتے ہیں۔ ہم سب کو عذاب سے توبہ کرنے کا وقت ہے۔ اللہ سب کو معاف کرنے والا ہے۔ خط تفصیلی اور مکمل لکھنا ہوتا ہے لیکن دن بھر میں 12 سے 13 گھنٹے بجلی کی لوڈ شیڈنگ، پورا دن میں رات گئے تک۔ ذہن ماؤف۔ دل برداشتہ، اپنی تحریر جوان حالات میں لکھتے ہیں، پڑھ کر خود مزہ نہیں دیتی۔ تشنگی ہی رہتی ہے۔ نہ لکھیں مگر اس محفل سے دور رہنے کے لیے ”دل ہے کہ مانتا نہیں“۔ اس دفعہ میر محفل آذین رضوان بھی ہمارے کورنگی سے ہیں۔ تبصرہ بہت مدلل اور عمدہ ہے۔ کہانیوں میں ”گمشدہ“ ملک صفدر کی بات کی جائے۔ یہ اپنوں کی ہوس اور بے راہ روی جس میں اپنے ہی بھائی کا خون اس بے دردی سے لیکن اللہ تعالیٰ سب دیکھ رہا ہے۔ اس نے انسپکٹر کے روپ میں کیسا انجام کیا۔ ”عقاب آب“ تاریخ کے وہ صفحات جو ہم نہ پڑھ سکے، وہ سب اس مضمون کے پڑھنے سے معلومات میں اضافہ ہوا اور مزہ بھی آیا۔ ”رونگ نمبر“ فون پر دھوکے بازی عام ہے۔ اب ہمارا ملک بھی کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ جہاں آدمی اپنی حد سے باہر ہو کر گناہ کی طرف بڑھا تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ جہاں فون ضرورت ہے، وہاں فریب اور گناہ کا ذریعہ بھی بن گیا ہے۔ ”سرنگ میں“ ماورائی کہانیوں میں ایک اچھی کہانی۔ یہ جن بھوتوں کی نہیں بلکہ ایک شخص کی ذہنی کہانی یا کیفیت کی عکاسی کرتی ہے۔ ایک کوفت اور پشیمانی جو اس شخص نے اپنے اوپر طاری کر لی اور اس کا اظہار ایک شخص کو گواہ بنا گیا۔ ایک اچھوتی کہانی لیکن پڑھنے اور سمجھنے کے لیے۔ ”تماشا گاہ عالم“ یہ دنیا ہمیشہ ہی امیر، غریب، بادشاہ اور رعایا کے اوپر قائم ہے۔ یہ کارخانۂ قدرت ہے۔ یہ ایک آزمائش ہے۔ اس کہانی میں دولت مند کی عیاشی اور پڑوسی کی غربت اور محرومی کا بڑا تال میل بہت عمدگی سے لکھا گیا ہے۔ ”جنگ باز“ بہت لاجواب داستان۔ بڑی برق رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہے۔ کہاں سے شروع ہوئی کہاں پہنچے گی۔ غریب آبادی سے نکل کر پورے پاکستان پر چھا گئی۔ طوالت بہت ہو گئی لیکن لکھاری ڈاکٹر عبدالرب کے قلم کا جادو کہانی سے نظر ہٹنے نہیں دیتا ہے۔ ملنے اور بچھڑنے کا عمدہ تال میل ہے۔ ”انگوٹھی“ بڑی عمدہ کہانی۔ غیر ارادی طور پر پھنس جانے والے شخص کی حیرت انگیز چالاکی۔ ایک معمولی انگوٹھی سے مصیبت میں پھنس جانے اور اسی انگوٹھی کی وجہ سے بچ جانے والی دلچسپ داستان۔ بہت اچھی لگی۔ ”انہونی“ تقسیم پاکستان وہندوستان کے وقت کی ہزاروں داستانوں میں سے ایک دلدوز داستان۔ پڑھ کر دل مغموم ہو گیا۔ اس دفعہ کا شمارہ اور اس کے چنیدہ مضامین۔ کہانیاں بہت عمدہ تھیں۔ ایک سے بڑھ کر ایک۔ کاوش صدیقی نے بڑی کاوش سے ”مجھے چاندنی نواز دو“ لکھ دی۔ بہترین کہانی بلکہ یادگار رہنے والی بہترین کہانی۔ جملوں کا چناؤ بہت ہی عمدہ۔ آخری پیرا تو جان ہے۔ اشعار کی محفل بھی اچھی رہی۔ دوستوں کے خطوط بھی دل سے لکھے گئے۔ سیلاب کی تباہ کاری پر دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ مہنگائی نے ہم پر مکمل قابو پا لیا ہے۔ اس پر کچھ بھی لکھنا بے سود ہے۔ ہم زندہ ہیں پر بہت شرمندہ ہیں۔ اللہ نے ہم پر ظالم حکمران مسلط کر دیے ہیں۔ یہ قوم کی بداعمالیوں کی سزا ہے جس کا اللہ نے قرآن میں اشارہ فرمایا ہے۔“

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

مسکان علی، سکھر۔ غلام حسین، لیہ۔ اسامہ خان، نواب شاہ۔ اشعر علی، ملتان۔ عمران احمد، چنیوٹ۔ نادیہ خان، پشاور۔ سنبل، حیدر آباد۔ ریاست علی خان، کوئٹہ۔ ندیم کمال، سبی۔ راجا توقیر، جہلم۔ نورالدین، گوجرانوالہ۔ نمرا نعیم، کراچی۔

کارزارِ الفت

اے آر راجپوت
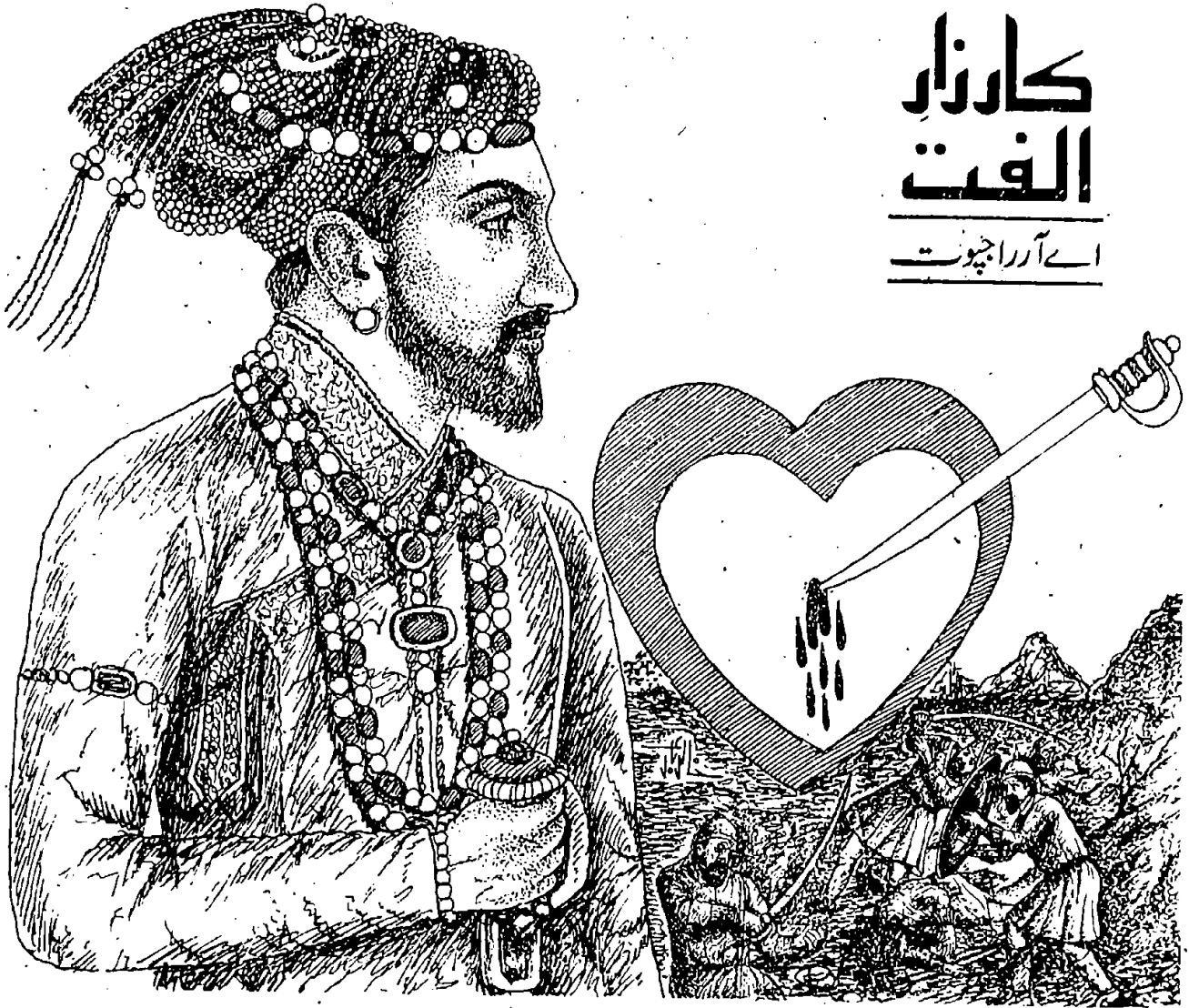
عشق کے جذبات اتنے اندھے ہوتے ہیں
جنہیں کسی کی بادشاہت یا عسرت...
امیری فقیری... خوبصورتی یا بدصورتی
سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ وہ تو بس اپنی
ہی روانی میں رواں رہتے ہیں... جیسے یہاں دو
انجانے دلوں کا ایک ہی تال پر دھڑکنا گویا تاریخ
میں رقم کیے جانے والا قصہ بن گیا۔ یہ امتیاز بھی
قسمت والوں کے حصے میں آتا ہے سو... ان کے حصے
میں بھی آگیا... جنگ و جدل کے بادلوں میں گھرنے کے
باوجود فقط ایک لمحے کا نظروں کا ملنا ان کے ملن کا سبب
بن گیا... اگرچہ جانتے تھے کہ کارزارِ الفت کا یہ سودا
انہیں کتنا مہنگا پڑے گا... اس کے باوجود کوئی پیچھے ہٹنے کو
تیار نہ تھا ...یہ اور بات کہ سرپھرے لوگوں کے لیے مہنگا سستا
کچھ نہیں ہوتا۔

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات
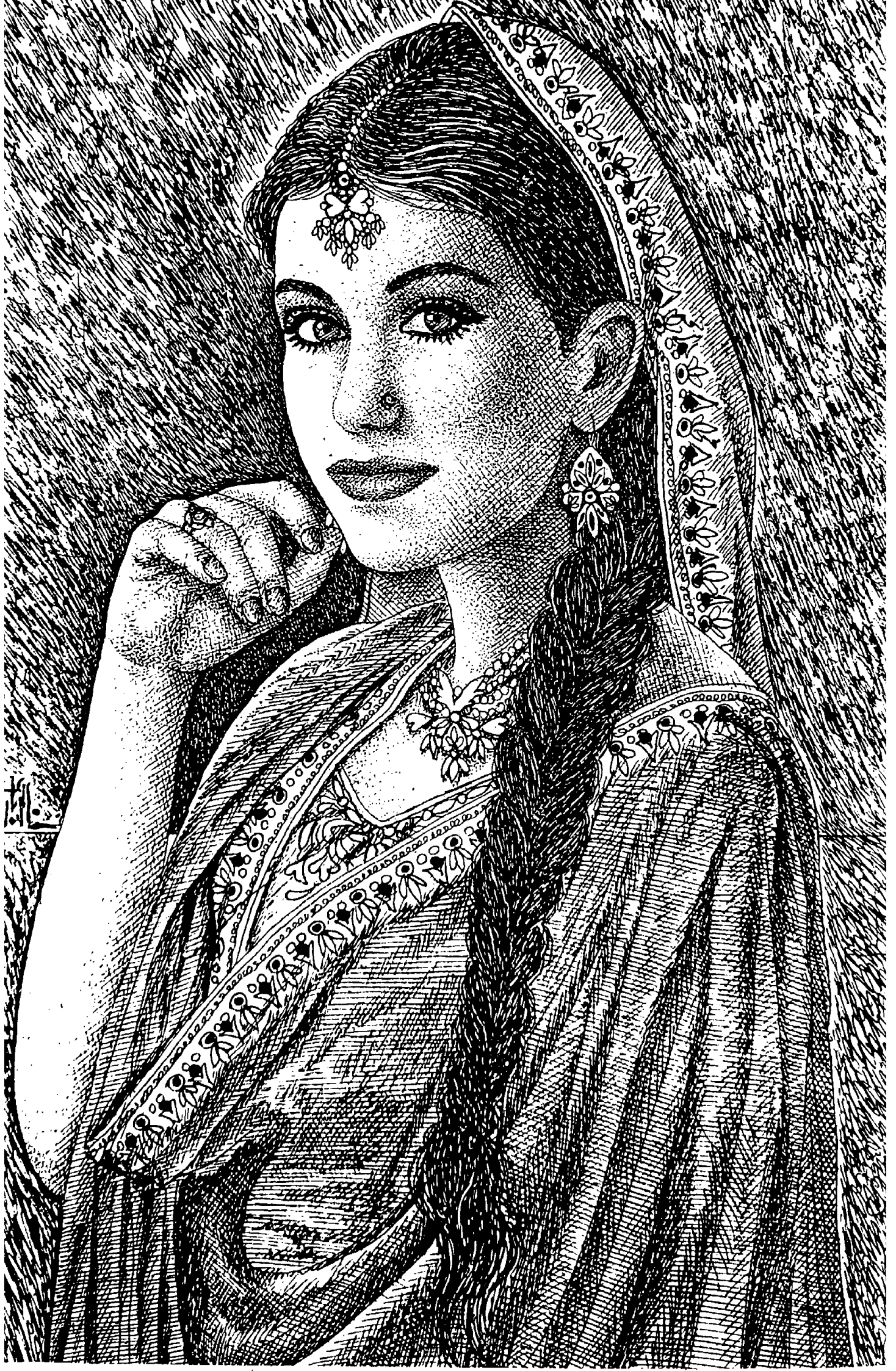
جعفر نے اعظم خان کو فکر مند پایا تو پوچھا۔
''کیا بات ہے آقا! آج آپ پریشان اور فکر مند سے نظر آرہے ہیں؟'' جعفر، اعظم خان کے والد کا غلام تھا۔ اس نے اعظم خان کو اپنی گود میں کھلایا تھا اور اس سے بڑی محبت کرتا تھا۔
''میرا خیال ہے جو ہونے جارہا ہے، وہ ٹھیک نہیں۔'' اعظم خان نے اسی فکر مندی سے کہا۔
''کیا ہونے جارہا ہے آقا؟ کچھ بتائیں تو۔'' جعفر نے سوال کیا۔
''تمہیں نہیں معلوم کہ شاہ جہاں نے شاہی قاصد کو کہاں بھیجا ہے؟''
''معلوم ہے، مگر اس میں فکر مندی کی ایسی کون سی بات ہے۔ یہ تو خیر سگالی کا پیغام ہے۔'' جعفر بولا۔
''نہیں جعفر! تم نہیں سمجھو گے۔ یہ خیر سگالی کا نہیں، درپردہ ایک بہت بڑی گڑبڑ کا پیغام ہے۔''
''گڑبڑ! کیسی گڑبڑ آقا؟'' جعفر الجھ کر بولا پھر دفعتاً ہی معنی خیز مسکراہٹ تلے بولا۔ ''بلکہ آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ مالوہ (برہان پور) سے معزز مہمان آرہے ہیں اور ان مہمانوں میں ایک حسین مہمان بھی ہے۔''
جعفر، اعظم خان کے دل کا حال جانتا تھا۔ وہ ایک راز داں تھا۔ بھلا ہوتا بھی کیوں نا، آخر کو اعظم خان اُس کی گود میں کھیلا تھا۔
اس کی بات پر اعظم خان کی چشمِ تصور میں واقعی ایک ''حسین مہمان'' کا چہرہ گلنار رقص کر گیا۔ یہ عزیزہ تھی۔ مالوہ کے حاکم خان جہاں کی خوبصورت بیٹی۔
اب اعظم خان، جعفر کو کیا بتاتا کہ اس کی پریشانی کی اصل وجہ یہی تھی۔
بظاہر یہ واقعی ایک خیر سگالی کا پیغام تھا۔ شاہ جہاں نے چند دن پہلے اپنے وزراء، امراء اور سرداروں سے صلح و مشورہ کرنے کے بعد مالوہ اچانک قاصد روانہ کر دیا تھا اس پیغام کے ساتھ کہ مالوہ کا حاکم اس کے دربار میں مہمان کی حیثیت سے آئے۔
شاہی قاصد جیسے ہی شاہ جہاں کا یہ پیغام لے کر مالوہ کے حاکم خان جہاں کے سامنے پیش ہوا اور شاہ جہاں کا پیغام پڑھ کر سنایا تو اس نے فوراً اسے باعثِ سعادت سمجھتے ہوئے قبول کر لیا۔
عزیزہ بھی اپنے دو جوان بھائیوں عظمت خان اور حسین خان کے ساتھ ہی والد کے پاس بیٹھی تھی۔ آگرہ روانگی کا سن کر اس کا دل بھی بے طرح دھڑکنے لگا۔
آتشِ الفت برابر لگی ہو تو دو فرزانوں کو ضرور ملاتی ہے۔ محبت کو دو آتشہ بنا دیتی ہے۔ عزیزہ کی نگاہ خواب میں بہادر، جری اور شریف سپہ سالار اعظم خان کا تصور گردش کرنے لگا۔
گو دونوں دیوانے ایک دوسرے کے دیدار کے لیے ترسے ہوئے تھے تاہم ان کے دلوں میں ایک بے چینی بھی گھر کیے دیتی تھی۔ اس کے حسین تصور میں وہ واقعہ گھوم گیا جوان کی پہلی ملاقات ہی نہیں، پہلی نظر کی محبت کا بھی امین رہا تھا۔
اس وقت اعظم خان اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ شکار کھیلتا ہوا دریائے چمبل کے کنارے جا پہنچا تھا پھر ایک سانبھر کا تعاقب کرتے ہوئے ساتھیوں سے بچھڑا اور حادثے کا شکار ہو کر دریا کے کنارے جا گرا۔
سوئے اتفاق وہیں مالوہ کے حاکم خان جہاں کی بیٹی عزیزہ اپنی سہیلیوں کے ہمراہ سیر و تفریح کی غرض سے آئی ہوئی تھی۔ اس نے جو ایک بانکے سجیلے نوجوان کو لڑھکتے اور بے ہوش ہو کر دریا میں گرتے دیکھا تو آؤ دیکھا نہ تاؤ، وہ اپنے گھوڑے سمیت دریا میں کود گئی۔
وہی اسے بچا کر دوسرے کنارے پر لائی۔ اعظم خان کو چوٹیں آئی تھیں۔ وہ بے ہوش تھا۔ وہ اسے اپنے محل میں لے آئی۔
تھوڑی دیر بعد ہی اعظم خان کو ہوش آ گیا۔ اس نے ایک ماہ لقا کو اپنے سامنے پایا۔ وہ مسکراتا اور حسین چہرہ اس کی تیمارداری میں مصروف تھا۔
''میں کہاں ہوں؟ تم کون ہو؟'' اس نے پوچھا۔
''آپ بالکل خیریت سے اور ٹھیک جگہ پر ہیں۔'' عزیزہ نے مسکرا کر کہا۔ وہ غور سے اس پیکرِ وجاہت کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہوں کی گہرائی میں کچھ ایسا تھا جسے اعظم خان نے صاف محسوس کیا تھا۔ اب وہ بھی مسکرا کر بولا۔
''اتنی تو مجھے بھی تسلی ہے کہ میں کم از کم دشمنوں کے درمیان نہیں ہوں۔''
''تو کیا آپ جنگ پر نکلے تھے؟'' عزیزہ نے شوخی سے پوچھا۔
''شکار پر نکلا تھا۔ ایک سانبھر ڈھیٹ نکلا اور قابو نہیں آتا تھا۔ بس، اس کے تعاقب میں......''
''یہاں تک آن پہنچے۔'' عزیزہ نے جیسے اس کا جملہ مکمل کیا اور پھر اپنے اور اس جگہ کے بارے میں بتا دیا۔

دونوں کے درمیان تھوڑی دیر باتیں ہوتی رہیں۔ ایک دل نشین سا ماحول بن گیا تھا۔ ایسا ماحول جسے پہلی ملاقات اور پہلی نگاہ سے تشبیہ دی جاسکتی تھی۔

دونوں ہی ایک دوسرے کو نظر بھر بھر کر دیکھ رہے تھے اور من تھا کہ سیراب ہی نہیں ہو پاتا تھا۔ اسی وقت ایک خادم نے آکر مطلع کیا۔

''آقا اس نوجوان کی طبیعت اور خیریت دریافت کرنا چاہتے ہیں۔''

''ابا جان سے کہو ہم ابھی پہنچ رہے ہیں۔'' عزیزہ نے خادم سے کہا۔ وہ واپس لوٹ گیا۔

''چلیں جی، اب ابا حضور کے ہاں پیشی ہے۔'' عزیزہ مسکرا کر بولی۔ اعظم خان کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اسی گوشۂ عافیت میں رہے۔ اس حسینۂ دل پذیر کو نگاہوں سے اوجھل بھی نہ ہونے دے مگر مجبوری تھی۔

وہ اٹھا۔ دونوں حاکم مالوہ خان جہاں کے سامنے پیش ہوگئے۔ اعظم خان نے باادب سلام کیا اور اپنے بارے میں بتایا۔ عزیزہ کے دونوں بھائی عظمت خان اور حسین خان بھی وہاں موجود تھے۔

والد اور بیٹے یہ سن کر خوش ہوئے تھے کہ اعظم خان کا تعلق شاہ جہاں کی افواج سے تھا اور وہاں وہ ایک بڑے عہدے پر فائز تھا۔

یوں ان کی ملاقاتیں پروان چڑھنے لگیں۔

بہرکیف، اگر آج شاہ جہاں کا قاصد مالوہ کی طرف مہمان داری کا پیغام لے کر گیا تھا تو اعظم خان کے خوش ہونے کے بجائے پریشانی کی ایک ٹھوس وجہ تھی۔

یہ پیغام جسے بظاہر خیر سگالی کا پیغام کہا جارہا تھا، درحقیقت اس وقت بنایا گیا تھا جب اس سے دو روز قبل ہی دربار میں شاہ جہاں اپنی ایک خصوصی نشست میں اپنے امراء، وزراء اور سرداروں کے ساتھ آس پاس کی کمزور ریاستوں میں اپنی عمل داری کے سلسلے میں صلاح مشورے کررہا تھا۔ ان میں فوج کے چند سالار بھی تھے جن میں خود اعظم خان بھی تھا۔ اسی لیے اسے دال میں کچھ کالا محسوس ہورہا تھا۔

خیر، مالوہ کا حاکم خان جہاں اپنے تین جواں سال بچوں عظمت خان، حسین خان اور عزیزہ کے ہمراہ شاہی محل پہنچا تو ان کا پرتپاک استقبال کیا گیا۔

عزیزہ کی بے تابانہ نگاہیں کسی کو تلاش کررہی تھیں اور پھر وہ بانکا سجیلا اور جری نوجوان اسے نظر آگیا جو خود بھی اس کا بے چینی سے منتظر تھا۔

''تمہیں میرے آنے کی کوئی خوشی نہیں ہوئی؟'' عزیزہ نے اعظم خان کو خلافِ توقع فکرمند پا کر پوچھا۔

''تم میری دنیا ہو، میرا جہاں ہو عزیزہ! میری پہلی اور آخری خوشی ہو تم۔'' اعظم خان فرطِ جذبات تلے بولا۔

''تو پھر مجھے دیکھ کر یہ تردد اور تفکر کیسا؟'' عزیزہ نے اپنی گھنیری پلکیں پھیلا کر سوال کیا۔

''مجھے کچھ گڑبڑ محسوس ہورہی ہے۔ خدا کرے کہ یہ محض میرا وہم ہو۔''

''حد سے زیادہ ملنے والی مسرت میں ایسا ہی ہوتا ہے۔'' عزیزہ دل نشیں مسکراہٹ تلے بولی۔

''کاش، وہم ہی ہو۔'' اعظم نے ہولے سے کہا۔

''یہی ہوگا، اب ذرا ایک خوشی کی خبر تو سن لو۔'' عزیزہ نے اٹھلا کر کہا۔

''کیسی خوشی کی خبر؟'' اعظم خان نے چونک کر اس کے حسین چہرے پر نظر ڈالی تو عزیزہ نے سرخ پڑتے چہرے سے بتایا۔

''ابا جان آپ کو میرے لیے پسند کرنے لگے ہیں۔''

اعظم خان کو وقت کے اس لمحے نے ڈس لیا تھا جب اسے کسی خطرے کی بو محسوس ہوئی تھی ورنہ اس کے لیے یہ خوشی کی خبر کم نہ تھی۔

☆☆☆

اگلے ہی دن اعظم خان کو اپنی نامعلوم اور تشویش آمیز بے چینی کا پتا چل گیا جب ایک بھرے دربار میں عظمت خان نے ایک معزز شاہی عرض بیگی کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔

عقدہ کھلا کہ عرض بیگی نے مالوہ کے حاکم خان جہاں کے جواں سال بڑے بیٹے عظمت خان کے سامنے یہ کہہ دیا تھا کہ بہت جلد مالوہ ہمارے قبضے میں آنے والا ہے۔ اسی لیے ابھی سے ہماری اطاعت تسلیم کرلینے میں ہی مصلحت اندیشی اور دانش مندی ہے۔

''جری، جنگجو اور باغیرت قوم اپنے لہو سے اپنے وطن کو سینچا کرتی ہے، اس کا سودا نہیں کیا کرتی۔'' عظمت خان نے نہایت غصے اور طیش میں آکر جواب دیا تھا اور ایک تھپڑ بھی جڑ دیا تھا۔ اس لیے کہ عرض بیگی ہی کیا، کوئی بھی شاہی فوجی افسر دوبارہ مالوہ کے بارے میں ایسی کسی بات کی جرأت نہ کرے۔

یہ گویا موقع فراہم کرنے والی بات تھی۔ جب شہنشاہ تک بات پہنچی تو اس نے بھی اپنے شاہی درباری کی تائید میں یہ بات کہہ ڈالی کہ مالوہ کو ولی نعمت کی عملداری میں دے دیا جائے۔

پھر تو جیسے طوفان کھڑا ہو گیا۔ مالوہ کا حاکم خان جہاں غصے میں بپھر گیا۔ میزبان اور مہمان دشمن بن کر اس روز جدا ہوئے۔ خان جہاں کو شاہ جہاں نے باغی کہا اور دربار میں ذلیل کر ڈالا۔

اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد شاہی لشکر نے مالوہ کے خلاف طبل جنگ بجا دیا۔

☆☆☆

شاہی لشکر کو مالوہ ... کی طرف روانہ کرنے کے بعد اعظم خان ایک درخت کے سہارے پریشان کھڑا رہ گیا۔ وہ گھبرایا ہوا ہر طرف نظریں اٹھاتا۔ شاید وہ کسی اہم نتیجے پر پہنچنا چاہتا تھا۔ کچھ دیر وہ کھڑا سوچتا رہا اور پھر اپنے مکان کی طرف چل دیا۔

یوں جعفر نے اعظم خان کو تفکر میں پا کر کہا۔

"آج آپ اداس کیوں ہیں میرے آقا؟"

جواب میں اعظم خان نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"میں نہ کہتا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے۔ دیکھو جعفر! مجھ پر آج ایک آزمائش کا وقت آن پڑا ہے اور اس کے لیے قربانیوں کی ضرورت ہے۔"

یہ سن کر جعفر بہ یک جنبش بولا۔ "بندہ حاضر ہے۔ آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، بس حکم کیجیے۔" یہ کہتے ہوئے جعفر کے دونوں ہاتھ سینے پر تھے۔

"ہاں، جعفر! تم ہی میری مدد کر سکتے ہو۔" اعظم خان نے بھرپور لہجے میں کہا۔ "تم ایسا کرو کہ فوراً برہان پور روانہ ہو جاؤ۔ میں تمہیں ایک خط لکھ کر دیتا ہوں۔ یہ خط خان جہاں کے ہاتھوں میں دینا۔ تم راستے میں کہیں نہ ٹھہرنا کیونکہ شاہی لشکر اس کے تعاقب میں روانہ ہو چکا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم لشکر کے پہنچنے سے پہلے ہی وہاں پہنچ جاؤ۔"

اعظم خان نے اسے بڑی صراحت سے سمجھاتے ہوئے مزید کہا۔ "اور سنو، تمہیں وہاں تک پہنچنے میں ذرا بھی دیر نہ ہونے پائے۔" کہتے ہوئے اعظم خان نے بڑے مستحکم انداز میں جعفر کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ فدویانہ لہجے میں خم کھا کے بولا۔

"جیسا آپ کا حکم آقا! آپ خط لکھ دیں۔ میں تب تک روانگی کی تیاری کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔

اعظم خان نے خان جہاں کے نام ایک خط لکھا اور ایک ریشمی رومال میں لپیٹ کر رکھ دیا۔

تھوڑی دیر بعد جب جعفر روانہ ہونے کے لیے تیار ہو کر آیا تو اعظم خان اسے خط دے کر بولا۔

"یاد رکھو جعفر! لشکر تمہیں نہ دیکھنے پائے۔"

"آپ اطمینان رکھیں آقا!" جعفر نے اطمینان دلایا اور خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

عرض بیگی نے بھی اپنی ذلت کا بدلہ لینے کی قسم کھا رکھی تھی۔ جس وقت ارادت خان مالوہ کے حاکم خان جہاں کی سرکوبی کے لیے شاہی لشکر لے کر روانہ ہو رہا تھا، اس نے اپنے دو خاص جری سپاہیوں ملوک اور شاہی کو خاص انعام کا لالچ اور ہدایت دے کر شامل کیا تھا کہ وہ اس جنگ میں کسی کو ہلاک کریں نہ کریں، خان جہاں کے بڑے بیٹے عظمت خان کو ضرور مار ڈالیں۔

ان دونوں سپاہیوں نے فوراً ہامی بھر لی تھی۔

☆☆☆

ادھر خان جہاں آگرہ سے نکل کر تیز رفتاری سے مالوہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ شاہ جہاں اس سے ضرور انتقام لے گا اور اس کے تعاقب میں ایک بھاری لشکر روانہ کرے گا۔ اس لیے وہ جلد از جلد برہان پور پہنچ کر خاطر خواہ تیاری کرنا چاہتا تھا۔

یوں وہ برابر آگے بڑھتا رہا مگر دریائے چمبل کے کنارے آ کر اسے ٹھہرنا پڑا کیونکہ برسات کا موسم ہونے کی وجہ سے دریا میں طغیانی تھی۔ دریا میں کوئی کشتی بھی نہیں تھی۔ پل پہلے ہی سیلاب کی نذر ہو چکا تھا۔ وہ گھوڑے سے اترا۔ اسے اترتا دیکھ کر عظمت خان، حسین خان اور عزیزہ بھی اپنے اپنے گھوڑوں پر سے اتر پڑے اور پھر سارے لشکر کو اترنا پڑا۔

خان جہاں نے اپنے بیٹے عظمت خان کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"فرزند! اب ہم دریا کو کس طرح عبور کر سکتے ہیں؟"

عظمت خان نے جواب میں باادب کہا۔ "ابا حضور! دریا گھوڑوں سے تو عبور نہیں کیا جا سکتا۔"

"تو پھر؟" باپ نے بیٹے کو جواب طلب نظروں سے دیکھا۔

"ابا حضور! میں نے ٹھیک کہا۔ اگرچہ ہمارا برہان پور پہنچنا بھی بے حد ضروری ہے۔" عظمت خان بولا۔ "اور ہمارے لیے ایک ایک لمحہ بھی قیمتی ہے مگر بات وہی ہے کہ ایسی حالت میں کیا، کیا جا سکتا ہے۔" عظمت خان مایوس

لہجے میں یہ کہہ کر خاموش ہوا پھر کچھ سوچ کر دوبارہ بولا۔
''ہاں، یہ ہوسکتا ہے کہ آج کی رات تو یہیں گزار لیتے ہیں ممکن ہے صبح تک طغیانی کچھ کم ہو جائے۔'' اس نے اپنی بات ختم کی تو عزیزہ بولی۔
''یہ مناسب ہے۔'' خان جہاں نے کہا پھر بیٹے کو ہدایت دی۔ ''تم جاؤ بیٹے حسین......! اور لشکر والوں کو بتادو کہ رات یہیں گزارنی ہے لیکن وہ ہوشیار رہیں اور چند سواروں کو پڑاؤ کی نگرانی پر مقرر کردو۔'' حسین چلا گیا۔
اب سب سے پہلے شاہی خیمہ نصب کیا جانے لگا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دریائے چمبل کے کنارے ایک شہر سا آباد ہوگیا۔ یہاں درندے بھی خوف کی وجہ سے کبھی پانی پینے نہیں آتے تھے۔ آج وہاں ہر طرف رونقیں نظر آرہی تھیں۔
تھوڑی دیر گزری تھی کہ ناگاہ پہاڑی کے دامن سے گرد اٹھتی ہوئی دکھائی دی۔ سارے لشکر کی نظریں اسی سمت کو اٹھ گئیں۔
سپاہیوں نے غور سے دیکھا تو ایک گھڑ سوار گھوڑا دوڑاتا ہوا اسی طرف بڑھ رہا تھا۔
ٹاپوں کی آواز سن کر خان جہاں، عظمت خان، حسین خان اور عزیزہ بھی اپنے خیمے سے باہر آگئے۔
پڑاؤ کے نزدیک پہنچ کر سوار نے اپنے گھوڑے کی رفتار سست کردی۔ وہ شاید شاہی خیمہ پہچاننے کی سعی کر رہا تھا۔
خان جہاں نے رومال ہلایا اور اجنبی سوار اسی طرف چل پڑا۔ اب وہ لشکر کے درمیان سے گزر رہا تھا۔ سارے لشکر کی نگاہیں اجنبی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ ہر سپاہی اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔
اجنبی سوار اب شاہی خیمے کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ پہریدار اسے قریب آتا دیکھ کر آگے بڑھا اور گھوڑے کی لگام پکڑی۔ سوار گھوڑے سے نیچے اتر پڑا اور بڑھ کر خان جہاں کو سلام کیا۔
خان جہاں نے سلام کا جواب دیا اور پوچھا۔ ''تم کہاں سے آرہے ہو؟''
اجنبی سوار نے جواب میں باادب کہا۔ ''میں آگرہ سے آرہا ہوں۔ مجھے اعظم خان سپہ سالار نے آپ کی خدمت میں یہ خط دے کر بھیجا ہے۔'' کہتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے خط نکالا۔
اعظم خان کا نام سنتے ہی عزیزہ کے مرجھائے ہوئے چہرے پر یک دم شگفتگی آگئی۔
خان جہاں نے سوار کے ہاتھ سے خط لے کر پڑھا۔ لکھا تھا۔
''شاہی لشکر تعاقب میں روانہ ہو چکا ہے۔ شاہی لشکر کا سردار ارادت خان ہے۔ ویسے میں نے اسے سب کچھ سمجھا دیا ہے لیکن غیر پھر بھی غیر ہی ہوتا ہے۔ اس سے کسی قسم کی امید نہیں کی جاسکتی۔ آپ سے ہوسکے تو قلعہ بند ہو کر مقابلہ کیجیے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ناکام و نامراد واپس جائے گا۔''
خان جہاں نے خط پڑھنے کے بعد عزیزہ کو دے دیا۔ یوں بھی اس کی پُراشتیاق نگاہ بار بار خط پر جاتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ یہی تحریر وہ عمر بھر دیکھا کیے رہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اس تحریر کو حرفِ زبان بنا کر اپنے سینے سے لگائے رکھے۔
ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد خان جہاں نے پوچھا۔
''شاہی لشکر کب روانہ ہوا ہے؟''
''پرسوں...... میں لشکر کی روانگی کے بعد ہی آگرہ سے چلا تھا۔ وہ عنقریب یہاں پہنچنے والا ہی ہوگا۔'' اجنبی جو جعفر ہی تھا، نے مختصر اً صراحت بتائی۔
''اچھا اب تم جا کر ذرا آرام کرو۔'' خان جہاں نے کہا۔
جعفر نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔ ''نہیں سردار! میں مجبور ہوں اور اسی وقت واپس جانا چاہتا ہوں۔ میرے آقا میرا بے چینی سے انتظار کر رہے ہوں گے۔''
خان جہاں نے قدرے تفکیر تلے جعفر کو سمجھاتے ہوئے کہا۔
''اندھیاری رات ہے پھر تم ان راستوں سے بھی ناواقف ہو، اس لیے یہی مناسب ہے کہ آج رات یہیں آرام کرو۔ صبح ہوتے ہی روانہ ہو جانا۔''
جعفر نے کہا۔ ''مجھے قیام کرنے پر مجبور نہ کیجیے سردار! میں کسی بھی صورت میں نہیں ٹھہر سکتا۔''
اب آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ پہاڑی نشیب سے ایک سوار تیز رفتاری سے گھوڑا دوڑاتا ہوا جا رہا تھا۔ خان جہاں اور عزیزہ کی آنکھیں اسی طرف لگی ہوئی تھیں۔
اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ آسمان پر ستارے البتہ چمک رہے تھے۔
سوار رفتہ رفتہ نظروں سے اوجھل ہوگیا لیکن عزیزہ کی نگاہیں ابھی تک اسی طرف تھیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔
یوں خان جہاں، اس کے بیٹوں اور عزیزہ نے ساری رات اضطرابِ مسلسل میں گزار دی۔ صبح ہوتے ہی عظمت اپنے والد کے خیمے میں آیا۔

عظمت سلام کر کے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر خاموش رہا۔ اسے شاید اپنے والد سے مشورہ کرنا تھا۔ آخر اس نے سوال کیا۔
''ابا جان! اگر دشمن پہنچ جائے تو ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''
باپ نے بیٹے کا چہرہ دیکھا اور بولا۔ ''ہاں، فرزند! خدا کا شکر ہے کہ ہمیں وقت سے پہلے ہی معلوم ہو گیا کہ شاہی لشکر ہمارے تعاقب میں روانہ ہو چکا ہے۔ یہ بہت اچھا ہوا ورنہ بے خبری میں خدا جانے ہمارا کیا حشر ہوتا۔''
''ہاں، ابا جان! سردار اعظم خان نے اس سلسلے میں ہماری بڑی مدد کی ہے۔'' عظمت بولا۔
ایک دو لحظہ سکوت کے بعد خان جہاں نے کہا۔ ''اگر بعض سیاسی پیچیدگیاں نہ ہوتیں تو میں ضرور عزیزہ کی شادی اعظم خان کے ساتھ کر دیتا۔ وہ بڑا بہادر اور شریف نوجوان ہے۔''
خان جہاں نے جیسے ہی اپنا جملہ مکمل کیا حسین اور عزیزہ خیمے میں داخل ہوئے۔ خان جہاں انہیں آتا دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ دونوں نے باپ کو سلام کیا اور خاموشی سے عظمت خان کے پاس بیٹھ گئے۔ عزیزہ کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ ساری رات روتی رہی تھی۔
خان جہاں اس کی اداسی کا سبب جانتا تھا اس لیے اس نے موضوع بدلتے ہوئے حسین سے پوچھا۔ ''بیٹے! دریا کا کیا رنگ ہے؟''
''ابھی تک وہی کیفیت ہے ابا جان!'' حسین نے جواب دیا اور آگے بولا۔ ''بلکہ پانی اور چڑھ گیا ہے۔''
''اگر یہ کیفیت ہے تو ہم دریا عبور نہیں کر سکتے۔ تم لشکر کو تقسیم کر دو۔'' خان جہاں کچھ اور بھی کہنے والا تھا کہ ایک سپاہی گھبرایا ہوا آیا اور بولا۔
''حضور! دشمن کا لشکر سر پر آن پہنچا ہے۔''
عظمت خان نے حیران ہوتے ہوئے سپاہی کی طرف دیکھا۔
''گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ عظمت! تم جاؤ اور لشکر کو تیار کرو۔ ہمیں ہر صورت میں دشمن کا مقابلہ کرنا ہوگا۔'' خان جہاں نے عظمت کو سمجھاتے ہوئے کہا۔
اپنے والد کی ہدایت پر عظمت خان اور حسین خیمے سے باہر چلے گئے۔

☆☆☆

خان جہاں کا لشکر پہلے ہی سے مقابلے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ شاہی لشکر کو دیکھ کر اس پر بھوکے شیر کی طرح ٹوٹ پڑا۔
اب باقاعدہ جنگ شروع ہو گئی۔ ارادت خان دور کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔
عزیزہ، عظمت اور حسین برابر دشمن پر حملے کر رہے تھے۔ میدانِ جنگ لاشوں سے پٹ گیا تھا اور بڑا غضب کا رن تھا۔
شاہی لشکر سفر کی وجہ سے نڈھال تھا اور مغل سپاہی ابھی آرام بھی نہ کر پائے تھے کہ انہیں جنگ میں جھونک دیا گیا تھا لہٰذا وہ خان جہاں کے لشکر کے اچانک اور شدید حملوں کی وجہ سے سہمے ہوئے تھے۔
اب سورج غروب ہو رہا تھا اور فضا تاریک ہوتی جا رہی تھی۔ یوں رات ہوتے ہی دونوں لشکر اپنے اپنے پڑاؤ کی طرف لوٹ گئے اور جنگ کا فیصلہ آنے والے کل تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا۔
شاہی لشکر کے دس ہزار سپاہیوں میں سے بیشتر کام آ چکے تھے۔ رات کی تاریکی میں ہر طرف آگ روشن تھی۔ خان جہاں نے نماز سے فارغ ہو کر عظمت کو بلا کر کہا۔
''بیٹے! یہ غفلت کا وقت نہیں ہے۔ اس نازک وقت میں دشمن ہر مکر و فریب سے کام لے گا۔ اپنے لشکر کو ہوشیار رہنے کی تاکید کر دو اور رات کو تم خود بھی نگرانی کرتے رہو۔''
''بہت بہتر ابا جان......!'' عظمت خان نے سعادت مندی سے کہا اور باہر چلا گیا۔
اب میدان میں ہر سو خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ خان جہاں اس وقت بستر پر پڑا کروٹیں بدل رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ گو آج تک کی جنگ میں اس کا پلہ بھاری رہا تھا مگر اس کے سپاہی گھبرا گئے تھے۔ پھر مغلوں کو مزید کمک ملنے کا بھی امکان تھا۔ اگر ایسا ہوا تو اس کا انجام بہت خراب ہوگا۔
اس وقت اس کے پاس کل دو ہزار سپاہی باقی بچے تھے۔ تین ہزار آج کی لڑائی میں کام آ چکے تھے۔ وہ انہی خیالات میں کھویا ہوا تھا کہ اذان کی آواز نے چونکا دیا۔
وہ اٹھا اور وضو کر کے...... نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔
نماز سے فارغ ہو کر وہ سیدھا عظمت کے خیمے میں پہنچا اور اسے بیدار کیا۔ وہ جب نماز پڑھ چکا تو خان جہاں نے پوچھا۔
''بیٹے! لشکر والوں کے حوصلوں کا کیا عالم ہے؟''
''ابا جان! ان کے حوصلے بلند ہیں۔'' عظمت نے جواب دیا۔
''اللہ کا شکر ہے۔ اچھا، اب تم جا کر لشکر کو باہر نکالو اور میرے پہنچنے کا انتظار کرو۔''
یہ کہہ کر خان جہاں اپنے خیمے میں واپس آ گیا اور عظمت لشکر کی طرف روانہ ہو گیا۔
عظمت خان نے لشکر کو تیار کیا اور جب سارا لشکر

میدان میں جمع ہوگیا تو طبلِ جنگ بجانے کا حکم دیا۔ طبلِ جنگ کی آواز نے لشکر میں ایک نئی روح پھونک دی۔
اتنے میں خان جہاں بھی پہنچ گیا۔ اس نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور اپنا گھوڑا میدانِ جنگ کی طرف سرپٹ دوڑا دیا۔ لشکر والوں نے جب یہ دیکھا تو وہ بھی اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور میدانِ جنگ میں کود پڑے۔ مغل لشکر ان کے انتظار میں تیار کھڑا تھا۔
ادھر عزیزہ بھی اپنا گھوڑا بڑھاتی ہوئی میدان جنگ کی طرف بڑھی تھی پھر وہ اپنے والد کے قریب پہنچ کر بولی۔
''ابا جان! ہمارے لیے یہ وقت بڑا نازک ہے۔ بہتر یہی ہے کہ آپ اپنی جان بچا کر بھاگ نکلیں۔ ہم دشمنوں کو روکتے ہیں اور آپ اپنا گھوڑا دریا میں ڈال دیجیے۔ آپ کا دریا عبور کرنا ازبس ضروری ہے تاکہ برہان پور پہنچ کر مغلوں کے مقابلے کے لیے لشکر کو تیار کر سکیں۔''
خان جہاں کو اپنی بیٹی کی یہ تجویز پسند آئی۔ وہ خود بھی سمجھ رہا تھا کہ اس کا برہان پور پہنچنا کس قدر ضروری ہے لہٰذا اس نے ایک نظر عزیزہ پر ڈالی اور ایڑ لگا کر اپنا گھوڑا دریائے چمبل کی لہروں میں ڈال دیا۔
اس کا لشکر پہلے ہی سے شکستہ حال تھا۔ اپنے سردار کو دریا میں کودتے دیکھ کر لشکر والے بھی لہروں میں تیرنے لگے۔ صرف چند جاں نثاروں کے ساتھ حسین خان دشمن کو روکے رہا۔
عزیزہ بھی میدانِ جنگ کی طرف بڑھی اور سہمے ہوئے سپاہیوں کو جوش دلا کر دشمن پر حملہ کرنے کی ترغیب دی لیکن اب نقشۂ جنگ اور پانسۂ جنگ پلٹ چکا تھا۔
ملوک اور شاہی بدستور عظمت خان کے تعاقب میں تھے۔ وہ لڑتے لڑتے بالآخر اس کے گھوڑے کے نزدیک پہنچ گئے۔ اس وقت یہ عالم تھا کہ تھک کر سب ہی چُور ہو رہے تھے لیکن مکار عرض بیگی نے ان دونوں کو یہی ہدایت کی تھی کہ انہوں نے صرف عظمت خان کو ہلاک کرنے میں اپنی توانائی کا مظاہرہ کرنا ہے اسی لیے وہ دونوں تازہ دم تھے۔
انہوں نے عظمت کے گھوڑے کو گھیرے میں لے لیا۔ عظمت اس وقت بڑی بہادری اور جرأت کے ساتھ دشمنوں پر اپنی تلوار سے ٹوٹا پڑ رہا تھا۔ تب ہی ملوک اور شاہی بیک وقت اس پر عقب سے ٹوٹ پڑے۔
شاہی نے تلوار کا ایک وار کیا۔ عقب سے وار میں بہادر بھی ڈھے جاتے ہیں، سو وہی حال جری اور جنگجو عظمت خان کا بھی ہوا۔ ہاتھ میں زخم آیا تو تلوار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔
ابھی وہ سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ شاہی نے اپنے نیزے سے عقب سے حملہ کیا۔ نیزہ عظمت کے پہلو میں گھسا اور وہ اپنے ہی گھوڑے پر جان کنی کے عالم میں ڈولنے لگا۔
ادھر عزیزہ نے حسین خان کو بھی دریا عبور کرنے کا مشورہ دیا اور خود اپنے چند سواروں کے ساتھ دشمن پر ٹوٹ پڑی۔ جب خان جہاں دریا کے پار پہنچ گیا تو عزیزہ بھی اپنے سواروں کو ساتھ لے کر دریا میں کود پڑی۔
خان جہاں، حسین خان اور عزیزہ اپنے سواروں کے ساتھ دوسرے کنارے پر جا رکے۔ انہوں نے دشمن کو دیکھا اور سامنے برہان پور کی بلند اور عالیشان عمارتوں پر نظر ڈالی اور مسکرائے۔
اب شام ہو چکی تھی۔ خان جہاں اپنے ساتھیوں کو ساتھ لے کر قلعے کی طرف بڑھا اور مغل لشکر اپنے شکار کو حسرت سے دیکھتا رہ گیا۔
اس جنگ میں شاہی لشکر کا سپہ سالار ارادت خان بھی مارا جا چکا تھا۔ اسے عزیزہ اور حسین خان نے ہلاک کیا تھا لہٰذا شاہی لشکر کی باگ اب دوسرے سالار نیابت خان کے سپرد تھی۔

☆☆☆

شاہ جہاں اپنے دربار میں بیٹھا تھا۔ سارے امرا اور وزیر حسب مراتب سرنگوں بیٹھے تھے۔ شاہ جہاں آج بے حد فکرمند اور اداس تھا۔ وہ پریشان تھا کیونکہ ارادت خان کو گئے ہوئے تقریباً ایک مہینا گزر چکا تھا لیکن اس کی اب تک خیر و عافیت معلوم نہ ہو سکی تھی اور نہ ہی یہ معلوم ہوا تھا کہ خان جہاں کا کیا ہوا؟
شاہ جہاں نے دربار پر ایک نظر ڈالی اور آصف جاہ سے مخاطب ہو کر بولا۔
''آخر تم کس مرض کی دوا ہو؟''
''ہم حضور کے اک اشارۂ جنبش پر اپنی جانیں نثار کرنے پر تیار ہیں۔'' آصف جاہ نے ادب سے جواب دیا۔
''یہ سب باتیں ہیں۔ جب تم اب تک ایک باغی سردار کو گرفتار نہ کر سکے تو آئندہ تم سے کیا امید رکھی جا سکتی ہے۔'' شاہ جہاں نے کہا۔
''آپ اطمینان رکھیں جہاں پناہ! ارادت خان ضرور اسے گرفتار کر کے آپ کے سامنے حاضر کرے گا۔'' آصف جاہ نے پُرتیقن لہجے میں بادشاہ کو اطمینان دلایا۔
''یہ صرف ایک خواب ہی بن کر رہ گیا ہے آصف جاہ!

میں چاہتا ہوں کہ دس ہزار کا ایک اور لشکر اس کی مدد کے لیے بھیجا جائے لیکن سوال یہ ہے کہ اس لشکر کی قیادت کس سردار کے سپرد کی جائے؟'' شاہ جہاں نے آخر میں دریافت کیا۔

اس پر عرض بیگی اپنی نشست سے اٹھا اور ادب سے بولا۔

''جہاں پناہ! غلام اس خدمت کے لیے حاضر ہے۔ خان جہاں نے بھرے دربار میں مجھے ذلیل کیا ہے۔ میں اس سے ضرور انتقام لوں گا۔''

شاہ جہاں نے عرض بیگی کی طرف غور سے دیکھا اور ایک خلعت عطا کرتے ہوئے بولا۔

''مجھے یقین ہے عرض بیگی! تم اس ذلیل شخص سے اپنی بے عزتی کا بدلہ ضرور لوگے۔ جاؤ، اب زیادہ وقت ضائع نہ کرو اور اپنے ساتھ پانچ ہزار مسلح سوار لیتے جاؤ۔'' شاہ جہاں نے اسے ہدایت کردی۔

عرض بیگی نے ادب سے کہا۔ ''ولی نعمت! اس بزدل انسان کے لیے اتنے بڑے لشکر کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنے ساتھ ایک مختصر سا لشکر لے جانا چاہتا ہوں۔''

''نہیں، میں جو کہتا ہوں وہی کرو۔'' شاہ جہاں جلال میں آکر بولا۔ ''طوفان کی طرح جاؤ اور اسے غرق و نابود کردو۔ ایسا غرق کہ وہ قیامت تک سر نہ اٹھا سکے۔''

''ایسا ہی ہوگا جہاں پناہ!'' عرض بیگی نے جھکتے ہوئے کہا اور سلام کر کے رخصت ہوگیا۔

جمنا کی ساکن لہروں پر پھیلتی ہوئی خاموش فضا میں لشکر کی روانگی کے لیے بجنے والے بگل نے ایک ہیجان پیدا کردیا تھا۔ عرض بیگی اپنے گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا اور لشکر اشارے کا منتظر تھا کہ شام کے دھندلکے میں دور ایک سوار، گھوڑا دوڑائے آتا دکھائی دیا۔

عرض بیگی نے اپنے لشکر کو اشارے سے روکا اور انتظار کرنے لگا کہ دیکھے آخر یہ آنے والا کون ہے اور کہاں سے آرہا ہے؟ جب سوار قریب آیا تو عرض بیگی نے پہچانا کہ وہ سپہ سالار اعظم خان تھا۔

عرض بیگی احتراماً گھوڑے سے اتر پڑا۔ سارے لشکر نے اس کی پیروی کی اور سارے سوار اپنے اپنے گھوڑوں سے اتر پڑے۔

اعظم خان نے لشکر کا جائزہ لیا اور عرض بیگی کو اشارے سے ایک طرف بلا کر کہا۔ ''ہمیں معلوم ہے عرض بیگی کہ تم کہاں جارہے ہو۔''

''جی حضور! میں اپنی عزت پر قربان ہونے جارہا ہوں۔'' عرض بیگی نے جواب دیا۔

''مگر دانستہ طور پر موت کے منہ میں جانے سے کیا فائدہ۔'' اعظم خان نے کہا۔

''میں ایسی زندگی کو موت سے بدتر سمجھتا ہوں حضور کہ جس میں بے عزتی ہو۔ اس خیال کے آتے ہی میرے تن بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔ میں پاگل ہوجاتا ہوں جب یہ سوچتا ہوں کہ عظمت خان یہ کہتا ہوگا کہ اس عرض بیگی کو بھرے دربار میں ذلیل کردیا۔''

اعظم خان کو عرض بیگی کے سینے میں سلگتی آتشِ انتقام اور جوشِ غیظ کا اندازہ تھا، تاہم بولا۔ ''عرض بیگی! وہ وقت کی بات تھی۔ ہر شخص کنارے تک پہنچنے کی کوشش میں ہاتھ پیر مارتا ہی ہے۔ کبھی کبھی بکری بھی شیر پر حملہ کردیتی ہے۔ وہ اس وقت موت کی آغوش میں تھا اور اگر......''

کہتے کہتے اعظم خان رک گیا تو عرض بیگی نے الجھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''تو آپ کیا چاہتے ہیں؟''

''کچھ نہیں۔ میں تو تمہیں نشیب و فراز سے آگاہ کرنے آیا تھا۔ یاد رکھو، جہاں پناہ تمہیں موت کے منہ میں دھکیل کر اپنی ناموری چاہتے ہیں۔ اگر تم میدان جنگ میں مارے گئے تو ان کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اگر تم نے خان جہاں پر فتح پالی تو بھی ان کا ہی نام ہوگا۔'' اعظم خان نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''میں آپ کا احترام کرتا ہوں اور حضور جہاندیدہ و گرگ باراں دیدہ بھی ہیں اور ہر ایک کے خیرخواہ بھی۔ آپ صاف صاف فرمائیں کہ کیا چاہتے ہیں؟'' عرض بیگی نے دریافت کیا۔

''میں کیا چاہوں گا عرض بیگی...... کہ تمہاری موت سے نہ مجھے کوئی افسوس ہوگا اور نہ تمہاری کامیابی پر کوئی خوشی۔ میں فقیر قسم کا آدمی ہوں۔ سپہ سالار نہ سہی، سپاہی ہی سہی مگر تمہیں یہ بتانا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ تم جان بوجھ کر موت کے منہ میں جارہے ہو۔'' اعظم خان نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''میں آپ کی اس ہمدردی کا شکریہ ادا کرتا ہوں معزز سردار!'' عرض بیگی باادب بولا۔ ''مگر میں اس سے زیادہ اپنے متعلق سوچنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ میں اس لیے نہیں جارہا ہوں کہ جہاں پناہ مجھے کوئی عہدہ دیں گے، صرف اس لیے جارہا ہوں کہ عظمت خان نے مجھے بھرے دربار میں ذلیل کیا تھا۔ میں اس سے اپنی بے عزتی کا انتقام لینا چاہتا ہوں۔''

اب اعظم خان اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ خاموش ہوگیا اور اشارے سے عرض بیگی کو جانے کی اجازت دے دی۔

عرض بیگی نے جھک کر سلام کیا اور لشکر کے ساتھ روانہ ہوگیا۔

اعظم خان دیر تک اسے جاتا دیکھتا رہا اور جب لشکر اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا تو اس نے ایک سرد سی ہمکاری بھرتے ہوئے خود کلامیہ کہا۔

''آہ...... میری قسمت کے چاند (عزیزہ)، تجھ پر دشمنوں کی کالی گھٹائیں چھاتی جارہی ہیں۔ تمہاری طرح میں بھی رحمت کی اس ہوا کا شدت سے منتظر ہوں جو انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے منتشر کردے۔ میں نے تجھے (عزیزہ) خدا کے حوالے کیا۔''

اعظم خان نے حسرت سے آسمان کی طرف دیکھا اور واپس لوٹ آیا۔

☆☆☆

برہان پور کے شاہی محل پر آج اداسی برس رہی تھی۔ نہ کوئی پہریدار تھا، نہ کوئی خادم۔ خان جہاں، اس کا بیٹا حسین خان اور شہزادی عزیزہ، عظمت کی جواں موت پر آنسو بہا رہے تھے۔

خان جہاں کی کمر خم ہوچکی تھی اور وہ دیدے پھاڑ پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا اور پھر تقریباً چیختے ہوئے بولا۔

''تم سب غلط کہتے ہو۔ حسین! میرا عظمت زندہ ہے۔ میرا شیر ان گیدڑوں کے ہاتھوں کبھی نہیں مرسکتا۔''

غمگسار عزیزہ اپنے باپ کے قریب آئی اور تسلی دیتے ہوئے بولی۔ ''ابا جان! اب افسوس کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ موت ہمارے سروں پر منڈلا رہی ہے۔ اب ہمیں اپنی فکر کرنا چاہیے۔ بے شک بھائی عظمت شہید ہوگئے لیکن وہ بہادری کی موت مرے ہیں۔''

غمگسار باپ نے کہا۔ ''بیٹی! اب مجھے نہ سلطنت کی ضرورت ہے، نہ کسی اور چیز کی۔ میں اب میدانِ جنگ میں جا کر......'' خان جہاں فرطِ رقت تلے جملہ پورا نہ کرسکا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔

''نہیں ابا جان! ہم ان بھوکے کتوں کو یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ عظمت کا خون رائگاں نہیں گیا۔ جب ہم موت کی تلاش میں میدانِ جنگ میں نکلیں گے تو موت ہم سے دور بھاگے گی اور ہم موت کے تعاقب میں دشمنوں کی صفوں کو چیر کر رکھ دیں گے اور......اور......''

عزیزہ جوش تلے مغلوب الغضب ہوتے ہوئے کہے جارہی تھی۔

''بیٹی! تمہارا باپ موت سے خائف نہیں بلکہ تمہارے بھائی کی موت نے اسے بزدل بنا دیا ہے۔'' خان جہاں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''خدا کے لیے ایسا نہ سوچیے ابا جان! ابھی آپ کو زندگی کی ضرورت ہے۔ ہمیں ابھی بھائی عظمت خان کے خون کا انتقام لینا ہے۔'' عزیزہ پُرجوش لہجے میں بولی۔

''بیٹی عزیزہ! ہم اس وقت دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں اور رہائی کی کوئی صورت ممکن نہیں۔'' خان جہاں نے کہا۔

''گھبرائیے نہیں ابا جان! ہم سپاہی زادے ہیں۔ آپ کی یہ مایوسانہ گفتگو ہمارا دل بھی خون خون کیے دیتی ہے۔ ہم مرنے کے طلبگار ہیں اور مرجائیں گے مگر بزدلوں کی موت نہیں مریں گے۔ ہم تلواروں کی چھاؤں میں پل کر جوان ہوئے ہیں۔ آپ یہاں رہیے مگر ہمیں اجازت دیجیے۔'' آخر میں عزیزہ نے اجازت طلب کرتے ہوئے کہا۔

''میں سب کچھ جانتا اور سمجھتا ہوں اور دشمنوں سے جنگ بھی کرنا چاہتا ہوں لیکن دشمن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ میں تمہاری زندگی چاہتا ہوں۔ میری بیٹی! خدا تمہیں سلامت رکھے۔ تم نے مجھے مجبور کردیا۔ میں بھی اب اس جنگ میں حصہ لوں گا۔ جاؤ حسین! تمہیں یہ خدمت مبارک ہو۔ مالوہ کے پہاڑوں کے ذرّے ذرّے کو، مکانوں کی اینٹ اینٹ کو مادرِ وطن کا یہ پیغام پہنچاؤ کہ مادرِ وطن اس وقت غلامی کی زنجیروں میں جکڑی جارہی ہے۔ بڑھو اور مرنے مارنے کے لیے تیار ہوجاؤ، پھر یہ وقت نہ آئے گا۔ آج آزادی ہمیں بلا رہی ہے۔ کل تمہارے خون کے دریاؤں میں طوفان کی آوازیں بھی اسے تمہاری طرف نہ لاسکیں گی۔''

خان جہاں جوش میں نہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ حسین اور عزیزہ اپنے باپ کی باتیں سن کر خوش ہورہے تھے۔ حسین نے تلوار سنبھالی اور باہر نکل گیا۔ گھوڑے پر سوار ہوا اور دشوار گزار راستوں میں روپوش ہوگیا۔

خان جہاں اپنی آرام گاہ کی طرف چلا گیا۔ وہ جاتے ہی بستر پر لیٹا اور سوگیا۔ عزیزہ نے مردانہ لباس پہن کر چہرے پر نقاب ڈالی، گھوڑے پر سوار ہوئی، گرد و پیش کا جائزہ لیا اور ایک طرف روانہ ہوگئی۔

عزیزہ نے سیدھا ریتی حنا کے جنگل کا رخ کیا۔ اس کی زمین کہیں گھاس زدہ اور کہیں ریتیلی تھی۔ یہاں اس نے اپنی

ایک خفیہ جنگی کمین گاہ بنائی ہوئی تھی۔ ریتی چنا کا مغربی حصہ موجودہ میدانِ جنگ سے زیادہ دور نہ تھا۔

اپنی ریتی چنا والی خفیہ جنگی کمین گاہ میں اس نے پورا ایک دن گزارا تھا اور اگلے ہی دن اس کے ایک جاسوس نے اطلاع دی کہ آگرہ سے ایک نیا اور تازہ دم شاہی لشکر آ کر نیابت خان کے پاس فروکش ہوا ہے اور اس کا سردار عرض بیگی ہے۔

میدانِ جنگ میں خیمہ زن دشمن لشکر کے بارے میں یہ خبر اس کے لیے دھماکے سے کم نہ تھی۔ اسے فکر ہونے لگی کہ تازہ دم کمک ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ انہیں شکست سے دوچار ہونا پڑ جائے گا، اگر اس کا جلد ہی سدباب نہ کیا گیا تو......

تب ہی اس نے سوچ بچار کے بعد اس نے ایک صندوق سے بھڑکیلا لباس نکالا اور اسے زیب تن کرنے لگی۔

☆☆☆

اگرچہ نیابت خان نے فتح ضرور پالی تھی مگر دس ہزار میں سے صرف چند...... سوار اس کے پاس زندہ بچے تھے۔ ان میں سے اکثر زخمی اور بیمار تھے۔ جو تندرست تھے، وہ اپنے اپنے گھروں کو واپس لوٹنا چاہتے تھے۔ اس موسم میں مالوہ کی آب و ہوا ان کے لیے مہلک تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ کہیں جا بھی نہیں سکتے تھے۔

نیابت خان نے ایک اونچی سی پہاڑی پر خیمے لگوائے تھے۔ پہاڑی ندی نالے لبالب بھرے ہوئے تھے۔ دریا میں سخت طغیانی تھی۔ نیابت خان اس صورتِ حال سے سخت گھبرایا ہوا تھا۔ وہ کہیں جا بھی نہ سکتا تھا اور نہ ہی کسی قاصد کو شہنشاہ تک بھیجا جا سکتا تھا۔

ایک مہینے سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا مگر اس طوفان میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ایک طرف وہ اس مصیبت میں گرفتار تھا تو دوسری طرف اسے یہ خوف تھا کہ خان جہاں ایک لشکرِ جرار کے ساتھ اپنے نوجوان بیٹے کے خون کا انتقام ضرور لے گا۔

ان کے پاس کھانے پینے کا سامان بھی ختم ہو رہا تھا۔ نیابت خان نے واپس لوٹنے کا فیصلہ کر لیا۔

وہ اپنے سپاہیوں کے ساتھ واپسی کی تیاری کر رہا تھا کہ شمال کی جانب سے ایک لشکر آتا ہوا دکھائی دیا اور نیابت خان کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ لشکر اب پہاڑی کے دامن میں پہنچ چکا تھا۔

اس نے غور سے دیکھا اور خوشی سے نعرے لگاتا ہوا آنے والے لشکر کی طرف بڑھا۔

لشکر اب گھوڑوں سے اتر چکا تھا۔ عرض بیگی اپنے گھوڑے سے اترا اور اپنا گھوڑا ایک غلام کو دے کر پہاڑی پر چڑھنے لگا۔

نیابت خان نے عرض بیگی کو دیکھا بلکہ دونوں ہی ایک سکتے کے سے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔

''تم کیا دیکھنے لگے عرض بیگی؟'' آخر نیابت خان نے سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔

''میں حیران ہوں نیابت خان کہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟'' عرض بیگی نے جواب میں کہا۔

''کچھ نہ پوچھو عرض بیگی! میں تمہیں کیا بتاؤں کہ یہ سب کیا ہو گیا ہے۔ ارادت خان مارا جا چکا ہے اور ہمارا لشکر کچھ تو دشمن کے ہاتھوں اور کچھ خدا کے غضب سے تباہ ہو چکا ہے۔ صرف چند سپاہی زندہ بچے ہیں۔ ان میں سے بھی آدھے موت کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ خان جہاں شکست کھا کر بھاگ گیا ہے اور عظمت خان میرے ہاتھوں مارا جا چکا ہے۔''

نیابت خان نے اسے نہایت صراحت کے ساتھ ساری باتیں سمجھا اور بتا ڈالیں۔

''تم گھبراؤ نہیں نیابت خان!'' عرض بیگی نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا اور پھر بولا۔ ''میں پانچ ہزار کا لشکر لے کر آیا ہوں اور کل صبح برہان پور کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گا۔''

''کیا تم اسی لیے آئے ہو؟'' نیابت خان نے پوچھا۔

''ہاں، میں اسی لیے آیا ہوں۔'' عرض بیگی نے جواب میں کہا۔ ''میں خان جہاں کو گرفتار کر کے اسے زنجیروں میں جکڑوں گا اور عظمت خان کا سر نیزے پر رکھ کر، عزیزہ کو ننگے سر لشکر کے حلقے میں لے کر آگرہ لے جاؤں گا اور وہاں انہیں دربدر اور خاک بسر کروں گا۔''

''خدا تمہیں، تمہارے ارادوں میں کامیاب کرے۔'' نیابت نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''ہم ضرور کامیاب ہوں گے نیابت خان! تم فکر نہ کرو، بس اب ذرا لشکر کے قیام کا انتظام کرو۔ سپاہی تھک کے چور ہو رہے ہیں۔ انہیں آرام کی ضرورت ہے تاکہ جنگ میں دشمن پر کاری ضرب لگا سکیں۔'' عرض بیگی نے کہا۔

''ٹھیک ہے، تم میرے خیمے میں قیام کرو۔'' نیابت نے کہا۔ ''میں لشکر کے قیام کا انتظام کراتا ہوں۔''

یہ کہہ کر نیابت خان سپاہیوں کے انتظام و انصرام میں مصروف ہو گیا اور عرض بیگی، نیابت خان کے خیمے میں چلا گیا۔

تاریکی بڑھتی جارہی تھی اور خیمے تیار ہو چکے تھے۔ جابجا آگ روشن تھی اور سپاہی آرام سے اپنے اپنے بستروں پر لیٹے ہوئے تھے۔

عرض بیگی، نیابت خان کے خیمے میں جو سب سے الگ ایک پہاڑی پر نصب کیا گیا تھا، بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ خیمے میں شمع روشن تھی۔ عرض بیگی اب تک کئی جام چڑھا چکا تھا۔ اس پر مدہوشی طاری ہونے لگی تھی کہ اچانک ایک حسین دوشیزہ خیمے میں داخل ہوئی اور خاموشی سے قنات کے ساتھ لگ کر کھڑی ہوگئی۔

عرض بیگی اسے دیکھ کر مسکرایا اور اس کے قریب آکر بولا۔ ''اے حسینہ! تم کون ہو؟''

''میں ایک مغنیہ ہوں۔'' دوشیزہ نے جواب دیا۔

''لل...... لیکن تم یہاں کیوں آئی ہو؟'' عرض بیگی کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔

''میں نے سنا ہے کہ حضور کو ناچ گانے کا شوق ہے اور یہ معلوم ہوا کہ آپ آج کی رات اسی خیمے میں قیام کریں گے اس لیے میں حاضر ہوگئی۔'' دوشیزہ بولی۔

''خوب! یہ نیابت خان نے یہاں جنگل میں منگل کر رکھا ہے کیا......؟ خیر، اچھا کیا کہ تم آگئیں۔ کیا کچھ سناؤ گی بھی یا......''

''جی ہاں، ضرور سناؤں گی مگر ذرا ہوش تو درست ہوجانے دیجیے۔'' کہتے ہوئے دوشیزہ نے ایک دلفریب انداز سے عرض بیگی کی طرف دیکھا اور مسکرائی۔

تب ہی اس نے ایک گیت سنایا اور اپنی سانس درست کرنے لگی۔

اثنائے راہ عرض بیگی جام پر جام لنڈھاتا رہا۔ کچھ دیر وہ دوشیزہ کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا رہا اور پھر اس کے قریب آکر دست درازی شروع کردی۔

''اتنی بے صبری اچھی نہیں۔ میں تو ساری رات ہی آپ کے پاس رہوں گی۔'' دوشیزہ اسے اطمینان دلاتے ہوئے اٹھلا کر بولی۔

عرض بیگی نے اسے جام بھرنے کی ہدایت کی۔ دوشیزہ اٹھی اور ایک جام بھر کے اس کے ہونٹوں سے لگادیا۔

وہ مستی سے جھوم رہا تھا۔ اس نے اٹھنا چاہا مگر اس کے پاؤں لڑکھڑانے لگے۔ دوشیزہ نے اسے سہارا دے کر بستر پر لٹادیا۔

کالی رات اپنی اداسیوں سمیت سو چکی تھی۔ لشکر والوں کی آوازیں اب خراٹوں میں بدل چکی تھیں۔ دوشیزہ نے چھپائے ہوئے خنجر کو نکالا اور اطمینان سے خنجر عرض بیگی کے سینے میں گھونپ دیا۔

عرض بیگی کراہا، تڑپا اور ٹھنڈا ہوگیا۔ اب وہ باہر جانے کے لیے بے قرار تھی۔

اس نے خیمے کا پردہ اٹھا کر دیکھا۔ چار مغل سپاہی اطمینان سے سو رہے تھے۔ باہر نکلنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ وہ پھر خیمے میں واپس لوٹ آئی پھر خنجر نکال کر خیمے کا کپڑا کاٹنا چاہا تاکہ اس سمت اور اس طرح سے وہ باہر نکلنے کے لیے کوئی صورت پیدا کرسکے لیکن وہ جس جگہ سے خیمے کا کپڑا کاٹنا چاہتی تھی، وہ حصہ حرکت کرنے لگا۔

دوشیزہ پیچھے ہٹی اور ایک کونے میں چھپ کر کھڑی ہوگئی۔ چند لمحے بعد ہی ایک نقاب پوش اسی راستے سے خیمے میں داخل ہوا۔

اس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ عرض

سچی قسم

گوالے نے نئے ملازم کو آواز دی۔ ''اوئے شکورے!''

''جی صاحب!'' شکورا دوڑ کر حاضر ہوا۔

''دودھ میں پانی ملادیا تھا؟'' گوالے نے پوچھا۔

''جی ہاں ...... صاحب!'' نئے ملازم نے مستعدی سے جواب دیا۔

گوالے کے تاثرات ایک دم بدل گئے اور وہ غصے سے اسے ڈپٹ کر بولا۔ ''ابے گدھے! تجھے پتا نہیں دودھ میں پانی ملانا کتنی بری بات ہے؟ بہت بڑی بے ایمانی ہے یہ۔''

''لیکن صاحب! آپ ہی نے تو کہا تھا۔'' نیا ملازم ڈرتے ڈرتے اور کچھ حیرت سے بولا۔

''ابے، بات کو غور سے سنا کر۔'' گوالے نے کچھ اور ڈانٹا۔ ''میں نے تجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ دودھ میں پانی ملایا کر۔ میں نے تو یہ کہا تھا کہ بالٹی میں پہلے آدھا پانی بھر لیا کر پھر اس میں بھینس کا دودھ نکالا کر۔ اس طرح ہم گاہک کے سامنے قسم کھا سکتے ہیں کہ ہم دودھ میں پانی نہیں ملاتے کیونکہ اس طرح ہم پانی میں دودھ ملاتے ہیں۔ دودھ میں پانی نہیں۔''

مرسلہ: پرویز بھٹی، بہاولپور

بیگی کو خون میں لت پت پڑا دیکھ کر حیران ہونے لگا۔ تب ہی اس نے نظریں اٹھا کر خیمے کا جائزہ لیا تو ایک کونے میں ایک رقاصہ زرق برق لباس پہنے کھڑی نظر آئی۔ خنجر اس کے ہاتھ میں چمک رہا تھا۔ نقاب پوش نے دوشیزہ کو غور سے دیکھا اور پہچان کر آہستہ سے بولا۔

''عزیزہ......!''

اب دوشیزہ بھی نقاب پوش کو پہچان چکی تھی۔ یہ اس کا بھائی حسین تھا۔ عزیزہ نے عرض بیگی کی لاش کو حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''بھیا! مجھے معلوم ہوا تھا کہ عرض بیگی تازہ دم لشکر لے کر یہاں آیا ہوا ہے۔ میں نے اسے کسی نہ کسی بہانے سے قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یوں میں نے رقاصہ کا روپ دھارا اور یہاں پہنچ گئی۔ یہاں آکر میں نے اسے شراب میں مدہوش پایا اور......''

''میں سمجھ گیا۔ اب چلو، یہاں ٹھہرنے کا وقت نہیں۔ صبح ہونے والی ہے۔'' حسین نے اس کی بات کاٹ دی۔

''چلو۔'' عزیزہ نے بھی جلدی سے کہا اور بھائی کے ساتھ ہولی۔

☆☆☆

عزیزہ اور حسین باہر نکلے اور پہاڑی پر کھڑے ہو کر اطراف و اکناف کا جائزہ لینے لگے۔ دور انہیں ایک سوار آتا ہوا دکھائی دیا جو اسی طرف گھوڑا دوڑائے چلا آ رہا تھا۔

سوار کو اپنی طرف آتا دیکھ کر دونوں ایک چٹان کی آڑ میں چھپ کر کھڑے ہو گئے۔ دونوں بہن بھائی اب آنے والے سوار کا انتظار کرنے لگے۔

سوار قریب پہنچ کر گھوڑے سے اترا اور احتیاط سے عرض بیگی کے خیمے کی طرف بڑھا۔ جوں ہی وہ ان کے قریب سے گزرا تو عزیزہ نے اسے پہچان کر آہستہ سے پکارتے ہوئے کہا۔

''ابا جان! ہم یہاں ہیں۔''

پہلے تو اجنبی سوار نے حیران ہو کر ادھر اُدھر دیکھا پھر سامنے کھڑے عزیزہ اور حسین کو مسکراتے دیکھ کر بولا۔

''ارے......تم......'' وہ حیران تھا۔ یہ برہان پور کا حاکم خان جہاں تھا جو عرض بیگی کی تلاش میں ادھر آ نکلا تھا۔

''ابا جان! میں نے عرض بیگی کو قتل کر دیا ہے۔'' عزیزہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''قتل......! مرحبا، بہت اچھا کیا بیٹی!'' خان جہاں نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''ابا جان! یہ بڑا اچھا موقع ہے۔ اب ہمیں دشمن کے لشکر پر حملہ کر دینا چاہیے۔'' حسین اپنے باپ کو مشورہ طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے۔ چلو اب ہم چل کر اپنے سپاہیوں کو تیار کر کے فیصلہ کن حملہ کریں۔'' خان جہاں نے اپنے بیٹے کے خیال کی تائید میں کہا۔

اس کے بعد تینوں اپنے لشکر کی جانب روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

خاموش فضا میں بگل کی آواز گونج رہی تھی۔

لشکر نیچے پہاڑی میدان میں جمع ہو رہا تھا۔ حسین اور عزیزہ کی کوششوں نے ہزاروں سپاہی تیار کر لیے تھے۔ وہ سر کی بازی لگا کر آئے تھے۔ اب تک سات ہزار کے قریب سپاہی جمع ہو چکے تھے اور یہ سلسلہ ابھی جاری تھا۔ بعض اپنے اپنے گھروں سے روانہ ہونے کی تیاریاں کر رہے تھے کیونکہ وہ عزیزہ اور حسین سے وعدہ کر چکے تھے کہ وطن کی آن پر قربان ہو جائیں گے۔

یوں میدان میں جمع ہونے والے لوگ میدانِ جنگ میں جانے کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔

جب لوگ جمع ہو چکے تو خان جہاں نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''بہادرو......! شاہ جہاں کی حسرت ہے کہ وہ تمہارے وطن پر قبضہ کر کے تمہیں غلام اور تمہاری عورتوں کو لونڈیاں بنائے۔ وہ پہلے بھی ایک لشکر بھیج چکا ہے لیکن تم لوگوں نے جس بہادری سے ان کا مقابلہ کیا، اس کی تعریف نہیں کی جاسکتی۔ پرسوں عرض بیگی ایک تازہ دم لشکر لے کر یہاں اس ارادے سے پہنچا ہے کہ وہ برہان پور کی اینٹ سے اینٹ بجادے گا۔''

یہاں تک کہنے کے بعد خان جہاں تھوڑا سانس لینے کے لیے رکا اور پھر کہنا شروع ہوا۔

''لیکن......شکریہ ادا کرنا چاہیے عزیزہ کا......جس نے اس نامراد کا کام تمام کر دیا۔ اب مغلوں کے لشکر میں کوئی سردار اس قابل نہیں رہا جو ہمارا مقابلہ کر سکے۔ ان کے لشکر میں صرف ایک نیابت خان باقی رہ گیا ہے لیکن وہ ہماری جاں فروشی دیکھ چکا ہے۔ اس لیے ہمارے مقابلے میں تلوار نہیں اٹھائے گا۔''

خان جہاں کی تقریر سے لوگوں کے دلوں میں جوش اور انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ انہوں نے تلواروں پر ہاتھ رکھ کر چاروں طرف دیکھا اور گھوڑوں پر سوار ہو کر میدانِ

جنگ کی طرف بڑھنے لگے لیکن عزیزہ نے روکتے ہوئے ان سے بلند آواز میں کہا۔

''ٹھہرو...... سرفروشو! زندگی کے سودے بغیر سوچے سمجھے نہیں کیے جاسکتے۔ ہم کوئی کھیل کھیلنے کے لیے نہیں جارہے ہیں۔ ہمیں اس کے متعلق پہلے سوچ لینا چاہیے کہ ہمیں میدانِ جنگ میں کیا کرنا ہوگا۔ شاہی لشکر تربیت یافتہ ہے اور ہم جنگ کی چالوں سے قطعی ناواقف۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم ٹکڑوں میں تقسیم ہوجائیں۔ ہمارے صرف چار سردار ہیں جو جنگی چالوں کو سمجھتے ہیں۔ یہ بات میرے لیے یقینی طور پر باعثِ فخر ہوگی کہ آپ لوگ مجھے اپنا سردار تصور کریں لیکن میری یہ سرداری اس قسم کی ہوگی کہ میں آپ کو موت کے منہ میں دھکیل دوں گی۔ اگر آپ کو منظور ہے تو آپ میں سے ایک ہزار بہادر الگ ہوجائیں۔''

یوں جیسے ہی عزیزہ نے تقریر ختم کی، تیرہ چودہ سو نوجوان ایک قطار میں کھڑے ہوگئے۔ وہ خوشی سے نعرے لگا رہے تھے۔

عزیزہ نے جب اپنے ہم وطنوں کے جوش کا یہ حال دیکھا تو وہ اپنے گھوڑے کے قریب آئی اور تلوار اٹھالی پھر گھوڑے پر سوار ہوکر نوجوانوں کو اشارہ کیا اور پھر روانہ ہوگئی۔

یہاں خان جہاں نے اپنا لشکر بھی دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک اپنی سرکردگی میں لیا اور دوسرا حسین کے سپرد کردیا۔ سواروں نے اپنی اپنی تلواریں نیاموں سے نکال لیں اور نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے صفیں درست کرنے لگے۔

☆☆☆

ادھر جب شاہی لشکر بیدار ہوا تو نیابت خان اٹھ کر سیدھا عرض بیگی کے خیمے میں پہنچا اور عرض بیگی کی لاش کو خون...... میں لت پت دیکھ کر گھبرایا ہوا باہر نکلا اور پہریدار کو طبلِ جنگ بجانے کی ہدایت کی۔

طبل کی آواز سن کر مغل سپاہی ہتھیار لگانے لگے اور عرض بیگی کے خیمے کے سامنے جمع ہونے لگے۔

نیابت خان اور پہریدار حیرت سے ایک دوسرے کا منہ تکے جارہے تھے۔ مغل سپاہی جمع ہوکر اپنے سردار کے حکم کا انتظار کررہے تھے۔

نیابت خان ایک بہادر سپاہی تھا لیکن اس وقت اس کے چہرے پر موت کی زردی چھائی ہوئی تھی۔ ہرچند کہ تازہ دم لشکر اس کے سامنے ہتھیار لگائے کھڑا تھا مگر اس کا دل خوف سے لرز رہا تھا۔

وہ مالوہ کے بہادروں کی شجاعت دیکھ چکا تھا اور یہ بات اچھی طرح سمجھتا تھا کہ مالوہ پر فتح پانا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کسی طرح لشکر کو بہلا پھسلا کر آگرہ کی طرف واپس لے جائے۔

نیابت خان کو یقین تھا کہ لشکر والے اس کی یہ تجویز ضرور منظور کرلیں گے کیونکہ مغل سپاہیوں کو خان جہاں سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں تھی۔

مغل لشکر خاموش کھڑا نیابت خان کے حکم کا انتظار کررہا تھا مگر وہ بار بار گھبرا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگتا۔ آخر نیابت خان اپنے لشکر سے مخاطب ہوا۔

''بہادرو......! دلیرو......! ساتھیو! شاید تمہیں یہ سن کر افسوس ہوگا کہ ہمارے سردار عرض بیگی کو نہایت پراسرار طریقے سے قتل کردیا گیا ہے اور یہ سب خان جہاں کے اشارے پر ہوا ہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں دس ہزار کا لشکر لے کر یہاں آیا تھا اور اب ہمارے پاس صرف چند سوار بچے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ خان جہاں خود بھی بہادر ہے اور اس کے سپاہی بھی شجاعت میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ ہم نے تو صرف اس کے بیٹے عظمت خان کو قتل کیا تھا اور اس کے بدلے میں اس نے ہمارا سارا لشکر کاٹ کر رکھ دیا اور اب وہ دوبارہ لشکر منظم کرکے عنقریب ہمارے سروں پر موت کی طرح نازل ہوجائے گا۔ وہ ہمارے سارے ارادوں سے واقف ہے۔ اس کا ثبوت عرض بیگی کا پراسرار قتل ہے۔''

اس کی تقریر سن کر سپاہیوں نے سر جھکائے۔ وہ ابھی کوئی فیصلہ نہ کرپائے تھے کہ عرض بیگی کا ایک حبشی غلام ہونٹ چباتا ہوا آگے بڑھا اور نیابت خان کو نفرت سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''بھائیو......! یہ سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ تمہارا سردار عرض بیگی مارا جاچکا ہے۔ ہم وطن سے دور آچکے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے فرائض سے غفلت نہ برتیں۔ میرا کسی پر زور نہیں ہے۔ تم لوگ واپس جانا چاہتے ہو تو جاؤ لیکن میں جب تک اپنے آقا کے خون کا بدلہ نہ لے لوں گا، ایک قدم پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ میرے دل میں آگ لگی ہوئی ہے۔ میرے جسم میں حرارت ہے اور ہاتھ میں تلوار......''

بچے کھچے مغل سپاہیوں نے حبشی غلام کی تقریر غور سے سنی۔ وہ اپنی بے عزتی برداشت نہ کرسکے اور یک زبان ہوکر بولے۔

”ہم اپنے گھروں سے اس لیے نہیں نکلے ہیں کہ ناکام ونامراد واپس جائیں۔ ہم بہادر ہیں اور ہم آج برہان پور والوں کو دکھا دیں گے کہ ہم کیا ہیں۔“

☆☆☆

سورج کی کرنیں ریتیلی چٹانوں پر پڑ رہی تھیں۔ اب نیابت خان اپنے لشکر کو لے کر ایک کھلے میدان میں پہنچ چکا تھا لیکن ابھی وہ اپنی صفیں درست بھی نہ کر پایا تھا کہ سامنے سے گرد وغبار اٹھتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ سمجھ گیا کہ خان جہاں لشکر کے ساتھ پہنچ رہا ہے۔

اس نے طبلِ جنگ بجانے کا حکم دے دیا۔ مغل سپاہیوں نے اپنے ہتھیار سنبھالے۔ خان جہاں کا لشکر بھی بجلی کی طرح بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ ادھر نیابت خان بھی مقابلے کے لیے ہر طرح تیار تھا۔

خان جہاں میدانِ جنگ میں پہنچتے ہی مغل سواروں پر ٹوٹ پڑا۔ تلواریں تڑپ کر چمکیں اور خون میں ڈوب کر نکلیں۔

گویا دونوں لشکر موت اور عزت کے طلب گار دیوانہ وار حملے کر رہے تھے۔ سورج نصف النہار پر پہنچ چکا تھا۔ زمین تپ رہی تھی۔

دونوں طرف کے سپاہی سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ سامنے پہاڑیوں پر ایک اور دستہ میدانِ جنگ کی طرف بڑھ رہا تھا اور نیابت خان کی آنکھیں اسی طرف لگی ہوئی تھیں کہ یکایک حسین خان اپنے لشکر کے ساتھ نعرے لگاتا ہوا پہنچ گیا۔

نیابت خان پہلے ہی سہما ہوا تھا۔ حسین خان کے لشکر کو دیکھ کر اس کے رہے سہے ہوش وحواس بھی جاتے رہے۔ یہ ایک نفسیاتی مار تھی ورنہ تو تعداد میں کوئی فرق نہ تھا۔ ایک ہی لشکر کو تقسیم کر دیا تھا اور دشمن پر رعب ڈالنے کے لیے مختلف سمتوں سے حملہ کیا جا رہا تھا۔ اس جنگی چال کا نتیجہ خاطر خواہ برآمد ہوا۔

نیابت خان تیزی سے اپنے لشکر کی اگلی صفوں میں چھپ کر محفوظ ہو جانا چاہتا تھا مگر اس وقت اسے نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ یا تو اس کے گھوڑے کے پاؤں زمین میں دھنس چکے تھے یا اس کے ہاتھوں میں لگام ہلانے کا دم خم ہی باقی نہ رہا تھا۔

دونوں فریقوں کے پلڑے ابھی تک تقریباً برابر ہی تھے۔ عزیزہ کا دستہ سب سے پہلے میدانِ جنگ میں آیا تھا اور اب تک بڑی بہادری سے لڑ رہا تھا۔ عزیزہ برابر نیابت خان تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔

دوپہر ڈھلتی جا رہی تھی۔ دونوں طرف کے سپاہی اب تھک چکے تھے مگر تلواروں کی پیاس ابھی تک نہیں بجھی تھی مگر کسی سردار میں یہ طاقت نہ رہی تھی کہ وہ حملہ کر کے کسی ایک فریق کی قسمت کا فیصلہ کر دیتا۔

گھوڑے بھی دوڑتے دوڑتے نڈھال ہو چکے تھے لیکن جنگ کسی طرح ختم ہوتی نظر نہ آتی تھی۔

ہر سپاہی گھبرایا ہوا چاروں طرف دیکھ رہا تھا کہ دور ایک لشکر آندھی طوفان کی طرح بڑھتا ہوا نظر آیا اور ہر سپاہی کی نظریں اسی طرف لگ گئیں کہ اچانک ایک تازہ دم لشکر میدان میں پہنچا اور مغلوں پر ٹوٹ پڑا۔

حبشی غلام نے جب یہ دیکھا تو وہ اپنا گھوڑا دوڑاتا ہوا صفوں کو چیرتا ہوا سامنے آیا اور گرجتے ہوئے بولا۔

”بہادرو! ہمیں موت نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ اب ہم یہاں سے بچ کر نہیں جا سکتے۔ ہم وطن سے دور ہیں اور کسی کمک کی بھی امید نہیں۔ دیکھو، تلواروں کی تیز دھاروں میں موت ہمیں پکار پکار کر اپنی طرف بلا رہی ہے۔ دیر نہ کرو، اگر یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو پھر قیامت تک پچھتانا پڑے گا۔ بڑھو اور جنگ کا فیصلہ کر دو۔“ حبشی غلام کی تقریر نے مغلوں میں جوش پیدا کر دیا۔

عزیزہ نے یہ حالت دیکھی تو گھوڑا دوڑا کر اپنے لشکر کے سامنے آ گئی اور گھوڑا روک کر بولی۔

”شیرو! دشمن نے تمہیں مٹا دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اگر تم یوں ہی پیچھے ہٹتے چلے گئے تو دشمن تمہیں ختم کر دے گا۔ وہ گنتی کے آدمی رہ گئے ہیں اور ہم ابھی ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں۔ شرم کرو، اپنی اولاد کی آزادی پر قربان ہو جاؤ۔ بڑھو اور ایک ہی حملے میں انہیں نیست ونابود کر دو۔ میرے پیچھے آؤ اور اس حبشی غلام کا خاتمہ کر کے جنگ کا نقشہ پلٹ دو۔“

یہ کہہ کر عزیزہ نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور دشمنوں کی صفوں میں روپوش ہو گئی۔

عزیزہ کے پیچھے پیچھے اس کا دستہ بھی آگے بڑھا اور دشمن پر ٹوٹ پڑا۔ دفعتاً ہی شاہی لشکر میں حرکت ہوئی اور عزیزہ دونوں ہاتھوں میں شاہی لشکر کے دونوں سرداروں نیابت خان اور حبشی غلام کا سر لیے آگے بڑھی۔ اس کا دستہ فتح کے نعرے لگاتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔

شاہی لشکر نے جب اپنے سرداروں کے کٹے ہوئے سر دیکھے تو وہ بھاگ کھڑا ہوا۔ شفق کی سرخیاں میدان پر چمک رہی تھیں اور فاتح لشکر نعرے لگاتا ہوا پہاڑی نشیب

وفراز سے اترتا ہوا واپس ہو رہا تھا۔
برہان پور کا بچہ بچہ ہاتھوں میں پھولوں کے ہار لیے ہوئے اپنے بہادروں کے انتظار میں کھڑا تھا۔

☆☆☆

خدا جانے مغل دارالسلطنت کی دلچسپیاں کس نے چھین لی تھیں۔ شاندار عمارتوں میں اداسی تھی۔ خود شہنشاہ پریشان اور فکرمند تھا اور سارا دربار اداس ہو کر رہ گیا تھا۔
گو بظاہر شاہ جہاں اپنا بیش قیمت تاج پہن کر اسی شان و شوکت سے تخت پر بیٹھا کرتا تھا۔ اراکین دربار اسی طرح چہکا کرتے تھے اور کمزور سلطنتوں پر قبضہ جمانے کی تجویزیں دی جاتی تھیں لیکن شاہ جہاں کے چہرے کی وہ رونق اب غائب ہو چکی تھی۔
آج وہ اپنے امرا سے ایک ضروری مشورہ لینا چاہتا تھا اس لیے آگرہ کے گلی کوچوں میں منادی کرادی گئی تھی کہ رعایا کا ہر فرد اپنی رائے دینے کا حق رکھتا ہے۔ دربار بھرا ہوا تھا اور سارے درباری شہنشاہ کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔
درباری حیران تھے کہ جس تجویز کے لیے اتنا اہتمام کیا گیا ہے، آخر وہ کیا ہے؟ جب سارے درباری جمع ہو چکے ... تو شاہ جہاں بڑی شان سے آیا اور تخت پر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک نظر دربار اور حاضرینِ دربار پر ڈالی پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔
''معزز سردار اور اراکینِ سلطنت! آج پورے دو مہینے ہو چکے ہیں جب ہم نے دس ہزار سواروں کا ایک لشکر حاکم مالوہ خان جہاں کی سرکوبی کے لیے بھیجا تھا لیکن جب اس کی کوئی خبر نہیں ملی تو ایک دوسرا لشکر عرض بیگی کی قیادت میں روانہ کیا مگر آج تک اس کے متعلق بھی معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا کیا حشر ہوا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ اب کیا کریں؟ آج تک نہ تو ان کی کوئی خبر آئی ہے اور نہ ہی حالات معلوم ہو سکے ہیں۔ ہمارا ارادہ ہے کہ اب ایک مسلح لشکر مالوہ بھیجا جائے۔''
یہ سن کر دربار پر سناٹا چھا گیا اور پھر چند مغل سرداروں نے کھڑے ہو کر کہا۔
''جہاں پناہ! ہم اس باغی سے ضرور انتقام لیں گے۔'' سردار کچھ اور بھی کہنا چاہتے تھے کہ ایک خستہ حال سوار دربار میں داخل ہوا اور کورنش بجالا کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔
شاہ جہاں نے اسے دیکھا اور قریب بلا کر دریافت کیا۔ ''تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟''
''جہاں پناہ! غلام اس لشکر کا سپاہی ہے جسے حضور نے مالوہ کی طرف بھیجا تھا۔'' سوار نے ادب سے کہا۔
''کیا خبر لائے ہو؟'' شاہ جہاں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
''جہاں پناہ! ہم تباہ ہو گئے، لٹ گئے۔ حضور! میں ان سواروں میں سے ہوں جو ارادت خان کی سرکردگی میں مالوہ کی تسخیر کے لیے گئے تھے۔ ایک میں ہی اتنا سخت جان تھا کہ زندہ بچا ہوں۔'' خستہ حال سوار نے جواب میں کہا۔
''ولی نعمت! پہلا دستہ بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ ارادت خان میدان جنگ میں کام آ گئے۔ ہم صرف چند سپاہی زندہ بچے تھے کہ عرض بیگی اپنا لشکر لے کر پہنچ گیا اور پھر ہم نے نئے سرے سے مقابلے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ رات تو کسی طرح گزر گئی لیکن جب صبح سو کر اٹھے تو معلوم ہوا کہ عرض بیگی بھی قتل ہو چکا ہے پھر بھی ہم نے نیابت خان کی قیادت میں مقابلہ کیا لیکن خان جہاں کا لشکر بھوکے شیروں کی طرح ہم پر ٹوٹ پڑا اور ہمارے پاؤں بھی نہ جمنے دیے۔'' سوار کی آواز بھرا گئی اور وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔
پندرہ ہزار کے لشکر کا صفایا شاہ جہاں کے لیے کم صدمہ نہیں تھا۔ اس کی نظروں میں دنیا اندھیر... ہو گئی۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور گرجتے ہوئے بولا۔
''اس سے زیادہ تباہی اور کیا ہو گی کہ ایک باغی نے شاہی لشکر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے۔ اعظم خان! اب تم خود جا کر باغی خان جہاں کو گرفتار کرو اور مالوہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دو۔ ہم تمہیں اختیار دیتے ہیں کہ جس قدر لشکر اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہو، لے جاؤ۔ اگر تم یہیں بیٹھے رہے تو ہم تنہا میدان میں جائیں گے۔ اعظم خان! تمہاری ذات سے ہمیں بڑی امیدیں ہیں۔ جاؤ، آج شام سے پہلے لشکر لے کر مالوہ کی طرف روانہ ہو جاؤ اور اپنے بھائیوں کے خون کا بدلہ لو۔''
یہ کہہ کر شاہ جہاں خاموش ہو گیا۔ اس کے بعد آصف جاہ کو اشارہ کیا۔ وہ اپنی نشست سے اٹھا اور اعظم خان کو اپنے ساتھ لے کر باہر چلا گیا۔
دربار برخاست ہو گیا اور شاہ جہاں غصے سے دانت پیستا ہوا شاہی محل میں چلا گیا۔
آصف جاہ، سپہ سالار اعظم خان کو ساتھ لے کر لشکر گاہ میں پہنچ چکا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد آصف جاہ بولا۔
''کیوں اعظم خان! اب کیا خیال ہے؟''
''کس بارے میں؟'' اعظم خان نے پوچھا۔
''مالوہ جانے کے ... سلسلے میں۔'' آصف جاہ نے کہا۔

''میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔'' اعظم خان بولا۔ ''آخر میں خان جہاں سے کیوں لڑوں؟ اس کا کیا گناہ ہے؟ یہی نا کہ وہ آزاد رہنا چاہتا ہے۔'' اعظم خان کا انداز مسکت اور فیصلہ کن تھا۔

''اعظم خان! تم کیوں بزدل ہو گئے ہو؟ اب تک تمہارے دس پندرہ ہزار سپاہی مارے جا چکے ہیں۔''

''اگر دس پندرہ ہزار سپاہی مارے گئے ہیں تو وہ اپنی بے وقوفی سے مارے گئے ہوں گے۔'' اعظم خان بولا۔

''اگر تم جیسا بہادر سردار جائے تو خان جہاں کو چھپنے کی بھی جگہ نہ ملے گی۔'' آصف جاہ اس کی ہمت بڑھاتے ہوئے بولا۔

''میں موت سے نہیں ڈرتا حضور! لیکن آپ انصاف سے کام لیجیے۔ میں مالوہ جا کر کس بات پر لڑوں؟ صرف اس لیے کہ خان جہاں ہمارے پندرہ ہزار سپاہیوں کو ہلاک کر چکا ہے لیکن اس میں ہماری اپنی غلطی ہے۔ ہم نے خود اس کے ساتھ فریب کیا ہے۔ ہم نے خود اسے دعوت نامہ بھیج کر بلایا تھا اور پھر اس کے بیٹے کو بھرے دربار میں ذلیل کیا۔ ہم نے خود اس کو یہ موقع دیا ہے کہ وہ باغی ہو جائے۔ ہم نے اسے گرفتار کرنے کے لیے حویلی کا محاصرہ کیا۔ کیا مہمانوں کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے؟ آپ ہی سوچیے کہ اگر کوئی حق کے لیے اپنی آواز بلند کرے تو کیا وہ باغی ہے؟''

''اعظم خان! یقین کرو، میں خود حیران ہوں کہ آخر شہنشاہ نے ایسا کیوں کیا؟ پھر ہمیں سوچنے سمجھنے کا موقع بھی نہیں دیا۔ خدا جانے انہوں نے کس کے مشورے پر خان جہاں کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کیا مگر اب......'' آصف جاہ کا جملہ مکمل بھی نہ ہونے پایا تھا کہ اعظم خان بولا۔

''حضور! جو کچھ بھی ہو لیکن مجھ سے آپ کوئی امید نہ رکھیں۔ میں قطعی مجبور ہوں۔ میں ایک فوجی سردار ہوں۔ میرا پہلا فرض لوگوں کے ساتھ انصاف کرنا ہے اور میں انصاف کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دوں گا چاہے شہنشاہ مجھے قتل ہی کیوں نہ کرا دیں۔''

''دیکھو اعظم خان! میں سارے معاملات ٹھیک کرلوں گا لیکن تم لشکر کو لے کر یہاں سے نکل تو جاؤ، چاہے مالوہ نہ جانا۔ یہاں سے صرف تین کوس کے فاصلے پر......''

''آپ مجھے بے وقوف بنا کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہتے ہیں۔'' اعظم خان نے پھر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''یہ کہاں کی ایمانداری ہے کہ دوسروں کو موت کے منہ میں دھکیل کر اپنا مطلب نکالنا چاہتے ہیں۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔''

''اعظم خان! مجھے تمہارے فیصلے سے اتفاق ہے۔'' آصف جاہ بولا۔ ''مگر مصلحت اسی میں ہے۔ جب تک تم لشکر لے کر روانہ نہیں ہو جاتے، میں شہنشاہ سے کوئی بات نہیں کر سکتا۔ جب تم چلے جاؤ گے تو شہنشاہ یہ سمجھیں گے کہ تم مقابلے کے لیے روانہ ہو چکے ہو پھر میں شہنشاہ کو خان جہاں سے صلح کرنے پر رضامند کرلوں گا۔'' آصف جاہ نے اسے سمجھایا۔

''مگر یہ صلح شاید اس وقت ہوگی جب چاروں طرف جنگ کی آگ بھڑک چکی ہوگی۔'' اعظم خان نے کہا۔

''تم مجھ پر بھروسا کرو۔ میدان جنگ میں پہنچ کر جنگ کو روکے رکھنا۔ میں میدانِ جنگ میں صلح کے لیے شاہی قاصد بھیجوں گا۔ میں تمہارا ہمدرد ہوں۔ میں تمہیں جنگ کا موقع ہی نہ دوں گا۔ بس، تم روانگی کی تیاری کرو۔'' آصف جاہ اسے اطمینان دلاتے ہوئے بولا اور شاہی محل کی طرف روانہ ہو گیا۔

اعظم خان چند لمحے کھڑا سوچتا رہا اور پھر ایک سوار کو بلا کر بگل بجانے کا حکم دیا۔ بگل کی آواز سنتے ہی سواروں نے تیاری شروع کر دی۔

جب لشکر تیار ہو چکا تو اعظم خان نے سرداروں کو جمع کر کے کہا کہ ہماری منزل مالوہ ہے۔ فوجی سرداروں نے کوچ کی تیاری شروع کر دی اور اپنے اپنے دستوں کو ہتھیاروں سے آراستہ کیا۔

اعظم خان بھی اپنے خیمے میں آیا اور فوجی لباس پہن کر باہر نکلا۔ لشکر روانگی کے لیے تیار کھڑا تھا۔ اعظم خان نے ایک بار پھر بگل بجانے کی ہدایت کی اور سپاہی گھوڑوں پر سوار ہو کر اپنے سپہ سالار کے پیچھے ہوئے۔

مغل سپہ سالار اعظم خان اپنے لشکر کے ساتھ دو دن کی مسافت کے بعد میدانِ جنگ میں پہنچ چکا تھا۔ خیمے نصب ہو چکے تھے اور سپاہی اپنے اپنے کاموں میں معروف تھے۔

اس وقت اعظم خان کا غلام جعفر بھی اعظم خان کے خیمے میں موجود تھا۔

اعظم خان ابھی تک فوجی وردی پہنے قالین پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں مستغرق تھا اور جعفر خاموشی سے اسے تکے جا رہا تھا۔

آخر اس سے صبر نہ ہو سکا اور معنی خیز انداز میں اسے گھورتے ہوئے بولا۔

''آقا! آپ نے ابھی تک اپنا لباس تبدیل نہیں کیا۔ آپ تھکے ہوئے ہیں۔ میں آپ کے پاؤں دباتا ہوں۔ نیند آ جائے گی۔''

''نہیں جعفر! مجھے اس وقت ایک ضروری کام سے جانا ہے اس لیے میں نے لباس تبدیل نہیں کیا۔'' اعظم خان نے کہا۔

''آقا! رات بہت اندھیاری ہے پھر ہم دشمن کے علاقے میں ہیں اس لیے میں آپ کو باہر جانے کا ہرگز مشورہ نہ دوں گا۔'' جعفر اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔

''مجھے دراصل دشمن کے سردار سے ہی ملنے جانا ہے۔ تم میرا انتظار کرنا میں جلد ہی واپس آجاؤں گا۔'' اعظم خان نے جواب دیا اور خاموشی سے اٹھ کر باہر نکلا۔

وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور روانہ ہوگیا۔ اسے آج ہی اپنے جاسوس کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ خان جہاں بھی لشکر کے ساتھ میدانِ جنگ میں موجود ہے اور اس کا خیمہ لشکر سے ذرا ہٹ کر ایک پہاڑی پر نصب کیا گیا ہے۔

اعظم خان گھوڑے پر سوار آہستہ آہستہ پہاڑی کی طرف بڑھ رہا تھا کہ ستاروں کی مدھم روشنی میں ایک سایہ سا دکھائی دیا۔ اس نے اپنی تلوار نیام سے نکال لی لیکن جونہی وہ چٹان کے قریب پہنچا تو اسے ایک سپاہی نظر آیا۔

یہ وہی سپاہی تھا جو پہلے اسے صرف ایک سایہ سا نظر آیا تھا۔ جب اس نے دشمن کو قریب آتے دیکھا تو تلوار سونت لی۔

اب اعظم خان اس کے بالکل نزدیک پہنچ چکا تھا۔

سپاہی نے اسے پہچان کر اپنی تلوار نیام میں ڈال لی پھر ایک سریلی آواز گونجی۔

''اعظم خان......!''

یہ مدھر بھری سی آواز وہ پہلے بھی سن چکا تھا۔ وہ جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور گھوڑے سے اتر کر بولا۔

''عزیزہ......!''

اس کے ساتھ ہی عزیزہ کی مخمور آنکھوں پر لمبی لمبی پلکیں جھک گئیں۔

''تم یہاں کیا کرنے آئی تھیں عزیزہ؟'' اعظم خان نے محبت پاش لہجے میں سوال کیا۔

''بس، یونہی۔ نیند نہیں آرہی تھی۔ آپ سنائیں، کیسے ہیں اور یہاں کیسے تشریف لے آئے؟'' عزیزہ نے دریافت کیا۔

''میں تو تم سے ملنے کے لیے اس طرف آن نکلا تھا۔'' اعظم خان نے جواب میں کہا۔

''آپ کو مجھ سے ملاقات کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟'' عزیزہ نے سوال کیا۔

''عزیزہ! کوئی ایسی تدبیر سوچو کہ یہ جنگ یہیں ختم ہوجائے اور......'' یہ کہہ کر اعظم خان کسی فکر میں ڈوب گیا اور عزیزہ اسے معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''میں تمہاری بات سمجھ رہی ہوں لیکن یہ کبھی نہیں ہوسکتا کیونکہ ابا جان شیر کی طرح بپھرے ہوئے ہیں۔ انہیں عظمت بھیا کی موت......''

''عزیزہ! خدا کے لیے میرے حال پر رحم کرو۔ ایسا نہیں کرسکتیں تو یہ تلوار لو اور مجھے ہی قتل کرڈالو۔ میرا ذہن ماؤف ہوچکا ہے۔ ایک طرف فرض ہے تو دوسری طرف محبت میرا ہاتھ روک دیتی ہے۔ میں عجیب کشمکش میں گرفتار ہوں۔ خدارا، مجھے اس الجھن سے نجات دلاؤ۔'' اعظم خان افسردہ لہجے میں بولا۔

''میں تم سے زیادہ مجبور ہوں۔ میں جس عذاب میں گرفتار ہوں، تم اس کا اندازہ نہیں کرسکتے۔ ابا جان کی مصیبتیں، بھائی جان کی موت......'' عزیزہ نے افسردہ سے لہجے میں کہا۔

''بس ایک ہی صورت ہوسکتی ہے کہ تم صلح کرلو۔'' اعظم خان نے کہا۔

''پھر کیا ہوگا؟'' عزیزہ بولی۔

''یہ خانہ جنگیاں ختم ہوجائیں گی۔ تمہارا خاندان حکومت کا ایک مختار جز سمجھا جائے گا۔ اگر تم نے منظور کرلیا تو میں اور......''

''اعظم خان! میرے سامنے ایسی باتیں نہ کرو۔'' عزیزہ نے اسے درمیان میں ہی ٹوک دیا۔ ''یہ کبھی نہ ہوسکے گا۔ تم نہیں جانتے میں آج تک کس طرح اپنے ارمانوں کا خون کرتی رہی ہوں مگر اب مجھے مجبور کیا جارہا ہے کہ میں ان خیالات کو اپنے ذہن سے نکال پھینکوں۔'' عزیزہ نے جواب دیا۔ اس کی آواز لرز رہی تھی۔

''کون...... کون مجبور کررہا ہے؟'' اعظم خان نے پریشان کن بے چینی سے پوچھا۔

''میرا وطن پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ وطن پر قربان ہوجاؤں۔ میرے فرائض مجھے مجبور کرتے ہیں کہ میدانِ جنگ میں مغلوں کے سپہ سالار اعظم خان کا مقابلہ کروں۔'' عزیزہ نے جواب دیا۔

''تو پھر مجھ سے مقابلہ کرنے میں تمہیں کیا اعتراض ہے؟'' اعظم خان نے کہا۔

''مجھے تم سے محبت ہے اعظم خان! میں تمہاری شجاعت اور شرافت کی قدر کرتی ہوں۔ میں تمہاری شریکِ حیات بننے پر فخر محسوس کروں گی لیکن اس سیاست نے میرے ارمانوں کا خون کردیا۔'' عزیزہ نے جواب دیا۔

’’میں کتنا خوش نصیب ہوں عزیزہ کہ تم بھی مجھے چاہتی ہو۔ میں بھی تم کو دل و جان سے چاہتا ہوں۔ دنیا کا وہ کون سا کام ہے جسے میں تمہاری خاطر نہ کر سکوں مگر اب تم ہی کوئی راستہ نکالو۔ عزیزہ! دیکھو، مجھے مایوس نہ کرو۔‘‘ اعظم خان شدتِ جذبات تلے مغلوب ہو کر بولا۔

’’یہ درد اب لا دوا ہو چکا ہے۔ میں ابا جان کو مجبور نہیں کر سکتی۔ عظمت بھیا کی موت ہماری راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اب صلح کی کوئی صورت ممکن نہیں۔ بس اب ایک ہی راستہ رہ گیا ہے۔‘‘ عزیزہ نے جواب دیا اور اعظم خان حیران ہو کر اسے دیکھنے لگا اور بے چین ہوتے ہوئے بولا۔

’’خدا کے لیے مجھے بتاؤ، میں اس پر ضرور عمل کروں گا۔ میں تمہاری خاطر سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں۔‘‘

عزیزہ بولی۔ ’’اب صرف یہی ایک راہ باقی ہے کہ تم بھی فیصلہ کر لو، جیسا کہ میں کر چکی ہوں۔ کل میدانِ جنگ میں پہنچ کر ہم اپنے اپنے فرائض پر اپنی جانیں قربان کر دیں۔‘‘ پھر ذرا ایک لحظے کی خاموشی کے بعد وہ اعظم خان سے دوبارہ بولی۔

’’اعظم خان! محبت ایک غیر فانی چیز ہے۔ جسموں کے ملاپ کو محبت نہیں کہتے۔ اگر تم مجھ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہو تو کل میدانِ جنگ میں میرا مقابلہ کرنا۔‘‘

اعظم خان یہ سن کر خاموش ہو گیا۔ اس پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ ایک نظر عزیزہ پر ڈالی اور گھوڑے پر سوار ہو کر چل دیا۔

وہ اب عزیزہ سے نظریں نہیں ملا سکتا تھا۔ عزیزہ اور اعظم خان دونوں کی پلکوں پر آنسو لرز رہے تھے۔ اعظم خان اپنے لشکر کی طرف بڑھ رہا تھا اور عزیزہ خاموشی سے اسے جاتا ہوا دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

طبلِ جنگ نے میدانِ جنگ میں ایک حشر برپا کر دیا تھا لیکن دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ اعظم خان اداس اور فکرمند تھا لیکن مغل سپاہی لڑنے کے لیے بے تاب تھے۔ دفعتاً لشکر میں حرکت ہوئی اور پھر تلواریں چمکنے لگیں۔

تاریخ میں اس جنگ کی نظیر نہیں ملتی۔ دونوں لشکر بہادری میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔

ابھی دن نہیں ڈھلا تھا مگر دونوں طرف کے سیکڑوں سپاہی ہلاک ہو چکے تھے۔ خود خان جہاں اور حسین خان بھی سپاہیوں کے دوش بدوش لڑ رہے تھے مگر عزیزہ کا کہیں پتا نہیں تھا۔

اعظم خان کی بے قرار آنکھیں عزیزہ کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ جب وہ کہیں نظر نہ آئی تو اسے یقین ہو گیا کہ وہ ضرور جنگ میں کام آ چکی ہوگی۔ یہ خیال آتے ہی اعظم خان دیوانہ وار دشمن کی صفوں میں گھس گیا۔ آج اسے اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہیں رہا تھا۔

خان جہاں اور حسین خان، مغل سپہ سالار اعظم خان کا شکار ہو چکے تھے۔ خان جہاں کے ہلاک ہوتے ہی اس کے لشکر کے قدم اکھڑ گئے اور سپاہی اپنی جانیں بچا کر فرار ہونے لگے۔

شاہی لشکر نے دور تک ان کا تعاقب کیا مگر وہ قابو نہ آئے۔ دفعتاً ایک پہاڑی کی اوٹ سے ایک نقاب پوش سوار سامنے آیا اور بھاگتے ہوئے سواروں کو روکا اور دوبارہ مقابلے پر آ گیا۔

خان جہاں کے سواروں کو لوٹتا دیکھ کر اعظم خان آگے بڑھا اور نیزے کے ایک ہی وار میں اسے گھوڑے سے گرا دیا۔ نقاب پوش سوار نے گرتے ہوئے اپنا نقاب الٹ دیا۔

اعظم خان نے اسے پہچان کر اپنی تلوار پھینک دی اور گھوڑے سے کود پڑا۔ بڑھ کر سوار کو اٹھایا اور اس کا سر اپنی رانوں پر رکھ کر آبدیدہ ہو گیا۔

اس نے جھک کر اس کے بکھرے ہوئے بالوں کو سنوارا اور گلوگیر آواز میں کہا۔

’’میری عزیزہ! کیا یہی ہمارے خوابوں کی تعبیر ہے؟‘‘

’’میری موت پر آنسو نہ بہاؤ اعظم! ہماری محبت کا انجام نہایت شاندار ہے کیونکہ میں اپنے وطن پر قربان ہو کر تمہارے بازوؤں میں دم توڑ رہی ہوں۔‘‘

عزیزہ نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا اور پھر اس کی زبان ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی۔

اعظم خان اپنے خیمے میں عزیزہ کی لاش پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خنجر تھا اور بار بار خیمے کا پردہ اٹھا اٹھا کر باہر جھانک رہا تھا۔

پھر اس نے عزیزہ کی لاش پر حسرت بھری نظر ڈالی اور خنجر اپنے سینے میں پیوست کر لیا۔

ماخذات

مالوہ اور اسلام (مولانا طاہر کتھی)
تاریخ شاہجہاں (فیروز بہادر آبادی)
آئینہ ہند، تاریخ ہند (زیب شاہ)

جاوید بسام

کوئی کتنا ہی نڈر ہو... کبھی کبھی انسان کے اندر کہیں ایک خوف پوشیدہ ہوتا ہے جو وقت آنے پر کسی نادیدہ دشمن کے مانند حملہ آور ہوتا ہے... وہ بھی انجانے خوف کے غیر محسوس حصار میں قید ہوتا جارہا تھا... وہ جو مردہ لوگوں کے بیچ سانس لے رہا تھا، نہیں جانتا تھا کہ وہ عنقریب انہی کے درمیان زندگی گزارنے والا ہے...

ایک ایسے پیلا نشان کا قصہ جس کے راز سے کوئی واقف نہ تھا

دنیا میں بہت سی چیزیں ہیں جن کی وضاحت کرنا ممکن نہیں۔ مثال کے طور پر موسیقی میں کچھ راگ مجھے خزاں کے پتوں کے بھورے اور سنہری رنگ کے بارے میں سوچنے پر کیوں مجبور کرتے ہیں؟ سینٹ سیسل کا ہجوم میرے خیالات کو غاروں میں بھٹکنے کے لیے کیوں لے جاتا ہے، جہاں کی دیواریں اوس کی اچھوتی چاندی سے چمکتی ہیں؟ چھ بجے کے براڈوے کا شور اور ہلچل اچانک میری آنکھوں کے سامنے برٹین کے ایک پُرامن جنگل کی تصویر سے کیوں بدل جاتی ہے جہاں سورج کی روشنی درختوں میں سے جھانک رہی ہوتی ہے اور سلویا ایک چھوٹی سی سبز چھپکلی کا جائزہ لیتے ہوئے حیرت سے جھک جاتی ہے اور یہ مشکل سنائی دیتی آواز میں کہتی ہے۔ ”ذرا سوچو، یہ مخلوق بھی خدا

کی سرپرستی میں ہے۔''

میں نے پہلی بار اس آدمی کو دیکھا تو وہ میری طرف پیٹھ کیے کھڑا تھا۔ میں نے اس پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور اتنی ہی توجہ دی جتنی اس وقت واشنگٹن اسکوائر سے گزرنے والے کسی دوسرے راہ گیر کو دی تھی۔ میں نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ وہ گرجا گھر کے دروازے میں کیسے غائب ہوا پھر جب میں کھڑکی سے ہٹ کر اسٹوڈیو میں واپس آیا تو اس کے بارے میں بھول چکا تھا۔

دوپہر کے اختتام پر دن گرم تھا اور کمرا حبس سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے تازہ ہوا میں سانس لینے کے لیے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ وہ ابھی تک گرجا گھر کے احاطے میں کھڑا تھا۔ میری نگاہیں چوک کا جائزہ لینے لگیں جہاں فوارہ چل رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میں اپنے ذہن کے پردے پر درختوں، فٹ پاتھ پر گزرنے والی آیاؤں اور کام سے چھٹی کر کے گھر جانے والے لوگوں کے نقوش لیے واپس گھوما تو میری نظر پھر بے ساختہ اس پر پڑی۔ اب اس کا رخ میری طرف تھا۔ میں اسے اچھی طرح دیکھنے کے لیے جھک گیا۔ میں نہیں جانتا کہ اس چہرے میں مجھے کیوں کراہت محسوس ہوئی لیکن مجھے فوری طور پر ایک خوفناک قبر کا خیال آیا اور مجھے احساس ہوا کہ میرے سامنے لاش کھانے والا ایک موٹا سفید کیڑا موجود ہے۔ یہ احساس اس قدر شدید تھا کہ مجھے متلی ہونے لگی جو غالباً میرے چہرے پر جھلک رہی تھی کیونکہ اس نے فوراً ناگوار نظروں سے مجھے دیکھا اور منہ پھیر لیا۔ میں نے سوچا لاروا کا خود ہی پریشان ہونا کتنا عجیب ہے؟

ایزل پر واپس آکر میں نے ماڈل کو مطلوبہ انداز لینے کا اشارہ کیا لیکن تھوڑا سا کام کرنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ رنگوں میں کچھ فرق آرہا ہے حالانکہ میں نے کوئی نیا رنگ نہیں لیا تھا۔ میں نے رنگ پترا لیا اور کینوس پر لگے رنگ کو کھرچنے لگا۔ دراصل تصویر میں جلد کا رنگ بدل کر کچھ عجیب سا ہو گیا تھا۔ مجھے حیرت تھی کہ یہ رنگ میں نے کب استعمال کیا ہے۔ ورکشاپ میں اچھی روشنی تھی۔ میں ایسی غلطی نہیں کرسکتا تھا۔

میں نے ٹیسی کی طرف دیکھا۔ وہ ذرا بھی نہیں بدلی تھی۔ اس کے گالوں اور گردن پر صحت مند چمک دار سرخی اب بھی موجود تھی۔ ''کیا مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، یہ میرا قصور ہے لیکن سمجھ نہیں آرہا کہ یہ میں نے کب کیا؟ میں اسے صاف کر رہا ہوں۔ تم چاہو تو کچھ دیر آرام کرسکتی ہو۔''

ٹیسی سگریٹ پینے کے لیے اٹھ گئی۔ اس نے جاتے ہوئے ایک تصویری میگزین اٹھالیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ تارپین سے نقصان پہنچا تھا یا کینوس میں کوئی خرابی تھی۔ میں جتنا رگڑتا گیا، تصویر کے رنگ اتنے پھیلتے گئے۔ میں نے اسے صاف کرنے کی بہت کوشش کی لیکن گردن کا رنگ بھی بدل گیا تھا۔ ایک عجیب انفیکشن نے پوری تصویر کو متاثر کیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے گہرے دھوئیں نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ میں نے مایوسی کے عالم میں رنگ پترا، تارپین اور چھیتڑے ایک طرف پھینک دیے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس خرابی میں ڈووال کا قصور ہے جس نے مجھے کینوس دیا تھا لیکن جلد ہی میں نے محسوس کیا کہ کینوس عیب دار نہیں ہے اور نہ ہی ایڈورڈ کے رنگ۔ یہ تارپین کے تیل کی وجہ سے ہوا ہے ورنہ میری آنکھیں دوپہر کی روشنی میں رنگوں کی تمیز کیسے کھو سکتی ہیں؟ میں نے ٹیسی کو بلایا۔

''تم نے پینٹنگ کے ساتھ کیا کیا ہے؟'' وہ وحشت سے بولی۔

''شاید تارپین کی وجہ سے ایسا ہوا ہے۔'' میں نے آہ بھر کر کہا۔

''کیا ڈراؤنا رنگ ہے۔ تم کو لگتا ہے کہ میرا جسم سبز پنیر جیسا ہے؟'' وہ بولی۔

''بالکل نہیں، کیا میں نے پہلے کبھی ایسا پینٹ کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کبھی نہیں۔ یہ واقعی تارپین کی وجہ سے ہوا ہے۔'' ٹیسی نے الجھن آمیز لہجے میں اتفاق کیا۔

پھر وہ کمونو پہن کر کھڑکی کے پاس چلی گئی۔ میں کینوس کو دیر تک رگڑتا اور کھرچتا رہا، یہاں تک کہ بیزار ہو گیا۔ آخر میں نے لعنت بھیجی اور برش اٹھا کر زور سے کینوس میں گھونپ دیے لیکن فوراً ہی گھبرا گیا۔ ٹیسی نے آواز سن لی تھی۔ وہ فوراً میری سمت مڑی اور افسوس اور غصے سے چلّائی۔

''اوہ نو...... یہ کیا احمقانہ حرکت ہے؟ تم نے تین ہفتوں تک اس پر محنت کی ہے اور اب اسے غارت کر دیا ہے۔ آخر یہ فنکار کس قسم کے لوگ ہوتے ہیں؟''

میں نے ویسی ہی شرمندگی محسوس کی جیسی کہ میں ہمیشہ غصے کے بعد کرتا ہوں اور مایوسی سے خراب کینوس کو دیوار کی طرف موڑ دیا۔ ٹیسی نے برش صاف کرنے میں میری مدد کی اور کپڑے بدلنے چلی گئی۔ وہ پردے کے پیچھے سے مجھے مشورہ دے رہی تھی کہ جب تم کو غصہ آئے تو اسے کیسے قابو

کرو اور پھر یہ سمجھتے ہوئے کہ میں کافی اذیت برداشت کر چکا ہوں، وہ باہر آگئی اور پیٹھ موڑ کر بٹن بند کرنے کا کہا۔

''سب برباد ہوگیا۔ ایسا لگتا ہے کہ جب تم نے مجھے گرجا گھر کے احاطے میں اس خوفناک آدمی کے بارے میں بتایا، اس کے بعد خرابی شروع ہوئی۔'' اس نے کہا۔

''ہاں، اس نے شاید تصویر پر جادو کیا ہے۔'' میں نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، سات بج گئے ہیں۔ میں جانتی ہوں۔'' ٹیسی نے آئینے کے سامنے اپنی ٹوپی کو درست کرتے ہوئے کہا۔

''میں تم کو اتنی دیر تک روکنا نہیں چاہتا تھا۔'' میں نے شرمندگی سے کہا اور کھڑکی میں چلا آیا۔ نیچے پھولے ہوئے چہرے والا آدمی موجود تھا۔ میں بیزاری سے پیچھے ہٹا اور ٹیسی کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر نیچے دیکھا اور سرگوشی میں بولی۔

''کیا یہ وہی آدمی ہے جسے تم ناپسند کرتے ہو؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''مجھے اس کا چہرہ واضح نظر نہیں آرہا لیکن لگتا ہے کہ وہ سفید اور پھولا ہوا ہے۔'' اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''یہ مجھے ایک خواب کی یاد دلاتا ہے۔ ایک خوفناک خواب...... جو میں نے کبھی دیکھا تھا۔ کیا وہ واقعی خواب تھا؟''

''میں کیسے جان سکتا ہوں؟'' میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

ٹیسی کے چہرے پر بھی مصنوعی مسکراہٹ آگئی۔ وہ بولی۔ ''بات یہ ہے کہ تم بھی وہاں موجود تھے۔''

''ٹیسی! کیا یہ کہہ کر تم میری چاپلوسی کرنے کی کوشش کر رہی ہو کہ میں تمہیں خواب میں نظر آتا ہوں؟'' میں نے ہنس کر کہا۔

''لیکن یہ سچ ہے۔'' اس نے اصرار کیا۔

''اچھا، آگے بڑھو۔'' میں نے جواب دیا اور سگریٹ جلا لیا۔

ٹیسی نے اپنی کہنیوں کو کھڑکی پر ٹکایا اور ایک لمحے کے توقف کے بعد بہت سنجیدگی سے اپنی کہانی شروع کی۔

''میں پچھلی سردیوں میں ایک رات دیر سے بستر پر گئی تھی۔ سارا دن کام کرنے کے بعد میں بہت تھکی ہوئی تھی لیکن کسی وجہ سے مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ میں نے شہر کے گھنٹا گھر کو دس، گیارہ اور پھر آدھی رات کے گھنٹے بجاتے سنا پھر مجھے نیند آگئی۔ میں نے خواب دیکھا کہ کوئی مجھ سے کہہ رہا ہے، اٹھو اور کھڑکی میں جاؤ۔ میں گھبرا کر اٹھ گئی اور کھڑکی کھولی۔ پوری پچیسویں شاہراہ خالی پڑی تھی۔ ہر چیز سیاہ اور خوفناک لگ رہی تھی۔ میں خوفزدہ ہوگئی پھر کسی سواری کے پہیوں کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ مجھے لگا کہ یہ وہی ہے جس کا مجھے انتظار تھا۔ آہستہ آہستہ آواز بڑھتی گئی۔ آخر گھوڑوں والی ایک کوچ سیاہ سڑک پر دھیرے دھیرے رینگتی نظر آئی۔ وہ قریب آتی جارہی تھی۔ جب وہ کھڑکی کے سامنے آئی تو میں نے دیکھا کہ وہ سیاہ رنگ کی میت گاڑی تھی۔ میں خوف سے کانپ اٹھی۔ کوچوان نے چند لمحوں کے لیے کوچ روکی اور میری طرف دیکھا۔ میں کھڑکی کے پاس کھڑی، ہوا اور سردی سے کانپ رہی تھی۔ کوچ آگے بڑھ گئی۔ میں نے مارچ میں پھر وہی خواب دیکھا اور کل رات بھی وہ خواب نظر آیا۔ تم کو یاد ہے کہ کل کتنی تیز بارش ہوئی تھی؟ جب میں کھلی کھڑکی کے پاس کھڑی تھی تو میرا لباس گیلا ہوگیا تھا۔''

''اچھا، میں اس خواب میں کہاں ہوں؟''

''تم...... تم تابوت میں تھے لیکن مرے نہیں تھے۔'' ٹیسی نے جواب دیا۔ اس کی آواز کانپ گئی۔

''تابوت میں؟''

''ہاں۔''

''لیکن تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا؟ کیا تم نے مجھے دیکھا تھا؟''

''نہیں، لیکن میں جانتی تھی کہ تم وہاں ہو۔''

''شاید تم مشروم یا لابسٹر سلاد زیادہ کھاتی ہو؟'' میں نے ہنس کر کہا۔ اچانک وہ خوف سے چیخ پڑی۔

میں تیزی سے کھڑکی کی طرف بڑھا۔ وہ ہاتھوں سے کھڑکی کی پٹی کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی اور اس کی آنکھیں وحشت سے پھیلی ہوئی تھیں۔

''وہ...... وہ آدمی جو گرجے کے پاس کھڑا ہے، وہ وہی کوچوان ہے۔'' اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

''کیا فضول بات ہے!'' میں نے کہا لیکن ٹیسی کی آنکھوں میں خوف بھرا ہوا تھا۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ تاہم اب وہ وہاں سے چلا گیا تھا۔

''ٹیسی! بے وقوف نہ بنو۔ تم نے بہت دیر کام کیا ہے۔ تھکن سے تمہارے اعصاب بکھر گئے ہیں۔'' میں نے پیار سے کہا۔

''کیا تمہیں لگتا ہے کہ میں وہ چہرہ بھول سکتی ہوں؟'' وہ بڑبڑائی۔ ''میں نے تین بار اپنی کھڑکی کے نیچے ایک میت گاڑی کو رکتے دیکھا اور ہر بار کوچوان نے میری طرف نگاہ اٹھائی۔ اس کا چہرہ بالکل اسی طرح سفید اور پھولا ہوا تھا جیسے مردہ آدمی کا چہرہ ہو۔''

میں نے اسے بٹھایا اور تسلی دینے کی کوشش کی۔
''سنو ٹیسی! ایک دو ہفتوں کے لیے گاؤں چلی جاؤ۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ تم سارا دن محنت کر کے تھک جاتی ہو اور شام کو سونے کے بجائے دوستوں کے ساتھ پارٹیوں میں یا گھومنے نکل جاتی ہو۔ تمہیں آرام کا بہت کم وقت ملتا ہے۔ اگلی صبح تم بالکل تھکی ہوئی آتی ہو۔ بے آرامی کے باعث تمہیں ایسے ڈراؤنے خواب آتے ہیں۔''
وہ ہلکا سا مسکرائی۔ ''اچھا، گرجا گھر کے اس آدمی کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟''
''اوہ خدا! وہ ایک عام سا بیمار آدمی ہے۔''
ٹیسی نے بے یقینی سے سر ہلایا اور بولی۔ ''بہرکیف، میں نے جو دیکھا وہ اتنا ہی سچ ہے جتنا کہ میرا نام ٹیسی رڈرین ہے۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اس شخص کا چہرہ بالکل میت گاڑی کے کوچوان کا چہرہ ہے۔''
''ٹھیک ہے، تو کیا ہوا؟ وہ ایک ایماندارانہ پیشہ ہے۔'' میں نے کہا۔
''تو تمہیں یقین آگیا کہ میں نے میت گاڑی دیکھی تھی؟''
''ہاں......'' میں نے تھک کر کہا۔ ''ہو سکتا ہے تم نے اس آدمی کو بطور کوچوان دیکھا ہو۔ اس میں عجیب بات کیا ہے؟''
ٹیسی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے خوشبودار چیونگم نکال کر منہ میں رکھی پھر دستانے پہن کر مجھ سے ہاتھ ملایا اور شب بخیر کہہ کر رخصت ہوگئی۔

☆☆☆

اگلی صبح ملازم لڑکا تھامس میرے لیے ہیرالڈ اور کچھ خبریں لے کر آیا۔ گھر کے سامنے واقع گرجا گھر بیچ دیا گیا تھا۔
''گرجا کس نے خریدا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''مجھے نہیں معلوم جناب! لیکن سنا ہے کہ ہیملٹن اپارٹمنٹ کے امیر مالک کی اس پر نظر تھی۔ شاید اسی نے خریدا ہو۔''
میں کھڑکی کے پاس گیا۔ پھولے ہوئے چہرے والا چوکیدار ہمیشہ کی طرح گیٹ پر کھڑا تھا۔ میں اسے دیکھ کر ناگواری سے پیچھے ہٹ گیا۔
''تھامس! یہ نیچے کون ہے؟''
تھامس نے گہرا سانس لیا۔
''وہ موٹا، گرجا گھر کا نیا چوکیدار ہے۔ مجھے اس کی طرف دیکھ کر کراہت محسوس ہوتی ہے۔ وہ سیڑھیوں پر بیٹھ کر گزرنے والوں کو توہین آمیز نظروں سے دیکھتا رہتا ہے۔ ایک دن میں برداشت نہ کر سکا اور اس کے سر پر گھونسا مار دیا۔ معاف کیجیے گا جناب......!''
''کوئی بات نہیں، بولتے رہو۔''
''ایک رات ہیری اور میں گھر آرہے تھے۔ وہ میرا دوست ہے، انگلینڈ سے تعلق ہے۔ یہ مجھر سیڑھیوں پر بیٹھا تھا۔ ہمارے ساتھ لڑکیاں بھی تھیں۔ مولی اور جینی۔ وہ ایک کیفے میں کام کرتی ہیں۔ اس نے ہمیں گھور کر دیکھا۔ بس جناب! میں برداشت نہ کر سکا اور پوچھا۔ تم کیا دیکھ رہے ہو موٹے خنزیر؟ مجھے افسوس ہے جناب! لیکن میں نے بالکل یہی کہا تھا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا تو میں نے کہا۔ یہاں آؤ، میں تمہارا سر توڑ دوں گا۔ وہ پھر خاموش رہا۔ میں نے گیٹ کھولا اور اندر داخل ہو گیا لیکن اس نے پھر بھی لب نہ ہلائے، صرف مذمتی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ آخر میں نے اسے پیٹ ڈالا لیکن......آہ، جناب! وہ اتنا گندا تھا کہ اسے چھونا بھی کراہت آمیز تھا۔''
''اچھا پھر کیا ہوا؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔
''بس کچھ نہیں جناب! میں بزدل نہیں ہوں لیکن میں اچانک وہاں سے بھاگ گیا۔ جب ہوش آیا تو دور پانچویں شاہراہ کے قریب تھا۔''
''کیا تم بھاگ گئے تھے؟''
''ہاں سر!'' تھامس نے شرمندگی سے اعتراف کیا۔
''لیکن کیوں؟''
''ہم سب بھی ڈر گئے تھے۔''
''ڈر کس بات کا؟''
تھامس نے پہلے تو ٹال مٹول کی۔ میرا تجسس اور بڑھ گیا۔ میں اصرار کرنے لگا۔ اس کے انکار کی وجہ یہ بھی تھی کہ اسے ڈر تھا کہ میں اس کی بات کا یقین نہیں کروں گا اور مذاق اڑاؤں گا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ ایسا نہیں ہوگا تو وہ بولا۔ ''جناب! بات یہ ہے کہ جب میں نے اسے مارا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے زور لگا کر اپنا ہاتھ چھڑایا تو خدا کی قسم......اس کی ایک انگلی ٹوٹ کر میرے ہاتھ میں آگئی۔''
ہم دونوں کچھ دیر تک خاموشی سے ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ تھامس کے چہرے پر چھایا خوف آہستہ آہستہ میرے اوپر بھی حاوی ہونے لگا تھا۔
''جناب! یہ اتنا ناگوار تھا کہ اب میں اسے دیکھتا ہوں تو مجھے ابکائی آنے لگتی ہے اور میں منہ موڑ کر چلا جاتا ہوں۔'' اس نے کہا۔
جب تھامس رخصت ہوگیا تو میں نے کھڑکی سے

جھانکا۔ چوکیدار دونوں ہاتھ سلاخوں پر رکھے گیٹ پر کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا، اس کی دائیں ہاتھ کی انگلی غائب تھی۔ میں فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنی بگڑتی طبیعت پر قابو پایا۔

ٹیسی نو بجے آئی اور خوش دلی سے گڈ مارننگ کہنے کے بعد پردے کے پیچھے غائب ہوگئی۔ جب وہ پوز دینے کے لیے تیار ہو رہی تھی تو میں نے پہلے ہی ایک نیا کینوس ایزل پر لگالیا تھا اور فیصلہ کیا تھا کہ مجھے کل کے واقعے کو بھول کر نئے عزم سے کام کرنا چاہیے۔ جب میں خاکہ بنا رہا تھا تو وہ خاموش تھی لیکن جیسے ہی خاکہ پورا ہوا، وہ چہچہانے لگی۔

''میں نے کل ایک شاندار شام گزاری۔ ہم لیزا کے گھر جمع تھے۔''

''وہ کون ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''آپ اسے جانتے ہیں۔ وہ مسٹر وائٹ کے لیے پوز کرتی ہے۔ ہم اسے پوپی کہتے ہیں کیونکہ اس کے سرخ بال ہیں جو آپ فنکاروں کو بہت پسند ہیں۔''

میں نے کینوس پر درست کا نشان بنایا اور کہا۔ ''ٹھیک ہے، بولتی رہو۔''

''وہاں کئی اچھے لوگ موجود تھے۔ بس مجھے ایک نوجوان سے پیار ہوگیا۔ وہ لیزا کا بھائی ہے اور اچھا آدمی ہے۔'' وہ ہنس کر بولی۔

میں نے والدین کی سی پریشانی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ ہمیں اپنی محبتوں کے معاملے میں محتاط رہنا چاہیے۔ وہ جواب میں مسکرائی اور بولی۔ ''ہاں، میں جانتی ہوں لیکن ایڈی کا بالکل مختلف معاملہ ہے اور لیزا میری بہترین دوست ہے۔''

پھر اس نے بتایا کہ ایڈی نے وراثت میں ملنے والا فارم چھوڑ دیا ہے اور اپنی بہن کے پاس شہر چلا آیا ہے۔ وہ ایک پڑھا لکھا اور خوبصورت نوجوان ہے۔ اس نے اپنی تقرری کا جشن منانے کے لیے ہمیں آئس کریم کھلائی۔ اسے ایک آفس میں جونیئر کلرک کی ملازمت مل گئی ہے۔ جب وہ یہ سب کہہ رہی تھی، میں نے اپنا کام شروع کیا اور اس نے کسی چڑیا کی طرح چہچہانا بند کیے بغیر صحیح پوز دیا۔ دوپہر تک میں کافی کام کر چکا تھا۔ ٹیسی ایک نظر ڈالنے کے لیے آئی۔

''اب یہ بہتر ہے۔'' وہ مسکرائی۔

میں بھی ایسا ہی سمجھتا تھا۔ ہم نے ساتھ ہی..... کھانا کھایا۔ میں مطمئن تھا کہ معاملات آخر کار درست راستے پر چلنے لگے تھے۔ ٹیسی میرے پاس میز پر بیٹھ گئی اور ہم نے ایک ہی بوتل سے سرخ مشروب پیا اور ایک ہی تیلی سے سگریٹ جلائے۔ مجھے ٹیسی سے بہت لگاؤ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ میری نظروں کے سامنے ایک اناڑی ماڈل سے ایک دلکش عورت میں بدل گئی تھی۔ اس کی شخصیت متاثر کن تھی۔ میرے لیے کام کرتے ہوئے اس کا یہ تیسرا سال تھا۔ وہ میری پسندیدہ ماڈل تھی اور میں اکثر یہ سوچ کر پریشان ہو جاتا تھا کہ یہ کوئل کسی دن کسی خوبصورت آدمی کے ساتھ اڑ نہ جائے۔ اگرچہ میں اس کی بہتری چاہتا تھا لیکن میری خواہش تھی کہ وہ میرے ساتھ رہے۔ حالانکہ یہ میری خودغرضی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اگر وہ کسی کی محبت میں مبتلا ہوگئی تو وہ نہیں رکے گی۔ جلد یا بدیر کوئی ٹیسی کو مجھ سے دور کردے گا۔ اگرچہ میں خود شادی کو زندگی کا ایک غیر ضروری عنصر سمجھتا تھا پھر بھی میں چاہتا تھا کہ ٹیسی کے پاس سب کچھ ہونا چاہیے۔ اس وقت تقدیر نے اسے خود ہی راستہ دکھایا تھا۔ وہ میز پر بیٹھی چھت پر دھوئیں کے چھلے اڑا رہی تھی اور کچھ سوچتے ہوئے اپنی شراب کے گلاس میں برف کے ٹکڑوں کو ہلا رہی تھی۔

''میں نے بھی کل رات ایک خواب دیکھا۔'' میں نے کہا۔

''وہ اس آدمی کے بارے میں تو نہیں تھا؟'' اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، وہ تمہارے خواب جیسا ہی تھا۔''

درحقیقت اس سے ایسی باتیں کرنا حماقت اور نادانی تھی لیکن آپ جانتے ہیں کہ درمیانی درجے کے فنکار کے پاس زیادہ عقل نہیں ہوتی۔ میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ ''میں تقریباً دس بجے سو گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے خواب میں دیکھا کہ میں بیدار ہوگیا ہوں۔ میں نے گھنٹا گھر کی آدھی رات کی پکار صاف سنی پھر کھڑکی کے باہر درختوں کی سرسراہٹ اور خلیج میں دخانی جہاز کی وسل سنائی دی۔ مجھے اب بھی پوری طرح سے یقین نہیں تھا کہ میں سویا ہوں یا نہیں۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میں کسی شیشے کے ڈھکنے والے ڈبے میں پڑا ہوں اور مجھے کہیں لے جایا جا رہا ہے۔ میں نے کوچ کی کھڑکی سے سڑک پر لگے لیمپوں کی مدھم روشنیوں کو دیکھا اور بے چین ہوگیا پھر حرکت کرنے کی کوشش کی لیکن ڈبا بہت تنگ تھا۔ میرے بازو میرے سینے پر پھیلے تھے۔ میں انہیں اٹھا نہیں سکتا تھا۔ میں کچھ دیر خاموش رہا پھر میں نے چیخنے کی کوشش کی لیکن میری آواز نہیں نکلی۔ حالانکہ میں واضح طور پر کوچ پر لگے گھوڑوں کی ٹاپیں اور پہیوں کی گھڑگھڑاہٹ سن رہا تھا پھر میں نے ایک اور آواز

سی، جیسے کسی نے کھڑکی کھولی ہو۔ میں نے اپنا سر ہلکا سا موڑا۔ اب میں بند گاڑی کی کھڑکیوں سے باہر دیکھ سکتا تھا۔ میں نے جن مکانات کو گزرتے ہوئے دیکھا، ان میں سوائے ایک کے سب خاموش اور خالی تھے۔ اس گھر میں دوسری منزل پر ایک کھڑکی کھلی تھی اور کھڑکی میں مجھے ایک عورت کی شکل نظر آئی جو نیچے دیکھ رہی تھی اور وہ تم تھیں۔''

ٹیسی نے سر جھکایا اور اپنی کہنیوں کو میز پر ٹکا دیا۔ وہ خوفزدہ نظر آرہی تھی۔

''وہاں میں نے تمہارا چہرہ دیکھا۔'' میں نے زور دے کر کہا۔ ''اور مجھے لگا کہ وہ غم ناک ہے پھر ہم آگے بڑھے اور جلد ہی ایک تنگ و تاریک سرنگ میں داخل ہوگئے۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ موت کی سرنگ ہے۔ اب گھوڑے رک گئے تھے۔ وقت بہت آہستگی سے گزر رہا تھا۔ میں خوف اور بے صبری سے آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ چاروں طرف قبرستان کی سی خاموشی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کئی گھنٹے گزر چکے ہیں۔ اچانک میں نے بے چینی محسوس کی۔ مجھے احساس ہوا کہ میرے قریب کوئی ہے۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور اپنے اوپر میت گاڑی کے کوچوان کا سفید چہرہ دیکھا جو تابوت کے شیشے کے ڈھکن سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔''

اچانک ٹیسی چیخ پڑی۔ وہ پتے کی طرح لرز رہی تھی۔ میں نے اسے اپنی کہانی سے دہشت زدہ کر دیا تھا۔ اپنی اس احمقانہ حرکت پر خود کو ملامت کرتے ہوئے میں نے صورتِ حال کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ ''ٹیسی! یہ سب جھوٹ ہے۔ میں صرف تم کو بتانا چاہتا تھا کہ خوابوں میں نظر آنے والی ایسی کہانیاں حساس لوگوں کو کیسے متاثر کرتی ہیں مگر اس خواب کے لیے کوئی ابہام نہیں۔ یہاں سب کچھ واضح ہے۔ کل تم نے مجھے جو خواب سنایا اور اس چوکیدار کے لیے میری ناگواریت میرے دماغ میں گھل مل گئی اور جیسے ہی میں بستر پر گیا......''

ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی تھی کہ اس نے اپنے ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کے آنسو بہہ رہے تھے، جیسے اس پر کوئی بھیانک مصیبت آگئی ہو۔ میں کتنا بے وقوف ہوں۔ میں نے اسے دکھی کر دیا تھا۔ میں اس کے پاس گیا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''پیاری ٹیسی! مجھے معاف کر دو۔ مجھے تم کو ایسی کہانی نہیں سنانا چاہیے تھی۔ تم بہت حساس اور سچی لڑکی ہو اسی لیے تم خوابوں پر اتنا یقین رکھتی ہو۔''

جواب میں اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا۔ وہ اب بھی سسکتے ہوئے کانپ رہی تھی۔ میں نے اس کو حوصلہ اور تسلی دینے کی کوشش کی۔

''ٹیسی! یہ سب خواب ہے، ڈرو مت۔''

''میں اپنے لیے نہیں ڈر رہی۔'' وہ بولی۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔

''پھر کس کے لیے؟''

''میں تمہارے لیے پریشان ہوں۔ میں تم سے پیار کرتی ہوں۔'' وہ بولی۔

پہلے تو میں ہنسا لیکن جب اس کے الفاظ کا مفہوم سمجھ میں آیا تو ہکا بکا رہ گیا۔ یہ میرے بے وقوفانہ رویّے کا نتیجہ تھا۔ اس کے کہنے اور میرے جواب کے درمیان مجھے ہزار بہانے مل سکتے تھے۔ میں بات کو مذاق میں اڑا سکتا تھا۔ میں اسے غلط سمجھنے اور اپنی خراب صحت کا بہانہ کر سکتا تھا۔ میں اسے سمجھا سکتا تھا کہ مجھ سے محبت کرنا ناممکن تھا لیکن میرا جواب میرے خیالات سے زیادہ تیز تھا اور اب کچھ بھی ٹھیک کرنے میں بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں صرف سوچ سکتا ہوں کہ میں نے یہ کیا، کیا تھا۔ میں نے بے اختیار جھک کر اسے بوسہ دیا تھا۔

☆☆☆

شام کو ہمیشہ کی طرح میں واشنگٹن پارک میں چہل قدمی کے لیے چلا گیا۔ میرا پراگندہ چہرہ دن بھر کے واقعات کی عکاسی کر رہا تھا۔ میں سنجیدہ اور پریشان تھا۔ واپسی کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ مجھے مستقبل کو سیدھی آنکھوں سے دیکھنا تھا۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ میں ایک اچھا مثالی انسان نہیں ہوں۔ میں گناہ گار آدمی ہوں لیکن پھر بھی میں اپنے آپ کو یا ٹیسی کو دھوکا نہیں دینا چاہتا تھا۔ میری زندگی کی واحد محبت برٹین کے جنگل میں کہیں گم ہوگئی تھی لیکن کیا وہ اب مجھے کبھی نہیں ملے گی؟ امید نے چیخ کر کہا ''نہیں!'' اور تین سال سے میں امید کی اس آواز کو سن رہا تھا اور اس تمام عرصے میں دہلیز پر مانوس قدموں کا انتظار کر رہا تھا۔ کیا سلویا مجھے بھول گئی ہے؟ ''نہیں!'' امید مجھ پر چیخ اٹھی۔

میں نے ایک آزاد زندگی گزاری تھی۔ میں ہر وہ کام کرتا جس میں مجھے خوشی ملتی تھی اور بعض اوقات افسوس اور تلخ پشیمانی بھی میرے ہاتھ آئی تھی۔ میں صرف ایک چیز میں سنجیدہ تھا اور وہ تھا میرا فن۔ دن میں جو کچھ ہوا، اس پر افسوس کرنے میں بہت دیر ہو چکی تھی۔ چاہے یہ ترس کی وجہ سے تھا یا پریشانی کے جواب میں یا میں کسی بھی صورت میں اس کے دل کو ٹھیس پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے اندر بھڑکنے والی شدید

محبت کی آگ کی مجھے توقع نہیں تھی۔ میرے پاس کوئی متبادل نہیں تھا۔ مجھے یا تو اس کو قبول کرنا تھا یا اسے دور کرنا تھا۔ موخر الذکر کام میں نہیں کر سکتا تھا۔ میں ہمیشہ لوگوں کو تکلیف پہنچانے سے ڈرتا ہوں۔ مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ اسے سختی سے جواب دے سکوں اور اس کے دل کے دروازے میرے لیے کھلتے گئے پھر بھی جذبات کا طوفان تھمنے کے بعد میں نے ٹیسی کو سمجھایا تھا کہ اس کے لیے بہتر ہوگا کہ وہ ایڈی کی محبت کو قبول کر کے اس سے منگنی کر لے لیکن وہ اس کے بارے میں بات کرنا نہیں چاہتی تھی پھر میں نے فیصلہ کیا کہ اگر وہ واقعی کسی ایسے شخص سے محبت کرنا چاہتی ہے جس سے وہ کبھی شادی نہیں کر سکتی تو مجھے رہنے دے۔ کم از کم میں اس کے ساتھ ایک دانشور کی طرح سلوک کروں گا اور جب اس کی پُرجوش محبت کا دور گزر جائے گا تو وہ پچھتائے گی۔ مجھے اس بات کا پورا یقین تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں ایک ایسے کام میں الجھتا جا رہا ہوں جو مجھ جیسے لوگوں کے لیے آسان نہیں ہے لیکن میں اس بات سے بھی آگاہ تھا کہ میرے ساتھ رہ کر وہ مکمل طور پر محفوظ رہے گی لیکن میں اس کی شخصیت کو اپنی غیر سنجیدہ فطرت پر قربان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مستقبل کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے واضح طور پر کئی ممکنہ انجام دیکھے جن پر یہ کہانی ختم ہو سکتی تھی۔ آخر کار وہ اس تعلق سے تھک جائے گی یا وہ اس قدر ناخوش ہوگی کہ مجھے اس سے شادی کرنا پڑے گی یا میں اسے بھگا دوں گا لیکن اگر ہم شادی کر لیتے ہیں تو ہم دونوں ناخوش رہیں گے۔ میرے پاس ایک بیوی ہوگی جو میرے لیے بالکل بھی مناسب نہیں ہوگی اور اس کے پاس ایسا شوہر ہوگا جو دنیا کی کسی عورت کے لیے مناسب نہیں ہے۔ اگر ہم جدا ہو جاتے ہیں تو وہ کچھ عرصے دکھی رہے گی لیکن پھر سنبھل کر ایڈی سے شادی کر لے گی۔ بہرحال اس کا ایک قابلِ رشک مستقبل تھا۔ ایڈی سے منگنی پھر شادی، بچے، ایک خوبصورت اپارٹمنٹ اور اس طرح کی تمام چیزیں۔ پارک کے درختوں کے نیچے ٹہلتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ میں دھیرے دھیرے اس کی ذہن سازی کروں گا کہ اسے ایک اچھا دوست تلاش کرنا چاہیے اور مستقبل کو محفوظ بنانا چاہیے۔ یہ ہم دونوں کے مفاد میں ہے پھر میں گھر چلا آیا جہاں میں نے اپنے دوست ایڈتھ کا پیغام پایا۔

''میں گیارہ بجے میٹروپولیٹن تھیٹر کے باہر تمہارا انتظر رہوں گا۔'' میں باہر جانے کی تیاری کرنے لگا۔

ہم دونوں نے تھیٹر دیکھا اور ریستوران میں کھانا کھایا۔ رات گئے جب ہماری محفل برخاست ہوئی تو میں پیدل گھر کی طرف چل دیا۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ میں مزے سے چلا جا رہا تھا۔ گھر کے قریب گرجا گھر کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے اسی جانے پہچانے چہرے کو دیکھا۔ سیڑھیوں پر چوکیدار کھڑا تھا۔ اس کے پپلے سوجے ہوئے منہ کو دیکھ کر مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی اور میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ اچانک اس نے کچھ کہا۔ وہ شاید مجھ سے مخاطب تھا یا منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا تھا۔ مجھے غصہ آنے لگا۔ ایسا گھٹیا آدمی مجھ سے کیسے مخاطب ہو سکتا ہے؟ میرا پہلا ردعمل یہ تھا کہ میں مڑوں اور اپنی چھڑی اس کے سر پر ماروں لیکن میں نے خود کو روکا اور خاموشی سے گزر گیا۔ جلد ہی میں گھر پہنچ گیا۔ کچھ دیر بعد میں سونے کے لیے لیٹا لیکن نیند غائب تھی۔ میں دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کی سرگوشی جیسی آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ میں نے اسے دماغ سے جھٹکنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ وہ گندی سرگوشی میرے کانوں سے چپک گئی تھی جیسے گرم گاڑھے تیل میں سے نکلنے والا چپچپا دھواں ہو۔ میں نے ان الفاظ کو یاد کرنے کی کوشش کی جو اس نے کہے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ الفاظ میری یادداشت میں تازہ ہو گئے۔ وہ بہت آہستگی سے کہہ رہا تھا۔

''کیا آپ کو پیلا نشان ملا؟''

''کیا آپ کو پیلا نشان ملا؟''

میں غصے سے بھنا اٹھا۔ اس کا کیا مطلب تھا؟ آخر میں نے اس پر لعنت بھیجی اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ میں جلد ہی کامیاب ہو گیا لیکن جب میں بیدار ہوا تو خود کو پژمردہ اور بیمار محسوس کر رہا تھا کیونکہ میں نے پھر وہی گزشتہ رات والا خواب دیکھا تھا اور اس بار اس نے مجھے پہلے سے بھی زیادہ پریشان کر دیا تھا۔

میں نے کپڑے بدلے اور اسٹوڈیو چلا آیا۔ ٹیسی کھڑکی کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر کھڑی ہوئی اور آگے بڑھ کر والہانہ انداز میں گلے لگی۔ وہ اتنی پیاری اور خوبصورت تھی کہ میں مزاحمت نہیں کر سکا۔ ''سنو، کل والا کینوس کہاں ہے؟'' میں نے ایزل خالی دیکھ کر پوچھا۔

ٹیسی نے میری بات سن لی تھی لیکن کسی وجہ سے جواب نہیں دیا۔ میں نے کینوس کے اس ڈھیر پر نظر ڈالی جو میں نے کبھی شروع کیے تھے اور کسی وجہ سے مکمل نہیں ہو سکے تھے۔ اسی وقت ٹیسی اسکرین کے پیچھے چلی گئی۔ میں صبح کی روشنی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اس لیے میں خود کینوس ڈھونڈنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ ٹیسی ابھی تک کپڑے پہنے اسکرین کے پاس کھڑی تھی۔

''کیا ہوا؟ کیا تم تھکی ہوئی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“
”تو پھر فوراً کام شروع کرتے ہیں تاکہ جلدی ختم ہوجائے۔“
”کیا تم چاہتے ہو کہ میں ہمیشہ کی طرح تمہارے لیے پوز کروں؟“
اس کی بات سن کر میں چونک گیا۔ مجھ پر واضح ہوا کہ میں نے اپنی بہترین ماڈل کھودی ہے۔ یہ نئی مشکلات کا آغاز تھا۔ میں نے الجھن آمیز نظروں سے ٹیسی کی طرف دیکھا۔
ایسا لگتا تھا کہ اس نے میرے چہرے پر چھائے ہوئے مایوسی کے سائے کو محسوس کرلیا ہے کیونکہ اس نے فوراً کہا۔ ”اگر تم چاہو تو میں ہمیشہ کی طرح تمہارے لیے پوز دوں گی۔ وہ کینوس پردے کے پیچھے پڑا ہے۔ میں نے اسے چھپادیا تھا۔“
”نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”ہم کچھ نیا شروع کریں گے۔“
میں ڈریسنگ روم میں گیا اور موتیوں اور ستاروں کے کام والا عربی طرز کا لباس نکال لایا۔ وہ ایک شاندار لباس تھا۔ ٹیسی اسے دیکھ کر خوش ہوئی اور پردے کے پیچھے غائب ہوگئی۔ جب وہ کپڑے بدل کر باہر آئی تو مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔ اس کی پیشانی کے گرد فیروزی جھالر بندھی ہوئی تھی جس پر چمکتی ہوئی رنگ برنگے موتی لٹک رہے تھے اور اس نے نقرئی کڑھائی والا شرارہ پہن رکھا تھا جو ٹخنوں تک پہنچ رہا تھا۔ اوپری بدن پر گہری نیلی چمک دار ریشمی قمیص تھی جس پر نقرئی رنگ کی بوٹیاں تھیں۔ اس کے اوپر ایک مختصر مشرقی طرز کی پھولی ہوئی واسکٹ تھی جس میں رنگ برنگے پتھر اور فیروزے لگے تھے۔ پیروں میں کڑھائی اور ستاروں سے مزین چپلیں تھیں اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ یہ سب ٹیسی کے لیے بہت خوش کن تھا۔
وہ میرے پاس آئی اور مسکرادی۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سونے کی زنجیر نکالی اور اس کے گلے میں ڈال دی۔
”یہ تمہارے لیے ہے۔“
”میرے لیے؟“ وہ حیرت آمیز خوشی سے چلائی۔
”ہاں، چلو اب کام شروع کرتے ہیں۔“
لیکن ٹیسی مسکراتی ہوئی اسکرین کے پیچھے بھاگی پھر فوراً نمودار ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں لکڑی کا ایک چھوٹا سا ڈبا تھا جس پر میرا نام لکھا ہوا تھا۔
”میں یہ رات کو دینا چاہتی تھی لیکن اب مزید انتظار نہیں کرسکتی۔“
جب میں نے ڈبا کھولا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اندر گلابی ساٹن پر سنگ سلیمانی کا ہک رکھا ہوا ہے۔ اس پر خالص سونے میں کچھ پراسرار نشانات نقش تھے لیکن یہ عربی یا چینی حروف نہیں تھے اور جیسا کہ میں نے بعد میں جانا کہ ان کا تعلق کسی بھی انسانی مروجہ زبان سے نہیں تھا۔
”مجھے یقین ہے کہ تمہیں یہ تحفہ پسند آئے گا۔“
”ہاں، یہ بہت عمدہ ہے۔ میں اسے ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گا۔“
ٹیسی نے اسے فوراً میری جیکٹ کی جیب پر لگادیا۔
”تم نے بہت قیمتی چیز خریدی ہے۔“ میں نے کہا۔
”میں نے خریدا نہیں۔“ وہ ہنسی۔
”پھر یہ کہاں سے آیا؟“
ٹیسی نے مجھے بتایا کہ اسے یہ ہک ایک سال پہلے کہیں پارک میں ملا تھا، جب وہ دوستوں کے ساتھ واپس آرہی تھی۔ اس نے مالک کو ڈھونڈنے کے لیے اخبارات میں اشتہار دیا لیکن کوئی لینے نہیں آیا۔
”یہ گزشتہ موسم سرما میں ہوا تھا اور اسی رات میں نے سیاہ میت گاڑی کے بارے میں اپنا پہلا خواب دیکھا تھا۔“ وہ بولی۔
مجھے فوراً اپنا خواب یاد آگیا لیکن میں کچھ نہیں بولا اور تیزی سے کینوس پر پنسل چلانے لگا جبکہ ٹیسی خوش کن تاثرات کے ساتھ میرے لیے ایک نئی تصویر کے لیے پوز کررہی تھی۔
☆☆☆
اگلا دن میرے لیے بہت بُرا تھا۔ جب میں کینوس کو ایک چبوترے سے دوسرے پر منتقل کررہا تھا تو تازہ پالش کیے ہوئے فرش پر پھسل کر گر گیا اور میری دونوں کلائیوں میں چوٹ آگئی۔ اس نے مجھے اتنی تکلیف دی کہ میں برش بھی نہیں پکڑ سکتا تھا۔ میں مایوسی سے کرسی پر بیٹھا پریشانی سے اپنے ادھورے کام کو دیکھتا رہا۔ بارش کھڑکیوں پر دستک دے رہی تھی اور سامنے چرچ کی چھت پر ڈھول بجارہی تھی۔ اس ہلچل نے بھی مجھے پریشان کردیا تھا۔ ٹیسی کھڑکی کے پاس بیٹھ کر کچھ سلائی کررہی تھی۔ وہ وقتاً فوقتاً نظریں اٹھاتی اور مجھے ایسی معصومیت سے دیکھتی کہ مجھے اپنے چڑچڑے پن پر شرم آنے لگتی۔ آخر میں نے بھی کچھ کرنے کا فیصلہ کیا اور لائبریری میں چلا آیا۔ میری لائبریری میں ڈھیروں کتابیں اور رسائل تھے لیکن زیادہ تر میں نے پڑھے ہوئے تھے۔ میں اپنی توجہ ہٹانے کے لیے ایک ایک کرکے شیلف کھولنے لگا اور کوئی ایسی کتاب ڈھونڈنے لگا جو میری بوریت دور کردے۔

پھر میں کھانے کے کمرے کی طرف جانے ہی والا تھا کہ اچانک میری نظر سانپ کی کھال کی جلد والی ایک موٹی کتاب پر پڑی جو اوپر کی شیلف پر سب سے دور، کونے میں رکھی تھی۔ مجھے یاد نہیں تھا کہ یہ کون سی کتاب ہے۔ نہ میں نیچے سے اس کے نام کو پڑھ سکتا تھا۔ میں نے ٹیسی کو بلا کر کتاب اتارنے کا کہا۔ وہ اسٹوڈیو سے چھوٹی سیڑھی لا کر اوپر چڑھ گئی۔

''یہ کون سی کتاب ہے؟'' میں نے بے صبری سے پوچھا۔

''پیلا بادشاہ۔'' وہ بولی۔

''پیلا بادشاہ!'' میں حیرت سے چلّایا۔ میں پریشان تھا کہ وہ کتاب میرے اپارٹمنٹ میں کیسے آئی؟ کون اسے یہاں رکھ گیا؟ کیونکہ میں نے بہت پہلے فیصلہ کرلیا تھا کہ میں اپنی زندگی میں اس کتاب کو کبھی نہیں پڑھوں گا اور دنیا کی کوئی طاقت مجھے اسے خریدنے پر مجبور نہیں کرے گی۔ جب بھی کتابوں کی دکانوں میں وہ مجھے نظر آتی، میں اس سے منہ موڑ لیتا تاکہ تجسس مجھے اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور نہ کردے۔ میرے واقف کار نوجوان کاسٹین کے خوفناک سانحے نے مجھے اس شریر کتاب کے صفحات کو پڑھنے سے ہمیشہ روکا تھا۔ مزید برآں میں ہمیشہ اس پر بات کرنے سے کتراتا تھا۔ حالانکہ اس کتاب کے دوسرے حصے پر بلند آواز میں بحث کرنے کی کسی کو بھی ہمت نہیں ہوتی تھی اس لیے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ان صفحات میں کیا ہوسکتا ہے۔ میں نے خوف سے اس کے گھناؤنے کیڑے کھائے ہوئے غلاف کو دیکھا جیسے میرے سامنے کوئی زندہ سانپ ہو۔

''ٹیسی! اسے مت چھونا۔ جلدی نیچے آؤ۔'' میں چلّایا۔

میرا انتباہ اس کے تجسس کو بڑھانے کے لیے کافی تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتا، اس نے کتاب اٹھالی اور ہنستے ہوئے اتر کر اسٹوڈیو کی طرف بھاگی۔ میں زور سے چلّایا اور اسے اپنے زخمی ہاتھوں سے روکنے کی کوشش کی لیکن وہ مسکرا کر غائب ہوگئی۔ اب میرے پاس اس کے پیچھے بھاگنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

''ٹیسی!'' میں راہداری سے چلّایا۔ ''سنو، میں سنجیدہ ہوں۔ اس کتاب کو رکھ دو۔ میں نہیں چاہتا کہ تم اسے کھولو۔''

لیکن وہ اسٹوڈیو میں نہیں تھی۔ میں نے اسے دونوں ڈرائنگ رومز میں تلاش کیا پھر بیڈروم، کچن، ڈائننگ روم پھر لائبریری میں جا کر دوبارہ دیکھنے لگا لیکن ٹیسی کہیں اس طرح چھپ گئی تھی کہ میں اسے آدھے گھنٹے بعد تلاش کرپایا۔ وہ خاموشی سے اسٹور روم کی الماری میں بیٹھی تھی اور بہت زرد اور کمزور نظر آرہی تھی۔ میں فوراً جان گیا کہ اس نے کیا حماقت کی ہے۔ اب سزا اس کا مقدر تھی۔ وہ منحوس کتاب اس کے قدموں میں پڑی تھی۔ ٹیسی پر ایک نظر ڈال کر مجھے اندازہ ہوگیا کہ بہت دیر ہوچکی ہے۔ اس نے کتاب پیلے رنگ کا بادشاہ پڑھ لی ہے۔ میں نے خاموشی سے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسٹوڈیو میں لے گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی سحر کے زیر اثر ہے۔ جب میں نے اسے صوفے پر لیٹنے کو کہا تو اس نے ایک لفظ کہے بغیر بات مان لی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں بند کرلیں اور اس کی سانسیں برابر ہوگئیں لیکن میں اس کا تعین نہیں کرسکا کہ وہ سوگئی ہے یا نہیں۔ میں کافی دیر تک اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا لیکن ٹیسی نے جنبش نہ کی اور نہ کچھ بولی۔ آخر میں اٹھ کر اسٹور روم میں گیا اور فرش سے وہ کھلی ہوئی کتاب اٹھائی۔ وہ مجھے ناقابلِ یقین حد تک بھاری لگ رہی تھی جیسے سیسے کی بنی ہو لیکن میں اسے اسٹوڈیو میں لے آیا اور صوفے کے پاس قالین پر بیٹھ کر اسے کھولا اور شروع سے آخر تک پڑھ ڈالا۔

دھیرے دھیرے اس کتاب کے الفاظ مجھ پر اثر انداز ہونے لگے۔ میں اپنے حواس کھونے لگا۔ آخر بھاری کتاب میرے ہاتھوں سے گر گئی اور میں صوفے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ٹیسی نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔

کچھ دیر تک ہم نے یکساں تناؤ بھرے لہجے میں بات کی اور مجھے محسوس ہوا کہ ہم پیلے رنگ کے بادشاہ کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔ ہم جان گئے تھے کہ ''پیلا بادشاہ'' ہستور کا حکمران ہے جہاں آسمان پر سیاہ ستارے لٹکتے ہیں۔ جہاں دوپہر کے وقت مُردوں کے سائے لمبے ہوتے ہیں، جہاں جڑواں سورج ہالی جھیل میں ڈوب جاتے ہیں۔ بادشاہ کی فطرت، اس کے مقاصد اور اس کا طریقۂ کار خفیہ تھا لیکن وہ زمین پر وقتاً فوقتاً نمودار ہوتا ہے۔ ان لاشوں کو حرکت میں لاتا ہے جو پہلے اس کے غلام تھے اور وہ زندہ لاشیں اسے نئے غلام ڈھونڈنے میں مدد کرتی ہیں۔ پیلا بادشاہ ایک پراسرار، مہلک اور مافوق الفطرت ہستی ہے۔ وہ جس کی جان لینا چاہتا ہے، اسے پہلے کتابی شکل میں پیلا نشان بھیجتا ہے جو ایک ممنوعہ خیالی ڈراما ہے۔ اسے پڑھنے والے شدید مایوسی یا پاگل پن کا شکار ہوجاتے ہیں۔ وہ ان الفاظ کے سحر میں گرفتار ہوجاتے ہیں جو اگرچہ بلور کی طرح صاف، چمکتے اور موسیقی کے آہنگ سے بھرپور ہیں مگر کسی بدنیت طبیب کے ہیروں کی طرح زہریلے ہیں۔ جو دھوکا دیتے ہیں اور انسانی روح اور ذہن کو مسحور اور مفلوج

کر دیتے ہیں۔ وہ جاہل اور خواندہ دونوں کو یکساں سمجھ میں آتے ہیں اور لوگ انہیں پڑھ کر جواہرات سے زیادہ قیمتی اور موسیقی سے زیادہ سکون بخش سمجھتے ہیں جبکہ وہ موت سے زیادہ خوفناک ہیں۔ باتوں کے دوران کچھ سائے ہمارے قریب منڈلانے لگے مگر ہم اپنے اردگرد جمع ہونے والے سایوں کو نظر انداز کر کے بات کرتے رہے۔ ٹیسی نے مجھ سے سنگِ سلیمانی کے ہک کو پھینکنے کو کہا کیونکہ ہم جان چکے تھے کہ یہ بھی پیلا نشان تھا۔ میں کبھی نہیں جان پاؤں گا کہ میں نے ایسا کرنے سے کیوں انکار کیا اور یہاں تک کہ جب میں اپنے بیڈروم میں یہ اعتراف لکھ رہا ہوں، میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ وہ کیا چیز تھی جس نے مجھے فوری طور پر پیلے رنگ کے نشان کو پھاڑ کر جلتی ہوئی چمنی میں پھینکنے سے روکا۔ مجھے یقین ہے کہ میں یہ کرنا چاہتا تھا لیکن ٹیسی کی تمام درخواستیں بے سود تھیں۔ رات ڈھلتی گئی اور وقت آہستہ آہستہ گزرتا رہا اور ہم پیلے بادشاہ کے بارے میں کچھ نہ کچھ بڑبڑاتے رہے۔ کہیں دور شہر کے گھڑیال نے آدھی رات کا گجر بجایا۔ ہم نے ہستور (فرضی شہر) اور کیسیلڈا (فرضی ملکہ) کے بارے میں بات کی جبکہ باہر دھند کھڑکیوں کے خالی شیشوں کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی جیسے ابر آلو لہریں ہالی (فرضی جھیل) کے ساحل پر ٹوٹ پڑتی ہیں۔

گھر میں عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی اور سڑک سے بھی کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ ٹیسی تکیے پر سر رکھے لیٹی تھی۔ اس کا چہرہ بہت اداس تھا لیکن اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دیے رکھا۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ میرے تمام خیالات کو آسانی سے پڑھ سکتی ہے، جیسا کہ میں کر رہا تھا کیونکہ ہم ہائیڈس (یونانی اساطیری کردار) کے اسرار کو سمجھ چکے تھے اور حقیقت کا پریت ہمارے سامنے تھا۔ جب ہم نے خاموشی سے ایک دوسرے کو سوچ سمجھ کر جواب دیے تو ہمارے اردگرد سایوں کی ہلچل بڑھ گئی اور کہیں دور گلی سے بگھی میں لگے گھوڑوں کے سموں کی آوازیں آنے لگیں......

وہ آرہا تھا۔ موت کا ہرکارہ۔ پہلے پہیوں کی ہلکی آواز آئی پھر صاف اور واضح ہوگئی۔ آخر میرے گھر کے دروازے پر آکر رک گئیں۔ میں بڑی مشکل سے کھڑکی کے پاس گیا اور نیچے ایک کالی میت گاڑی دیکھی۔ گیٹ کھلا اور بند ہوا۔ میں کانپتا اور رینگتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا اور بولٹ چڑھا دیا حالانکہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ کوئی بھی بولٹ اور تالا ہمیں اس خوفناک ہرکارے سے نہیں بچا سکتا جو پیلے رنگ کے نشان کے لیے آیا تھا...... پھر میں نے کسی کو آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سنا۔ وہ دروازے تک چلا آیا۔ آخر بولٹ اس کے لمس سے یکدم پگھل گئے۔ میں نے گھبرا کر اندھیرے میں دیکھا لیکن میں اسے کمرے میں داخل ہوتے نہیں دیکھ سکا اور جب میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے اپنی نرم برفیلی گرفت میں لے رہا ہے تو میں زور سے چیخا اور بچنے کے لیے جدوجہد کرنے لگا لیکن میرے ہاتھوں نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ اس نے سنگِ سلیمانی کا ہک میرے چہرے پر مارا۔ مجھے ایک زوردار دھچکا لگا۔ گرتے ہوئے میں نے ٹیسی کی چیخ سنی اور اس کی روح جسم سے پرواز کرگئی۔ اس وقت میں نے خواہش کی کہ میں بھی اس کے پیچھے جاؤں کیونکہ میں جانتا تھا کہ اب صرف خدا سے دعا کرنا باقی رہ گیا ہے۔

میں مزید بات کرسکتا ہوں لیکن مجھے نہیں معلوم کہ اس سے دنیا کو کیا فائدہ پہنچے گا۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں پہلے ہی انسانی مدد اور امید کھو چکا ہوں۔ جب میں یہ لکھ رہا ہوں تو مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں لکھنے سے پہلے مرجاؤں یا نہ مروں۔ میں ڈاکٹر کو دیکھتا ہوں جو میرے پاس کھڑا اپنا کام کر رہا ہے۔

یقیناً اس دنیا کے بہت سے لوگ اس سانحے کے بارے میں جاننے کے لیے بے تاب ہوں گے۔ خاص طور پر وہ صحافی جو کتابیں اور لاکھوں اخبارات شائع کرتے ہیں لیکن میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گا۔ صرف پادری ہی میری آخری باتیں سنے گا اور اقرار کی رازداری کو برقرار رکھنے کے لیے اس کے منہ پر مہر لگادی جائے گی۔ ہاں، صحافیوں کو انسانی دکھ لکھنے دو۔ انہیں خون اور آنسوؤں کی کہانی رقم کرنے دو لیکن یہ جاسوس میری کوئی بات نہیں سنیں گے۔ وہ جانتے ہیں کہ ٹیسی مرچکی ہے اور میں بھی جلد ہی مرجاؤں گا۔ وہ جانتے ہیں کہ پڑوسی میری غیر انسانی چیخ سے بیدار ہوکر گھر میں آئے اور انہوں نے مجھے زندہ اور دو لاشیں وہاں پائیں لیکن وہ نہیں جانتے کہ میں اب اپنے اعتراف کرنے والے سے کیا کہوں گا اور وہ کبھی نہیں جان پائیں گے کہ ڈاکٹر نے ورکشاپ کے کونے میں ایک خوفناک شکل کے ڈھیر کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے جو گرجا گھر کے چوکیدار کی جامنی نیلی لاش تھی، یہ کیوں کہا۔ ''میرے پاس اس بات کی کوئی وضاحت اور کوئی مفروضہ نہیں ہے کہ اس شخص کو مرے ہوئے کئی مہینے ہوگئے ہیں۔ آخر یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟''

مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں مر رہا ہوں۔ کاش یہاں کوئی پادری ہوتا۔

⌘⌘⌘
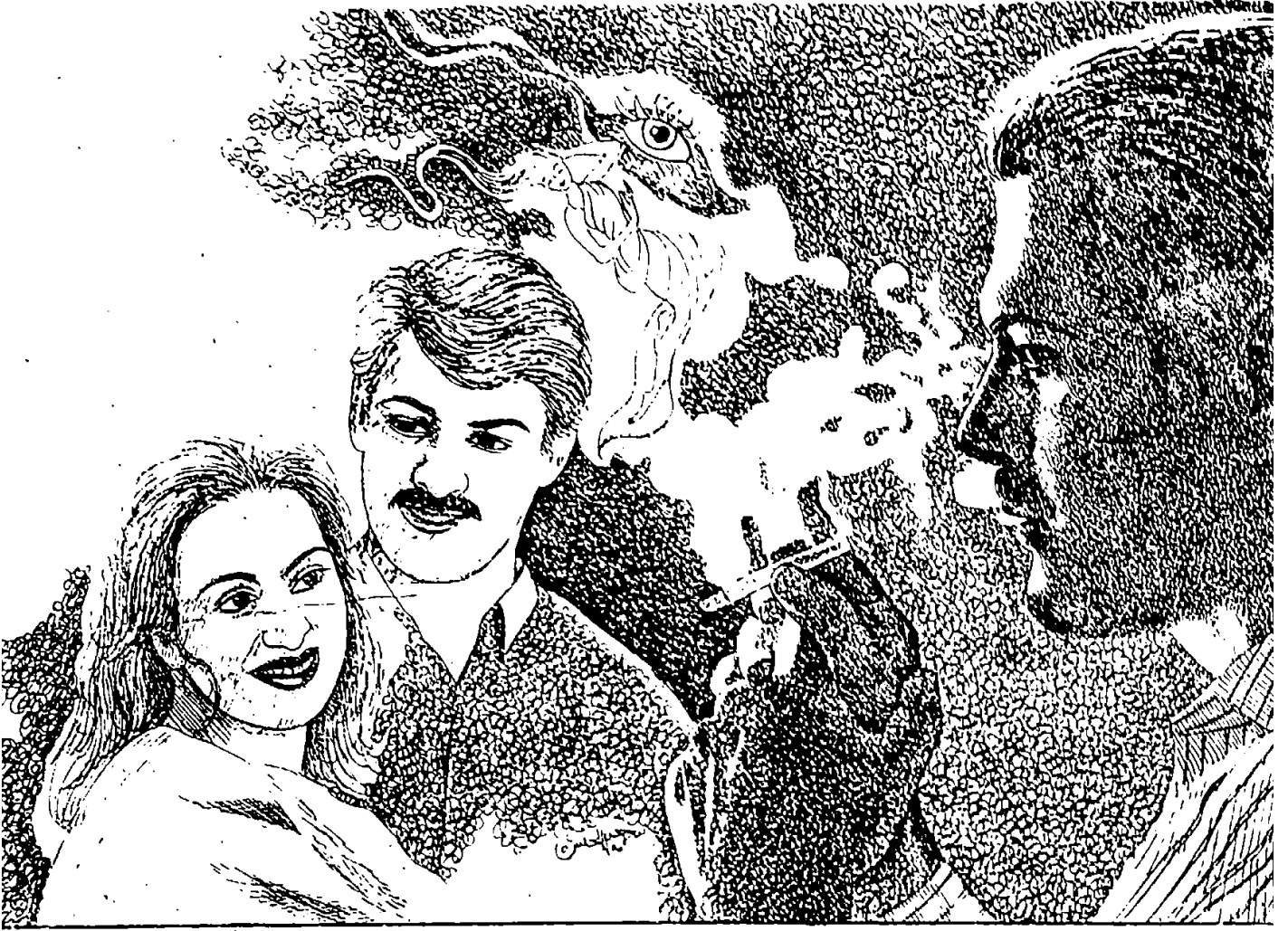
سانحہ

اُمِ عبداللہ

کہتے ہیں خوش نصیب ہے وہ شخص جسے مخلص دوست میسر ہوں مگر... جب دوست کے روپ میں دشمن مل جائیں تو تصور کرنا بھی محال ہوجاتا ہے کہ وہ اتنی شدت سے بھی حملہ آور ہوسکتے ہیں... کہ سنبھلنا بھی دشوار تر ہو جاتا ہے... اس کے ساتھ ہونے والا سانحہ بھی کچھ ایسا ہی تھا کہ وہ بری طرح لڑکھڑا کر رہ گیا۔

یقین و بے یقینی کے بھنور میں الجھے دوستوں کا انجام

اس حادثے کو میں اتفاقی ہی سمجھ رہا تھا مگر شاہنواز نے جس طرح آہستہ آہستہ اپنی اصلیت دکھائی وہ مجھے شش و پنج میں مبتلا کر گئی......

ہم پانچ دوست پنجاب کی معروف یونیورسٹی میں ساتھ ہی پڑھتے تھے۔ یاسر، زمان اور محمود تو پنجاب ہی کے مختلف اضلاع سے تعلق رکھتے تھے جبکہ میں اسلام آباد کا باشندہ اور شاہنواز مری سے آگے پتریاٹہ کا رہنے والا تھا۔ وہاں اس کے بزرگوں کی آبائی زرعی زمینیں تھیں۔ ہاسٹل میں ساتھ رہنے کی

وجہ سے ہماری دوستی بہت گہری تھی۔

تھرڈ ائیر کے امتحانات سے فراغت کے بعد ہم دوستوں نے بالائی علاقوں کی سیر کا پروگرام بنایا۔ یاسر کا کہنا تھا کہ کراچی کا کوئی ہٹ کرائے پر لے کر چند دن خوب سمندر کی سیر کی جائے۔ ان دنوں کراچی کا موسم بھی خاصا خوشگوار تھا۔ اس کے رشتے دار بھی وہاں رہتے تھے۔ وہ ان کی گاڑی بھی استعمال کرسکتا تھا اور ہم دوست ان کے بنگلے میں کچھ دن ٹھہر کر کراچی کی سیر بھی کرسکتے تھے۔ اس کے علاوہ مائی مکھی ہل، ٹھٹھہ، کلری جھیل اور لاڑکانہ وسندھ کے معروف علاقوں بشمول موئن جو دڑو جانے کا بھی اس نے بہتیرا غل ڈالا۔

''ہاں ضرور! خشک جنگلوں میں دھوپ تاپتے تم ہی پھانکنا ریت۔'' اس کا مشورہ یہ کہہ کر بھی رد کردیا گیا کہ کسی کا احسان نہیں لینا۔ زمان اور محمود کا کہنا تھا کہ پنجاب کے تاریخی مقامات بالخصوص قلعہ روہتاس اور دیگر معروف مقام دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

شاہنواز جو اپنے گھر لوٹ رہا تھا، اس کا کہنا تھا کہ تم لوگ میرے ساتھ ہی چلو مری اور اس سے ملحق علاقے بہت خوبصورت ہیں، اگر مناسب لگا تو ''کلڈانہ'' بھی چلنا۔ میں چونکہ اسلام آباد کا رہائشی تھا راولپنڈی تک آنا کچھ مشکل نہیں تھا جہاں سے ہم نے روانہ ہونا تھا مگر زمان اور محمود ابھی تک نہیں پہنچ پائے تھے، ان کی ٹرین جو اسی ریلوے اسٹیشن پر آنی تھی' تاخیر کا شکار ہو چلی تھی۔ شاہنواز وقت کا پابند تھا، وہ پہلے ہی سے اسٹیشن پر آیا بیٹھا تھا۔

سب نے اپنے اپنے گھر سے رقم کے ساتھ اجازت، ضرورت کے کپڑے اور اشیا لے کر اس کی بتائی ہوئی مقررہ جگہ پر پہنچنا تھا جہاں سے ہمیں اپنا سفر شروع کرنا تھا۔ ہاسٹل سے ہمیں رخصت مل چکی تھی اور نتیجے کے بعد ہی ہماری نئی کلاسیں شروع ہوتیں۔ ہم یہ فراغت والا وقت سیر وتفریح میں ہی گزارنا چاہتے تھے۔ میں نے دادا کی پرانی جیپ مستعار لی تھی جو انہوں نے خوشی خوشی عنایت کردی۔ ابو نے ہماری سہولت کے پیش نظر جیپ کی تھوڑی مرمت کے ساتھ اس میں نئی اضافی نشستیں بھی لگوائی تھیں اور بوقت ضرورت چھت کا بھی انتظام کیا تھا تاکہ پہاڑی علاقوں میں اچانک بارش یا بوچھاڑ سے بچاؤ بھی ہوسکے۔ ہمارا ارادہ مزید آگے تفریحی مقام پر جانے کا بھی تھا۔ ایک بڑی رقم والد صاحب نے میری جیب میں ڈال دی تھی تاکہ دوستوں پر بار نہ ہو۔ ہم قدرے کھاتے پیتے لوگ تھے جبکہ اس کے برعکس میرے دوست کچھ سفید پوش تھے اور اپنے اچھے مستقبل کے لیے مہنگی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کررہے تھے۔ یہ لوگ میرے اس ''سرپرائز'' سے بہت خوش ہوئے یعنی اب گاڑی کا ''مسئلہ'' بھی حل ہوگیا تھا اور ہم جہاں چاہیں آزادی سے جاسکتے تھے۔ یہ جیپ پہاڑی علاقوں کے لیے بھی موزوں تھی۔ کچھ انتظار کے بعد وہ دونوں بھی یہاں آپہنچے۔

''بڑے ہیرو بن کے بیٹھے ہو کالا چشمہ پا کے...... چلانی بھی آتی ہے۔'' محمود مجھے جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے دیکھ کر ہنسا۔ میں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا اور اتر کر باری باری سب کا سفری سامان ٹھکانے لگادیا۔ شاہنواز میرے برابر میں اور تینوں پچھلی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ موسم بہترین اور موزوں تھا۔

''تمہارا سامان دکھائی نہیں دے رہا خرم!'' محمود نے سیٹ پر بیٹھتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ میں اب ڈرائیونگ سیٹ پر بڑے دھڑلے سے بیٹھا تھا۔ دل میں ایک انجانی سی خوشی تھی کہ والدین سر پر ہوں اور ساتھ ان کی دعائیں اور کچھ رقم بھی ہو تو بندہ ''بھاری بھرکم'' سا ہو جاتا ہے۔ میں نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا کہ بے شک وہی نوازنے والا ہے۔

''اس چھوٹے بیگ میں ضروری چیزیں ہیں، باقی کپڑے وغیرہ راستے سے خرید لوں گا۔'' میں نے اسے جواب دیتے ہوئے جیپ آگے بڑھادی۔ وہ سبک رفتاری سے چلتی راولپنڈی کو پیچھے چھوڑتی اسلام آباد کی حدود میں داخل ہوگئی۔ یہاں میں نے بڑے ریسٹورنٹ سے کھانا پیک کرایا۔ ہم سب نے صبح کا ناشتا کیا ہوا تھا اور اب دن کے ڈھائی بج رہے تھے۔ نماز ہم نے اسٹیشن پر ہی ادا کرلی تھی۔

''یار خرم! یہ ٹھیک نہیں۔'' یاسر نے مجھے ریسٹورنٹ سے کھانا لاتے دیکھا۔

''کیا؟'' کولڈ ڈرنک سمیت کھانے کا بڑا تھیلا میں نے شاہنواز کو پکڑایا۔

''اتنے مہنگے کھانے تو ہم افورڈ نہیں کرسکیں گے یار! ہمیں پر ہیڈ (فی کس) کا بھی حساب لگانا ہوگا۔ اس طرح تو ہمارا دو دن میں ہی دِوالیا ہوجائے گا۔'' یاسر نے توجہ دلائی۔

''اچھا چلو آج جانے دو، اس کھاتے کو...... جیپ کی خوشی میں سمجھ لو تمہیں ٹریٹ دی ہے...... چلو شروع کرو۔'' میں نے جواب دیا۔

یہ سب میرے جگری دوست تھے اور ہماری دوستی مثالی تھی۔ میری کوشش یہی ہوتی تھی کہ میں ان کے کچھ نہ

کچھ کام آجاؤں۔ میں ان کا رہن سہن اور سادی خوراک جانتا تھا کہ وہ کیسے اپنی سفید پوشی کا بھرم رکھتے تھے۔ زمان اور محمود تو صبح فجر میں ہی خالی پیٹ ٹرین میں جا چڑھے تھے۔ انہوں نے کسی اسٹیشن پر چائے کے ساتھ بسکٹ لیے تھے اور یاسر نے جلدی میں جیسے تیسے پراٹھے کے چند نوالے چائے سے نگلے تھے کہ کہیں ہم اس کی وجہ سے لیٹ نہ ہو جائیں۔ رہی بات شاہنواز کی تو وہ بھلا چنگا تھا۔ اس نے ہاسٹل سے یہاں پہنچ کر سکون سے اسی اسٹیشن پر اپنی من پسند حلوا پوری سے ناشتا کیا تھا۔ وہ بھی کچھ متمول گھرانے کا تھا اور کبھی کبھی ہم پر بھی پیسے خرچ کر دیا کرتا۔ بہرحال ہمارا سفر شروع ہو چکا تھا۔ ہم سب سے پہلے اسلام آباد سے مری پہنچے۔ دو دن ہم نے وہاں قیام کیا۔

میں نے اپنے بچپن میں غربت کا مزہ چکھا تھا میری حتی المقدور کوشش ہوتی کہ اپنے قریبی عزیزوں کی کچھ نہ کچھ مدد کر جاؤں۔ یہ لوگ بھی کچھ رقم ادھار بھی لیتے تو میں مطالبہ نہیں کرتا۔ واپسی پر مسکرا کر انہیں ہی لوٹا دیتا تو ان کے چہروں کی خوشی دیدنی ہوتی۔ میرے والد اور دادا بھی دیالو قسم کے آدمی تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ان کا کپڑے کا کاروبار خوب چمک اٹھا تھا۔ میں گھر میں سب سے بڑا تھا۔ باقی پانچ بہنوں کے بعد ایک چھوٹا بھائی تھا جو اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد ابو کا ارادہ مجھے بھی اپنے کاروبار میں شامل کرنے کا تھا۔ دادا کو بھی مجھ سے بہت توقعات وابستہ تھیں اور میں انہیں مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔

دوسرے دن ہم سامان سمیت چیئر لفٹ اور کیبل کار کے ذریعے پتریاٹہ پہنچ گئے جہاں شاہنواز کی رہائش تھی۔ ہم یہاں زیادہ دیر نہیں رکے، ہمارا ارادہ کلڈانہ کے علاقوں میں جانے کا تھا جہاں کی رغبت ہمیں یہاں تک لے آئی تھی۔ تھوڑی میزبانی کا شرف اس کے گھر والوں کو دے کر ہم شاہنواز سمیت پھر نئے سفر کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہ یہاں کے چپے چپے سے واقف تھا۔ اس کی ہمراہی اور راہنمائی میں ہم کلڈانہ کے تفریحی مقامات کی سیر کو نکل جاتے۔ بلند و بالا پہاڑوں میں اونچے لانبے گھنے درخت بادلوں کی اوٹ میں کھڑے دکھائی دیتے۔ سورج کی سنہری کرنیں ہر سو اپنا حسن بکھیرتی نظر آتیں۔

شام کے سائے ڈھلنے لگے تھے۔ ہم صبح سے سیر کے لیے نکلے ہوئے تھے اور اب لوٹ رہے تھے۔ یہاں قریبی آبادی میں شاہنواز کی دوسری دادی کا گھر تھا۔ اس نے پہلے سے ہماری آمد کی خبر کر رکھی تھی' میں اس کے بتائے ہوئے راستے پر پہاڑی علاقوں میں جیپ دوڑا رہا تھا۔ گو کہ مجھے ڈرائیونگ آتی تھی مگر یہ بلند و بالا پہاڑوں میں اونچے نیچے راستے میرے لیے نئے تھے، کہیں گہری کھائی تو کبھی کسی خطرناک موڑ سے گزرتے میں بہت احتیاط سے گاڑی چلا رہا تھا۔ ہلکی ہلکی بوچھاڑ ہو چلی تھی۔

وہ پہاڑ کی چوٹی پر بنگلا نما مکان میں ہمیں لے گیا۔ بنگلے کے احاطے میں کافی بڑا سا لان تھا جو پھولوں اور گھاس سے سجا ہوا دکھائی دیا۔ یہ نیا اور جدید طرز پر بنایا گیا تھا۔ چند بچے لان میں نصب جھولوں پر جھولا جھولتے غل مچائے ہوئے تھے۔ یہاں اس کے دادا کی آبائی زمینیں تھیں۔ ان کی دو بیویاں تھیں، بڑی والی دوسرے علاقے میں رہتی تھیں۔ یہاں کافی نفوس تھے، ہر جگہ رونق سی لگی تھی۔ بڑے بڑے ستونوں والے دالان کے قریب ہی چند عمر رسیدہ خواتین وہاں بچھے تخت پر اپنی محفل سجائے بیٹھی تھیں۔ ان لوگوں نے ہماری خاصی آؤ بھگت کی۔ سلیقے سے دسترخوان بچھا تھا، انہوں نے خاصا اہتمام کیا تھا۔ بکرے کی بھنی ہوئی دو رانیں، چکن کڑاہی، روغنی نان، چپاتیاں، بچھیا کی مسالے دار بریانی، سیخ کباب، سلاد، رائتہ اور کھوئے میوے سے بھرا لذیذ زردہ اور فیرنی۔ کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو اور گرم اٹھتی بھاپ دیکھ کر ہماری بھوک چمک اٹھی۔ ہم سب ہی مہذب انداز میں کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ اس سے پہلے ہم اپنی اور کھانے کی تصویریں لینا نہیں بھولے تھے۔

''تیری یہ نیلی شرٹ بہت پیاری لگ رہی ہے یار! مجھے بھی دینا چند تصویریں بناؤں گا اپنی۔'' شاہنواز نے میری تصویر اپنے سیل پر دکھائی۔

''لے لینا، کھانا کھانے کے بعد مگر دھونے کی شرط یاد رکھنا۔'' میں نے مسکرا کر اسے دھیمے سے جواب دیا۔

شاہنواز سمیت اس گھر کے چند مرد بھی ہمارے ساتھ کھانے میں شریک تھے جن سے ہم خاصا گھل مل گئے تھے۔ یہ بہت سادہ لوح اور مہمان نواز تھے اور مجھ سے خاصا مرعوب ہو رہے تھے۔

''ارے! یہ گلاس کہاں رہ گئے۔ اب کیا جگ سے منہ لگا کر پئیں پانی۔'' کسی میزبان کے منہ سے نکلا، وہ شاہنواز کا بہنوئی اور پھوپی زاد ضمیر تھا اس کی گفتگو سے زنانہ پن جھلکتا تھا۔ گلاس واقعی دسترخوان پر موجود نہیں تھے۔

''ابھی کہے دیتا ہوں بھائی۔'' دوسرا شخص دروازے پر موجود کسی سے گلاسوں کا کہہ آیا۔

ایک لڑکی تیزی سے گلاس اٹھائے پردوں سے الجھتے

ہمارے دسترخوان پر گرتے گرتے بچی تھی۔
''کس کو چاہیے گلاس؟ کون مانگ رہا ہے گلاس؟''
وہ اپنی ہی دھن میں بولتی چلی گئی۔ شاہنواز کھاتے کھاتے اب زمان کی ویڈیو بنانے میں لگا ہوا تھا جو خواہ مخواہ ہی چھری کانٹے سے ران کے گوشت کو کاٹنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہا تھا۔ سب کی پشت پردے کی طرف تھی جہاں سے ''وہ'' برآمد ہوئی تھی۔ شاہنواز کیمرا لیے اب الائچی پھانکتے یاسر کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔
''گھر کی عورتوں کی مت بنانا۔'' ساتھ کھانا کھاتے شاہنواز کے تایا کی سرگوشی قریب سے سنائی دی۔
میں جو سامنے آئی اس ''طوفان میل'' کی طرف متوجہ تھا، دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا۔ ''اتنا مکمل حسن......!''
وہ باری باری سب کو مصروف دیکھ کر میری طرف گلاس لیے چلی آئی۔ میں سامنے ہی بیٹھا تھا' اس نے گلاس میری طرف بڑھائے۔ میں مبہوت سا اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ گڑبڑا سی گئی۔ میں نے بے خیالی میں اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیے تو وہ اٹھلاتی، بل کھاتی جیسے آئی تھی ویسے ہی لوٹنے لگی۔
''رکو بیٹا! چھ گلاس اور لاؤ......اور نمک بھی نہیں ہے ادھر۔''
دسترخوان پر موجود گھر کے کسی معمر آدمی نے اس سے کہا۔
وہ کچھ کہتے کہتے جھپاک سے پردے کے پیچھے گم ہوگئی۔ ذرا دیر میں وہ مزید گلاس یہاں رکھ گئی۔
''اسے مردانے میں نہیں بھیجو۔ اچھا نہیں لگتا۔'' کسی سے کہتے پردے کے پیچھے سے تایا کی آواز آئی۔ وہ خود ہی جا کر نمک کا برتن اٹھا لائے تھے۔ ہم سب کھانے میں مصروف ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ کشمیری چائے سے بھی ہماری تواضع کی گئی جو وہ چھلکاتی چھلکاتی یہاں رکھ گئی۔
''اے ہے! سارے پستے تو نے یہاں لاتے لاتے اچھال دیے۔'' ضمیر نے اس کی توجہ ٹرے میں پیالیوں کے اطراف میں پڑے بادام اور پستوں کی طرف دلائی۔
''تو چمچہ بھی رکھا ہے نا ساتھ جس کی طرف گرا ہے وہ خود ہی اٹھا کر ڈال دے گا۔'' ترکی بہ ترکی جواب دیتے اس نے حاضر جوابی کی حد کر دی۔
''اے رانی! کیا باتیں بنا رہی ہے، ادھر آ۔'' باہر سے کسی خاتون کے بلانے کی آواز آئی۔
''ویسے یہ پہلے کی گری ہوئی ہے' میں نے نہیں گرائی۔ دادی اماں خود ٹکرائی تھیں مجھ سے۔'' وہ جاتے جاتے بول گئی۔ پردہ ایک بار پھر پھڑپھڑایا تھا۔ میں دل تھام کر رہ گیا۔ محمود پانی پی کر اب کڑاہی گوشت پر ہاتھ صاف کر رہا تھا۔
''ارے! آپ لے نہیں رہے، کھائیے نا!'' ضمیر کی آواز مجھے چونکا گئی۔
ہم چند دن یہاں ٹھہرے، شروع کے دو دن موسلا دھار بارش میں کہیں نکلنے کا موقع ہی نہیں مل سکا۔ یہ دن میری زندگی کے اہم ترین دن تھے۔ سارا جنگل ہرا بھرا اور نکھرا نکھرا تھا۔ ہمارے پاس چھتریاں بھی تھیں۔ ہم یہاں موسم کے تیور دیکھ کر قرب و جوار میں پیدل ہی گھوم پھر کر واپس آجاتے۔
وہ لاابالی شوخ و چنچل، چلبلی، نٹ کھٹ سی لڑکی رانیہ اکثر دکھائی دے جاتی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں شرارت بھری ہوئی تھی۔ ہمیں گھر کی اوپری منزل پر شاہنواز کے کمرے سمیت دو بڑے کمرے اور اس سے ملحق صحن و باتھ روم دیے گئے تھے۔ کھڑکی سے نیچے لان کا منظر صاف دکھائی دیتا۔ کبھی وہ بچوں کو جھولا جھلا رہی ہوتی۔ ایک صبح میں سامنے پہاڑوں کا نظارہ کرتے کمرے کی کھڑکی سے تازہ ہوا سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ بار بار تیز تیز جھولا جھولتے بال سکھاتی وہ دکھائی دی۔ اس کے لانبے بال ہواؤں کے دوش پر ہلکورے لیتے۔ وہ بے خبر پھولوں میں آ کھڑی ہوئی۔ میں وہیں کمرے کی کھڑکی سے اسے دیکھ رہا تھا جیسے کسی دیس کی شہزادی یہاں باغ میں چہل قدمی کرنے آنکلی ہو۔ کوئی اسے گھر میں سے آوازیں لگا رہا تھا۔ اس نے یہیں سے جواب دیا اور جھولے میں دوبارہ بیٹھنے ہی لگی تھی کہ اس کی نگاہ مجھ پر پڑی۔ اس نے فوراً ہی دوپٹا سر پر اوڑھ لیا پھر تیزی سے برآمدہ پار کرتے ہوئے اندر چلی گئی۔
نہ جانے کیوں مجھے اس مہ جبیں کا ہی انتظار رہتا۔ اس کی ایک جھلک مجھے آسودہ کر جاتی۔
ہم نے ادھر کے کافی علاقوں میں سیر و تفریح کی، مزید ملحق علاقوں میں بھی گئے۔ ہماری چھٹیاں پیسوں سمیت ختم ہونے لگی تھیں اور ہمیں اگلے تعلیمی سال کے لیے بھی تیاری کرنا تھی۔ شاہنواز کو شرف میزبانی بخشنے کے بعد ہم نے دوسری صبح ہی اپنے گھروں کو لوٹنا تھا۔ ہم خوب سیر کر کے آئے تھے اور تھک ہار کر بستروں میں جا دبکے تھے۔ سردی بڑے مزے کی ہو گئی تھی۔ واپسی میں' میں نے خشک میوے بھی لیے تھے۔ دیگر تحائف کے ساتھ خشک میوہ جات کی چند تھیلیاں شاہنواز کے گھر بھی ''تحفتاً'' دیں۔
شام ڈھلنے لگی تھی۔ جنگل پہاڑوں سمیت سونے میں نہایا معلوم ہو رہا تھا۔ شاہنواز صبح سے کہیں نکلا ہوا تھا۔ اس سے پوچھنا بھی ضروری تھا کہ آیا وہ ہمارے ساتھ ہی واپس

جائے گا یا یہیں رہے گا۔ میں نیچے ''مردانے'' میں جا کر پوچھنا چاہتا تھا اور برآمدے میں ہی آنا چاہتا تھا کہ مجھے اسی مہ جبیں کی آواز سنائی دی۔

''ارے! یہ شرٹ تو وہی ہے جو آپ کے دوست نے پہنی تھی۔'' شاہنواز درخت کے نیچے آڑ میں لگے بید کے جھولے میں آڑا ترچھا لیٹا اپنے اسمارٹ فون سے دھڑا دھڑ سیلفیاں بنا رہا تھا۔ یہ لان کا پچھواڑے کی طرف نکلتا حصہ تھا اور یہاں گھنے درختوں کے ساتھ اوپر جاتی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں بھی نکلتی تھیں۔ بندہ قدرت کی کاریگری کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا۔ میں وہیں ستون کی آڑ میں ہو گیا۔ وہ دوپٹا لپیٹے شاید نماز پڑھ کر ادھر ہی آنکلی تھی۔

''بڑی گہری نگاہ ہے آپ کی۔'' شاہنواز کی آواز آئی۔

''آئیں! ایک سیلفی میرے ساتھ بھی۔ آپ ہر بار ہی منع کر دیتی ہیں اب کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔'' وہ جھولے سے نکل کر اٹھ کھڑا ہوا تھا اور اس کے قریب جاتے تصویر کھینچنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ مجھے اس کی آواز پھر سنائی دی۔

''نہیں شاہنواز بھائی! مجھے پسند نہیں...... شکریہ۔'' کہہ کر وہیں کسی دروازے سے وہ مڑ گئی۔ شاید کسی نے اسے اندر سے آواز دی تھی۔ میں الٹے قدموں واپس لوٹ گیا۔ کسی معمر خاتون کے زور زور سے ڈانٹنے کی آواز آ رہی تھی۔

''چشمہ لگا کر دیکھیں وہ آپ کے سپوت' شاہنواز بھائی ہیں۔'' وہ جیسے ان خاتون کے کان میں چلا کر اپنی ''بات'' ان تک پہنچاتے ان کی غلط فہمی دور کرنے میں لگی تھی۔ شاہنواز بھی وہاں سے اٹھ کر دادی کے پاس چلا گیا۔ وہ چلتے چلتے ویڈیو کے ساتھ آواز بھی محفوظ کر رہا تھا جہاں اب اس کی دادی اس پر گرم ہو رہی تھیں اور وہ ہنستے ہنستے حظ اٹھا رہا تھا۔

☆☆☆

پُرتکلف ناشتے کے بعد ہم نے پھر رختِ سفر باندھا۔ صبح کی اجلی کرنوں میں ہر منظر نکھرا نکھرا سا تھا۔ اطراف کے پہاڑوں پر دھوپ چمک رہی تھی۔ ہم بس نکلنے ہی والے تھے۔ جیپ خارجی راستے پر سامان سمیت کھڑی تھی۔

''سب کو خدا حافظ......!'' دور سے ہی زور زور سے بولتے اچانک ہی نجانے کہاں سے وہ آدھمکی تھی جسے میری بے چین نگاہیں صبح سے تلاشتی پھر رہی تھیں۔ اس نے کالے رنگ کی کامدار شال اوڑھی ہوئی تھی اور چہرے پر نقاب کیا ہوا تھا۔ فضا میں ایک دم ہی رنگینی اور شوخی سی بکھر گئی۔

☆☆☆

ہم دوستوں کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی۔ سب ہی کسی نہ کسی مصروفیت میں لگے ہوئے تھے مگر رابطہ بہرحال اب بھی ہمارا قائم تھا۔ ہماری دوستی میں کبھی کمی نہیں ہوئی۔ اس چنچل سی شوخ حسینہ کی یادوں کے سہارے چند ماہ و سال یونہی گزر گئے۔ چھوٹی بہن کی بات طے ہو گئی تھی اور ابو کا ارادہ تھا کہ مجھے بھی ''ٹھکانے'' لگا دیا جائے۔ میں نے ان ہی دنوں دادا کی ٹیکسٹائل فیکٹری میں بڑا عہدہ سنبھالا تھا۔ زمان اور محمود جنہیں ابھی تک کوئی نوکری نہیں مل سکی تھی، انہیں میں نے یہاں قدم جمانے کے بعد... اچھے عہدے پر رکھوا دیا تھا جس کے لیے وہ میرے خاصے ممنون تھے۔ شاہنواز اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کے ساتھ مزید تعلیم جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس کا بیرونِ ملک جا کر پیسا کمانے کا ارادہ تھا جس کے لیے اس نے ویزے اور سفر کی لاگت میں آنے والی میری ''خدمات'' بھی ''ادھار'' حاصل کر لی تھیں جسے واپس لینے کا میں قائل نہیں تھا۔ آخر وہ بھی تو میرا جگری دوست تھا۔ وہ ہنوز بے روزگار تھا اور ہاتھ پہ ہاتھ دھرے گھر بیٹھا تھا۔ یاسر اپنے رشتے داروں کے توسط سے کراچی میں ہی کسی کاروبار کی کوششوں میں لگا تھا۔ ابو اور جنہوں نے مجھ سے لڑکی پسند کرنے کی بابت دریافت کیا۔ مجھے تو وہ ''شہزادی رانیہ'' ایک ہی نگاہ میں بھا گئی تھی جس کی آواز اور ہنسی کی کھنکناہٹ میری تنہائیوں کو آسودہ کر جاتی' جو چھم سے میرے خوابوں کے جزیرے کو آباد کر جاتی اور میں نہال ہو جاتا۔ اس کا یوں میرے خیالوں میں وارد ہونا، اس کی شفاف اور بے ریا ہنسی سب ہی کچھ بار بار یاد آتا۔

میں نے محمود کے توسط سے امی اور بہنوں کو کہلوا دیا کہ مجھے شاہنواز کی کزن رانیہ پسند ہے۔ یہ میرا حق تھا اور میرا رجحان بھی اسی کی طرف تھا۔ بہرحال بڑی چھان پھٹک اور امی ابو کی آمد جامد کے بعد یہ رشتہ قبول کر لیا گیا۔ ان کے گھر کے مردوں نے مجھے دیکھ رکھا تھا، سو یوں میری بات طے ہونے میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی۔ شاہنواز ان دنوں اپنے گھر کے کسی بزرگ کے ساتھ منگلا ڈیم کے نواح میں زمینوں کی دیکھ بھال کے لیے گیا ہوا تھا سو اسے کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔ اس کے علاوہ رانیہ کے گھر والے کلڈانہ سے دور کسی دوسرے علاقے کے رہائشی تھے۔ ان کے دادا کچھ روایتی اور پرانے خیالات کے مالک تھے۔ انہوں نے ابو اور مجھے تاکید کی کہ کسی دوست یا رشتے دار کو فی الحال اس نسبت طے کرنے کے بارے میں نہ بتایا جائے۔ لوگ نظر لگا دیتے ہیں اور بنی بنائی بات بگڑ جاتی ہے۔ شادی

میں سب کو بلا لیں گے۔ محمود کو میں نے منع کر دیا تھا کہ کم از کم شادی ہونے تک کسی کو اس نسبت طے ہونے کے بارے میں نہ بتائے۔ وہ میرا راز دار تھا اور مجھ پر جان چھڑکتا تھا۔ اس نے مجھے مبارک باد دی جو میں نے خندہ پیشانی سے قبول کرتے، اس کی ہوٹل میں چھوٹی سی دعوت بھی کی۔ بہن کی رخصتی کے دوسرے دن ہی میری برات تھی اور یوں رانیہ ان چند ماہ و سال کے وقفے کے بعد میری زوجیت میں آ گئی۔

سنتے ہیں کہ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ میں خوشی سے پھولے نہیں سما رہا تھا میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ میری محبت مجھے یوں آسانی سے مل جائے گی۔ میرے دوست اس شادی میں شریک تھے اور سب نے ہی مجھے بہت مبارک باد بھی دی۔ شاہنواز کو بھی میں نے اچانک ہی شادی کی خوشخبری سنائی تھی اور اسے تاکید کی تھی کہ وہ ضرور شامل ہو مگر میری شادی والے دن ہی اس کی دادی کا انتقال ہو گیا اور وہ بے چارہ آنے سے قاصر رہا۔ ہم نے اس کی کمی بہت محسوس کی۔ حکمتِ عملی سے کام لیتے ہوئے میں اسے ویڈیو اور شادی کی تصاویر بھی رات گئے ہی بھیج سکا کہ اس کا دل فوتگی کی وجہ سے غمزدہ ہوگا۔ اس کے گھر کے بیشتر لوگ بھی ہماری شادی میں آنے سے رہ گئے تھے۔ شاہنواز فوتگی والے گھر میں کافی انتظام سنبھالے ہوئے تھا شاید وہ اسی لیے مجھے شادی کی مبارک باد بھی نہیں دے سکا جس کا میں نے گلہ کرنا ضروری نہیں سمجھا۔

رانیہ بہت محبت کرنے والی بیوی ثابت ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں جلتے دیے مجھ سے مخفی نہ رہ سکے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ خوامخواہ ہی وہاں میرا انتظار کرتی۔

وہ ہنس مکھ اور خوش گفتار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سگھڑ اور گھریلو لڑکی بھی تھی۔ اس نے آتے ہی گھر کو خاصا سنبھال لیا تھا۔ میرے سب کام اس نے خود اپنے ذمے لے لیے تھے۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو پا کر بہت خوش تھے۔ ہنی مون ہم نے پُرلطف انداز میں منایا۔ رانیہ کی سنگت میں زندگی بہت حسین ہو گئی تھی۔ ہم پھر اپنے گھر اسلام آباد لوٹ آئے، کچھ وقت یونہی کاروبار کی مصروفیات میں سرک گیا۔

☆☆☆

شادی کے دوسرے سال ہم دوستوں نے پھر پروگرام بنایا تھا کہ اب سردی سے لطف اندوز ہونے کسی نئے مقام کی سیر کو چلا جائے اور اس سلسلے میں شاہنواز کی کوئی خدمات لیے بغیر اپنے بل بوتے پر ہی ملک کے سرد علاقوں کی سیر کو نکلا جائے۔ دسمبر کا اوائل تھا اور بالائی علاقوں میں برف باری شروع ہو چکی تھی۔ جیپ اب میری ملکیت تھی اور دادا نے مجھے تحفے میں دے دی تھی۔ انہیں اب ابو ہی اپنے ساتھ گاڑی میں لے جاتے جہاں وہ کاروبار میں ابو کو مفید مشوروں سے نوازتے۔ میں بھی گاہے بہ گاہے چکر لگا لیتا اور کاروبار کے "رموز" سمجھتا۔ دادا اور ابو زیادہ تر مجھے نصیحتیں کرتے جنہیں میں بعض معاملاتِ زندگی میں شامل کر لیتا۔ رانیہ امید سے تھی اور سب گھر والوں کی آنکھوں کا تارا بنی ہوئی تھی۔ گھر کے کافی امور میں ہی سرانجام دیتا جس سے مجھے خاصی پذیرائی بھی ملتی اور اب ایک اور مہمان کا بھی گھر میں اضافہ ہونے والا تھا۔ زندگی خوبصورت نہج پر چل نکلی تھی اور میں اپنے پروردگار کا شکر گزار تھا۔

ایک بار پھر ہم پانچوں دوست ملک کے سیاحتی علاقوں میں تفریح کرنے آئے تھے۔ موسم کا بھرپور انداز میں لطف اٹھاتے ہم پھر پہاڑوں کے ہمراہ بادلوں میں اڑتے ہنزہ کے نواحی علاقوں میں جا نکلے تھے۔ ایک ہوٹل کے نیچے گھنے درختوں سے گھری سڑک اور اطراف میں لگے خودرو پھول بوٹے ایک انوکھا ہی منظر پیش کرتے۔ یہ ایک غیر معروف مگر پُرفضا مقام تھا۔ یہ شاہراہ عام نہیں تھی، ہم صبح صبح ہواخوری اور چہل قدمی کے لیے قدرت کے نظاروں سے لطف اندوز ہوتے، گھومتے پھرتے دکھائی دیتے۔ کبھی کبھی کوئی ہارن بجاتے ہمیں سڑک کے بیچوں بیچ "خبردار" کرتے نکل جاتا اور ہم پھر اسی "ڈگر" پر چل پڑتے۔ ان علاقوں کا الگ ہی مزہ تھا۔ میرے رب کی قدرت ہر جا موجود تھی۔ ہمیں یہاں چند دن ہو گئے تھے۔ بارشوں کی وجہ سے موسم کے تیور خاصے خطرناک تھے۔ برف باری کی شدت میں تیزی کی وجہ سے سڑکیں بند اور کاروبارِ زندگی متاثر ہوتے دیکھ کر ہم نے آپس میں مشاورت کی اور واپسی کے لیے دوسرے دن کا ارادہ باندھتے آج بھی ہم سیر کے لیے نکلے تھے۔

جیپ کی وجہ سے ہمیں سفر میں آسانی ہو گئی تھی، یہ پہاڑی علاقوں میں سفر کے لیے خاصی موزوں سواری تھی۔ شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے اور اب ہم مزید بالائی علاقے میں کسی غیر معروف سیاحتی مرکز کی "زیارت" کے لیے "رختِ سفر" باندھ چکے تھے۔ میں بڑی احتیاط سے جیپ چلا رہا تھا۔ بلاشبہ یہ راستے جتنے حسین تھے، اتنے ہی پُرخطر بھی تھے۔ دھند بادلوں کی طرح وادیوں پر چھائی ہوئی تھی اور اس کا حسن دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

"یار! ذرا اپنا سیل تو دے، اس کے کیمرے کا

رزلٹ اچھا ہے۔'' شاہنواز نے میرا اسمارٹ فون مانگ لیا جو سامنے ہی ڈیش بورڈ پر دھرا تھا۔ وہ اطراف کے مناظر کی ویڈیو بنانے لگا۔ شاہنواز میرے برابر والی سیٹ پر جبکہ یاسر، محمود اور زمان پچھلی سیٹوں پر بیٹھے تھے۔ یہ لوگ خوش گپیوں میں لگے ہوئے تھے۔ بالائی علاقے پر جاتا یہ راستہ خاصا پُرخطر تھا۔ کہیں نہ کہیں کوئی خطرناک موڑ آجاتا۔ کبھی کوئی گاڑی ہارن بجاتے اچانک ہی سامنے سے نمودار ہوجاتی۔ کہرے نے بھی موسم کو خوابناک کرنے کے ساتھ ساتھ خطرناک بنا دیا تھا۔ شوق اور ڈر ساتھ ساتھ ہی محوِ سفر تھے۔ میں ان پُرپیچ راستوں پر بڑے دھیان سے جیپ چلا رہا تھا۔ ذرا سی چوک ہمارا قلع قمع کرسکتی تھی۔

''بریک لگا! سامنے سے گاڑی آرہی ہے۔''

شاہنواز نے اطراف کی عکس بندی شروع کردی۔

''بریک کی کیا ضرورت، سائڈ پر تھی جگہ..... ڈر کیوں رہے ہو؟'' میں نے اسٹیئرنگ گھما کر ہنستے ہوئے کہا۔

''اسپیڈ تیز کیوں کردی یار! خطرناک موڑ ہیں ادھر۔'' شاہنواز اب دوسری ویڈیو بنانے میں لگا تھا جہاں اس کے بائیں سمت میں گہری کھائی دکھائی دے رہی تھی۔

''اسپیڈ تو وہی ہے، کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے انجن میں شاید۔'' میری توجہ بھی اب اس طرف سنجیدگی سے ہوئی جسے میں نے ایکسلریٹر پر محمول کیا تھا۔

''نظر تو نہیں لگ گئی تیری رانی (جیپ) کو۔'' زمان نے بھی گفتگو میں حصہ ڈالا۔

یہ لوگ اپنی اپنی باتیں کررہے تھے اور ادھر ڈرائیونگ کرتے میری توجہ بٹنے لگی تھی۔ مجھے ڈرائیونگ پر خاصا عبور تھا مگر ان چٹانی ٹیلوں پر جیپ اب میرے قابو سے باہر ہوتی جارہی تھی۔ شاہنواز اور دیگر ساتھیوں نے بھی یہ بات محسوس کرلی تھی کہ تیز رفتار جیپ میں کوئی مسئلہ ہوگیا ہے۔ اس کے بریک میں کوئی نقص پیدا ہوگیا تھا شاید۔

''سامنے سے گاڑی آرہی ہے، اسپیڈ کم کر خرم!''

اب کی بار پچھلی سیٹ پر بیٹھا محمود چلّایا۔ شاہنواز کے ہاتھ میں میرا اسمارٹ فون ہنوز تھا اور اس پر عکس بندی (ویڈیو) بھی جاری تھی۔

''رفتار کم نہیں ہورہی، بریک بھی کام نہیں کررہے۔''

مجھے اچانک ہی سنگینی کا انکشاف ہوا۔ میں جیپ کو کھائی میں گرنے سے بچانے کے لیے حواس باختہ سا تیزی سے موڑ کاٹ چکا تھا' مخالف سمت سے آتی گاڑی ہارن بجاتے قریب سے گزر گئی۔ اندر بیٹھے آدمی نے غصے سے پانچ انگلیوں سے مجھے ''اشارہ'' دیا جسے سمجھنے کے لیے میرے پاس وقت نہیں تھا۔ اسٹیئرنگ میرے قابو سے باہر ہوتا جارہا تھا، اس پر مستزاد جیپ کی رفتار خاصی خطرناک حد تک بڑھی ہوئی تھی۔ رستہ انتہائی پُرخطر اور برف باری سے روڈ پر پھسلن کا بھی اندیشہ تھا۔ میں اپنی سی تگ و دو میں ہی مصروف تھا کہ دوسرے پہاڑ کا موڑ شروع ہوگیا۔ اب کی بار سامنے سے آتا، بجری سے لدا ٹرک ہماری شامت کا منتظر تھا۔

''جان بچاؤ اوئے اپنی اپنی!'' یاسر حلق پھاڑ کر چلّایا۔ وہ دوڑتی جیپ کے پچھلے حصے کے کنارے کو پکڑ کر کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ان لوگوں کی بے ہنگم سی چیخیں بلند ہوئیں اور میرے اوسان خطا ہوئے' جیپ میرے قابو سے باہر ہوگئی۔

''کود..... ! خر..... ر..... رم..... م..... م!''

محمود کی بھاری آواز ٹرک کی چنگھاڑتی آواز میں مدغم ہوگئی۔

مجھے بس اپنے رب ہی کا آسرا تھا۔

مجھے نہیں یاد پڑتا کہ کس وقت جیپ گہری کھائی میں جا لڑھکی تھی مگر ان سب کی چیخیں ضرور یاد تھیں۔ انہوں نے بروقت جیپ سے چھلانگ لگا کر اپنی جانیں بچالی تھیں اور میں لڑھکتی جیپ سے حاضر دماغی سے کام لیتے کیسے باہر چھلانگ لگا کر درختوں، جھاڑیوں، شاخوں میں الجھتا، نشیب میں برف پر پھسلتا نجانے کہاں گر کر بے ہوش ہوگیا.....

مجھے جب ہوش آیا تو میں کاٹیج میں اپنے بستر پر پڑا تھا۔ اسی ٹرک والے نے ہمیں مقامی لوگوں کی مدد سے یہاں پہنچایا تھا۔ یہ لوگ معمولی سے زخمی ہوئے تھے۔ بچ تو الحمدللہ میں بھی گیا تھا مگر مجھے طبی امداد کی اشد ضرورت تھی جو' ان پہاڑی علاقوں میں ناممکن سی بات تھی۔ بقول شاہنواز یہاں دور دور تک کوئی اسپتال نہیں تھا۔ میرا دایاں بازو اور ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ سر اور چہرے پر بھی چوٹیں آئی تھیں اور جسم کے مختلف حصوں پر گہری خراشیں پڑگئی تھیں۔ یہ اچھا ہوا کہ جیپ کھائی میں پھسل کر کسی درخت کی آڑ میں جارکی تھی وگرنہ تو اندھی کھائی میرا قلع قمع کرسکتی تھی۔ میرے رب نے میری جان بچالی تھی۔ میرے ٹوٹے ہوئے خون آلود اعضا کو صاف کرکے ان دوستوں نے اپنی مدد آپ کے تحت پٹیاں باندھ دی تھیں۔ پینٹ کی جگہ اب شلوار نے لے لی تھی۔ انتہائی تکلیف کی شدت میں' میں اپنے رب کو پکار رہا تھا۔ وہی مسبب الاسباب میرے درد کا مداوا کرنے پر قادر تھا۔ ان چاروں نے بروقت چھلانگ لگا کر اور مجھے ہوشیار کرکے میرے لیے بھی آسانی کردی تھی ورنہ تو کافی بڑا جانی

نقصان ہوسکتا تھا‘ میں ان کا ممنون تھا۔
’’یہاں کوئی ڈاکٹر نہیں، سب علاقے چھان مارے ہیں۔‘‘ شاہنواز کی آواز سماعتوں میں اتری۔
’’پھر بھی ہمیں کوشش جاری رکھنی چاہیے، کہیں ایسا نہ ہو کہ خون زیادہ بہہ جانے سے اسے کوئی نقصان پہنچ جائے۔‘‘ یہ یاسر کے جملے تھے۔
’’ہاں یار! خون اس کا پہلے بھی بہت ضائع ہو چکا ہے، کہیں کوئی اور مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے۔‘‘ محمود نے تشویش سے سر جھٹکا۔
’’یار! اس کا حال دیکھ دیکھ کر تو مجھے ہول آ رہا ہے، چل محمود! ہم دونوں ہی کسی ڈاکٹر کا بندوبست کر لیتے ہیں۔ شاہنواز تو کسی کام کا نہیں۔‘‘ زمان نے محمود کا ہاتھ پکڑا اور تیزی سے کاٹیج سے نکلنے لگا۔
’’کرلو تم بھی اپنی سی کوشش، مگر دیکھ بھال کر جانا۔ طوفانی جھکڑ چل رہے ہیں اب...... موسم بہت خطرناک ہو گیا ہے۔‘‘ شاہنواز نے پیچھے سے انہیں تاکید کی۔
’’اس سے بڑھ کر اور کیا طوفان ہوگا کہ ہمارا جگری یار یوں اس بیابان میں بے یار و مددگار زخمی پڑا ہے۔ اسے خون کی بھی ضرورت ہوگی...... میں بھی آ رہا ہوں، رکو!‘‘ یاسر نے رندھی ہوئی آواز میں وہیں سے انہیں آواز دی۔ وہ عجلت میں دکھائی دیتا تھا۔ اس نے اپنے بیگ سے کچھ رقم وغیرہ نکالی اور جیکٹ پہنتا ہوا میرے پاس آیا۔
’’گھبرانا مت یار! اللہ تمہاری نگہبانی کرے۔‘‘ اس نے محبت سے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور فی الفوران سے جا ملا۔ میں کراہتے ہوئے کسمسا کر رہ گیا۔
مجھے ہوش میں آتا دیکھ کر شاہنواز میرے پاس چلا آیا۔ ان کے باہر نکلتے ہی وہ داخلی دروازہ بند کر آیا تھا جہاں سے برفیلی ہواؤں کے کاٹ دار جھونکے کمرے کو یخ بستگی کی نذر کر گئے تھے۔
’’آ گئے ہوش میں تم؟‘‘ شاہنواز میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا تھا۔ آج اس کا لہجہ ہی بدلا ہوا تھا۔
’’ہاں یار! اللہ تعالیٰ نے جان بچالی، تمہاری مہربانی کہ بروقت مجھے آگاہ کر دیا ورنہ تو شاید میں دوسرے جہاں سدھار چکا ہوتا۔‘‘ میرے منہ سے ساتھ ہی کراہ برآمد ہوئی۔ تکلیف کی شدت سے بولنا بھی محال ہو رہا تھا۔
’’تو دوسرے جہاں میں اب بھی جایا جا سکتا ہے، دیر کس بات کی۔‘‘ اس کی خوبصورت آواز میں اب نفرتوں کے الاؤ دہک رہے تھے جو مجھے اچنبھے میں مبتلا کر گئے۔ وہ اب کھڑکیوں کے پردے برابر کرنے لگا تھا جس سے اطراف کے مناظر واضح دکھائی دے رہے تھے۔
’’ہوا کیا ہے دوست؟‘‘ میں نے دوستانہ فضا قائم رکھتے ہوئے اس سے اس رویّے کے بارے میں استفسار کیا جو میری سمجھ سے باہر ہو چلا تھا۔ بجائے میرے زخموں پر مرہم رکھنے کے وہ نجانے کن مردوں کو اکھیڑنے پر تلا تھا۔ یہ صورت حال میرے لیے انتہائی تکلیف دہ تھی۔
’’تو نے میری محبت چھین لی خرم!‘‘ وہ چلّایا۔
اور...... پھر اس نے جو انکشاف کیا وہ مجھے دہلانے کے لیے کافی تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ رانیہ سے بچپن سے ہی محبت کرتا تھا اور دیارِ غیر میں اچھی سی نوکری کے بعد اس کا ہاتھ مانگنا چاہتا تھا۔ بقول اس کے میں نے اس کی محبت پر ڈاکا ڈالا اور اسے بھنک بھی نہیں پڑنے دی۔ وہ مستقل ناکامیوں کا سامنا کر رہا تھا جس میں بڑا دخل اس کی فارغ البالی اور روزگار میں عدم دلچسپی تھی، اس کا تعلیمی معیار بھی بہتر نہیں تھا۔
’’کیا وہ بھی تمہیں چاہتی تھی شاہنواز؟‘‘ میں نے ایک اہم نکتہ اٹھایا۔
’’یہ جاننا تمہارا کام نہیں، جب بندے کے پاس پیسا ہو تو محبت ہو ہی جاتی ہے۔‘‘ نہ جانے اس کی کیا منطق تھی جو میری سمجھ سے باہر تھی۔ نیز جیپ کے بریک فیل ہونے میں بھی بقول اس کے اس کا ہی ہاتھ تھا۔ وہ مجھے اس حادثے میں ختم کر دینے کے بعد اسی بہانے رانیہ کو حاصل کر سکتا تھا۔ وہ مجھے کسی طور بھی زندہ سلامت نہیں دیکھنا چاہتا تھا اور مجھے اسی طرح بے یار و مددگار دیکھ کر اپنی کمینگی کا ثبوت دے رہا تھا۔ وہ مجھ سے اس درجہ حسد کرے گا یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔
’’تم نے مجھے بتایا تو ہوتا، میں اپنے دوست کے لیے ایثار کر دیتا۔‘‘ میں نے دوستی کا بھرم قائم رکھنا چاہا۔
’’چپ چپاتے شادی کر کے تو نے بھنک ہی کب پڑنے دی۔ تو تئی والے گھر میں رات گئے ویڈیو بھیج کر میری محبت کا جنازہ نکال دیا تو نے کمینے......!‘‘ غصے سے دانت کچکچاتے اس کے منہ سے کف نکلنے لگا تھا۔
’’اب تم کیا چاہتے ہو شاہنواز؟‘‘ میرا حلق خشک ہو رہا تھا، زخموں میں رہ رہ کر ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ میں جو اپنے والدین کی ہتھیلی کا چھالا بنا ہوا تھا، آج ٹوٹی ہڈیوں میں بسترِ مرگ پر پڑا کسمپرسی کے عالم میں اپنے پروردگار کو یاد کر رہا تھا۔
’’ابھی پتا چل جائے گا۔‘‘ اس نے میرے سرہانے

والی کھڑکی کھول دی جہاں کچھ دیر قبل اس نے پردے سرکائے تھے۔ یخ بستہ ہوائیں مجھے جما دینے پر تلی تھیں اور میرے جسم پر کوئی گرم کپڑا نہیں تھا۔ ایک مفلر میرے سر پر لپٹا تھا جو ہوا کے جھونکے سے سرک گیا۔ علاوہ ازیں اس نے ایک ہی جھٹکے سے میرا کمبل کھینچ لیا جو محمود اور یاسر نے مل کر مجھے اوڑھایا تھا۔ نقاہت اور کپکپی سے میری جان نکلی جارہی تھی۔ ہلنے جلنے کی سکت پہلے ہی نہیں رہی تھی اب کمبل بھی میری پہنچ سے دور تھا۔

''بس اب سدھارا اگلے جہاں کو...... دیکھتا ہوں کون آتا ہے تجھے بچانے۔'' اس نے میرے ٹوٹے ہوئے پیر کو حتی الامکان اوپر کی طرف اٹھایا اور تیزی سے نیچے چھوڑ دیا۔ جھٹکے سے پیر گرنے سے جیسے میری تو جان ہی نکل گئی تھی۔ اس نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ میرے ٹوٹے بازو کو پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا جس سے میرا رکا ہوا خون پھر سے جاری ہوگیا' میں درد کی شدت سے بلبلا اٹھا۔ میری ٹیسیں سوا ہوگئیں۔ وہ پرانے بدلے لینے پر تلا تھا اور اس اٹھا پٹخ کا مطلب میں سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھے کسی بھی طرح اذیت دے دے کر مارنا چاہتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ''سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے'' کے امکان کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی طرح میرے خون کے اخراج کو جاری رکھنا چاہتا تھا جس کی وجہ سے میری جان جانے کا اندیشہ تھا۔ آہ! یہ بے بسی اور اذیتوں کا عروج......

''رانیہ میری ہے اور میری ہی رہے گی۔'' اس پر خون سوار تھا۔ ''بس اس کے لیے تمہیں مرنا ہوگا۔ کسی بہانے تمہارے ان سب چیلوں کو یہاں سے غائب کردوں گا۔ تمہارا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوگا ادھر۔ انہیں تو میں نے مکھن سے بال کی طرح پرے کردیا ہے۔ جلد ہی تمہاری موت کی خبر بھی کسی طرح تمہارے گھر والوں کو مل جائے گی۔ تمہارے سیل فون پر ریکارڈ ویڈیو بھی حادثے کی گواہی دے گی۔ سوگ میں ڈوبی ''بھابی'' ہفتہ، مہینے بعد جب ''فارغ'' ہوجائے گی تو شرعاً اس کی عدت بھی ختم ہوجائے گی۔ مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا اور نہ ہی اس کا حصول میرے لیے کوئی مشکل کام ہے بلکہ بیوہ کے لیے کنوارے کا رشتہ تو ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ اپنے راج میں' رانیہ کو ملکہ بنا کر رکھوں گا اپنی اور بچے کو باپ کا پیار بھی دوں گا۔ آخر کو وہ میرے دوست کی اولاد ہے۔'' نہ جانے وہ کیا کیا بکے جارہا تھا۔ ادھر میری حالت دگرگوں تھی۔ میں سناٹے میں آگیا تھا۔

چیکنگ

خیر دین نے اپنے پڑوسی اللہ دتہ سے باتیں کرتے ہوئے کہا۔ ''سنا ہے ارشاد کے ہاتھ کی انگلیاں کٹ گئی ہیں۔ یہ حادثہ کیسے ہوا؟''

''اس نے یہ دیکھنے کے لیے ایک گھوڑے کے منہ میں ہاتھ ڈالا تھا کہ اس کے کتنے دانت ہیں۔'' اللہ دتہ نے بتایا۔

''پھر کیا ہوا؟'' خیر دین نے دریافت کیا۔

''گھوڑے نے یہ دیکھنے کے لیے اچانک منہ بند کرلیا کہ ارشاد کے ہاتھ میں کتنی انگلیاں ہیں۔'' اللہ دتہ نے جواب دیا۔

مرسلہ: اویس علی، سرگودھا

پہچان

ایک پاکستانی سیاح کو گائیڈ نے پیسا کا مشہورِ عالم مینار دکھاتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ ہے پیسا کا وہ ٹیڑھا مینار جسے لوگ دنیا بھر سے دیکھنے آتے ہیں۔''

پاکستانی سیاح نے اوپر سے نیچے تک مینار کو دیکھا اور منہ بنا کر بولا۔ ''اس میں تو کوئی ایسی خاص بات نہیں۔ اس ٹھیکیدار کی بنائی ہوئی کئی عمارتیں ہمارے ہاں کراچی میں بھی موجود ہیں۔''

مرسلہ: نازیہ جہانگیر، ملتان

دوستوں کو نکلے کافی دیر ہوگئی تھی۔ وہ اس دوران میں کمرے میں اِدھر اُدھر چکراتے پھرتے طنز کے تبر برساتے میرے زخموں پر نمک پاشی کرتے میرے جگر کو بھی پارہ پارہ کررہا تھا۔ میں دہری اذیت میں گرفتار ہوگیا تھا۔ حادثے سے بڑھ کر یہ سانحہ میرے لیے سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔ میرا سامنا ایسے حالات سے ہوگا یہ میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔

میں پہلے ہی اس انکشاف سے سنبھلا نہیں تھا اور اب اس کی بے وفائی اور دل میں چھپی کدورت نے رنگ جمانا شروع کردیا تھا۔ وہ مجھے اکیلا اور نہتا دیکھ کر نجانے میرے ساتھ مزید کیا سلوک کرنے والا تھا۔ میں تو اٹھ کر اس کا بڑھتا ہاتھ بھی نہیں روک سکتا تھا۔ وہ حیرت میں تھا کہ جیپ گہری کھائی میں گرنے کے باوجود میں زندہ کیوں بچ گیا؟ جس کے لیے میں نے ہر موڑ پر جان نچھاور کی، آج وہ میری ہی جان

کے درپے تھا۔ وہ میرا چلچلاتی دھوپ میں اسلام آباد کی سڑکوں پر اس کے ویزے، پاسپورٹ اور دیگر کاغذات کے حصول کے لیے بھاگ دوڑ اور بڑی بڑی رقوم جمع کرانا۔ سفارشوں کے لیے تگ ودو کرنا اور میری ساری محنت وہ سب کچھ ہی اس عناد وعداوت کی بھینٹ چڑھا کر اور ''زن'' کے ''فساد'' میں پس پشت ڈال کرا کارت کرچکا تھا۔ اس نے میری جیپ کو بھی اپنے قبضے میں لینے کی بات کی تھی جو صحیح سلامت پہاڑ کی گھاٹی میں جھاڑیوں میں اٹکی ہوئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اب اس ویرانے میں کون تمہاری کھٹارا جیپ کا دیدار کرنے آئے گا، جب تم ہی نہ رہو گے۔

میں سمجھ گیا تھا کہ جس طرح کے ''حالات'' سے اب میرا سامنا ہونے والا ہے وہ یقیناً کچھ نہ کچھ گل کھلائے گا اور وہ خود بری الذمہ ہو کر بچ جائے گا۔ میرے بوڑھے والدین، میرے چھوٹے بہن بھائی، میری رانیہ اور آنے والا وہ بچہ جو میری شناخت چاہتا تھا، انہیں میں یوں زندہ درگور نہیں کرسکتا تھا۔ بلاشبہ میں زخمی حالت میں پڑا تھا اور ٹس سے مس بھی نہیں ہوسکتا تھا مگر جب تک سانس تب تک آس کے تحت مجھے اپنی بقا کی جنگ لڑنا ہی تھی اور اس کے لیے کچھ حکمت عملی سے بھی کام لینا تھا۔

''مجھے بھی اپنی زندگی جینے کا حق ہے، تمہاری موت ہی میری اصل جیت ہے۔'' وہ پھر گویا ہوا۔ اس کے دل میں کینہ اور بغض کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

''کبھی بھی دشمن کو خود پر غالب نہیں آنے دینا بیٹا! معاف کردینا مگر بدلہ نہ لینا...... اور اس اجر کی صرف اللہ ہی سے امید رکھنا۔ کوئی تم سے کتنا ہی عناد کرے ہر جگہ صبر سے کام لینا اور اپنی زبان کو خیر کے کاموں میں ہی استعمال کرنا۔ سب کا بھلا، سب کی خیر...... سب کے بھلے میں اپنی خیر۔'' دادا جانی کے کہے گئے جملے میری سماعتوں میں اترے۔

''اچھا یار! مجھے معاف کردے جو کچھ بھی انجانے میں ہوا۔'' میں نے اس کے سامنے اپنا ایک ہاتھ ہی جوڑا۔ میری آنکھوں میں اس کی احسان فراموشی اور ہتک آمیز رویے سے آنسو بھر آئے تھے۔ اس نے میرا ہاتھ زور سے جھٹک دیا۔ عناد اس کی شعلہ برساتی آنکھوں سے جھلک رہا تھا۔ اس کا یہ روپ بہت بھیانک اور تکلیف دہ تھا۔

''اتنا بڑا ڈاکا میری محبت پر ڈال کر تُو معافی مانگ رہا ہے؟ تجھے معافی نہیں مل سکتی۔ مجھے تو بس تیری موت چاہیے جس کے لیے مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑے گی۔'' وہ اب بھی کمرے میں چکراتا پھر رہا تھا۔ اس کا متوحش چہرہ اس کے اندر چھپے بغض کی غمازی کررہا تھا۔ ادھر میری ٹیسیں جن کی کراہ میں مستقل دبائے ہوئے تھا، اب پھر سوا ہوگئی تھیں جو اس کی ''کارگزاری'' کے نتیجے میں دوبارہ جاری وساری ہوگئی تھیں۔

اس کے یوں کمرے میں اِدھر اُدھر ہوتے دیکھ کر میں نے اس سے آنکھ بچا کر بائیں ہاتھ سے اپنا والٹ اور سیل فون ڈھونڈنا چاہا مگر دونوں ہی ندارد تھے۔ میرے جسم پر ایک موٹے کپڑے کی شرٹ تھی جس کی اندرونی جانب جیب لگی تھی۔ اس میں ہمہ وقت ایک چھوٹا سا پین اور نوٹ پیڈ ساتھ رکھا رہتا تھا۔ میں نے ٹٹول کر دیکھا، وہ وہیں موجود تھے۔ مجھے کچھ ڈھارس ملی۔ میں اپنا پیغام اس میں لکھ سکتا تھا اور یوں بے گناہ، بے موت مارا جانا بھی۔ نیز شاہنواز کی ''کارگزاری'' بھی اس کا راز کھول سکتی تھی مگر......

رانیہ کا یوں سرعام تذکرہ مجھے گوارا نہیں تھا۔ وہ انتہائی باحیا اور باوفا لڑکی سراہے جانے کے قابل تھی۔ وہ کسی بھی طرح شاہنواز کے ہم پلہ نہیں تھی۔ میرے مرنے کے بعد بھی اور یہ سب میرے مرنے پر ہی منحصر تھا اور اسی صورت میں ممکن تھا مگر میں اس کسمپرسی کے عالم میں یوں اپنی جان گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ میرے مرنے پر وہ ''فاتح'' قرار پاتا اور یہ نام نہاد جیت میری مردانگی پر چوٹ تھی۔ میرا ذہن تیزی سے کام کررہا تھا۔ اس عفریت سے نمٹنا آسان کام نہیں تھا جبکہ میں کسی بھی طرح اپنا بچاؤ نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی شاطرانہ چال نے مجھے چوکنا کردیا تھا اور اب دانش مندی کا تقاضا تھا کہ اس کے اس ''عمل'' کے ''ردعمل'' میں جو بھی کرنا تھا، انتہائی ہوشیاری سے کرنا تھا۔

دروازے پر دستک کی آواز سے چونک کر بکتے جھکتے مجھے گھورتے' وہ ادھر چلا گیا۔ کچھ دیر وہ وہیں ٹھہرا باتیں کرتا رہا' شاید کوئی پڑوس سے آیا تھا۔ یہاں چند اور بھی اسی طرح کے کاٹیجز سیاحوں کے لیے بنائے گئے تھے۔ اسی دوران میں نے نوٹ پیڈ پر بائیں ہاتھ سے ہی ٹوٹی پھوٹی چند سطریں لکھ ڈالیں اور شاہنواز کے آنے سے قبل ہی اسے علیحدہ کرکے سو کے نوٹ میں لپیٹ دیا اور نوٹ کو تکیے کے نیچے چھپا دیا۔ میری ذرا ذرا سی جنبش بھی مجھے اذیت میں مبتلا کیے ہوئے تھی۔ اس عمل کو عجلت میں کرتے مجھے دانتوں تلے پسینا آگیا تھا مگر ''مجرم'' کو بے نقاب کرنا بھی اشد ضروری تھا۔ یہ نوٹ بھی اتفاقاً اس جیب میں چلا گیا تھا جو وہاں کسی مقام پر ہم نے بوڑھے شخص سے گرم بھٹے خرید کر کھائے تھے۔ اس نے مجھے سات سو واپس کیے تھے مگر سو روپے رکھ کر میں نے اپنی خوشی سے اسے چھ سو دے دیے اور سو کے نوٹ کو عجلت میں گریبان

میں بنی جیب میں ڈال دیا۔ وہ بوڑھا مجھے دعائیں دے رہا تھا اور مجھے انجانی خوشی ملی تھی۔ ہم بڑے بڑے ہوٹلوں اور ریسٹورنٹ میں اپنی مرضی سے ''بخشش'' دیتے ہیں، حالانکہ وہ لوگ اس کے مستحق بھی نہیں ہوتے۔ جبکہ ہمارے اطراف میں ہی ایسے بہت سے لوگ ہوتے ہیں کہ اگر ان کی مدد کی جائے تو بہت سے مستحق لوگوں کا بھلا ہوجائے۔

شاہنواز واپس کمرے میں لوٹ آیا تھا۔ اس کے ساتھ اسی کاٹیج کا مالک جو ریٹائرڈ فوجی بھی تھا، میرے ایکسیڈنٹ کا سن کر یہاں آیا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا آدمی تھا' اس کا گھر نزدیکی پہاڑی پر تھا۔ شاہنواز کے روکتے روکتے بھی وہ میری خیریت پوچھنے میرے بیڈ تک آ گیا۔ وہ شاہنواز کو ڈانٹ رہا تھا کہ اس برف باری کے جھکڑوں میں مجھے کھلا کیوں لٹایا ہوا ہے اور سامنے کا شیشہ بھی کھلا ہوا ہے جو آدھی دیوار پر محیط ہے۔

''ٹھنڈی ہوا سے خون جم جائے گا تو مزید بہے گا نہیں۔'' اس نے بھونڈی دلیل پیش کی۔

''واہ! کیا منطق ہے۔'' اس کے لہجے میں چھپا طنز مجھ سے مخفی نہ رہ سکا۔ ادھر شاہنواز کے چہرے پر دلنواز سی مسکراہٹ دکھائی دی۔ میں سرد آہ بھر کر رہ گیا۔ رہ رہ کر بے اختیار میرے منہ سے کراہ نکل جاتی۔

اس نے مجھے اچھے سے کمبل اوڑھایا اور بٹھا کر خیریت پوچھنے کے ساتھ پانی بھی پلایا۔ میرا دایاں بازو ڈھلکا ہوا تھا جو ہلانے سے بھی نہیں ہل رہا تھا' اس پر سوجن بھی سوا تھی۔ شاہنواز کا چہرہ اس کے اندر چھپی عداوت کی غمازی کررہا تھا جسے اس نووارد نے بھی محسوس کرلیا تھا۔ وہ کسی دور دراز علاقے سے سفر کرکے آرہا تھا۔ اس نے میرے پاس بیٹھنے کے بہانے شاہنواز کو چائے بنانے کا کہا۔ کاٹیج کے اس مالک جس کا نام محمد احمد تھا' اسے میں نے ہی آن لائن پیشگی کرایہ دیا تھا۔ وہ مجھے پہچان گیا تھا اور ہر ممکن تعاون کی پیشکش کی تھی۔ وہ میرے دوستوں کو اپنی دوسری گاڑی ڈرائیور سمیت دے آیا تھا تاکہ میرے علاج میں تاخیر نہ ہو۔ نیز اس نے شاہنواز کا سرد رویّہ بھی ملاحظہ کرلیا تھا جو ''رنگ میں بھنگ'' پڑنے سے ہوگیا تھا۔ اس نے اپنے ساتھ لائے کسی بیگ سے نکالی چھوٹی سی سرنج میں میرا خون بھرلیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ ڈاکٹروں کی ماتحتی میں بھی اس طرح کے کام انجام دیتا رہا ہے۔ شاہنواز بادل ناخواستہ ہی چائے بنانے چلا گیا۔ وہ آڑ میں بنے کچن سے بار بار ادھر جھانکتا دکھائی دیتا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ اس نے کبھی چائے بنائی ہو مگر آج وہ ہر کام کرنے کا ارادہ رکھتا تھا جو اس نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں کیے۔ اس کے تیور محمد احمد نے آتے ہی بھانپ لیے تھے۔ وہ خاصا زیرک اور معاملہ فہم شخص معلوم ہوتا تھا۔ وہ دبنگ فوجی مجھ سے حادثے کے بارے میں استفسار کررہا تھا۔ وہ شاہنواز کا رویّہ بھی دیکھ رہا تھا یا شاید داخلی دروازے پر ہی اس کے چہرے نے اس کی چغلی کھائی تھی جبھی وہ زبردستی یہاں چلا آیا تھا۔ مگر میں شاہنواز کی موجودگی میں اسے کیسے بتاتا کہ وہ ''آستین کا سانپ'' نکلا ہے مگر بات اب اظہر من الشمس ہوچلی تھی۔ شاہنواز منہ پھلائے چائے رکھ کر بالکونی میں جا کھڑا ہوا تھا۔ شاید اپنے دل کا حبس دور کرنے۔ نقاہت سے میری حالت غیر ہونے لگی تھی۔

''تمہارے دوست میری گاڑی لے جانے پر روتے ہوئے شکریہ ادا کررہے تھے اور یہ تمہارا کیسا دوست ہے، اسے ذرا تمہارا خیال نہیں۔'' اس نے کچن سے خود ہی جاکر مجھے چمچ سے چائے پلاتے ہوئے پوچھا۔ اس کی محبت اور دلجوئی کی باتوں سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

دروازے پر پھر دستک ہوئی تھی۔ یاسر اکیلا ہی آیا تھا اور اس نے پھولی ہوئی سانسوں میں بتایا کہ قریبی جگہ پر کسی ڈاکٹر سے بات ہوچکی ہے اور اب جلد ہی مجھے وہاں طبی امداد کے لیے یہ لوگ لے جانے والے ہیں۔ وہ ٹیلے پھلانگتا اوپر پہنچا تھا۔

''حادثے والی جگہ پر کچھ ہی دور سول اسپتال تھا۔ کس بے وقوف نے تمہیں مشورہ دیا کہ اسے زخمی حالت میں اسپتال کے بجائے یہاں کاٹیج میں لاؤ۔'' محمد احمد کی پاٹ دار آواز کمرے میں گونجی۔

''جی! شاہنواز نے ہی کہا تھا کہ یہیں کسی ڈاکٹر کا بندوبست ہوجائے گا۔'' یاسر نے جواب دیا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔

''ہڈیاں ٹوٹ گئی ہیں اس کی اور گہرے زخموں سے خون اب بھی رس رہا ہے، ابھی تک اس کا ایکسرے ہوکر پلاستر بھی باندھ دیا جاتا۔ سارا بستر خون میں لت پت ہوگیا ہے۔ خون زیادہ بہنے سے جان بھی جاسکتی ہے تمہارا دوست۔'' اس نے تنبیہ کی۔ ادھر میری کراہ دباتے دباتے بھی نکل گئی۔

''میں بتانے آیا تھا، بس کچھ ہی دیر میں ہم لوگ اسٹریچر کا بندوبست کرکے آرہے ہیں۔'' وہ تیزی سے جانے کے لیے واپس مڑا۔

''ذرا بھی دیر نہ کرو' اس کا مزید خون یہاں بھی ضائع ہوا ہے...... یہ لے کے چلو، میں بھی وہیں آرہا ہوں۔'' محمد احمد نے خون سے بھری سرنج یاسر کو تھمائی۔

''یاسر!'' کراہتے ہوئے میرے منہ سے بمشکل ہی نکل سکا۔ وہ جاتے جاتے لوٹ آیا۔

''بول میرے دوست......!'' وہ دوڑا دوڑا میرے پاس آیا۔ اس کا ہنستا مسکراتا چہرہ ستا ہوا تھا۔

''یہ رکھ لے......'' میں نے بڑی دقت سے تکیے کے نیچے سے نکالا وہ کاغذ والا لپٹا ہوا سو کا نوٹ اس کی طرف بڑھایا۔

''نہیں یار! میرے پاس ہیں پیسے، بس تو اچھا ہو جائے اور کچھ نہیں چاہیے میرے دوست۔'' دھواں دھواں چہرہ لیے میرا نوٹ والا ہاتھ پیچھے کر کے وہ میرے ماتھے پر پیار کرتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ میری آنکھوں میں بھی اس کی محبت سے آنسو بھر آئے تھے۔ دل پر ایک رقت سی طاری تھی۔

شاہنواز اس دوران قریب ہی کھڑا بے تعلق سا ادھر ادھر دیکھنے لگا تھا۔ میں نے یاسر کی مٹھی میں وہ نوٹ زبردستی دبا کر ہلکے سے ہاتھ کو جنبش دی۔

''چلو! اب دیر نہ کرو...... اللہ نگہبان ہو تمہارا۔ ہم اسٹریچر لے کر آرہے ہیں...... حوصلہ رکھو یار!'' محمد احمد نے میرا شانہ ہولے سے تھپتھپایا۔ میں اسی ایک ہاتھ سے بے بسی سے اپنے آنسو پونچھ رہا تھا۔ مجھے اپنے رب پر ہی بھروسا تھا، بے شک وہی کارساز تھا۔

محمد احمد تیزی سے یاسر کو لیے داخلی دروازے سے نکل گیا۔ جاتے جاتے وہ شاہنواز کو میرا خیال رکھنے کی تاکید کرنا نہیں بھولا تھا۔ دروازہ وہ خود ہی بند کر گیا تھا۔ اس سے پہلے اس نے برابر میں موجود کھڑکی کا پٹ سرکا کر پردہ ''درست'' کیا تھا۔ میں انہیں جاتے دیکھ رہا تھا اور اس کسمپرسی کے عالم میں ایک بار پھر اس کے ''رحم وکرم'' پر تھا مگر اپنے رب سے ناامید ہرگز نہیں تھا' بے شک میرا معبود برحق میری شہ رگ سے بھی زیادہ میرے نزدیک تھا۔

''تمہارے پیچھے رونے والے بہت ہیں، چلو اب مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔'' شاہنواز ''مطلع'' صاف دیکھ کر پھر طنز کے تیر برساتے سفاکی سے مسکرایا۔ وہ میرے سرہانے آپہنچا تھا۔

''گا میرے منوا، گاتا جارے...... رے...... رے...... جانا ہے ہم کا د...... و...... و...... ور......'' وہ بے سرے انداز میں گاتے، کمرے میں چکراتے اپنی فتح کا ''جشن'' منا رہا تھا۔ اس نے گاتے گاتے ایک بار پھر میرے ٹوٹے ہوئے بازو کو زور کا جھٹکا دیا تھا۔

''یا اللہ!'' درد کی شدتوں میں تڑپتے، بے اختیار میری کراہ کے ساتھ نکلا۔ تکلیف کی شدت سے میرے آنسو نکل آئے تھے۔

''کلمہ پڑھ لے خرم! اب تیرا آخری وقت آگیا ہے۔''

لحظہ بھر میں وہ میرے بیڈ پر چڑھ آیا۔ اس نے زوردار لاتیں اب کی بار میرے گھٹنے اور زخمی حصوں میں ماری تھیں جس کے جھٹکے کی شدت سے وہ خود بستر سے گرتے گرتے بچا۔ میری حالت کا اندازہ ''قبر کا حال مردہ جانے'' کے مترادف تھا۔ مجھے بس اب کسی کی مدد کی ضرورت تھی جو مجھے اس عفریت سے نجات دلا دیتا۔ اس نے میرے خون میں لت پت وجود کو اپنی ٹھوکروں کی زد میں رکھ لیا تھا۔ میری کراہیں بلند ہونے لگیں۔ خون کا اخراج اس کی ان حرکتوں سے پھر جاری ہو گیا تھا۔ میں تکلیف کی انتہائی شدتوں سے گزر رہا تھا۔ اس کے بھاری پیر کی ضرب سے میری گردن میں بھی زوردار جھٹکا لگا تھا جس سے میری زبان دانتوں تلے آگئی۔ منہ میں خون کا ذائقہ روح تک میں کڑواہٹ گھول گیا تھا۔

میری ''آہ!'' اب کی بار بلند ہو گئی تھی۔ شدید تکلیف اور نقاہت سے آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ میرے سینے پر پیر رکھتے چھلانگ لگا کر بستر سے کود گیا جس کی پاداش میں مجھ پر مزید اذیتوں کے دَر وا ہو گئے۔

اس نے اپنی جیب سے میرا والٹ نکالا اور بڑے نوٹوں کی گڈی سے جو خرچ کر کے اب کچھ مختصر ہو چلی تھی، پانچ ہزار کا نوٹ کھینچ نکالا۔ گڈی اس نے اپنی جیب میں منتقل کر لی بھلا رقم بھی کوئی چھوڑنے والی چیز تھی اور اس نے تو سب کچھ ہی یکے بعد دیگرے اپنے اوپر حلال کر لیا تھا، میرے خون سمیت...... رانیہ کو بھی...... نہیں...... نہیں...... میں اس کا یہ منصوبہ کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔

''کیا سوچنے لگے؟ والٹ یہیں رکھ دیا ہے استاد! فون بھی یہیں پڑا ہے تیرا...... جا رہا ہوں۔ اگلے جہان میں ہی ملاقات ہو گی اب۔'' وہ مجھ پر اچٹتی سی نگاہ ڈالتے دروازے پر جاتے جاتے واپس لوٹ آیا۔ وہ اب میرے بستر کی بائیں جانب آکھڑا ہوا تھا۔ چاروں طرف نگاہ دوڑاتے وہ سفاکی سے گویا ہوا۔

''مجھے خوامخواہ ہی تیری فکر لگی رہے گی۔ کیوں نہ تیرا قصہ ہی پاک کرتا جاؤں۔ لمحے بھر میں ہی تجھے اٹھا کر پٹخنے کی دیر ہے۔ سامنے ہوٹل میں کھانا کھانے جا رہا ہوں زور کی بھوک لگی ہے، جب تک یہ لوگ آئیں گے تو یہی سمجھیں گے کہ تو نے اٹھنے کی کوشش میں خود کو گرا لیا ہے۔ تیری اکڑی لاش ہی اٹھائیں گے اب، اس...... ٹے...... رے...... ے...... چ...... رر...... (اسٹریچر) پر۔'' وہ پھر آگے کو بڑھ آیا۔

بغض وحسد کی آگ میں جلتا وہ سفاکی کی حدوں کو چھو رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں رب کو پکارا۔ میں اس کا مدعا سمجھ گیا تھا۔ وہ بائیں طرف سے پھر میرے بستر پر آچڑھا تھا اور اب اس عناد کے فساد میں مبتلا مجھے دھکا دے کر زمین پر گرانا ہی چاہتا تھا کہ ایک بھاری آواز نے کمرے کا سکوت توڑ دیا۔

''نیچے اتر جاؤ! کھوتے۔'' یہ کوئی اور نہیں محمد احمد فوجی تھا جو اس وقت رحمت کا فرشتہ بن کر یہاں آپہنچا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اس کا سیل فون تھا جو اس نے کھڑکی میں سے اٹھایا تھا۔ یاسر، محمود اور زمان، دو مزید افراد کے ساتھ اسٹریچر لیے تیزی سے اندر داخل ہوئے تھے۔ شاہنواز جس جوش اور ولولے سے میرے بستر پر چڑھا تھا، اترتے ہوئے جیسے اس کا دم خم ہی ختم ہوگیا تھا۔ اس کے چہرے کی تمتماہٹ پر اب زردی کھنڈی ہوئی تھی جیسے چور کو اچانک ہی پکڑ لیا جائے۔

''میں تو اس کا پیر ٹھیک کر رہا تھا۔'' دبے لفظوں میں اپنی ''صفائی'' پیش کرتے وہ خاموشی سے ایک طرف کھڑا ہوگیا تھا۔

''یہ ویڈیو سب بتادے گی تو کیا کیا ٹھیک کر رہا تھا۔'' محمد احمد نے آگے بڑھ کر ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ وہ جیسے گھوم ہی گیا۔ اس نے جلدی سے ساتھ آئے دونوں لڑکوں کو، مجھے لے جانے کو کہا اور خود کسی کا نمبر ملا کر بات کرنے لگا۔

''معاف کردیں سر! بس غلطی ہوگئی تھی۔'' شاہنواز کے منمنانے کی آواز میری ڈوبتی سماعتوں میں اتری۔ یقیناً وہ اپنا ''تعارف'' کراچکا تھا جو اب شاہنواز کو خطرے کی گھنٹی سنائی دے گئی تھی۔ میرا ذہن تاریکی میں ڈوبتا جارہا تھا۔ مجھے کب ہوش آیا یہ تو مجھے نہیں معلوم مگر محمد احمد نے میری خاطر داری میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ خون کا بندوبست بھی فوراً ہی کردیا گیا تھا۔ میرے دوست بھی سب کچھ چھوڑ کر میری تیمارداری میں لگے تھے۔ محمد احمد نے جلد ہی میرے علاج کا بندوبست کردیا تھا۔ میرا دوست نما دشمن بے نقاب ہو چکا تھا۔ آستین کے اسی سانپ نے مجھے ڈسا تھا جس پر میں نے اعتبار کی حد کردی تھی۔ اس ریٹائرڈ فوجی کا کہنا تھا کہ وہ میری خیریت پوچھنے کاٹیج میں سڑک کی جانب سے آرہا تھا جب اس نے وہاں شاہنواز کو اس برفانی طوفان میں بڑی کھڑکی کھولتے دیکھا۔ وہ خود گرم کپڑوں میں لپٹا ہوا تھا اور جب وہ مجھے دیکھنے آیا تو میری حالت خلافِ توقع زیادہ نازک اور شاہنواز کا سرد رویہ اسے اچنبھے میں مبتلا کر گیا۔ کچھ سوچ کر ہی اس نے جاتے وقت مزید تفتیش کے لیے اپنا سیل فون کھڑکی میں کیمرا آن کر کے چھپا دیا تھا تاکہ یہاں ہونے والی کارروائی کا پتا چل سکے۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی بروقت ہتا چل جائے۔ اس کے لیے اسے زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی۔ یاسر کو دیے گئے ''نوٹ'' میں میرے مخفی پیغام سے بھی اس نے نتیجہ اخذ کیا تھا اور حتی الامکان اسٹریچر کو لانے اور میری زندگی بچانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ وہ میرا محسن تھا اور مجھ سے دوستوں کی طرح پیش آرہا تھا۔ اس نے شاہنواز کو اسی ویڈیو اور اس سے منسلک بات چیت کو ہی محرک بنا کر اس کو قرار واقعی سزا دلوانے کو کہا۔ مگر میں نے اسے معاف کردیا کہ اللہ تعالیٰ معافی کو پسند فرماتا ہے اور پھر وہ اپنے والدین کا سہارا تھا۔

''مومن ایک ہی سوراخ سے بار بار نہیں ڈسا جاتا۔'' سو اسے دوبارہ آزما کر میں کسی اور آزمائش میں مبتلا نہیں ہونا چاہتا تھا۔ سب کا بھلا، سب کی خیر...... سب کے بھلے میں اپنی خیر کرتے میں نے محمد احمد کو ثبوت کے باوجود شاہنواز کے لیے عدالتی کارروائی کرنے سے منع کردیا تھا۔ میرا ظرف یہی تھا، اس نے جو کچھ میرے ساتھ کیا وہ میں معاف کر چکا تھا مگر اسے میں نے اپنے دوستوں کی فہرست سے نکال باہر کیا تھا۔ وہ میرا کھویا ہوا اعتماد اب بحال نہیں کرسکتا تھا اور ایک مخلص دوست سے ہمیشہ کے لیے محروم ہوگیا تھا۔ حقیقت کھلنے پر میری دیکھا دیکھی یاسر، زمان اور محمود نے بھی اس سے تعلق توڑ لیا تھا مگر ہم اب بھی پانچ ہی دوست تھے۔ محمد احمد جو لگ بھگ میرے والد ہی کا ہم عمر تھا، وہ بھی اب میرا جگری دوست بن گیا تھا۔

میرا علاج شہر کے بہترین اسپتال میں کرایا گیا۔ میرے زخم مندمل ہوگئے تھے مگر ہڈیوں کو جڑنے کے لیے ایک عرصہ درکار تھا۔ اگلے ماہ ہی میں ایک پیارے سے بیٹے کا باپ بن گیا۔ میری صحت کا جشن اور بچے کا عقیقہ دھوم دھام سے منایا گیا اور غریبوں کی دل کھول کر مدد کی گئی۔ رانیہ میرے منع کرنے کے باوجود اپنا آپ بھلا کر ہمہ وقت میری خدمت میں لگی رہتی اور میں پل پل اپنے پروردگار کا شکر ادا کرتا کہ اس نے مجھ پر بہت احسانات کیے اور اپنی نعمتوں کی بارش چھما چھم برسائی۔ بے شک اس کی نعمتوں کا شمار نہیں، ہم بندے اس کا شایانِ شان شکر ادا نہیں کرسکتے مگر ہر حال میں ہی شکر کریں کہ شکر سے نعمت بڑھتی ہے۔

''آخر وجہ کیا ہوئی تھی دوست! جو تمہارا جگری دوست شاہنواز تمہاری جان کا دشمن بن گیا۔'' لوگ، دوستوں اور محمد احمد سمیت مجھ سے استفسار کرتے مگر میں بھی یہ راز زبان پر نہیں لانا چاہتا تھا۔

⌘⌘⌘

زندگی پیار کا گیت ہے مگر... صرف وہاں جہاں معاشرہ ناہمواریوں کا شکار نہ ہو... جہاں انصاف اور توازن عنقا نہ ہوں اور بدقسمتی سے وہ جس معاشرے میں رہتا تھا وہاں ناانصافیوں کی تندو تیز آندھیوں نے اسے محض سراپا انتقام بنا دیا تھا... ایک طرف فنون حرب و ضرب کے ماہر ہاتھوں نے اسے ناقابلِ شکست بنایا تو دوسری طرف ظلم و جبر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے والے اس پُرعزم نوجوان کو حرف غلط کے مانند مٹائے جانے کے منصوبے بنائے جارہے تھے... اس کی زندگ جوالمیوں کا شکار... اندھیروں کے قریب اور روشنی سے دور تھی لیکن... بے خبری میں جنم لینے والے عشق کی لو اسے تیرگی میں بھی راستہ دکھا رہی تھی... رفتہ رفتہ وہ ایک ایسے طوفان کا روپ دھار گیا جس میں شعلوں کی لپک اور بجلی کی چمک تھی... اس کی بے قراریوں کو قرار دینے کے لیے اس کا جنون، اس کا پیار اس کے ساتھ تھا... پھر وہ کیسے زمانے کی چیرہ دستیوں کے آگے ہار مان لیتا... اگرچہ تارِ عنکبوت نے طاقت اور گھمنڈ کے نشے میں چُور لوگوں پر پردہ ڈالا ہوا تھا لیکن وہ ہر وار کا توڑ کرتا حق و باطل کی ازلی جنگ یوں لڑتا رہا کہ وارداتِ قلب بھی اس کے فرض کی راہ میں حائل نہ ہو سکی...

اپنے حریفوں پر قہر بن کر نازل ہونے والے ایک سراپا انتقام نوجوان کی حیرانگیز داستان

گذشتہ اقساط کا خلاصہ
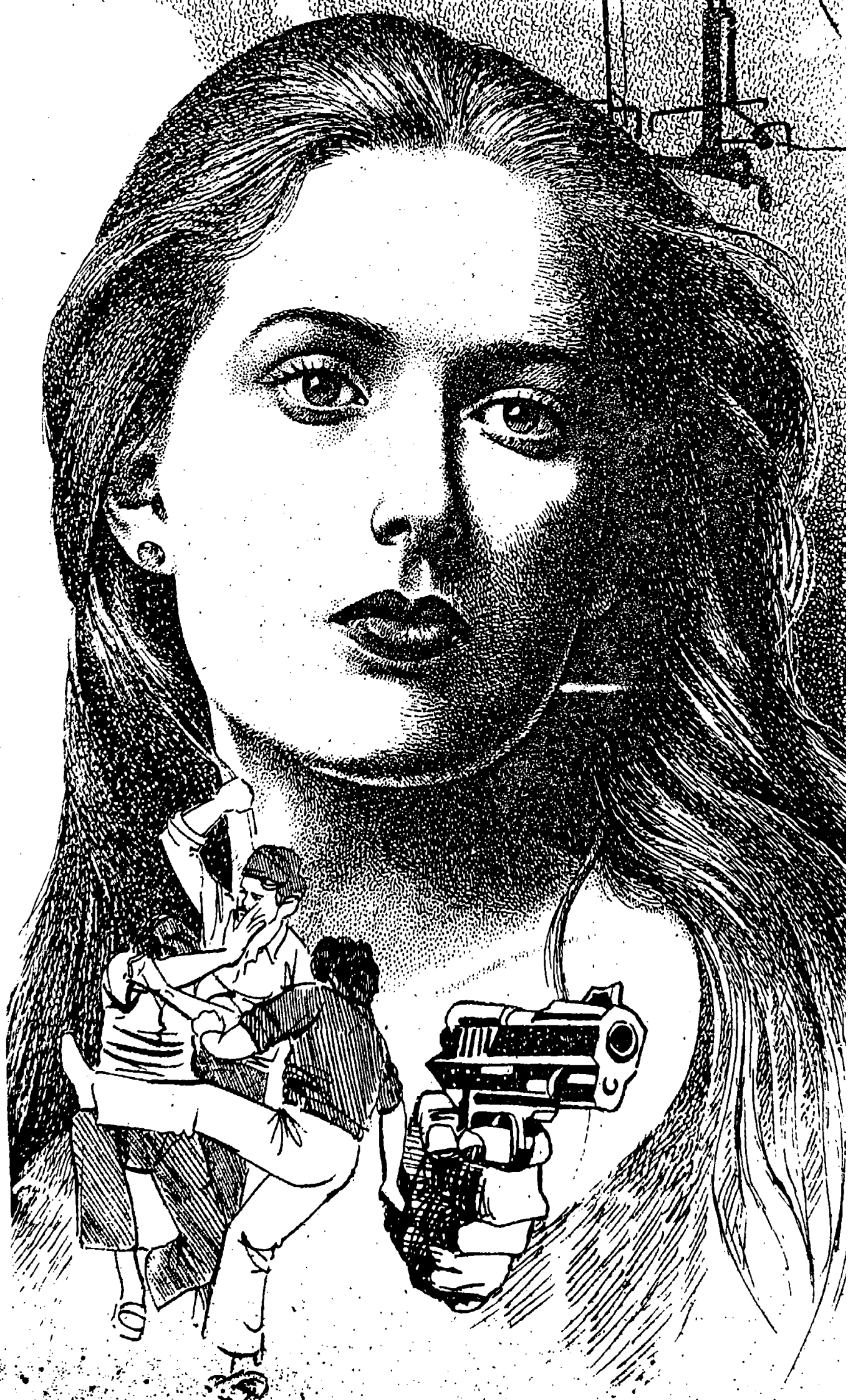
معاذ ایک ذہین لیکن متلون مزاج لڑکا یونیورسٹی کا طالب علم ہے لیکن ساتھ ساتھ اس نے دیگر کئی مشاغل بھی پال رکھے ہیں۔ آج کل اس پر مارشل آرٹ سیکھنے کا شوق سوار ہے اور اس نے باقاعدہ ایک ادارہ جوائن کیا ہوا ہے۔ معاذ کے والد سرکاری افسر ہیں اور اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ ایک شام معاذ انسٹی ٹیوٹ سے واپس آرہا تھا تو وہ چند لڑکوں کو سڑک پر کھڑی ایک لڑکی کو اغوا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھ لیتا ہے۔ وہ لڑکی یونیورسٹی ہی میں پڑھتی ہے اور لڑکوں کا تعلق بھی وہیں سے ہے۔ اپنی نڈر فطرت کے باعث وہ اس معاملے میں کود پڑتا ہے اور بشریٰ نامی اس لڑکی کو بچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ بشریٰ ماس کمیونی کیشن کی طالبہ ہے اور ایک اخبار کے لیے کالم وغیرہ لکھتی ہے۔ اس ویران جگہ بھی وہ ایک زیرِ تعمیر رہائشی منصوبے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے ہی آئی تھی۔ معاذ بشریٰ کو بہ حفاظت اس کے گھر پہنچا دیتا ہے اور خود اس واقعے کو فراموش کر دیتا ہے لیکن جن رئیس زادوں سے اس نے ان کا شکار چھینا تھا، وہ اس واقعے کو فراموش نہیں کرتے اور موقعے کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ موقع انہیں یونیورسٹی ٹرپ کی صورت میں مل جاتا ہے اور ایک دن جنگل کی سیر کے دوران وہ فوٹوگرافی کے شوق میں سب سے الگ تھلگ ہو جانے والے معاذ کو بے خبری میں گھیر کر بری طرح زدوکوب کرتے ہیں اور بلندی سے اسے دھکا دے دیتے ہیں۔ معاذ کے واپس نہ آنے پر انتظامیہ کے افراد، پولیس اور ریسکیو ذرائع کی مدد سے اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ کامیاب نہیں ہوتے۔ ادھر معاذ کو ہوش آتا ہے تو وہ خود کو ایک جوگی کی جھونپڑی میں پاتا ہے۔ اپنی حالت سے اسے اپنے شدید زخمی ہونے کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ جوگی اپنی خاص جڑی بوٹیوں کی مدد سے اس کا علاج کرتا ہے۔ معاذ کا موبائل جنگل میں ہی کہیں گر جاتا ہے اور جوگی کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا جس سے باہر کی دنیا سے رابطہ کیا جا سکے۔ وہاں رہتے ہوئے جوگی کی شخصیت اس کے لیے دلچسپی کا باعث بن جاتی ہے۔ جوگی بھی اسے پسند کرنے لگتا ہے اور ایک دن اسے بتاتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ہے جنہیں قدرت کچھ خاص صلاحیتوں سے نواز کر دنیا میں بھیجتی ہے۔ معاذ سے خاصی بات چیت کے بعد وہ اسے پُراسرار علم سکھانے کی ہامی بھر لیتا ہے اور معاذ واقعی اس سے یہ علم سیکھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ادھر جائے وقوعہ سے ملنے والے معاذ کے کیمرے سے جب تصویریں نکلوائی جاتی ہیں تو بہت سے قدرتی مناظر کی تصویروں میں سے ایک ایسی تصویر بشریٰ کی نظر میں آجاتی ہے جس میں بہت دور ایک درخت کے پیچھے سے ایک چہرہ جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ وہ کافی کوشش کے بعد اس چہرے کو پہچان لیتی ہے۔ یہ وہی لڑکا ہوتا ہے جو اس کو اغوا کرنے کی کوشش کرنے والوں میں شامل تھا۔ اصل میں وہ لڑکا کامران اسی شخص کا بیٹا ہے جس کے پروجیکٹ کے غیر قانونی ہونے کے سلسلے میں بشریٰ تحقیق کر رہی تھی۔ بشریٰ کے اپنے والد جرنلسٹ ہوتے ہیں اور حق گوئی ان کے خون میں شامل تھی۔ اس انکشاف کے بعد وہ پولیس سے رابطہ کرتی ہے۔ اس کی پاداش میں بشریٰ کو کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کی ماں کو بے آبرو کر کے مار دیا جاتا ہے جبکہ باپ صدمے سے جان دے دیتا ہے۔ اس سب میں باذل نامی غنڈے کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بشریٰ انتقام لینے کی ٹھان لیتی ہے۔ ان تکلیف دہ دنوں میں ہی معاذ واپسی کا ارادہ کرتا ہے تاہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ ڈاکو اسے پہچان کر اس کا سودا عرفان اللہ اور یزدانی سے کرنا چاہتے ہیں۔ معاذ کو وقاص نامی ایک لڑکا وہاں سے نکال لے جاتا ہے۔ ادھر باذل اچانک بشریٰ کو چھاپ لیتا ہے اور اسے بے آبرو کر دیتا ہے۔ معاذ کو واپس لانے کے لیے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے اس کے بھائی کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اسے واپس آنے کا پیغام دیا جاتا ہے۔ معاذ دشمنوں کے پاس خود حاضر ہو جاتا ہے۔ وہ لوگ کسی دوسری پارٹی سے اس کا سودا کر کے اسے ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قید میں معاذ سے معلومات لی جاتی ہیں، نہ بتانے پر اس کے بھائی کا ایک گردہ نکال لیا جاتا ہے۔ مجبوراً معاذ کو سب بتانا پڑتا ہے۔ ادھر بشریٰ بھی انتقام کی آگ میں جلتی ہوئی سونیا خان سے مل جاتی ہے اور اس کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ معاذ کے دوست عالم شاہ کے بہنوئی کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ کئی فنون میں مہارت حاصل کر لیتا ہے۔ اسے ہپناٹائز کر کے اس کے دماغ پر کنٹرول کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاہم وہ فیضو سے حاصل انوکھے علم کی بدولت ان کا معمول نہیں بنتا۔ عالم شاہ اور اس کا نوکر سرمد، باذل کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عالم کی بہن سجل شاہ کے نومولود بیٹے کو اغوا کر لیا جاتا ہے اور اغوا کا الزام لطیف سومرو پر آتا ہے۔ عالم شاہ، باذل کی قید میں موجود ایک زخمی شخص کی مدد سے وہاں سے فرار ہو جاتا ہے۔ ادھر بشریٰ دبئی پہنچ جاتی ہے۔ وہاں وقاص اسے باربی کے روپ میں پہچان لیتا ہے اور ان دونوں کے درمیان اعتماد کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ وہ سلطان کو مارنا چاہتی ہے تاہم وقاص اسے ایسا کرنے سے روکتا ہے۔ ادھر عالم شاہ، باذل کی قید سے نکل کر اس کا پیچھا کرتا ہے تاہم وہاں اچانک فائرنگ اور دھماکے ہونے لگتے ہیں۔ وہ وہاں معاذ کو دیکھتا ہے۔ صداقت شاہ، لطیف سومرو کو گھیرنے کے لیے اس کی خفیہ بیوی اور بچے کا کھوج لگاتے ہیں اور بچے کو اغوا کر لیتے ہیں۔ لطیف سومرو مجبور ہو جاتا ہے۔ معاذ کو اس کے گھر والوں سے ملنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔ عالم شاہ کو اس کے والد انڈیا روانگی کا عندیہ دیتے ہیں۔ ادھر معاذ بھی ایک مشن پر سونیا کے ساتھ انڈیا روانہ ہوتا ہے تاہم کچھ لوگ سکھ یاتریوں سے بھری بس کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ معاذ اور سونیا جانے کے تمام افراد کو ٹھکانے لگا دیتے ہیں تاہم باہر موجود دیگر اغوا کاروں سے مقابلہ ہوتا ہے اور معاذ زخمی ہو جاتا ہے۔ صداقت شاہ کے انڈیا میں موجود رشتے دار کے ہاں شادی ہوتی ہے۔ عالم شاہ، سجل اور سرمد انڈیا روانہ ہو جاتے ہیں۔ ائرپورٹ سے گھر روانگی پر راستے میں کچھ لٹیرے انہیں لوٹ لیتے ہیں۔ عالم شاہ ایکشن میں آنا چاہتا ہے تاہم اجالا نامی عالم شاہ کی کزن اس کا راستہ روک لیتی ہے۔ گھر پہنچنے پر پولیس کی ریڈ ہوتی ہے اور وہ عالم شاہ اور سرمد کو لے جاتے ہیں۔ ادھر بشریٰ اور وقاص باذل

کو اسپتال میں مارنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ بچ جاتا ہے۔ معاذ اور سونیا پناہ کی تلاش میں ہوتے ہیں اور بالآخر اپنے سہولت کاروں سے مل جاتے ہیں۔ عالم شاہ اور سرمد کو تشدد کا نشانہ بنا کر ویرانے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ واپس اپنے میزبانوں کے ہاں پہنچ جاتے ہیں۔ شادی کے دوران انہیں پتا لگتا ہے کہ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں اجالا اور اس کا عاشق شامل ہوتے ہیں۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سن رہا ہوتا ہے کہ اسے چھاپ لیا جاتا ہے۔ تاہم وہاں مار اماری ہوتی ہے اور اجالا کا عاشق مارا جاتا ہے۔ پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے کزن انہیں اپنے دوسرے خفیہ بنگلے پر پہنچا دیتے ہیں جہاں کچھ لوگ ان پر حملہ کر دیتے ہیں۔ وہ وہاں سے بحفاظت نکل جاتے ہیں۔ ادھر معاذ کو سونیا اپنے ساتھ نئے مشن پر لے کر جاتی ہے جس میں ایک ریلوے لائن کو دھماکے سے اڑانا ہوتا ہے۔ معاذ ایسا نہیں چاہتا اس لیے وہ ٹرین کی آمد سے قبل بارودی دھماکا کر دیتا ہے۔ وہ زخمی ہو جاتا ہے اور اسے ہندو سادھو اپنی کٹیا میں لے جاتا ہے جہاں اس کی اچھی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ سونیا کے آدمی معاذ کو تلاش کرتے ہیں مگر ناکام ہو جاتے ہیں۔ ادھر عالم شاہ اور سرمد خفیہ ذریعے سے بارڈر پار کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر وہ دھر لیے جاتے ہیں اور ''را'' کی قید میں پہنچ جاتے ہیں۔ انہیں تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ادھر بشریٰ باذل کو مارنے کی کوشش میں خود نشانہ بن جاتی ہے۔ معاذ سادھو کی مدد سے ایک انڈین ہیروئن کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ وہیں اسے عالم اور سرمد کی گرفتاری کا پتا چلتا ہے۔ ادھر سجل کو اس کا شوہر ذہنی اذیت دیتا ہے۔ معاذ ڈاکٹر فردوس سے ملتا ہے اور اسے سجل کی مدد کرنے کا کہتا ہے۔ عالم اور سرمد قید سے فرار کا سوچتے ہیں اور دھر لیے جاتے ہیں جس کی پاداش میں انہیں مزید تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ علینہ اور وقاص وغیرہ کو لالہ عیسیٰ ملک سے باہر نکال دیتا ہے اور ہر ممکن احتیاط کی ہدایت کرتا ہے لیکن علینہ پاکستان میں ثوبیہ سے رابطہ کرتی ہے جو ان کے لیے مصیبت بن جاتا ہے۔ ثوبیہ پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ وقاص، علینہ اور اس کے گھر والوں کو مار دیا جاتا ہے۔ معاذ سبھاش نامی شخص کے خلاف کارروائی کرتا ہے تاہم وہ مارا جاتا ہے اور معاذ بھی زخمی ہو جاتا ہے اور اپنا نشان وہاں چھوڑ دیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس معاذ کو دیوا نامی شخص سے مدد لینے کا کہتی ہے۔ معاذ اس کے ساتھ مل کر موہن نامی ''را'' کے ایجنٹ کو اغوا کر لیتا ہے۔ معاذ اپنے کزن کو پاکستان کال کرتا ہے تو اسے پتا چلتا ہے کہ اس کے گھر والوں کو مار دیا گیا ہے۔ وہ اپنے دشمنوں سے انتقام لینے کی ٹھان لیتا ہے۔ ادھر ڈاکٹر فردوس کو اس کے سسرال والے سجل کو بھگانے کی پاداش میں تشدد کا نشانہ بناتے ہیں۔ معاذ، عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے اور انہیں ''را'' کی قید سے نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے لیکن عالم اور سرمد کو دیوا کے آدمی کسی دوسری جگہ پہنچا دیتے ہیں۔ سونیا معاذ کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتی ہے اور اسے اپنے تعاون اور مدد کی یقین دہانی کرواتی ہے۔ ادھر باذل ایک جگہ لالہ عیسیٰ کی موجودگی پر کارروائی کرتا ہے تاہم لالہ خود کو گولی مار کر ختم کر لیتا ہے۔ ڈاکٹر فردوس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیوا گینگ ڈاکٹر فردوس کی میت اٹھنے پر وہاں فائرنگ کر دیتے ہیں۔ شکیل اور جلیل مارے جاتے ہیں اور فیصل اور پانڈے زخمی ہو جاتے ہیں۔ پولیس دیوا کو گھیر لیتی ہے۔ معاذ دیوا اور اس کے آدمیوں کو نکالنے کے عوض عالم کا پتا معلوم کر لیتا ہے۔ سونیا اور معاذ حیدرآباد نواب بدرالدین کی حویلی پہنچ جاتے ہیں۔ تاہم کالے خان اور رادھا دیوی کو میڈم ایکس کے شکنجے سے چھڑانے کے لیے انہیں واپس آنا پڑتا ہے، کالے خان کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ معاذ نواب صاحب کی حویلی میں عالم اور سرمد کی رہائی کے لیے کارروائی کرتا ہے مگر نواب صاحب کا بیٹا ان کے سامنے آجاتا ہے۔ وہ سجل کو بھی اغوا کر کے حویلی لے آتا ہے۔ تاہم وہ لوگ عبید کو قبضے میں کر کے وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ وہ لوگ نئے ٹھکانے پر پہنچتے ہیں تو وہاں معاذ سے ملنے جارو نامی شخص آتا ہے۔ اسے معاذ نے ''را'' کی قید سے نکالا ہوتا ہے۔ ادھر سجل کا بیٹا اعظم اپنی ناک میں پتھر پھنسا لیتا ہے۔ جارو اور معاذ، سجل سمیت اسپتال جاتے ہیں اور پہچان لیے جانے پر پولیس ان کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ پولیس سے مقابلے کے بعد وہ ایک بستی میں پناہ کے لیے گھس جاتے ہیں اور دو لوگوں کو یرغمال بنا کر ان کی جھونپڑی میں قیام کرتے ہیں۔ ادھر سونیا عالم وغیرہ سمیت سب کو ٹھکانا بدلنے کا کہہ کر معاذ کی تلاش میں نکلتی ہے اور اسے بستی میں پہنچنے پر معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ معاذ اور جارو وغیرہ الوپ نامی شخص کے ساتھ اس کے مالک کے بنگلے میں قیام کرتے ہیں۔ سونیا بھی معلومات حاصل کرتی ہوئی مذکورہ بنگلے تک پہنچ جاتی ہے۔ عالم شاہ اور سرمد بھی سونیا کا پیچھا کرتے ہوئے وہیں پہنچ جاتے ہیں۔ ادھر وقاص، علینہ و دیگر لوگ زندہ ہوتے ہیں۔ وقاص حلیہ بدل کر کلو کا باڈی گارڈ بنتا ہے۔ وہ معاذ کو تلاش کرنے کے لیے انڈیا روانہ ہوتا ہے۔ وہاں اس کی گل خان سے ملاقات ہوتی ہے اور معاذ کا سراغ ملتا ہے۔ سونیا، معاذ اور دیگر ساتھیوں سے مل جاتی ہے تاہم جس بنگلے میں ہوتے ہیں وہ دشمن کا ہوتا ہے۔ وقاص بھی معاذ کو ڈھونڈتا ہوا وہیں پہنچ جاتا ہے۔ دشمن سب کو بے ہوش کر کے کہیں لے جا رہے ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی کو حادثہ پیش آجاتا ہے۔ ان سب کو چینی بھکشو طبی امداد دیتے ہیں اور ان سے پوچھ گچھ کی جاتی ہے۔ سجل کی حالت تشویشناک ہوتی ہے اور اسے وہاں موجود ایک وید دیکھتا ہے اور اس کے دماغ میں رسولی کی موجودگی کا بتاتا ہے۔ ادھر لالہ واپس اپنے لوگوں میں پہنچ کر ایکشن میں آجاتا ہے اور حامد کو اغوا کروا لیتا ہے۔ میڈم ایکس کو شک ہو جاتا ہے کہ لالہ زندہ ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

جب میڈم ایکس کو یہ احساس ہوا کہ شاید اس سے کہیں غلطی ہو رہی ہے تو اس نے فوری طور پر نئے احکامات جاری کردیے۔

'اصغر کی نگرانی کرواؤ۔ مجھے اس کے ایک ایک پل کی

رپورٹ چاہیے۔ کہاں جاتا ہے، کس سے ملتا ہے؟ سب معلوم ہونا چاہیے۔'' یہ حکم جاری کرتے ہوئے وہ ایک مختلف نہج پر سوچ رہی تھی۔ اسے خیال آرہا تھا کہ جیسے ڈکی کی موت کی مکمل یقین دہانی کے باوجود وہ منظر پر آگیا تھا، ممکن تھا کہ لالہ بھی اسی طرح زندہ ہو اور اس کی خودکشی ایک سوچا سمجھا ڈراما ہو۔

''اوکے میڈم! اور کوئی حکم؟'' سامنے کھڑے غلام نے تابعداری سے پوچھا۔

''فی الحال یہ کام اچھی طرح کرو۔ مجھے امید ہے کہ کچھ نہ کچھ ضرور نکل کر آئے گا۔'' میڈم نے جواب دیا اور اشارے سے جانے کی اجازت دی۔

وہ چلا گیا تو اس نے اپنا جام ختم کیا اور کچھ دیر کسی اَن دیکھے نقطے پر نظریں جمائے بیٹھی رہی پھر اپنا موبائل نکالا۔ اس جدید موبائل کی بڑی خوبی یہ تھی کہ اس پر آنے جانے والی کالز کا ٹریس ہونا ممکن نہیں تھا۔ اس نے موبائل کی اسکرین پر انگلی پھیرتے ہوئے اس میں محفوظ کانٹیکٹس نکالے اور ڈیوڈ کا نام منتخب کر کے کال ملائی۔ دوسری ہی گھنٹی پر اس کی کال وصول کر لی گئی۔

''کیا اطلاعات ہیں ڈیوڈ؟'' اس کے لہجے میں ہلکی سی پژمردگی تھی۔

''گاڑی کو حادثہ پیش آنے کی تصدیق ہوگئی ہے۔ حادثہ شدید تھا۔ میرا ایک بھی آدمی زندہ نہیں بچا لیکن معاذ اور سونیا کے ساتھ ساتھ اس کے سارے ساتھی حیرت انگیز طور پر غائب ہیں۔''

''کیا مطلب ہے، غائب ہیں؟ اگر تمہارے آدمی مُردہ حالت میں پائے گئے ہیں تو باقی لوگوں کو بھی مردہ یا کم از کم زخمی حالت میں ان کے ساتھ ہی پایا جانا چاہیے تھا۔''

''ہونا تو یہ چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا ہے اور جائے وقوعہ کے معائنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں کچھ لوگ موجود تھے۔ یقیناً وہی لوگ انہیں اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔''

''کون لوگ؟ کون ہو سکتے ہیں وہ لوگ؟'' میڈم ایکس نے اس کی دی اطلاع پر تیز لہجے میں پوچھا۔ ویسے اس اطلاع نے غیر محسوس طور پر اس کے اندر تبدیلی پیدا کی تھی اور وہ ریلیکس دکھائی دینے لگی تھی۔

''یقین سے نہیں کہا جاسکتا لیکن جو اطلاعات ملی ہیں، ان کی روشنی میں امکان ہے کہ انہیں چینی اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔''

''چینی......؟'' اس نے اچنبھے سے استفسار کیا۔ ''چینی کہاں سے آگئے وہاں؟''

''چینی بھکشو وقتاً فوقتاً ان علاقوں میں حرکت کرتے رہتے ہیں۔ بنیادی طور پر ان کی آمد و رفت اپنے مذہبی پیشوا سے ملاقات کے لیے ہوتی ہے لیکن اڑتی اڑتی معلومات کے مطابق ان بھکشوؤں کے بھیس میں کچھ جاسوس بھی موجود ہوتے ہیں۔'' ڈیوڈ نے اسے بتایا۔

''اگر ایسی اطلاعات ہیں تو تمہارے پاس ان بھکشوؤں کے بارے میں مکمل معلومات ہونی چاہیے تھیں۔''

''ان کے بارے میں معلومات رکھنا میرے دائرۂ کار میں نہیں آتا۔ مجھے جو ذمے داریاں سونپی گئی ہیں، میں انہیں اب تک احسن طریقے سے پورا کرتا رہا ہوں۔ موجودہ مسائل تم اور تمہاری ٹیم کے پیدا کردہ ہیں۔'' اس کے اعتراض پر ڈیوڈ کا لہجہ سرد ہوگیا۔

''چینی خطرناک لوگ ہیں ڈیوڈ! اور دنیا کے موجودہ حالات میں ہم ان کو نظرانداز نہیں کر سکتے۔ وہ کبھی بھی، کسی بھی وقت ہماری راہ پر لگ سکتے ہیں۔'' اس نے اپنا لہجہ قدرے نرم کیا۔

''اسی وجہ سے ہم ان سے دور دور رہتے ہیں لیکن تمہاری وجہ سے لگتا ہے اب ہمارا ان سے پالا پڑنے والا ہے۔ تمہیں پتا ہے سونیا میرا گولڈن اسٹار اپنے ساتھ لے گئی ہے اور اگر چینیوں نے اس کے پاس سے وہ برآمد کر لیا تو پھر وہ اس سے ایک ایک بات معلوم کیے بغیر اس کی جان نہیں چھوڑیں گے۔'' ڈیوڈ نے یہ اطلاع دے کر اس کا سارا اطمینان رخصت کر دیا۔

''سونیا گولڈن اسٹار اپنے ساتھ لے گئی ہے، اس بات کا کیا مطلب ہے؟ وہ کوئی اپنی مرضی سے تو نہیں گئی ہے۔ تمہارے لوگوں نے یہ کام کیا ہے اور ان کا فرض تھا کہ ہر فرد کی مکمل تلاشی لیتے۔'' وہ سونیا کے بارے میں نئی اطلاع سن کر بے چین ہوئی تھی تو یہ کیسے ممکن تھا کہ ڈیوڈ سے باز پرس نہ کرتی۔

''کوتاہی کرنے والوں کو ان کے کیے کی سزا مل چکی ہے لیکن یہ سوچو کہ اگر سونیا چینیوں کے سامنے زبان کھول دیتی ہے تو تنظیم کو کتنا نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

''سونیا کوئی عام لڑکی نہیں ہے جو چینی اس سے آسانی سے کچھ معلوم کر لیں۔''

''پر لڑکی ہی تو ہے نا اور عورتوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا کہ

کب جذبات میں عقل پر پتھر پڑ جائیں۔ تمہاری بیٹی تو پہلے ہی بہت عجیب کام کرتی پھر رہی ہے۔'' ڈیوڈ کا ایک طعنہ اس کے فخر کو سبوتاژ کرنے کے لیے کافی تھا۔

''وہ ہماری ایک نہایت تربیت یافتہ کارکن ہے ڈیوڈ! اس کی موجودہ نادانیاں اس کے ماضی کے کارناموں کو دھندلا نہیں سکتیں۔ تم اگر اسے اپنے تربیتی کیمپ تک پہنچانے میں کامیاب ہوجاتے تو وہ دوبارہ ہمارے لیے کارآمد بن سکتی تھی۔ میں نے تو پروفیسر وکٹر تک کو راضی کرلیا تھا کہ وہ وہاں پہنچ کر سونیا کی ذہن سازی کریں۔'' اس بار میڈم کا انداز ذرا مدافعتی تھا۔

''حادثے اور اتفاقات کبھی بھی، کسی بھی پلاننگ کو تباہ کرسکتے ہیں۔ تم جانتی ہو ان علاقوں میں سفر کرنا کتنا مشکل ہے۔ میں نے انہیں کیمپ تک بھجوانے کے لیے ٹھیک ٹھاک انویسٹمنٹ کی تھی اور امید تھی کہ تربیت کے بعد ایک بہترین ٹیم میدان میں بھیجنے کے لیے تیار ہوگی لیکن اس کے بالکل برعکس ہوا اور صورتِ حال یہ ہے کہ ہم خود مصیبت میں پڑ سکتے ہیں۔'' ڈیوڈ بھی درحقیقت الجھا ہوا اور پریشان تھا۔

''کیمپ پر موجود افراد میں سے کچھ کو بھکشوؤں کی راہ پر لگاؤ۔ ہمارے آدمی اگر بھکشوؤں تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے تو صورتِ حال بدل کر ہمارے حق میں بھی ہوسکتی ہے۔'' اس نے مشورہ دیا۔

''کوئی فائدہ نہیں۔ ہم لیٹ ہوچکے ہیں۔ ہمارے پاس حادثے کی اطلاع دیر سے پہنچی تھی اور بھکشوؤں کو علاقے سے نکلنے کا موقع مل گیا تھا۔ ویسے بھی وہ ان راستوں کے کیڑے ہیں اور کسی تعاقب کار کو دھوکا دے کر بہت آسانی سے بھاگ سکتے ہیں۔'' ڈیوڈ کے پاس اس کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں تھی اور اسے لگ رہا تھا کہ سب کچھ ہاتھوں سے نکلا جارہا ہے۔

''سونیا کو کھونا ہمارا بہت بڑا نقصان ہوگا ڈیوڈ!'' اسے خود بھی سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کس طرح اپنی کیفیت کا اظہار کرے۔

''ان بھکشوؤں میں اگر جاسوس بھی شامل تھے تو ہم امید رکھ سکتے ہیں کہ ان لوگوں کو سیدھا بیجنگ پہنچایا جائے گا۔ اگرچہ وہاں ہمارا زیادہ مضبوط سیٹ اپ نہیں لیکن میں کوشش کرتا ہوں کہ جو لوگ موجود ہیں، وہ اہم معلومات جمع کرکے دے سکیں۔'' ڈیوڈ نے اس کی بات اَن سنی کرتے ہوئے اپنی کہی۔

''بیجنگ میں وہ لوگ ٹریس ہوجاتے ہیں تو ہمارا اگلا قدم کیا ہوگا؟'' اس نے وہ سوال کیا جس کا جواب خود بھی جانتی تھی۔

''تم جانتی ہو، وہاں سے ان لوگوں کو نکالنا ہمارے لیے قریباً ناممکن ہوگا اس لیے تنظیم کے مفادات کے لیے سخت فیصلے کرنا پڑیں گے۔'' ڈیوڈ کا جواب صاف تھا۔ حقیقتاً ان لوگوں کی موت کے سوا اب ان کے پاس کوئی حل نہیں رہ گیا تھا۔

''مجھے افسوس ہے رابیل! لیکن تنظیم اور اس کا تحفظ ہر شے سے اوپر ہے۔''

''ہاں۔ تنظیم اور اس کا تحفظ ہر شے سے اوپر ہے۔'' اس نے ڈیوڈ کے الفاظ نہیں، اپنا عہد دہرایا۔

''میرے پاس تمہارے لیے ایک اچھی خبر ہے۔''

''وہ کیا؟''

''سجل شاہ کا بیٹا میرے پاس ہے اور میرے خیال میں تم مقامی معاملات کو سنبھالنے کے لیے اس بچے کا استعمال کرسکتی ہو۔ لطیف سومرو کے ناکارہ ہونے کے بعد اس علاقے میں کام کرنے کے لیے تمہیں کسی اور بڑے وڈیرے کی مدد درکار ہوگی اور اس بچے کے نانا اور دادا دونوں ہی بارسوخ وڈیرے ہیں۔''

''یہ تو تم نے بہت اچھی خبر سنائی۔'' ڈیوڈ کی دی اطلاع سن کر اس نے خوشی کا اظہار کیا لیکن اگر وہ اپنے دل میں جھانک کر دیکھتی تو وہاں خوشی کا نام ونشان نہیں تھا۔ وہاں اس کی ممتا پڑی کُرلا رہی تھی۔ رابیل سے میڈم ایکس تک کا سفر اس نے ہر بار اپنی ممتا کو کچل کر ہی طے کیا تھا۔

☆☆☆

''ہمارا پیچھا ہورہا ہے استاد!'' اصغر کو ٹھکانے سے روانہ ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ڈرائیور نے اسے اطلاع دی۔

''کون ہیں بہن کے......'' اصغر فوراً سیدھا ہوکر بیٹھا اور خود بھی بیک ویو مرر میں تعاقب کاروں کو دیکھنے کی کوشش کی۔

''نیلی ہنڈا ہے۔ میں نے اپنے اڈے کے پاس بھی اسے دیکھا تھا اور اب پھر یہ اپنے پیچھے دکھائی دے رہی ہے۔'' ڈرائیور نے نشاندہی کی۔

''ذرا اِدھر اُدھر کے پھیرے مار کر کنفرم کر پھر دیکھ لیتے ہیں سالوں کو۔'' اصغر کو گالی کے بغیر کم ہی بات کرنے کی عادت تھی اور اس وقت تو وہ یوں بھی زیادہ محتاط تھا کہ لالہ سے ملاقات کے لیے جارہا تھا۔ اڈے پر گنتی کے چند نہایت

ہی وفادار لوگوں کے سوا کسی کو لالہ کے زندہ سلامت ہونے اور واپس لوٹ آنے کی خبر نہیں تھی۔ احتیاط کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے لالہ نے بھی وہاں قیام کو مناسب نہیں سمجھا تھا اور اپنی ایک خفیہ کوٹھی میں منتقل ہو گیا تھا۔ حامد کو بھی اسی کوٹھی میں رکھا گیا تھا تا کہ اگر کوئی اس کی تلاش میں اڈے کا رخ کرے تو ناکامی کا سامنا کرنا پڑے۔

''صحیح بولتا ہے۔ سالے ماں کے یار مستقل پیچھے لگے ہوئے ہیں۔'' تعاقب کرنے والے اگرچہ احتیاط کر رہے تھے لیکن مسلسل فوکس کرنے سے تصدیق ہوئی تھی کہ نیلی کار کبھی فاصلہ بڑھا کر تو کبھی گھٹا کر مسلسل تعاقب میں ہے۔ اصغر نے تعاقب کرنے والوں کو بلا تکلف مزید دو چار گالیوں سے نوازتے ہوئے اپنا موبائل نکال کر نمبر ملایا اور کال ریسیو ہوتے ہی بولا۔

''بندے تیار کر ٹونی اور پہنچ میرے پاس۔ کچھ آوارہ کتے پیچھے لگ گئے ہیں۔ ان کو ان کی آوارگی کا مزہ چکھانا ہے۔'' احکامات دیتے ہوئے اس نے ٹونی کو اپنے محلِ وقوع کے متعلق بھی بتا دیا۔

''یہاں سے نکل کر ہم سیدھا یزدانی ہاؤس اسکیم جانے والی سڑک پکڑیں گے۔ ہماری اسپیڈ کم ہوگی۔ تو شارٹ کٹ مار کر تیزی سے آیا تو ہمارے ساتھ ساتھ ہی وہاں پہنچ جائے گا۔''

''تو میری فکر نہ کر۔ ان حرام کے پلّوں کو حملہ کرنا ہوتا تو اب تک کر چکے ہوتے۔ میرے پیچھے لگنے سے ان کا کوئی اور مطلب ہے۔'' لالہ نے پہلے ہی اس خدشے کا اظہار کر دیا تھا کہ حامد کے والی وارث اس کا کھوج لگانے کے لیے ان کی طرف ضرور رخ کریں گے اس لیے اسے فوراً سمجھ آ گئی تھی کہ تعاقب کار کون لوگ ہو سکتے ہیں۔

''آگے پیٹرول پمپ پر روک کر ٹینکی فل کروا لے۔ ٹونی کو پہنچنے کے لیے تھوڑا ٹیم مل جائے گا۔'' کال منقطع کرنے کے بعد اس نے ڈرائیور کو حکم دیا تو اس نے تفہیمی انداز میں سر کو جنبش دی اور پانچ منٹ بعد ہی گاڑی ایک پیٹرول پمپ پر لے جا کر کھڑی کر دی۔ اگرچہ وہ کسی حملے کی امید نہیں کر رہے تھے پھر بھی احتیاطاً اپنے ہتھیار تیار کر لیے تھے کہ ایسا کچھ ہونے کی صورت میں اپنا دفاع کیا جا سکے۔ توقع کے مطابق کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی اور نیلی کار انہیں چھوڑتی ہوئی آگے نکل گئی۔ اس موقع پر اس نے نوٹ کیا کہ کار میں ڈرائیور سمیت تین افراد موجود ہیں۔

گاڑی میں پیٹرول بھروانے کے بعد وہ لوگ اطمینان سے آگے بڑھے۔ نیلی کار حسب توقع آگے جا کر منتظر کھڑی تھی۔ کار والوں نے اگرچہ کوشش کی تھی کہ سڑک پر موجود گڑھے میں پھنس کر ناکارہ ہو جانے والی بس کی آڑ میں خود کو پوشیدہ رکھ سکیں لیکن تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے تھے۔

''پیچھے آ رہے ہیں سڑک چھاپ عاشق۔'' کچھ مزید آگے جا کر نیلی کار ایک بار پھر ان کے پیچھے دکھائی دی تو اصغر نے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے قہقہہ لگا کر اعلان کیا۔

ابتدا میں راستہ پُر رونق تھا لیکن جیسے جیسے وہ یزدانی ہاؤسنگ اسکیم سے قریب ہوتے گئے، ٹریفک کم ہونا شروع ہو گیا۔ یہ کم ہوتا ٹریفک ہاؤسنگ اسکیم والی سڑک پر گاڑی ڈالتے ہی بالکل برائے نام رہ گیا۔ اسی وقت اصغر نے اپنے موبائل پر ٹونی کی کال موصول کی۔

''ہم ہاؤسنگ اسکیم کے قریب پہنچ گئے ہیں استاد! اور ہمیں اپنے آگے ایک نیلی ہنڈا جاتی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔''

''وہی ہے سالی...... لگا رہ پیچھے۔ تھوڑا اور آگے آنے پر دونوں مل کر دبا لیں گے۔'' اصغر نے جوش سے جواب دیا۔ فی الحال اسے عقب نما آئینے میں نیلی کار دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

''بس، ادھر ہی روک لے۔ آتے ہوں گے کتے کے...... یہیں دبوچ لیں گے انہیں۔'' اس نے ڈرائیور کو رک جانے کا حکم دیا۔ اس کے خیال میں نیلی کار والوں نے انہیں ہاؤسنگ اسکیم والی سڑک پر چڑھتے دیکھ کر قصداً فاصلہ بڑھا لیا تھا کہ کہیں اس خالی سڑک پر وہ ان کی نظر میں نہ آ جائیں۔ ابھی انہیں گاڑی روکے مشکل سے آدھا منٹ ہی گزرا ہوگا کہ ایک بار پھر ٹونی کی کال آنے لگی۔

''وہ ہاؤسنگ اسکیم والی سڑک پر نہیں چڑھے استاد! بالکل عین وقت پر انہوں نے یوٹرن مار لیا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے وہ سمجھ گئے ہیں کہ ہم انہیں گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' ٹونی نے اس کے ہیلو بولنے کا بھی انتظار نہیں کیا اور کال ملتے ہی جلدی جلدی اطلاع دینے لگا۔

''روک سالوں کو۔ بھاگ کر جانے نہ پائیں۔'' اصغر نے اسے حکم دیا اور ساتھ ہی اپنے ڈرائیور سے بھی چیخ کر بولا۔ ''پیچھے لے پیچھے۔ سالے چوہے بھاگ رہے ہیں۔'' ڈرائیور نے گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہی رکھا ہوا تھا چنانچہ فوراً ہی گاڑی ریورس کی۔ اسی وقت فضا میں گولیوں کی آواز گونجی۔ اصغر کے تجربے نے اسے بتایا کہ فائر لائٹ

مشین گن کا ہے۔ اس فائرنگ کا جواب دینے میں بھی زیادہ وقت نہیں لگا اور یقینی طور پر ٹونی اور اس کے ساتھیوں کی طرف سے بھی بیک وقت دو رپیٹر چلے۔

''جھپٹ لو میرے شیرو! بھاگنے مت دینا۔'' اصغر وہیں بیٹھے بیٹھے چلّایا۔ جوش میں اس نے اپنے ہتھیار کو ہاتھوں میں تھام کر اس کی نال کھڑکی سے باہر نکال لی تھی لیکن آگے ٹونی اور اس کے ساتھیوں کی گاڑی ایک جگہ کھڑی دکھائی دی تو اس کے جوش کی جگہ تشویش نے لے لی۔ قریب پہنچنے پر وجہ بھی سمجھ آگئی۔ گاڑی کے ٹائر برسٹ ہو چکے تھے اور دو افراد ناکارہ ٹائروں کو بدلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ نیلی کار کا سڑک پر دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔

''انہوں نے پہلی بار میں ہی دونوں طرف کی کھڑکیوں سے فائر کر کے سیدھا ہماری گڈی کے ٹائروں کو بیکار کیا اور اسپیڈ بڑھا کر بھاگ نکلے۔ ہم نے بھی فائر کیا پر وہ رینج سے نکل چکے تھے۔'' ٹونی رپورٹ پیش کرتے ہوئے کچھ شرمندہ تھا۔

''چل، کوئی بات نہیں۔ بھاگ گئے سالے بزدل چوہے۔ تم لوگ ٹائر بدلی کروا کر واپس جاؤ، ہم بھی اپنے رستے جاتے ہیں۔'' اصغر نے تسلی دینے والے انداز میں اس کا شانہ تھپکا۔

''اگر تھوڑی دیر ویٹ کر سکو تو ہم ٹائر چینج کر کے سیکیورٹی کے لیے ساتھ چلتے ہیں۔'' ٹونی نے پیشکش کی۔

''پہلے ہی اس چکر میں لیٹ ہو گیا ہے بابا! اب اور دیر نہیں کر سکتا۔'' اصغر اس سارے ہجوم کو لالہ کی رہائش گاہ تک نہیں لے جانا چاہتا تھا اس لیے ٹونی کو ٹال دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ ایک بار پھر اپنی منزل کی طرف گامزن تھے۔ اس بار انہوں نے اپنے تعاقب کا پہلے سے زیادہ خیال رکھا تھا چنانچہ لالہ والی کوٹھی میں قدم رکھتے ہوئے پوری طرح مطمئن تھے۔

''بہت لیٹ ہو گیا اصغر! پتا ہے نا اپنے کو ٹائم کی پابندی کرنے والا بندہ پسند ہے۔'' لالہ کے روبرو حاضر ہوتے ہی اسے وہ سننا پڑا جس کا خدشہ تھا۔

''راستے میں گڑبڑ ہو گئی تھی لالہ!'' دنیا بھر کو منہ بھر بھر کے گالیاں دینے والا اصغر، لالہ کے روبرو آواز بھی اونچی کرنے کا نہیں سوچ سکتا تھا۔

''کیسی گڑبڑ؟'' لالہ سن کر چونک گیا۔ جواباً اصغر نے ساری کتھا سنا ڈالی۔

''ہوں...... اس کا مطلب ہے ہم پر حامد کے اغوا کا شک کیا جا رہا ہے۔'' لالہ نے ایک زوردار ہنکارا بھرتے ہوئے تبصرہ کیا۔

''حالات سے تو یہی ظاہر ہے۔'' اصغر نے تائید کی۔

''حالات سے تو یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ اڈے کی خبریں باہر لیک ہو رہی ہیں۔'' لالہ کے لہجے میں گمبھیر سنجیدگی تھی۔

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' اصغر سن کر اچھل پڑا۔

''ایسا ہی ہو رہا ہے اصغر! تیرے پاس سے یہ خبر نکل کر مخالفین تک پہنچی ہے کہ حامد وہاں نہیں ہے اس لیے وہ لوگ تیرا پیچھا کر کے اس تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔'' لالہ کے لیے نتیجہ اخذ کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ اصغر سن کر کچھ بھی کہنے کے لائق نہیں رہا۔

''کڑی نظر رکھ ہر طرف۔ غدار اور مخبر سے بڑھ کر کوئی خطرناک نہیں ہوتا۔'' لالہ نے اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے نرم الفاظ میں نصیحت کی پھر موضوع بدلتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''حامد نے میڈم ایکس کا جو ایڈریس دیا تھا، اس کی نگرانی کروا رہے ہو یا نہیں؟''

''بالکل لالہ! چوبیس گھنٹوں کے لیے بندوں کی ڈیوٹی لگا دی ہے۔''

''خیال رکھنا، بس دور دور سے نگرانی ہو۔ نہ نظر میں آنا ہے، نہ کوئی چھیڑ چھاڑ کرنی ہے۔ بہت ہوشیار بندے بٹھانے ہیں نگرانی پر۔'' لالہ نے یاددہانی کروائی۔

''جو حکم لالہ!'' اصغر نے سیدھے سیدھے تابعداری کا مظاہرہ کیا اور یہ یاد دلانا قطعی ضروری نہیں سمجھا کہ وہ یہ ساری ہدایات پہلے بھی دے چکا ہے۔

''دِکی کی بڑی فکر ہے مجھے۔ دیوا نے بھی اب تک کوئی اطلاع نہیں دی۔'' لالہ نے بڑبڑاتے ہوئے جام اٹھا کر منہ سے لگا لیا۔

''سنا تھا دیوا کے اپنے بُرے دن چل رہے ہیں اور وہ پولیس کے ڈر سے انڈر گراؤنڈ ہے۔'' اصغر نے جھجکتے ہوئے دیوا کے متعلق اپنے تحفظات کا اظہار کیا۔

''ہاتھی مر کر بھی سوا لاکھ کا رہتا ہے اور دیوا تو ابھی زندہ ہے۔ اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا وہ اسے ایڈجسٹ کر لے گا۔ باقی رہی میرے کام کی بات تو وہ تو، تو دیکھ لینا کہ ہو کر رہے گا۔ بڑے کانٹیکٹس ہیں اس نامراد عاشق کے اپنے دیس میں۔'' دیوا کے خیال سے لالہ کی آنکھوں میں چمک سی ابھری۔ کسی زمانے میں وہ دھندے کے ساتھی ہوتے تھے۔ بیرونِ ممالک سفر میں بھی ایک دوسرے سے

ملاقات ہوتی رہتی تھی پھر لالہ کو اپنے آس پاس کے حالات اور افراد سے باخبر رہنے کی بھی عادت تھی اس لیے دیوا کی داستانِ عشق سے بھی کسی حد تک واقف تھا۔ البتہ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ دیوا کا چھوٹا بھائی دلیپ خفیہ طور پر کسی علیحدگی پسند تنظیم کا حصہ ہے اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ہندوستانی حکومت کو زک پہنچانے کا موقع نکالتا رہتا ہے۔

''اپنا وکی بڑا ہوشیار اور پھرتیلا ہے۔ دیکھنا وہ وہاں بھی کسی نہ کسی طرح اپنا راستہ نکال لے گا۔'' اصغر صرف لالہ کو تسلی نہیں دے رہا تھا، اسے اپنے کہے ہوئے ہر لفظ پر یقین بھی تھا۔ حقیقتاً وکی اپنی عادت، ذہانت اور جرأت مندی کے باعث ہر ایک کا ہی لاڈلا تھا۔

''وقت کی چال بہت بُری ہوتی ہے اصغر! کوئی کتنا ہی بڑا پھنے خان ہو، اگر اس چال کی زد میں آجائے تو......'' لالہ کا جملہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ اس کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اصغر نے جلدی سے آگے بڑھ کر میز پر رکھا سیل فون اٹھا کر اس کے حوالے کیا۔ اس دوران وہ اسکرین پر چمکتا دیوا کا نام دیکھ چکا تھا۔

''کیا خبر ہے میرے لیے یارا!'' ایک آدھ رسمی جملے کے بعد ہی لالہ فوراً اپنے مطلب کی بات پر آ گیا۔

''تو نے جو کلیوز دیے تھے منڈے کے بارے میں، ان کو لے کر بہت کچھ جاننے کو ملا ہے۔ اب پتا نہیں وہ تیرے لیے اچھا ہے کہ بُرا۔'' دوسری طرف دیوا بھی کچھ الجھا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

''جو کچھ پتا چلا ہے بتا دے، اچھے بُرے کا فیصلہ میں خود کرلوں گا۔''

''ٹھیک ہے، بتاتا ہوں پر تھوڑا بیک گراؤنڈ بتانا پڑے گا۔'' دیوا نے تمہید باندھی۔ لالہ زبان سے کچھ کہے بغیر اس کی اگلی بات کا منتظر رہا۔

''پچھلے دنوں، ادھر تیری طرف سے کچھ لوگ ادھر آئے تھے۔ سچ جھوٹ کی جانکاری سے میرا مطلب نہیں۔ بس ہوا یوں کہ دو بندے جاسوسی اور آتنک واد کے چکر میں پکڑے گئے۔ ایسا ہوتا رہتا ہے اور ہم اس پر فوکس بھی نہیں کرتے لیکن بھگوان کا کرنا یہ ہوا کہ ایک دن ایک منڈا میرے پاس مدد مانگنے چلا آیا کہ ان دونوں بندوں کو چھڑوانے میں اس کی مدد کروں۔ وہ جس کی سفارش لے کر آیا تھا، اس کو میں کسی صورت انکار نہیں کرسکتا تھا اس لیے یہ رسکی کام کرنے کو تیار ہو گیا۔'' دیوا اتنا بتا کر کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ لالہ بس اتنا ہی محسوس کرسکا کہ اس نے ہچکی یا سسکی لی ہے۔ کچھ کچھ حیران وہ دیوا کے دوبارہ کچھ بولنے کا انتظار کرنے لگا کہ خاموشی ضرور چھائی تھی لیکن سلسلہ منقطع نہیں ہوا تھا۔

''شما چاہتا ہوں یارا! حلق خشک ہو گیا تھا تو ذرا دو گھونٹ پینے بیٹھ گیا تھا۔'' وہ دوبارہ لائن پر آیا تو اپنی خاموشی کی وضاحت دیتے ہوئے معذرت طلب کی۔ لالہ نے محسوس کیا کہ اس کی آواز پہلے کے مقابلے میں بھاری ہو گئی ہے۔ ویسے تو اسے دیوا ابتدا ہی سے بہکے ہوئے محسوس ہو رہا تھا لیکن آواز کا موجودہ بھاری پن شراب نوشی کا نتیجہ نہیں لگتا تھا۔

''تو ٹھیک تو ہے دیوا!'' وہ بے ساختہ پوچھ بیٹھا۔

''اس کے مرنے کے بعد بھی زندہ ہوں تو کیا یہ کم ہے؟'' وہ جواباً جو بولا اس نے پل بھر کے لیے لالہ کو گنگ کر دیا۔ جس ہستی کا نام کبھی باقاعدہ دیوا کی زبان پر نہیں آیا تھا، وہ اس کے مرنے کی اطلاع دے رہا تھا۔

''کیسے؟ مطلب کیا ہوا تھا؟'' وہ بہت مشکل سے پوچھ سکا۔

''جیسے بھی اور جو کچھ بھی ہوا تھا، اس کے قاتلوں کو پورا پورا بھگتان بھگتنا پڑا ہے۔ میں نے کسی کو اس کے کھون (خون) کا ایک قطرہ بھی معاف نہیں کیا۔'' اس کے لہجے میں غم و غصے کی عجیب سی تپش تھی۔

''سن کر بہت افسوس ہوا۔'' ہر تعزیت کرنے والے کی طرح لالہ کے پاس بھی دیوا کے دکھ سن کر پُرسہ دینے کو وہی لگے بندھے الفاظ تھے۔

''چھوڑ دے اس کتھا کو اور اپنے مطلب کی بات سن۔'' دیوا نے خود ہی موضوع بدل دیا۔

''میں تجھے بتا رہا تھا کہ سفارش ایسی تھی کہ میں کام کو منع نہیں کرسکتا تھا پر جو منڈا مدد لینے آیا تھا اس سے ہمارا اپنا کچھ حساب کتاب نکل آیا۔ ہم نے اس کے بندے تو چھڑوا لیے لیکن حساب پورا کرنے کے لیے اس کے حوالے نہیں کیے اور حیدرآباد میں ایک نواب صاحب کے ذاتی قید خانے میں رکھوا دیے۔ وہ منڈا بہت تیز تھا۔ اپنی ایک ساتھی کو لے کر بہانے سے نواب صاحب کی حویلی میں گھس گیا اور اپنے ساتھیوں کو وہاں سے لے کر بھاگ نکلا۔ نواب صاحب نے اس بات کو اپنی انسلٹ سمجھا اور ساروں کو ان بھگوڑوں کی تلاش پر لگا دیا۔ بڑی مشکل سے پتا لگا کہ وہ مین سٹی سے تھوڑی دور ایک بنگلے میں چھپے ہوئے ہیں۔ پولیس نے بنگلے کے آس پاس کے سارے علاقے کی ناکا بندی

کردی اور ریڈ کے لیے بھی تیار ہوگئی لیکن اچانک ہی عجیب قصہ ہوا۔ جس بنگلے کے بارے میں اطلاع ملی تھی، وہ اور اس کے ساتھ والے بنگلے میں اچانک ہی آگ بھڑک اٹھی۔ آگ اتنی تیز تھی کہ فائر بریگیڈ کے پہنچنے تک سب کھاک (خاک) ہوگیا۔ پولیس کو جلے ہوئے بنگلے کے ملبے سے دو لاشیں ملیں۔ لاشیں اتنی بری طرح جلسی ہوئی تھیں کہ پہچان کٹھن تھی۔'' دیوا روانی سے بولتا جارہا تھا لیکن لالہ کی سانسوں کی روانی قائم نہیں رہی۔ دو جلی ہوئی ناقابلِ شناخت لاشوں کے ذکر نے اس کے دل کو اپنی مٹھی میں بھینچ لیا۔

''پولیس نے ڈی این اے کروا کر کھوج لگائی کہ وہ لاشیں وہاں بنگلے پر کام کرنے والے نوکر انوپ اور اس کے دوست کی ہیں۔'' دیوا کو خبر بھی نہیں ہوئی کہ وہ ایک پل میں کسی کی سانسیں روکنے اور بحال کرنے کا کارنامہ انجام دے چکا ہے۔

''اس سارے میں، میرا دکی کدھر ہے دیوا؟'' لالہ کو خود معلوم نہیں تھا کہ اس پل وہ کتنا جذباتی ہو چکا ہے۔ قریب ہی مؤدب کھڑا اصغر اس کی آنکھوں میں نمی دیکھ کر بیک وقت حیران و پریشان ہوا تھا۔ وہ دوسری طرف کی گفتگو سننے سے قاصر تھا اور لالہ نے جو گنے چنے جملے بولے تھے، وہ کچھ بھی سمجھنے کے لیے ناکافی تھے۔

''وکی ہے، جب ہی تو میں تجھے یہ قصہ سنا رہا ہوں۔'' دیوا نے یوں ٹوکے جانے پر بُرا منایا۔

''اچھا تو چل، جلدی سے پوری بات بتا۔'' لالہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

''بنگلے سے وہ دو لاشیں نکالنے کے بعد پولیس شاید ہاتھ جھاڑ کر ایک طرف ہوجانے کا سوچ رہی تھی لیکن اچانک ہی ایک پٹھان کہانی میں گھس آیا اور میڈیا کے سامنے ہنگامہ مچا کر رکھ دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس بنگلے میں اس کے کم سے کم چار پانچ ساتھی موجود تھے لیکن پولیس اس سچ کو چھپا رہی ہے۔ اس نے تو یہاں تک الزام لگایا کہ پولیس نواب صاحب کی پٹھو بنی ہوئی ہے اور یہ آگ پولیس نے ہی نواب صاحب کے کہنے پر لگوائی ہے اور اب لاشوں کو میڈیا اور پبلک سے چھپا رہی ہے۔''

''وہ پٹھان کون ہے؟'' لالہ نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔

''یہ وہی پٹھان ہے جس کے ساتھ وکی کو دہلی میں دیکھا گیا اور پھر جس کے ساتھ تم کو اس کے حیدرآباد جانے

کی اطلاع ملی۔'' دیوا نے شک و شبے کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی۔

''گل خان......!'' لالہ کے ذہن میں حامد کا بتایا ہوا نام موجود تھا اس لیے فوراً زبان سے پھسل گیا۔

''ہاں، ہاں۔ یہی نام ہے۔ میں پولیس ریکارڈ سے کنفرم کروا چکا ہوں۔'' دیوا نے تصدیق کی۔

''وکی اس بنگلے میں کیسے اور کیا کرنے گیا تھا، اس بارے میں گل خان نے کچھ بتایا ہے؟'' لالہ نے سنبھل کر سوال کیا۔

''پولیس کو تو اس نے کچھ نہیں بتایا حالانکہ پولیس والوں نے مار مار کر اس کی حالت پتلی کر دی ہے پر اپن نے اپنے ایک بندے کو تھانے میں گھسا کر اس سے بہت کچھ پتا کر لیا ہے۔'' دیوا نے فخر سے بتایا۔

''تیرے بندے کے سامنے کیسے زبان کھول دی اس نے؟ شک نہیں ہوا اسے کہ پولیس کی ہی کوئی چال ہے؟''

''ہوا تھا شک اور سالا شروع میں پٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دے رہا تھا پر میرا آدمی بھی پوری تیاری سے گیا تھا۔ پوری آگے پیچھے کی داستان سنا کر ثابت کیا کہ اپن تیرے معاذ صاحب، سونیا میڈم، بجلی بی بی اور باقی سب کو جانتا ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ وکی، سونیا میڈم اور دوسرے لوگوں کو تلاش کرتا ہوا پاکستان سے یہاں پہنچا تھا۔ اس نے یہ بھی وشواس دلایا کہ وہ وکی اور دوسرے لوگوں کو تلاش کرنے میں اس کی مدد کر سکتا ہے۔ بس پھر سالا پٹھان پھسل گیا اور سب اگل دیا۔'' دیوا اسے تفصیل بتا رہا تھا لیکن اس کا ذہن تو معاذ کے نام پر اٹک گیا تھا۔

''یہ معاذ...... معاذ کون ہے؟'' تصدیق کے لیے کہ یہ معاذ وہی ہے جو علینہ کا بھائی ہے، اس نے دیوا سے پوچھا۔

''یہ معاذ بڑی دکھری چیز ہے۔ وہی بندہ جو میرے پاس اپنے دوستوں کو چھڑوانے میں مدد کے لیے میرے پاس آیا تھا۔ اپنے بارے میں جانکاری نہیں دی تھی اس نے لیکن اپن نے ہاتھ پاؤں مار کر پتا لگا ہی لیا تھا۔ اسی کی مالا جپتا تیرا وکی اس بنگلے میں گیا تھا۔ گل خان بتاتا ہے کہ اس نے سونیا کو اس بنگلے میں دیکھ کر اندازہ لگایا تھا کہ معاذ اور دوسرے ساتھی بھی وہیں ہوں گے۔ وہ سب الگ الگ پوائنٹ سے بنگلے کی نگرانی کر رہے تھے تو وکی نے اسے کال کر کے پولیس کے گھیرے کی خبر دی اور وہاں سے نکل جانے کو کہا۔ اسے نہ چاہتے ہوئے بھی وکی کی بات ماننا پڑی لیکن اس کو پورا یقین ہے کہ وکی نچلا نہیں بیٹھا ہوگا اور اس بنگلے میں ضرور گھسا ہوگا جہاں اس نے سونیا کو دیکھا تھا۔ اب اس کو دو ہی شک ہیں۔ ایک یہ کہ پولیس نے سب کو اریسٹ کر کے چپکے سے نواب صاحب کے حوالے کر دیا ہے اور دوسرے یہ کہ وہ سب بھی بنگلے کی آگ میں جل کر مر گئے ہیں لیکن پولیس اصل بات چھپا رہی ہے۔'' دیوا نے اسے تفصیلی جواب دیا۔

''جلنے والے بنگلوں کے مالکان کون تھے؟''

''ان کے بارے میں، میں نے جانکاری کی کوشش نہیں کی۔ بس اتنا سنا ہے کہ دونوں بنگلے والے آپس میں رشتے دار ہیں اور ساتھ مل کر کہیں گھومنے پھرنے گئے ہوئے ہیں۔''

''وہاں آگ کیسے لگی تھی؟'' لالہ نے جذبات کو سنبھال لیا تھا اور ایک کے بعد ایک تابڑ توڑ سوال کر رہا تھا۔ قریب کھڑے اصغر کو سوالات کی نوعیت نے بے چین کر دیا تھا لیکن ظاہر ہے وہ گفتگو میں دخل نہیں دے سکتا تھا۔

''پولیس کی رپورٹ کے انوسار شارٹ سرکٹ ہوا تھا لیکن ایک جرنلسٹ کا کہنا ہے کہ اسے وہاں کسی کیمیکل کی بو محسوس ہوئی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ آگ لگی نہیں بلکہ لگائی گئی ہو۔''

''ہو سکتا ہے وکی اور دوسرے لوگوں نے پولیس کی توجہ ہٹانے اور فرار کا موقع پیدا کرنے کے لیے خود وہ آگ لگائی ہو۔'' لالہ نے امید ظاہر کی۔

''اپنے کو ایسا نہیں لگتا۔ پولیس جیسے میڈیا سے کنی کترا رہی ہے، اس سے اپنے کو بھی لگتا ہے کہ پولیس نے کوئی...... پن کیا ہے۔ دوسرے وہ منڈا معاذ بھی دوسری طبیعت کا ہے۔ اپنا من نہیں مانتا کہ وہ خود کو بچانے کے لیے دو بسے بسائے گھروں کو زندہ انسانوں سمیت جلا کر بھاگ نکلا ہوگا۔'' دیوا نے دنیا دیکھی تھی۔ اس کی معاذ کے ساتھ کئی ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ کچھ قصے دلیپ نے بھی سنائے تھے اس لیے اسے ماننے میں تامل تھا کہ یہ سب معاذ نے کیا ہوگا۔

''ٹھیک ہے پھر۔ تو اپنی آنکھیں کھلی رکھ اور چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی اگنور نہ کر۔ میں تجھ سے اس بارے میں اپ ڈیٹ لیتا رہوں گا۔''

''جو تیری اچھا۔''

''اور ہاں، اس کام کا خرچہ پانی تیرے فارن اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کروا رہا ہوں۔ جتنا چاہیے ہاتھ کھول کر خرچ کرنا پڑے، کام رکنا نہیں چاہیے۔'' لالہ خود جرم کی دنیا

کا باشندہ تھا اور جانتا تھا کہ مجرم بننے والا تقریباً ہر شخص پیسے کے لیے غیر معمولی محبت رکھتا ہے اس لیے خرچے پانی کے نام پر دیوا کو ایک خطیر معاوضہ دینے کے لیے تیار تھا۔

''نہیں رکے گا۔'' دیوا نے اسے یقین دہانی کروا کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

لالہ کال سے فارغ ہو جانے کے باوجود کسی حکم کے منتظر کھڑے اصغر کی طرف متوجہ نہیں ہوا اور گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اصغر کی ہمت نہیں تھی کہ اسے اس سوچ سے نکال کر اپنی طرف متوجہ کرتا۔ اس نے زندگی میں پہلی بار لالہ کو اس درجہ متفکر دیکھا تھا۔

☆☆☆

سونیا کو ہوش آیا تو درد کی تیز لہر نے اسے بے ساختہ کراہنے پر مجبور کر دیا۔ اس نے آنکھیں کھول کر اپنے سامنے موجود چہروں کو دیکھا۔ یہ وہی لوگ تھے جو اس کی زبان کھلوانے کے لیے اب تک اس پر تشدد کرتے رہے تھے۔ وہ ایک بار پھر تشدد برداشت کرنے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگی۔

''کیسی ہو دیوی جی؟'' ہندی سے واقف نارنجی لبادے والے بھکشو زانگ تاؤ نے میٹھے لہجے میں اس سے پوچھا۔ اس نے جواب دینے کے بجائے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔

''ایسے منہ نہ پھیرو دیوی جی! تم منہ پھیرو گی تو ہمیں ہمارے سوالوں کا جواب کون دے گا؟'' بھکشو نے اسے چھیڑا۔ وہ کوئی جواب دیے بغیر دوسری طرف دیکھتی رہی۔

''یہ تو انیائے ہے دیوی جی! ہم آپ سے اتنے پریم سے بات کر رہے ہیں اور آپ ہماری طرف دیکھتی بھی نہیں۔'' بھکشو کا لہجہ بناوٹی تھا۔

''فضول باتوں میں ٹائم ضائع مت کرو اور مجھ پر تارچر شروع کرو۔ ہوسکتا ہے کسی اسٹیج پر آ کر میری برداشت جواب دے جائے اور تم اپنا مقصد حاصل کر لو۔'' اس بار سونیا نے رخ بدلا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یوں بولی جیسے اسے چیلنج کر رہی ہو۔

''اتنا غصہ نہ کریں شریمتی جی! یہ تو ہماری مجبوری نے ہمیں آپ پر ہاتھ اٹھانے پر مجبور کر دیا ورنہ ہم بڑے شانتی والے لوگ ہیں۔ اب بھی ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اب کوئی آپ کو انگلی بھی نہیں لگائے گا۔'' وہ نرم اور میٹھے لہجے میں بات کر رہا تھا لیکن سونیا کو اس لہجے کی تہ میں کچھ اور محسوس ہو رہا تھا۔ وہ الجھ کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

''ہم نے آپ کو سمجھنے میں غلطی کر دی تھی پر اب ہم سمجھ گئے ہیں کہ جو کچھ ہم کرتے رہے ہیں اس سے آپ کو توڑنا ممکن نہیں ہے۔ آپ مر تو جاؤ گی پر ہماری اچھا کے انوسار اپنی زبان نہیں کھولو گی۔ پر ایسا بھی نہیں کہ آپ کی زبان کھلوانے کا کوئی اُپائے ہی نہیں ہے ہمارے پاس۔ اپائے ہے اور اب ہم اسی کو آزمانے جا رہے ہیں۔''

''آزما کر دیکھ لو۔'' بھکشو کے ذہن میں کیا ہے، یہ تو وہ نہیں سمجھ سکی تھی لیکن خود کو اس کے سامنے کمزور ظاہر کرنا بھی مناسب نہیں تھا۔

''بس تو پھر دل تھام کر بیٹھیے شریمتی جی! ابھی یہ پردہ ہٹے گا تو آپ اپنے ایک ساتھی کو اپنے سامنے دیکھیں گی۔ ہم اس کو اس سے تک مارتے رہیں گے جب تک آپ زبان نہ کھول دیں یا وہ اپنی جان سے نہ چلا جائے۔ ایک مرے گا تو ہم اس کی جگہ دوسرے کو لے آئیں گے اور دوسرے کی جگہ تیسرے کو پھر دیکھیں گے کہ آپ اپنی ضد پر اپنے کتنے ساتھیوں کو بلی چڑھاتی ہیں۔'' اب بھکشو زانگ تاؤ کے لہجے سے نرمی غائب ہو گئی تھی اور اس کی جگہ سفاکی نے لے لی تھی۔ وہ پہلے والی سونیا ہوتی تو اس دھمکی سے ذرا متاثر نہ ہوتی لیکن اس وقت وہ اندر سے کانپ گئی تھی۔

''یہ بھی کر دیکھو۔'' ڈر جانے کے باوجود اس نے اپنا ڈر ظاہر کرنا مناسب نہ سمجھا اور سپاٹ سے لہجے میں کہہ کر ایک بار پھر منہ پھیر لیا۔ اسے منہ پھیرتے دیکھ کر بھکشو دھیرے سے مسکرایا اور اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ اگلے لمحے وسیع و عریض جھونپڑے کو دو حصوں میں منقسم ہونے والا پردہ ہٹ گیا۔

''تمہارا پہلا ساتھی، تمہاری ضد کی بھینٹ چڑھنے کو تیار ہے۔ نظریں نہ چراؤ اور اسے اپنی آنکھوں سے مرتا ہوا دیکھو۔'' بھکشو نے اسے مخاطب کیا لیکن اس نے رخ موڑ کر نہیں دیکھا۔ اگلے ہی لمحے ایک زوردار شڑاپ کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ وہ جانتی تھی یہ کوڑا ہے جو پوری قوت سے کسی انسانی جسم پر برسایا گیا ہے۔ کوڑے کی آواز کے ساتھ ہی انسانی چیخ سننے کی منتظر اس کی سماعت کو مایوسی کا سامنا کرنا پڑا تو اس نے پلٹ کر دیکھا اور پوری جان سے کانپ گئی۔

☆☆☆

''ہاں پرویز! مل گیا فلیٹ۔ کوئی مشکل تو نہیں ہوئی؟'' اصغر فون پر اپنے ایک آدمی سے رپورٹ لے رہا تھا۔

''ٹھیک ہے یار! لینے دے کرایہ زیادہ۔ بس کام

طریقے اور احتیاط سے ہونا چاہیے۔ میں نے سردار کو سارا ضروری سامان پیک کرنے کا بول دیا تھا تو اسے فون کر کے ایڈریس لکھوا دے، وہ سامان پہنچا دے گا۔ تو بس اس بات کا خیال رکھنا کہ اگلی پارٹی بہت چالاک ہے اس لیے تم لوگوں سے کوئی غلطی نہ ہونے پائے۔'' پرویز کو ہدایات جاری کرتے ہوئے اس نے کلائی کی گھڑی پر وقت دیکھا۔

''میں دیکھتا ہوں۔ ہوسکتا ہے آدھے پونے گھنٹے میں، میں خود ادھر کا چکر لگاؤں۔ اگر نہ بھی آسکا تو، تو سب اچھی طرح سنبھال لینا۔'' آخری ہدایت دے کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور کمپیوٹر کی اسکرین پر نظر آنے والے مناظر دیکھنے لگا۔ یہ اڈے کے مختلف حصوں کے مناظر تھے۔ وہ چاہتا تو ان میں سے کسی ایک کو منتخب کر کے وہاں کی آوازیں بھی سن سکتا تھا۔ ساتھیوں میں کسی غدار کی موجودگی کے شک کے باعث یہ سسٹم حال ہی میں نصب کروایا گیا تھا۔ اتفاق تھا کہ بجلی سے متعلق چند چھوٹے موٹے کام کافی دنوں سے التوا میں پڑے ہوئے تھے۔ مرمت کے بہانے بھروسے کے الیکٹریشنز بلوائے گئے اور ساتھ ساتھ خفیہ کیمرے اور مائیک وغیرہ نصب کروا دیے گئے۔ اس سارے سیٹ اپ کی گنتی کے چند ایک لوگوں کو ہی خبر تھی اور انہیں اصغر نے سختی سے زبان بندی کا حکم دے دیا تھا۔ وہ موقع ملنے پر خفیہ کیمروں کی مدد سے اپنے آدمیوں کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتا رہتا تھا۔ سسٹم میں ریکارڈنگ کا آپشن بھی موجود تھا اور اس وقت اس کا ریکارڈنگز ہی دیکھنے کا ارادہ تھا اس لیے پرویز کو آدھے پونے گھنٹے بعد پہنچنے کا بتایا تھا۔

''عرفان اللہ آیا ہے استاد!'' ابھی اس نے ریکارڈنگز کھولی بھی نہیں تھیں کہ ایک آدمی نے آکر اسے اطلاع دی۔

''عرفان اللہ!'' اس نے حیرت سے نام دہرایا پھر پوچھا۔

''اکیلا آیا ہے یا ساتھ کوئی اور بھی ہے؟''

''صرف گارڈز ہیں ساتھ۔''

''اچھا چلو، میں آتا ہوں۔'' اس نے کمپیوٹر بند کیا اور اپنی جگہ چھوڑ دی۔ ملاقاتیوں والے کمرے میں عرفان اللہ اس کا منتظر تھا۔

''آج آپ نے کیسے اس غریب خانے کو رونق بخشی؟'' رسمی علیک سلیک کے بعد اصغر نے عرفان اللہ سے براہِ راست سوال کیا۔

''کوئی پہلی بار تو نہیں آیا ہوں۔ لالہ کے زمانے میں اکثر آنا جانا لگا رہتا تھا۔'' عرفان اللہ نے اس کے لہجے کا تیکھا پن محسوس کرنے کے باوجود نظر انداز کر دیا اور نرم لہجے میں بولا۔

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، یہ آنا جانا لالہ کے ہوتے بھی کافی پہلے چھوٹ گیا تھا اس لیے اس وقت گزرے دنوں کا حوالہ دینا بنتا نہیں ہے۔'' اصغر اسے رعایت دینے کو تیار نہیں تھا۔

''چھوڑو یار گزری باتیں۔ گاہک دکان پر کتنے ہی عرصے بعد آئے، دکاندار اسے دھتکارتا نہیں ہے۔ جو بیت گیا، سو بیت گیا۔ اب آگے کی بات کرو۔''

''کیا خریدنے آئے ہیں آپ یہاں؟'' اصغر نے اسے جانچتی نظروں سے گھورا۔

''تمہاری خدمات۔'' عرفان اللہ نے ہاتھ میں پکڑے سگار کا کش لگایا۔

''کس مقصد کے لیے؟''

''سیاست کے میدان میں اپنے قدم مضبوط رکھنے کے لیے تم جیسوں کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ تم میرا ساتھ دو۔ میں تمہیں منہ مانگے دام دوں گا۔''

''کیوں، وہ تمہارا اپنا باذل ہے نا۔ وہ تو تمہاری خاطر کشتوں کے پشتے لگا سکتا ہے۔'' اصغر نے ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ باذل کے غیاب سے واقف ہے اور طنزیہ لہجے میں بولا۔

''باذل آج کل یہاں موجود نہیں ہے اور اس کی عدم موجودگی کی وجہ سے ہی مجھے باہر کے لوگوں سے کام لینا پڑ رہا ہے۔'' عرفان اللہ نے اب بھی تحمل کا مظاہرہ کیا۔

''کیوں، کیا اس ڈنگر کو دنیا فتح کرنے کے مشن پر بھیج دیا ہے؟'' اصغر کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

''ہر بار میں ہی اسے کہیں بھیجوں، یہ ضروری نہیں ہے۔ وہ عاقل، بالغ اور آزاد بندہ ہے۔ اپنی مرضی سے کبھی بھی اور کہیں بھی جا سکتا ہے۔'' حقیقتاً عرفان اللہ خود بھی باذل کے اچانک غیاب سے پریشان تھا لیکن اس پر اپنی پریشانی کو ظاہر کرنا مناسب نہ سمجھا۔

''یہ بھی ٹھیک کہا آپ نے۔ وہ حرام کا جنا تو دنیا کا وہ آزاد ترین بندہ ہے جو باپ کے تنتے سے بھی آزاد ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی زندگی میں کبھی ایسا موقع نہیں آیا ہوگا کہ کسی نے اس کا کان پکڑ کر برا بھلا سکھانے کی کوشش کی ہو۔ کیا کبھی آپ نے ایسی کوئی کوشش کی؟'' اصغر کے اچانک پوچھے گئے سوال نے عرفان اللہ کو گڑبڑا کر رکھ دیا۔

''میں ایسا کیسے کر سکتا ہوں؟ میرا بھلا کیا حق ہے اس پر؟'' اس نے بے اختیار اپنے ماتھے پر سے پسینا صاف کیا۔

''یہ بھی ٹھیک کہا۔ حق تو اصل میں حق ادا کرنے والوں کو ہی حاصل ہوتا ہے۔'' اصغر نے آہستہ سے اسے چرکا لگایا اور جب دیکھا کہ اس کی رنگت متغیر ہو رہی ہے تو آرام سے بولا۔

''اب دیکھیے نا، اگر آج اس کا باپ زندہ ہوتا تو اسے ایسے بے نتھے بیل کی طرح آزاد تھوڑی چھوڑ دیتا۔ کچھ تعلیم و تربیت دیتا اس وحشی کو۔ سچ...... اپنے کو بڑا افسوس ہوتا ہے کہ اس جیسا جی دار اور ٹیلنٹڈ بندہ محض تربیت کی محرومی کے باعث انسان بننے سے بھی محروم رہ گیا۔''

''اب کیا باذل پر ہی بات کرتے رہو گے اور مجھے میری اس بات کا جواب نہیں دو گے جس کے لیے میں خود چل کر یہاں تک آیا ہوں۔'' عرفان اللہ نے جز بز ہوتے ہوئے اسے ٹوکا۔ حقیقت یہ تھی کہ آج کل تاجور نے بھی باذل کے حوالے سے اس کی جان کھائی ہوئی تھی کہ معلوم کرو باذل کہاں غائب ہے؟ تاجور کی فرمائش پر اس نے باذل کو تلاش کروانے کی تھوڑی بہت کوشش بھی کی تھی لیکن کوئی سراغ نہیں ملا تھا اور اس کے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ سارا وقت اسی کام میں لگا رہتا۔

''سالا خود چل کر آنے کی بھی خوب کہی آپ نے۔ اپن کی مانو تو اسے بھی رب کا احسان جانو کہ اپنے پیروں پر چلنے کے لائق ہو ورنہ وہ ٹھگنا لطیف شاہ دیکھو کیسی اکڑ والا تھا لیکن اب بستر پر مُردوں کی طرح پڑا ہے۔''

''تم ایسا کرو، اڈا چھوڑ کر تبلیغی جماعت کے ساتھ چلّے پر چلے جاؤ۔ یہ تعلیم و تربیت کی باتیں، یہ شکرانے کی نصیحتیں وہیں بیٹھ کر کرتے ہوئے اچھے لگو گے تم۔'' بالآخر عرفان اللہ کا ضبط جواب دے گیا اور اصغر کو اس کی باتوں پر ٹوک ڈالا۔ اصغر اس کے یوں ٹوکنے پر کھلکھلا کر ہنسا پھر سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔

''بات اپن نے سن اور سمجھ لی ہے پر فیصلہ سنانے کو تھوڑی مہلت چاہیے ہے۔ سوچ سمجھ کر ایک آدھ دن میں جواب دے دوں گا۔''

''جواب ہاں میں ہی ہونا چاہیے۔ پرانے تعلق کا اتنا مان تو تمہیں رکھنا ہی ہوگا۔ اگر تمہاری جگہ یہاں لالہ بیٹھا ہوتا تو وہ بھی فیصلہ میرے حق میں ہی دیتا۔ اس کی وضع داری مجھے انکار کرنے ہی نہیں دیتی۔'' عرفان اللہ نے اسے جذباتی کرنے کی کوشش کی۔

''اب بھی فیصلہ لالہ ہی کا ہوگا۔'' اصغر بے اختیار بول اٹھا۔

''کیا مطلب؟'' عرفان اللہ ٹھٹکا۔

''مطلب، لالہ کا طریقہ تھا کہ کوئی بھی الجھا ہوا کام ہاتھ میں لینے سے پہلے اپنے اعتبار کے بندوں سے مشورہ لے لیتے تھے۔ مجھے بھی بس یہی کرنا ہے۔'' اصغر نے بات بنائی۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ تمہیں ایسے لوگ میسر ہیں۔ اب مجھے ہی دیکھ لو۔ سب طرف اکیلا ہی بھاگا پھرتا ہوں۔ پہلے یزدانی کا آسرا تھا لیکن اسے جوان بیٹے کی موت کا غم لے ڈوبا ہے۔ سارا وقت یا تو پیتا رہتا ہے یا روتا رہتا ہے۔ جب ان دونوں کاموں سے تھک جاتا ہے تو سو جاتا ہے۔ بالکل بھی کسی کام کا نہیں رہا ہے۔'' عرفان اللہ نے اپنا رونا رو دیا۔

''سنا تھا آپ کا بیٹا بھی بیمار ہے اور آپ نے علاج کے لیے باہر بھیجا ہوا ہے۔ کچھ فرق پڑا اسے گوروں کے علاج سے؟'' اصغر نے ظاہری ہمدردی سے پوچھا۔

''علاج ابھی شروع ہی کہاں ہوا ہے۔ ابھی تو ٹیسٹ پر ٹیسٹ کروا رہے ہیں وہ لوگ۔ یہاں کی رپورٹوں کو کہاں مانتے ہیں گورے ورنہ ٹیسٹ تو یہاں بھی بے حد و حساب ہوئے تھے۔''

''بس تو ٹھان لیجیے کہ جب بھی آپ کو موقع ملا، اپنے ملک میں بھی ایسے کالج اور اسپتال بنائیں گے جن کی ڈگریوں اور رپورٹوں کو گورے بھی مانیں۔'' اصغر نے مفت مشورہ دیا۔

''اچھا، اب میں چلتا ہوں۔ ایک دو دن بعد فون کر کے تمہارا جواب مانگوں گا۔'' عرفان اللہ اس کے مشورے کے جواب میں جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے روانہ ہوتے ہی اصغر نے بھی روانگی اختیار کی۔ روانی سے دوڑتی گاڑی شہر کے ایک ایسے حصے میں جا رکی جہاں کثیر المنزلہ عمارات کی بہتات تھی۔ ان عمارتوں میں سے کچھ عمارتیں رہائشی تھیں جبکہ اکثریت کاروباری مقاصد کے لیے استعمال ہو رہی تھیں۔ اس کی گاڑی جس عمارت کے سامنے جا کر رکی، وہ رہائش کے لیے استعمال ہو رہی تھی۔ وہ گاڑی سے اترا تو اس عمارت کے مقابل سڑک کے پار دوسری کثیر المنزلہ عمارت کا کن انکھیوں سے جائزہ لیا۔ عمارت کی تعمیر میں شیشوں کا کثرت سے استعمال کیا گیا تھا لیکن یہ وہ شیشے تھے جن کے باہر کی طرف سے اندر نہیں جھانکا جا سکتا تھا البتہ اندر والے بہ خوبی باہر کا جائزہ لے سکتے تھے۔

''یہیں انتظار کرو، میں اکیلا اوپر جاؤں گا۔'' اس نے ساتھ آئے ڈرائیور کو حکم دیا اور خود رہائشی عمارت کی

طرف بڑھ گیا۔ داخلی راستے پر موجود گارڈ نے اس کی منزل کا پوچھ کر پہلے پرویز سے رابطہ کیا اور وہاں سے گرین سگنل ملنے کے بعد ہی اسے لفٹ میں سوار ہونے کی اجازت دی۔ لفٹ میں اس کے ساتھ ایک تیرہ چودہ سالہ لڑکا اور اس سے کچھ برس چھوٹی بچی موجود تھی۔ دونوں شکل سے بہن بھائی لگتے تھے اور ہاتھوں میں آئس کریم پکڑے اردگرد سے بے نیاز آپس میں گفتگو کررہے تھے۔ یقیناً رہائشیوں کے تحفظ کے لیے ہی وہاں سیکیورٹی کا انتظام ذرا سخت رکھا گیا تھا اور اجنبیوں کو بلا روک ٹوک داخلے کی اجازت نہیں تھی۔

"کیسا چل رہا ہے؟" اصغر اپنی مطلوبہ منزل پر لفٹ سے اتر کر ایک اپارٹمنٹ میں داخل ہوا تو اندر گھستے ہی اپنے لیے دروازہ کھولنے والے پرویز سے پوچھا۔ اس کے ساتھ لفٹ میں سوار بچے پہلے ہی کسی نچلی منزل پر اتر چکے تھے۔

"ٹیلی اسکوپ فٹ کردی ہے اور ایک آدمی کو مستقل نگرانی پر بھی بٹھا دیا ہے لیکن زیادہ فائدہ دکھائی نہیں دے رہا۔ یہاں کی طرح وہاں بھی ایسے شیشے لگے ہیں کہ باہر سے اندر کا کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ بس ہم انہی لوگوں کو دیکھ سکتے ہیں جو سیڑھیاں چڑھتے اترتے سامنے آجاتے ہیں۔" پرویز نے قدرے مایوسانہ انداز میں اس کے سوال کا جواب دیا۔ اس نے زبان سے کچھ کہنے کے بجائے تسلی دینے والے انداز میں پرویز کا شانہ تھپکا اور خود اس کھڑکی کی طرف بڑھ گیا جس کے ساتھ ٹیلی اسکوپ فٹ کی گئی تھی۔ کھڑکی کا شیشہ بے شک بند تھا لیکن جس منہمک انداز میں ٹیلی اسکوپ کے پیچھے بیٹھا بندہ اپنے کام میں مصروف تھا، اس سے ظاہر تھا کہ اسے سب صاف دکھائی دے رہا ہے۔

اصغر نے آہستہ سے اس شخص کا بازو دبا کر اسے متوجہ کیا اور اشارے سے سیٹ چھوڑنے کا حکم دیا۔ اب وہ خود آنکھ لگائے سامنے موجود عمارت کا جائزہ لے رہا تھا۔ صورت حال وہی تھی جو اسے بتائی گئی تھی۔ وہ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ سامنے موجود عمارت کے دفاتر میں کیا ہورہا ہے۔ پوری عمارت میں بس دائیں جانب بنائی گئی سیڑھیاں ہی دکھائی دے رہی تھیں اور اس وقت ان سیڑھیوں سے اپنی وردی سے چپڑاسی دکھائی دیتا ایک آدمی ہاتھ میں چند فائلیں لیے نیچے کی طرف جاتا دکھائی دے رہا تھا۔

اصغر کی دلچسپی کا اصل مرکز عمارت کا ٹاپ فلور تھا۔ حامد پر کڑا تشدد کر کے بالآخر وہ اس سے جو چند اہم معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تھے، ان میں سے اہم ترین اطلاع یہی تھی کہ اس عمارت کے ٹاپ فلور پر میڈم ایکس کا قبضہ تھا۔ یہاں اس کے دفاتر بھی تھے اور رہائشی یونٹ بھی۔ وہ عمارت میں آمد و رفت کے لیے ایک پرائیویٹ لفٹ استعمال کرتی تھی۔ یہ لفٹ عمارت کے گراؤنڈ فلور پر واقع پارکنگ اور اس سے آگے بیسمنٹ تک جاتی تھی۔ عمارت کا بیسمنٹ کئی حصوں میں منقسم تھا اور ہر حصہ مختلف کمپنیوں کے استعمال میں تھا جسے وہ اپنے ریکارڈ روم یا اسٹور وغیرہ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ میڈم ایکس کی تحویل میں موجود حصہ ساؤنڈ پروف تھا جسے ضرورت کے مطابق مختلف مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

"یہاں سے نگرانی بس اس حد تک کارآمد ہے کہ ہمارے مطلوبہ حلیے والے مرد اور عورت میں سے کوئی سیڑھیوں کا استعمال کرے اور اس بات کا امکان بہت کم ہے کہ لفٹ کے ہوتے ہوئے کوئی سیڑھی کا استعمال کرے۔" پرویز اس کے پیچھے آکھڑا ہوا اور اپنی رائے دی۔

"ابن کو ہر ایریا کور کرنا ہے۔ ادھر پارکنگ کی Exit پر بھی بندے بٹھائے ہیں۔ کہیں سے بھی اپنے مطلب کا کچھ بھی مل سکتا ہے۔ تو بس اپنے کو ہر بات کی اطلاع دیتے رہنا۔" اصغر نے اسے جواب دیا۔ حقیقتاً وہ خود لالہ کی ہدایات پر عمل کررہا تھا اور وہی ہدایات اپنے آدمیوں تک پہنچا دیتا تھا۔

"کہو تو وہ آواز سنانے والی ڈبی ابھی ادھر لگوا دوں۔ کچھ تو سن گن ملے اور بندہ خالی بیٹھا مکھیاں مارنے سے بچے۔" پرویز بھاگ دوڑ اور مار کٹائی کرنے والی فطرت کا بندہ تھا اس لیے اسے چند گھنٹوں میں ہی نگرانی کے اس سست عمل سے اکتاہٹ ہونے لگی تھی۔

"ہرگز نہیں۔" اصغر ٹیلی اسکوپ چھوڑ کر فوری طور پر اس کی طرف گھوما اور تیز لہجے میں بولا۔

"ڈبیا کو فائر کرنے کے لیے تمہیں کھڑکی کھولنا پڑے گی اور ایسے میں تم لوگ کسی کی نظر میں بھی آسکتے ہو۔"

"بس دو منٹ کی تو بات ہے۔"

"دو سیکنڈ کے لیے بھی ایسا نہیں کرنا۔ جب بتا دیا ہے کہ کام آدھی رات کے بعد کرنا ہے تو بس اسی ٹائم کرنا ہے اور دھیان رکھنا ہے کہ اس ٹائم یہاں معمولی سی بھی روشنی نہ ہو۔ تم لوگوں کا نظر میں آجانا ساری محنت کو ضائع کردے گا۔" وہ بہت سختی سے پرویز کو باور کروا رہا تھا کیونکہ یہ تو وہ بھی جانتا تھا کہ حامد سے معلومات اگلوانے میں کتنی محنت لگی تھی اور اس حساس آلے کا حصول کتنے مہنگے داموں ممکن ہوا تھا جسے کسی گولی کی طرح اس کے ٹریگر سے فائر کر کے کسی بھی

ٹھوس سطح پر چسپاں کیا جاسکتا تھا اور پھر اس کی مدد سے اردگرد کے علاقے میں پیدا ہونے والی انسانی آوازیں سنی جاسکتی تھیں۔

''ٹھیک ہے بابا! نہیں کروں گا اپنی مرضی۔ تم شانت ہوجاؤ۔'' اس کے لہجے نے پرویز کو سمجھا دیا کہ وہ کتنی ہی بیزاری محسوس کیوں نہ کرے، کرنا اسے وہی ہے جو کہا گیا ہے۔

''مجھے تیری طبیعت کا پتا ہے اس لیے میں خود ادھر آیا تھا۔ خیال رکھنا، جلد بازی تیرے ساتھ دوسروں کو بھی مروادے گی۔ اگلی پارٹی جتنی تگڑی ہے، تجھے اس کا اندازہ ہی نہیں ہوسکتا۔'' پرویز کو ہدایات دیتے ہوئے اصغر کو درحقیقت خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کا واسطہ کن لوگوں سے پڑا ہے۔

☆☆☆

شڑاپ......شڑاپ......شڑاپ......کوڑا ایک تسلسل سے جس شخص پر برس رہا تھا، وہ کتنا ہی مضبوط قوتِ ارادی کا مالک سہی، تھا تو گوشت پوست سے بنا انسان ہی۔ ابتدائی تین چار ضربیں خاموشی سے برداشت کرلینے کے بعد اب اس کے منہ سے کراہیں نکلنا شروع ہوگئی تھیں اور وہ کوشش کے باوجود انہیں روکنے میں کامیاب نہیں تھا۔

''تم خوامخواہ اس کو ظلم کا نشانہ بنارہے ہو۔ یہ میرے ساتھ ضرور تھا لیکن اس کا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں جن کے بارے میں تم جاننا چاہتے ہو۔'' سونیا نے ایک نظر ضبط کی کوشش میں سرخ پڑتے معاذ کے چہرے کو دیکھا اور تنتے ہوئے چہرے کے ساتھ زانگ تاؤ سے مخاطب ہوئی۔

''اس کا نہ سہی پر تمہارا تو سمبندھ ہے ان لوگوں سے۔ تم بتاؤ ہمیں ان کے بارے میں۔'' زانگ تاؤ مکاری سے بولا اور کوڑے برسانے والے کو اشارہ کیا کہ ہاتھ نہ روکے۔

''بتایا تو ہے کہ میرا کوئی تعلق نہیں کسی سے۔ وہ گولڈن اسٹار بس اتفاق سے میرے ہاتھ لگ گیا تھا۔'' بے شک وہ چند وجوہات کی بنا پر تنظیم سے بددل ہوئی تھی اور معاذ کی محبت میں ماں کی مخالف سمت میں بھی چل پڑی تھی لیکن اس کی پرورش تو ان ہی لوگوں کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ بچپن سے اس کے دماغ میں یہ بات بٹھائی گئی تھی کہ جان دے دینا لیکن دشمنوں کے سامنے تنظیم کا کوئی راز افشا نہ کرنا۔ اس لیے آج بھی اس کے لیے زبان کھولنا مشکل تھی۔ اس مشکل کو ایک ذاتی وجہ نے اور بھی شدید کردیا تھا اس لیے اس کی زبان کھلنے کو تیار ہی نہیں ہورہی تھی۔

''اس لڑکے کو اتنا مارو کہ اس کی کھال گرجائے۔ اس کی جان نکلنے سے پہلے تمہارے ہاتھ رکنے نہ پائیں۔'' بھکشو زانگ تاؤ نے خونخوار لہجے میں حکم جاری کیا اور ساتھ ہی ایک دوسرے بندے کو بھی اشارہ کردیا۔ اب معاذ کے جسم پر بیک وقت دو آدمی کوڑے برسارہے تھے اور اس کی کراہیں پہلے کے مقابلے میں مزید بلند ہوگئی تھیں۔ اتنی تکلیف کے باوجود بھی اس نے ایک بار بھی سونیا کو نہیں پکارا تھا اور نہ ہی اس سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ اپنی زبان کھول کر اسے اس اذیت سے نجات دلادے۔ وہ تو اس کی طرف دیکھ تک نہیں رہا تھا اور سونیا اس کے اس انداز کو سمجھ رہی تھی۔ اس نے فیصلے کا اختیار مکمل طور پر اس کے ہاتھ میں دے دیا تھا اور کسی صورت اسے مجبور نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''یہ نرک میں پہنچ جائے تو اسے لے آنا جس کی ٹانگ زخمی ہے۔ دیکھتے ہیں یہ اپنے کتنے ساتھیوں کو اپنی ضد کی بھینٹ چڑھاتی ہے۔'' زانگ تاؤ کا لہجہ غصے میں قہر برسارہا تھا۔

''رک جاؤ۔ فار گاڈ سیک! رک جاؤ۔ جو تم جاننا چاہتے ہو، میں تمہیں بتاؤں گی لیکن پلیز! کسی کو کچھ نہ کرنا۔ یہ سارے نردوش ہیں اور ان میں سے کوئی بھی وہ نہیں جانتا جو میں جانتی ہوں۔'' معاذ کے جسم سے خون نکل کر لکیروں کی صورت بہنے لگا تو سونیا کا ضبط جواب دے گیا۔ یوں بھی زانگ تاؤ کے لہجے کی سفاکی نے اسے بتادیا تھا کہ وہ اپنے کہے پر عمل کرے گا اور یہ وہ جانتی تھی کہ معاذ اسے اپنا خون معاف کردے گا لیکن اپنے ساتھیوں میں سے کسی پر آنچ آنا اسے گوارا نہیں ہوگا۔

''رک جاؤ بھئی اور ذرا بندے کے زخموں پر کوئی مرہم شرہم لگاؤ۔ اپنی شریمتی جی کی یادداشت واپس آگئی ہے تو ان کے ساتھی کو بھی تھوڑا آرام دو۔'' بھکشو کے حکم پر کوڑے برساتے ہاتھ رک گئے اور فوراً ہی زخموں سے خون روکنے کا کام شروع کردیا گیا۔

''اب بولنا شروع کردو دیوی جی! پر یاد رکھنا، جہاں تمہاری زبان رکی، وہیں میرے سیوکوں کے ہاتھ بھی مرہم لگانا چھوڑ کر اس کے زخموں پر نمک مرچ لیپنا شروع کردیں گے۔'' بھکشو زانگ تاؤ نے سونیا کے بولنے سے پہلے ہی اسے دھمکانا ضروری سمجھا تھا۔ ویسے وہ شخص بھکشوؤں کی عمومی امن پسند فطرت کے بالکل مخالف تھا اور ایسا لگتا تھا کہ کسی انسان پر کیا جانے والا تشدد اسے تسکین دیتا ہے۔

''میں تمہیں سب کچھ بتادوں گی۔'' سونیا نے اسے یقین دہانی کروائی اور ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔ پتا نہیں وہ اپنے الفاظ کو مجتمع کررہی تھی یا عہد شکنی کے لیے دل

ہی دل میں معافی مانگ رہی تھی۔
"گولڈن اسٹار اسرائیلیوں کی قائم کردہ ایک تنظیم ہے۔ اس بات کو بہت سے لوگ جانتے ہیں۔ گولڈن اسٹار بھاری معاوضے پر ان سارے ممالک کو سروسز فراہم کرتی ہے جن کے مفادات اسرائیل سے وابستہ ہیں۔ سروسز لینے والے ممالک جہاں ممکن ہو ہمیں فیسی لیٹ بھی کرتے ہیں۔ اسی لیے گولڈن اسٹار نے تقریباً پوری دنیا میں اپنی جڑیں بہت مضبوط کرلی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اب یہ تنظیم دنیا پر اسرائیل کی تنہا حکمرانی کے خواب دیکھ رہی ہے۔"
"تنہا......! تمہارا مطلب ہے بالکل اکیلے...... کسی کو اپنے ساتھ ملائے بغیر؟" زانگ تاؤ نے حیرت سے پوچھا۔
"ایسا ہی ہے لیکن پہلے مرحلے میں چھوٹے ممالک کو نشانہ بنایا جائے گا۔ بڑے اور دوست ممالک کے لیے ان کی پالیسی ذرا مختلف ہے۔ ہوسکتا ہے ظاہری طور پر ان کے حکمران نہ بدلیں لیکن ان ممالک میں بھی ہوگا وہی جو اسرائیل چاہے گا۔"
"یہ تو کسی دیوانے کا سپنا لگتا ہے۔" زانگ تاؤ بڑبڑایا۔
"وہ لوگ جس دیوانگی سے اس سپنے کو پورا کرنے کے لیے کام کررہے ہیں، وہ دن دور نہیں جب دنیا سچ مچ ایسا ہوتا دیکھے گی۔" سونیا نے دعویٰ کیا۔
"مگر کیسے؟ کیا دنیا میں اپنے چند آتنک وادیوں کو پھیلا کر ایسا کرنا ممکن ہوسکتا ہے؟" زانگ تاؤ ماننے کو تیار نہیں تھا۔
"تمہیں صرف آتنک وادی کیوں دکھائی دے رہے ہیں؟ تم ان سائنٹسٹس اور ایکسپرٹس کو کیوں نہیں دیکھتے جو دنیا بھر سے علم حاصل کرنے کے بعد لیبارٹریز میں ہر روز ایک نئی انوینشن کررہے ہیں۔ ان تاجروں کی طرف تمہارا دھیان کیوں نہیں جاتا جو ہر بڑی پروڈکٹ کے مالک ہیں۔ اکنامکس کو یہودیوں سے بڑھ کر جاننے والی دنیا میں کوئی دوسری قوم موجود نہیں ہے۔ تم ایک ایک کرکے ہر فیلڈ کے بارے میں سوچتے جاؤ اور پھر بتاؤ کہ وہ کون سی جگہ ہے جہاں یہودی موجود نہیں ہیں۔ یہودی اور اسرائیل دونوں ایک دوسرے سے الگ دو نام نہیں ہیں۔ دنیا کا ہر یہودی جس نے چاہے اپنی زندگی میں ایک بار بھی اسرائیل میں قدم نہ رکھا ہو، وہ اسرائیل کا وفادار ہے۔ اسرائیل سے وفاداری کے بغیر کسی یہودی کا ایمان مکمل نہیں ہوسکتا۔" وہ جو کچھ کہہ رہی تھی، اس نے معاذ کو اپنی تکلیف بھلا کر پوری طرح اس کی طرف متوجہ کردیا تھا۔ یہ اس سے بہت آگے کی باتیں تھیں جو اب تک سونیا اسے بتا چکی تھی۔
"وشواس نہیں ہوتا کہ تم جو کچھ کہہ رہی ہو، وہ سچ ہے۔" زانگ تاؤ اب بھی بے یقینی کا شکار تھا۔
"نہ کرو وشواس لیکن ایک دن دنیا یہ سب ہوتا دیکھے گی۔ ہوسکتا ہے وہ وقت آنے تک میں اور تم نہ رہیں لیکن یہ خواب مرے گا نہیں۔ یہ ایک دن پورا ہو کر رہے گا۔ اسرائیل دنیا کے ہر ملک کی شہ رگ پر انگوٹھا رکھنے کی بھرپور تیاری کررہا ہے۔ ہتھیار، منشیات، معیشت اور موسم...... ہر شے آنے والے سمے میں اسرائیل کے کنٹرول میں ہوگی۔ زندہ بس وہ رہے گا جو سر جھکا کر اس کی غلامی کرے گا۔ سر اٹھانے والوں کو انگلی کی ایک جنبش سے کچل دینے کا اختیار ہوگا اسرائیل کے پاس۔" وہ بول رہی تھی اور اب زانگ تاؤ اسے جھٹلانے کے بجائے غور سے سن رہا تھا۔ وہ خود دنیا کے ایسے ملک کا شہری تھا جس نے قلیل مدت میں انتھک محنت سے اپنا آپ منوایا تھا اور ہر شعبے میں ترقی کرکے خود کو اس لائق بنالیا تھا کہ کسی طاقت کے لیے اسے آنکھیں دکھانا آسان نہیں رہا تھا۔
"کوئی ملک کتنا ہی طاقتور ہو اور کتنی ہی بڑی مین پاور (افرادی قوت) رکھتا ہو، اس سے کیا کرسکے گا جب اس کے قیمتی جنگلات میں اچانک ہی ایسی آگ بھڑک اٹھے گی جو جنگل کو راکھ کیے بغیر بجھنے کا نام نہیں لے گی۔ اس کی آبادیوں میں ایسے وبائی امراض پھوٹیں گے جن سے بچاؤ اور حفاظت کی دوا تیار کرتے کرتے وہ تھک مریں گے۔ زلزلوں سے پورے پورے شہر الٹ جانے کے بعد سروائیول کی جنگ لڑنا کتنوں کے لیے ممکن ہوگا؟ کوئی خشک سالی کے ہاتھوں مرے گا تو کسی کو سیلاب لے ڈوبیں گے۔ تم اندازہ ہی نہیں لگاسکتے کہ اس دنیا کو اپنے کنٹرول میں کرنے کے لیے کتنے ٹول تیار کیے جاچکے ہیں اور کتنے لیبارٹریز میں تیاری کے پروسس میں ہیں۔ اسرائیل اگر گولڈن اسٹار جیسی تنظیموں کی صورت طاقتور ممالک کے لیے کرائے کا ٹٹو بنا ہوا ہے تو صرف اس لیے کہ اسے ہر بڑی ٹیکنالوجی کے حصول کے لیے بھاری فنڈز کی ضرورت ہے۔ یہ فنڈز ایک طرف معاوضے کے طور پر حاصل کیے جارہے ہیں تو دوسری طرف ہم جیسے کارکن دنیا سے لوٹ کھسوٹ کر اس تک پہنچا رہے ہیں۔ نیچے سے لے کر اوپر تک ہر لیول پر کام ہورہا ہے۔ وسائل سے بھی پہلے ذہنوں پر قبضے کی تیاری ہے۔ کوئی کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو، اس کے ذہن میں شک کا بیج بودیا گیا ہے۔ الجھے ہوئے ذہنوں والی پوری ایک نسل تیار

ہو رہی ہے اور یہ نسل ایسی ہوگی جو ملک اور قوم تو کیا، اپنا بھی کوئی بھلا نہیں کر سکے گی۔'' انکشافات کا سلسلہ تھا کہ رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اوّل اوّل حیرت کا شکار معاذ کو بتدریج اس کی ہر بات کا یقین آتا جا رہا تھا۔ جو کچھ وہ کہہ رہی تھی، وہ کسی نہ کسی صورت اس کے ارد گرد موجود تو تھا لیکن اس سب سے مسلسل چشم پوشی اختیار کی جا رہی تھی۔ صاحب اختیار و اقتدار افراد اپنی عیاشیوں اور بینک بیلنس میں اضافے سے آگے کی نہیں سوچتے تھے اور عوام کو شعور نہیں تھا کہ وہ کتنے خطروں کی زد میں ہیں۔ کہیں تھوڑا بہت ادراک تھا بھی تو بچاؤ کی راہ نہیں سوجھتی تھی۔

''سن رہے ہو مانک! جو کچھ یہ تمہاری سو کالڈ ساتھی بتا رہی ہے؟ وشواس کرو، اگر ہم نے اس کی ڈاڑھ میں چھپا سائنائڈ کا کیپسول نہ نکال لیا ہوتا تو یہ ہمیں یہ سب کچھ بتانے کے بجائے آتما ہتھیا کر چکی ہوتی۔'' زانگ تاؤ نے معاذ کو مخاطب کر کے معنی خیز لہجے میں جتایا۔ جواباً معاذ کچھ نہ بولا اور خاموشی سے اس شخص کو دیکھتا رہا جو اسے بندشوں سے آزاد کر رہا تھا۔ اس کا دوسرا ساتھی ہاتھ میں گن تھامے بالکل چوکنا کھڑا تھا۔ اس کے علاوہ بھی وہاں مزید دو مسلح افراد موجود تھے اور ان کے ہوتے ہوئے کسی غلط حرکت کی گنجائش نہیں تھی۔

''سوری معاذ! مجھے معلوم ہے کہ میں نے تمہیں ہرٹ کیا ہے۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔ میں نے تمہیں کتنے ہی دھوکے میں رکھا ہو لیکن یہ سچ اپنی جگہ رہے گا کہ میں نے تم سے بالکل سچی محبت کی ہے۔'' بالکل غیر متوقع طور پر سونیا نے اسے مخاطب کر کے کہا تو وہ بھکشو کی طرح اسے نظر انداز نہیں کر سکا۔ کچھ ایسا تھا اس کے لہجے میں جس نے اسے نظریں اٹھا کر سونیا کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا۔ دونوں کی نظریں آپس میں ملیں اور یکدم ہی معاذ کو ادراک ہوا کہ وہ اس سے صرف معافی نہیں مانگ رہی تھی، وہ اپنی زندگی کے آخری الفاظ ادا کر رہی تھی۔ اس نے اپنے قریب کھڑے شخص کو دھکا دیا اور چھلانگ لگا کر سونیا تک پہنچنے کی کوشش کی لیکن وہ اس سے پہلے ہی حرکت میں آ چکی تھی اور بجلی کی طرح لپک کر زانگ تاؤ کی کمر کے ساتھ بندھی کٹار کھینچ لی تھی۔ اس ساری صورت حال پر وہاں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا تھا۔ زانگ تاؤ کے ساتھی ہتھیار سونتے للکاریں مار رہے تھے۔ یقینی طور پر وہ چینی زبان میں اسے زانگ تاؤ سے دور رہنے اور گولی مار دینے کی دھمکی دے رہے تھے۔ اگر وہ زانگ تاؤ کے بے حد قریب نہ ہوتی تو وہ صرف دھمکی دینے کے بجائے گولی بھی چلا دیتے۔ ایسے وقت میں زانگ تاؤ نے ہی ہوش و حواس سے کام لیا اور سونیا کے کٹار والے ہاتھ کو دبوچ کر کٹار پر اس کے ہاتھ کی گرفت ختم کرنے کی کوشش کی۔ ردعمل میں سونیا نے اسے ایک زوردار لات رسید کی جس کے نتیجے میں وہ الٹ کر پیچھے جا گرا۔ ہاتھ زانگ کی گرفت سے آزاد ہوتے ہی سونیا نے کٹار کا رخ اپنی گردن کی طرف کر لیا۔ معاذ نے جو اس کے قریب پہنچ چکا تھا، اس کے ہاتھ پر ہاتھ ڈالا لیکن شاید اسے دیر ہو چکی تھی اور سونیا کی گردن پر ابھرنے والی سرخ لکیر نے تیزی سے خون اگلنا شروع کر دیا تھا۔

☆☆☆

برف پر اپنے تھکے ہوئے قدموں کو گھسیٹتا جب وہ بالکل ہی نڈھال ہو گیا تو نہ چاہتے ہوئے بھی رکنے کا فیصلہ کرنا پڑا اور ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر ہانپی ہوئی سانسیں لینے لگا۔ وہ مسلسل کئی روز سے اس برف زار میں موجود تھا اور وہ بھی کسی ساتھی کے بغیر۔ اتنے دشوار گزار راستوں اور سخت موسم کا مقابلہ تن تنہا کرنے کے لیے جس وحشت اور جنون کی ضرورت تھی، اس کی اس کے پاس کوئی کمی نہیں تھی۔ وہ باؤل تھا۔ وحشیانہ فطرت والا وہ جنونی انسان جو اگر کچھ کرنے کی ٹھان لیتا تو پھر کسی بات کی پروا نہیں کرتا تھا۔ خود اپنی جان کی بھی نہیں۔ اس نے جس وقت بھکشوؤں کا تعاقب کرنے کا فیصلہ کیا تھا، وہ جانتا تھا کہ وہ ایک ایسے اندھے سفر پر جا رہا ہے جس کے دوران اس کے ساتھ کچھ بھی پیش آ سکتا ہے لیکن اس کی حیوانی جبلت نے اسے زیادہ غور و خوض کا موقع نہیں دیا تھا اور اس نے لمحوں میں خود کو اس مشکل میں جھونک دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اپنے اس اندھے فیصلے کے نتیجے میں اس نے اچھی خاصی صعوبتیں برداشت کی تھیں۔ مسلسل پیدل چلتے رہنے سے پیروں میں چھالے ہو گئے تھے اور سوجن اتنی زیادہ ہو گئی تھی کہ اس کے جوتے تنگ ہو گئے تھے۔ سب سے بڑا عذاب ٹھنڈک کا تھا۔ بھاری گرم کپڑوں کے باوجود سردی اتنی زیادہ تھی کہ بندہ اگر پہلو بدلے بغیر زیادہ دیر ایک زاویے سے بیٹھا رہے تو اسی زاویے پر جم کر رہ جائے۔ اس کے پاس موجود سامان کے تھیلے میں سلیپنگ بیگ اور ایک چھوٹا سا اسٹوو نہ ہوتا تو وہ زندہ بھی نہ رہ پاتا۔ اسٹوو کو بھی اس نے نہایت کفایت شعاری سے انتہائی ضرورت کے وقت استعمال کیا تھا۔ حقیقتاً سردی سے لڑتے لڑتے اس کی حالت پتلی ہو گئی تھی اور پورے سفر میں ایک آدھ بار ہی یہ

موقع میسر آیا تھا کہ سوکھی لکڑی مل جانے پر اس نے آگ جلا کر اپنے منجمد ہوتے وجود کو گرمی پہنچائی تھی۔

بھکشوؤں کا پیچھا کرتے اور ان کے ٹھکانے تک پہنچتے ہوئے موسم پھر بھی اتنا سخت نہیں تھا لیکن واپسی کے سفر میں درجۂ حرارت یکدم ہی کئی ڈگری نیچے گر گیا تھا۔ موسم کے ساتھ ساتھ اسے خوراک کی کمی کا مسئلہ بھی درپیش تھا۔ وہ جو خشک خوراک ساتھ لے کر چلا تھا، وہ کفایت شعاری سے استعمال کرنے کے باوجود ختم ہو گئی تھی اور اب وہ گزشتہ کئی گھنٹوں سے بھوکا تھا۔ بھوک، تنہائی اور تھکن آہستہ آہستہ اس کے اعصاب کو متاثر کر رہی تھی لیکن وہ آخری حد تک لڑنے اور حالات کا مقابلہ ڈٹ کر کرنے والوں میں سے تھا۔ اگر اس کی فطرت میں منفی خصوصیات کے رنگ ضرورت سے زیادہ گہرے اور تیز نہ ہوتے اور وہ مناسب ماحول اور ہاتھوں میں پرورش پاتا تو اس باذل سے مختلف ایک شاندار جوان بھی ہو سکتا تھا لیکن وہ نہیں تھا کہ اس کی رگوں میں تاجور بائی کا خون دوڑتا تھا اور اپنی مشکوک ولادت نے اس کے اندر غم و غصے کا وہ الاؤ دہکائے رکھا تھا جس نے اس کی شخصیت کو ایک ایسے آتش فشاں پہاڑ کا روپ دے دیا تھا جو وقتاً فوقتاً تھوڑا تھوڑا لاوا اگلتا رہتا تھا۔ یہ کھولتا ہوا لاوا ابھی کسی عورت کی عزت کو خاک کر دیتا تھا تو کبھی کسی جیتے جاگتے وجود کو دردناک اذیت دے کر بھسم کر ڈالتا تھا۔ وہ سراپا قہر تھا اور اس قہر کی زد میں کبھی بھی، کوئی بھی آ سکتا تھا۔ خود اس کا اپنا آپ بھی۔

اب بھی دشمن کو نیست و نابود کر دینے کی ضد اسے اس حد تک لے آئی تھی کہ وہ غیر یقینی حالات میں بھوکا پیاسا ایک پتھر پر بیٹھا ہانپ رہا تھا اور خود کو سمجھا رہا تھا کہ اگر زندہ رہنا ہے تو ہمت کرو اور ایک بار پھر چلنا شروع کر دو ورنہ جس پتھر پر بیٹھے ہو، اسی پر بیٹھے بیٹھے حنوط ہو جاؤ گے۔ ہانپتی ہوئی سانسیں ذرا بحال ہوئیں تو اس نے خود کو دوبارہ چلنے پر آمادہ کر ہی لیا اور پتھر پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کھڑے ہوتے ہی اس کی آنکھوں نے ایک ایسا منظر دیکھا کہ رگ و پے میں جوش دوڑنے لگا۔ وہ ایک چھوٹا پہاڑی بکرا تھا جو جانے کس طرف سے بھٹک کر ادھر آ نکلا تھا اور کچھ بے چین سا ادھر اُدھر گردن کو جنبش دیتا اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ شاید اسے وہ راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا جس پر چل کر واپس اپنے ساتھیوں کے درمیان پہنچ جائے۔ اس بے زبان کو معلوم ہی نہیں تھا کہ باذل کی نظروں میں آنے کے بعد اس کے پاس واپسی کا کوئی راستہ ہی نہیں رہا تھا۔

اپنے وجود کو بالکل ساکت کرتے ہوئے اس نے بنا کسی آہٹ کے اپنا پستول نکالا اور دائیں ہاتھ کو دستانے سے آزاد کر کے احتیاط سے نشانہ باندھا۔ ٹریگر پر جمی اس کی انگلی نے دو بار جنبش کی اور اگلے ہی لمحے پہاڑی بکرے کا جسم زوردار جھٹکا کھا کر ڈھلان پر پھسلا۔ باذل نے پستول واپس رکھا اور پنڈلی سے بندھا خنجر کھینچ کر تیزی سے تڑپتے پھڑکتے بکرے کی طرف بھاگا۔ فاصلہ مختصر تھا۔ اس نے بکرے کے گلے پر چھری پھیر کر اس کی مشکل آسان کی اور تیزی سے کھال اتار کر کچھ گوشت الگ کیا۔ اب وہ اسٹوو جلائے اس پر گوشت کے پارچوں کو بھون رہا تھا۔ گوشت بھونے جانے کی خوشبو نے اس کی بھوک سے بے چین آنتوں کو مزید بے چین کر دیا تھا۔ بھوک کی زیادتی اور ایندھن کی کمی نے اسے زیادہ دیر گوشت کو بھوننے کی اجازت نہیں دی اور جلدی جلدی کچا پکا گوشت دانتوں سے نوچنے لگا۔ کئی گھنٹوں بعد میسر آنے والی یہ خوراک جو کہ مرچ مسالوں سے محروم تھی، اس کے لیے اعلیٰ ترین ریستورانوں میں کھائے جانے والے کھانوں سے زیادہ عمدہ تھی۔ وہ گوشت کا شوقین تھا اور شدید ترین بھوک میں تازہ اور منفرد ذائقے کا گوشت میسر آ جانے پر خوشی سے جھوم اٹھا تھا۔ وہ جب سے اس برف زار میں موجود تھا، رک سیک میں موجود بھنے چنوں، خشک میوہ جات اور چاکلیٹس کے علاوہ کسی چوتھی شے کا ذائقہ چکھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ اب اپنے ذوق کے مطابق خوراک میسر آئی تھی تو جی بھر کر اسے اپنے شکم میں اتار رہا تھا۔ شکم سیری کے بعد اس نے برف سے ہی اپنی پیاس بجھائی اور پھر بکرے پر سے مزید گوشت کے پارچے اتارنے لگا۔ پورے کا پورا گوشت ساتھ لے جانا ممکن نہیں تھا اس لیے اس نے باقی رہ جانے والے راستے کی مناسبت سے گوشت کے ٹکڑے کاٹ کر پلاسٹک کی ان خالی تھیلیوں میں منتقل کیے جن میں محفوظ خوراک وہ کب کی اپنے معدے میں اتار چکا تھا۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ ایک بار پھر سفر کے لیے تیار تھا۔ بھرے پیٹ کی آسودگی نے اس دشوار سفر کی کوفت کو قدرے کم کر دیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ کچھ روز قبل پاکستان سے روانہ ہوتے وقت اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایسی کسی جگہ پہنچ جائے گا۔

وہ تو وکی کے پیچھے پیچھے حیدرآباد پہنچا تھا۔ اسے اس کام پر لگانے والوں نے ہی اطلاع دی تھی کہ وکی کہاں موجود ہے۔ وہ بتائے ہوئے مقام پر پہنچ کر اپنا لائحہ عمل طے کر ہی رہا تھا کہ اسے حکم دیا گیا کہ وہاں جو ہو رہا ہے، وہ

ہونے دے اور ایک فون نمبر پر رابطہ کرنے کے بعد وہاں سے ملنے والی ہدایات پر من وعن عمل کرے۔ اس نے ایسا ہی کیا تھا اور نتیجتاً اس گاڑی میں سوار ہو گیا تھا جو قیدیوں کو لے کر کسی نامعلوم ٹھکانے کی طرف جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ اس سفر میں قیدیوں کے علاوہ تین مزید افراد شامل تھے۔ ان میں سے دو باری باری ڈرائیونگ کرتے تھے جبکہ ایک بے ہوش قیدیوں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ وہ تینوں اس سے لیے دیے سے رہتے تھے لیکن ان کی آپس کی گفتگو سے اسے چند باتیں معلوم ہو گئی تھیں۔ وہ جان گیا تھا کہ انہیں کسی سرد مقام تک پہنچنا ہے اور اس سرد مقام تک پہنچنے سے پہلے انہوں نے راستے میں گرم کپڑوں اور خشک خوراک کی خریداری بھی کی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ گاڑی بس ایک مخصوص مقام تک جائے گی جہاں کچھ لوگ اسے اور قیدیوں کو وصول کرنے کے لیے موجود ہوں گے۔ باقی لوگوں کو اسی مقام سے واپس لوٹ جانا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ جہاں اسے لے جایا جا رہا ہے، وہاں اس کے ذمے کیا کام ہوگا لیکن وہ بے چون وچرا وہاں تک جانے کے لیے تیار ہو گیا تھا کہ ایک تو اسے میڈم ایکس کو ناراض کرنا منظور نہیں تھا، دوسرے وہ سارے لوگ جو آج کل دشمنوں کی فہرست میں سب سے اوپر تھے، وہیں لے جائے جا رہے تھے اور اسے امید تھی کہ اسے ان سے نمٹنے کا بھرپور موقع ملے گا۔

اس کی سوچ جو بھی تھی، قدرت نے اس سے ہٹ کر منصوبہ بندی کر رکھی تھی۔ ڈرائیور تجربہ کار تھا اور اس کا ان علاقوں میں یہ کوئی پہلا سفر نہیں تھا پھر بھی جانے کیا ہوا کہ حادثہ پیش آ گیا۔ حادثے کے وقت وہ بالکل دروازے کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ دروازہ جھٹکے سے کھلا تو وہ توازن قائم نہ رکھتے ہوئے باہر جا گرا۔ گرنے سے اسے چوٹیں تو آئیں لیکن یہ گرنا ہی اس کی زندگی بچا گیا۔ وہ جب تک سنبھلتا اور الٹی ہوئی گاڑی کے قریب پہنچتا، وہاں بھکشو آ گئے تھے۔ وہ فوری طور پر ان کے سامنے جانے کے بجائے ایک جگہ چھپا ان کی کارروائی دیکھتا رہا۔ انہوں نے اس کے سامنے گاڑی سے زخمیوں اور لاشوں کو نکالا پھر زخمیوں کو طبی امداد دینے لگے۔ باذل کو خود بھی مرہم پٹی کی ضرورت تھی لیکن وہ ان کے سامنے جانے سے جھجک رہا تھا کہ وہ اس سے قیدیوں کی بابت سوال جواب کرتے۔ اس کے آزاد ہونے سے یہ بات تو بالکل واضح تھی کہ وہ قیدیوں کے بجائے ان کا ساتھی ہے جو قیدیوں کو لے کر جا رہے تھے۔

اسی شش و پنج میں کچھ لمحے مزید سرک گئے۔ حادثہ جس مقام پر پیش آیا تھا وہ کوئی عام گزرگاہ نہیں تھی کہ کسی اور کے آنے کا امکان ہوتا۔ وہ بھکشو بھی جانے کیوں موجود تھے اور ان کے انداز واطوار دیکھ کر اسے یہ نہیں لگ رہا تھا کہ وہ ان سیدھے سادھے بھکشوؤں کی طرح ہیں جو تارک الدنیا ہو کر اپنی تپسیا میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ اس کے سامنے جو لوگ موجود تھے، ان کی حرکات وسکنات میں ایک طرح کی ہوشیاری اور تیزی وطراری تھی۔ سونیا کو طبی امداد دینے والا بھکشو اس کے گلے میں موجود زنجیر اتار کر تیز لہجے اور آواز میں اپنے ساتھیوں کو پکارنے لگا تو صورت حال میں تیزی سے تغیر آیا۔ وہ فاصلے پر ہونے کے باوجود زنجیر میں جھولتا سنہری ستارہ دیکھ سکتا تھا اور اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ اس سنہری ستارے کو دیکھ کر بھکشوؤں کے رویے میں عجیب سی تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ کچھ دیر کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ تیز تیز لہجے میں بولتے رہے تھے اور پھر گویا ان کے درمیان وہاں سے کوچ کر جانے کا فیصلہ ہو گیا تھا۔ باذل کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ اکیلے نہیں جا رہے تھے بلکہ قیدیوں کو بھی انہوں نے اپنے ساتھ لے لیا تھا اور انہیں اپنے خچروں پر لادے تیزی سے وہاں سے روانہ ہو گئے تھے۔

ان کے روانہ ہونے کے بعد باذل جائے حادثہ پر پہنچا اور وہ سارا سامان نکال لیا جس کی اسے اس برفانی علاقے میں ضرورت پڑ سکتی تھی۔ بھکشوؤں کے مشکوک رویے نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ ان کا تعاقب کرے۔ بھکشوؤں کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ جلد از جلد سفر طے کر لینا چاہتے ہیں لیکن بے ہوش قیدیوں کی وجہ سے ان کے لیے اپنی رفتار تیز رکھنا ممکن نہیں تھا۔ ان کی یہ مجبوری اس کے لیے مددگار ثابت ہوئی تھی۔ وہ جسمانی طور پر چاق وچوبند اور مضبوط تو تھا لیکن ایسے راستوں پر سفر کرنے کا تجربہ نہیں رکھتا تھا اس لیے اس کی رفتار اتنی تیز نہیں تھی۔

بہر حال جیسے تیسے وہ ان کا پیچھا کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچ گیا تھا جہاں ان بھکشوؤں نے اپنا ٹھکانا بنا رکھا تھا۔ پہلے اس نے سوچا کہ رات کے وقت وہاں گھس کر ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرے گا لیکن ان کے پاس جدید اسلحے کی موجودگی اور مستقل پہریداری نے اسے اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ خوش قسمتی سے حادثے میں اس کا موبائل محفوظ رہا تھا۔ اس نے موبائل کی چارجنگ بچانے کے لیے زیادہ تر اسے بند رکھا تھا۔ اس لیے وہ استعمال کے قابل تھا۔ واپسی کے سفر میں وہ مختلف مقامات پر رک رک کر تمام اہم نشانیوں کی ویڈیو بناتا

رہا تھا تا کہ دوبارہ جب اس طرف آنا ہو تو بھٹکنے کے امکانات نہ رہیں۔ اگر اس علاقے میں نیٹ ورک دستیاب ہوتا تو ان سب کی ضرورت ہی نہ پڑتی اور وہ پہلی فرصت میں اپنے مددگاروں سے رابطہ کر لیتا لیکن اب اسے جو کچھ کرنا تھا، خود ہی کرنا تھا۔

اگرچہ اس کی زندگی ابتدا ہی سے ہنگاموں سے پُر رہی تھی لیکن اتنے سخت وقت سے وہ پہلی بار گزر رہا تھا کہ نہ کوئی مددگار آس پاس تھا، نہ سفر کی مناسب سہولیات۔ سوجے ہوئے زخمی پیروں کے ساتھ خالی پیٹ ایک برف زار میں چلتے چلے جانے کا تجربہ وہ یقیناً ساری زندگی نہیں بھول سکتا تھا اور کئی گھنٹے بھوکے رہنے کے بعد پیٹ بھرنے کی آسودگی کا نشہ بھی اس نے پہلی بار محسوس کیا تھا۔ اس نشے میں مست وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا کہ ایک زوردار للکار نے ٹھٹکنے پر مجبور کر دیا۔

''اسٹاپ!'' بلند آواز میں پکار کر نہ صرف اسے رکنے کا حکم دیا گیا تھا بلکہ تنبیہاً ایک گولی بھی چلا دی گئی تھی جو اس کے کان کے پاس سے سرسراتی ہوئی گزر گئی تھی۔

''ہینڈز اپ!'' رک جانے پر دوسرا حکم بھی فوراً ہی صادر ہو گیا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ اسے جدید اسلحے سے لیس چار افراد نے گھیر رکھا ہے۔ وہ ایک پسٹل اور خنجر کے زور پر تن تنہا اس کھلی جگہ پر ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا چنانچہ بے چون و چرا... اپنا بیگ نیچے رکھ کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ ان میں سے ایک اس کے قریب آیا اور اس کی جامہ تلاشی لینے لگا۔ جلد ہی وہ اس کا پسٹل اور خنجر اپنے قبضے میں لے چکا تھا۔

''کون ہو تم؟'' نقش و نگار اور رنگت سے اس کی قومیت کا اندازہ لگا کر اسی کی زبان میں سوال کیا گیا۔

''سیاح ہوں۔ پہاڑوں اور برف زاروں سے عشق کرتا ہوں اس لیے ان کے درمیان مارا مارا پھرتا ہوں۔'' اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

''سیاح...... یہاں اور وہ بھی بالکل تنہا؟''

''کوہ نوردی کا اصل مزہ تنہائی میں ہی ہے۔ میں کسی کو ساتھ رکھ کر خود کو ڈسٹرب کرنا پسند نہیں کرتا اس لیے ہمیشہ تنہا ہی سفر کرتا ہوں۔'' باذل کا انداز بڑا بے نیازانہ تھا۔

''لیکن یہ بہت خطرناک ہے۔ تمہیں کوئی حادثہ پیش آ گیا تو کوئی تمہاری ہیلپ کرنے والا بھی نہیں ہوگا۔'' اس سے گفتگو کرنے والا گفتگو کرتا جا رہا تھا جبکہ وہ شخص جس نے اس کی جامہ تلاشی لی تھی، اب اس کے رک سیک کی تلاشی لے رہا تھا۔

''میں ان پہاڑوں میں مر کر اگر اس کی برف کے نیچے دفن ہو گیا تو اسے اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔ مرنے کے بعد بھی اپنی پسندیدہ جگہ پر رہنے سے بڑی خوش قسمتی بھلا کیا ہو سکتی ہے۔'' وہ یوں ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا جیسے اس سے بڑھ کر کوئی پہاڑوں کا عاشق نہ ہو۔ عاشق بھی ایسا جسے اس کے عشق نے دیوانگی کی حد تک پہنچا دیا ہو۔

''تمہارا پاسپورٹ اور دوسرے شناختی کاغذات کہاں ہیں؟'' رک سیک کی تلاشی لینے والے نے اپنا کام ختم کر لیا تھا اور یہ سوال اسی کی جانب سے آیا تھا۔ وہ بہت جانچتی نظروں سے باذل کا جائزہ لے رہا تھا۔

''میرا چھوٹا بیگ جو بیلٹ کے ساتھ کمر سے بندھا تھا، ایک کھائی کو پار کرتے ہوئے کھائی میں جا گرا تھا۔ میرے سارے اہم ڈاکیومینٹس اور کرنسی اسی بیگ میں تھے اس لیے اب میں وہ سب کچھ کھو چکا ہوں۔'' وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جھوٹ بولنے کی صلاحیت رکھتا تھا اور اس وقت بھی پوری ڈھٹائی سے یہ کام کر رہا تھا۔

''کس کنٹری سے ہو؟'' پہلے والے نے اس سے پوچھا۔

''انڈیا۔'' غیر ملکیوں کے لیے انڈوپاک کے شہریوں کو الگ الگ شناخت کرنا مشکل ہوتا ہے لیکن ان دو ممالک کے لوگ بہ خوبی ایک دوسرے کو الگ الگ شناخت کر لیتے ہیں۔ اس نے بھی ان دو افراد کے لب و لہجے سے ان کی قومیت کا درست اندازہ لگا لیا تھا اس لیے خود کو ان کا ہم وطن ظاہر کرنے میں ہی بھلائی سمجھی۔

''انڈیا میں کہاں سے؟''

''تم لوگ اس کا انٹرویو ہی کرتے رہو گے یا کوئی کام کی بات بھی معلوم کرو گے؟'' باذل جواب میں کچھ کہتا، اس سے قبل ہی ایک تیسرے شخص نے گفتگو میں دخل دیا اور بیزاری سے اپنے ساتھیوں کو ٹوکا۔

''کام کا سوال تم کر لو۔ ہمیں تو یہ کچھ مشکوک لگ رہا ہے اس لیے اس کے بارے میں پوری جانکاری حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔'' جامہ تلاشی لینے والے نے ذرا سا برا مان کر اپنے اس ساتھی کو جواب دیا۔

''اس کو بعد میں ٹھوک بجا کر دیکھ لینا۔ ابھی تو اس سے پوچھو کہ اس نے کہیں چینی بھکشوؤں کو دیکھا ہے یا نہیں؟'' اس شخص کی زبان سے نکلنے والے سوال نے باذل کو چونکا دیا۔

''لگتا ہے ہمیں یہاں بھجوانے والوں کو حادثے کا علم ہو گیا ہے اور انہوں نے ہماری کھوج میں بندے لگا دیے

ہیں۔ ان لوگوں کو بھکشوؤں سے متعلق کوئی کلیو ملا ہوگا جب ہی انہیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ دل میں آنے والے اس خوش کن خیال نے ان لوٹوں کی طرف سے اس کے شکوک کم کر دیے اور کسی کے سوال کیے بغیر خود ہی بول پڑا۔

"میں نے چینی بھکشوؤں کو دیکھا تھا۔ وہ تعداد میں اچھے خاصے تھے اور لدے ہوئے خچروں کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔"

"ان کے خچروں پر کیا لدا ہوا تھا؟" فوراً ہی بے چینی سے سوال ہوا لیکن باذل نے فوراً جواب نہیں دیا اور چہرے پر ایسے تاثرات سجا لیے جیسے جواب دینے میں شش و پنج کا شکار ہو۔

"تم نے بتایا نہیں کہ ان کے خچروں پر کیا لدا ہوا تھا؟" اس بار ذرا سخت لہجے میں سوال دہرایا گیا۔

"میں ٹھیک سے دیکھ نہیں سکا۔ کیا ہے نا کہ انہوں نے خچروں کی پیٹھ کو بڑی بڑی چادروں سے ڈھانپ رکھا تھا۔ چادروں کے نیچے کیا ہے، دکھائی ہی نہیں پڑتا تھا، پرنتو......" اس نے ایک بار پھر زبان روک لی۔ اس طرح وہ ان کے تجسس کو ہوا دے رہا تھا۔

"پرنتو کیا......؟ جو ہے صاف بول۔"

"میں نے ایک چادر کے نیچے جھولتے کالے بال دیکھے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے...... جیسے خچر کے اوپر کوئی جوان مہیلا لدی ہو۔" اس نے ڈرنے، جھجکنے کی شاندار اداکاری کرتے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

"کس طرف جاتے دیکھا تم نے ان لوگوں کو؟" دیے گئے جواب نے سوال کرنے والوں کا جوش و خروش بڑھا دیا۔

"اگر تم لوگ مجھ پر وشواس کرو اور بتاؤ کہ تم ان لوگوں کو کیوں کھوج رہے ہو تو شاید میں تمہیں زیادہ اچھی طرح سے گائیڈ کر سکوں۔" اس بار اس نے تھوڑا کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ تصدیق ہو سکے کہ یہ وہی لوگ ہیں جو وہ سمجھ رہا ہے۔

"شرطیں رکھتا ہے سالا۔" اس کے مطالبے نے جامہ تلاشی لینے والے کو آپے سے باہر کر دیا اور وہ اسے مارنے کے لیے لپکا۔ اس کے ایک ساتھی نے درمیان میں آکر بمشکل اسے قابو کیا۔

"آپ لوگ مجھے غلط مت سمجھو۔ ہم ایک ہی دیش کے رہنے والے ہیں اور اپنے دیش سے پریم کرتے ہیں۔ میری بس اتنی اچھا ہے کہ میں اس بارے میں بس انہیں بتاؤں جن کا ادھیکار ہے۔" باذل بڑے سلجھے ہوئے لہجے میں اپنا موقف پیش کر رہا تھا۔

"تیری اچھا کی ایسی کی تیسی۔ اگر ہم نکلوانے پر آئے تو تیرے حلق میں ہاتھ ڈال کر ساری انفارمیشن نکلوا لیں گے۔" اس پر حملہ آور ہونے والے کو اگرچہ اس کا ساتھی پیچھے دھکیل چکا تھا لیکن اس کا غیظ و غضب اب بھی تھما نہیں تھا اور اب بھی خونخوار لہجے میں دھمکی دے رہا تھا۔

"تم چپ کر و شری! یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ پہلے ہمیں اپنے بارے میں اس کی تسلی کروانی چاہیے۔" چوتھا ساتھی جواب تک خاموش رہا تھا، گفتگو میں دخل انداز ہوا اور اپنے جوشیلے ساتھی کو ڈانٹنے کے بعد باذل کی طرف متوجہ ہو کر نرم لہجے میں بولا۔

"بات کیول اتنی ہے کہ ہمارے ساتھی ایک گاڑی میں کچھ کھاس (خاص) لوگوں کو لے کر ہم تک آرہے تھے کہ ان کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ ہمیں اس ایکسیڈنٹ کا پتا کافی سمے گزرنے کے بعد تب ہوا جب طے شدہ ٹائم گزرنے کے کئی گھنٹے بعد بھی وہ لوگ ہم تک نہیں پہنچے اور ہمیں ان کی کھوج میں نکلنا پڑا۔ ایکسیڈنٹ کی جگہ پر ہمیں کیول اپنے تین ساتھیوں کی لاشیں ملیں تو خود بخود دماغ میں ہلچل مچ گئی کہ باقی لوگ کدھر گئے۔ تھوڑی بھاگ دوڑ کے بعد جانکاری ملی کہ چینی بھکشوؤں کا ایک گروپ اپنے گرو سے ملنے ہماری سائڈ آیا ہوا تھا۔ یہ جگہ ایسی ہے کہ ہر طرف سرکار کی عملداری نہیں ہے اور بھکشوؤں اور کچھ دوسرے لوگوں کو ایسے راستوں کی جانکاری ہے جہاں سے چوری چھپے آنا جانا لگا رہتا ہے۔ ہمیں بھکشوؤں کی ادھر موجودگی کا پتا چلا تو ہم سمجھ گئے کہ وہ ہی ہیں جو ہمارے ساتھیوں کو اٹھا کر لے جا سکتے ہیں۔ بس اسی لیے ہم ان کی کھوج میں لگے ہوئے ہیں۔" اس کی بات کے اختتام تک باذل کا چہرہ خوشی سے کھل چکا تھا۔ جیسے ہی وہ چپ ہوا، خود چہک کر بولا۔

"بدھائی ہو، جن ساتھیوں کی کھوج میں آپ نکلے تھے، میں ان ہی میں سے ایک ہوں اور جانتا ہوں کہ ہمارے قیدیوں کو چینی بھکشو ہی اٹھا کر لے گئے ہیں۔ میں نے اپنی جان پر کھیل کر ان بھکشوؤں کا پیچھا کیا تھا اور ان کا ٹھکانا دیکھنے کے بعد مدد لینے ہی واپس آرہا تھا۔" یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ یہ وہی لوگ ہیں جن تک اسے پہنچنا تھا، اس نے کھل کر سب بتا دیا۔

"ٹھیک ہے۔ تو پھر تم ہمیں ترنت ان کے ٹھکانے پر لے چلو تاکہ ہم انہیں ان کی اس حرکت کا مزہ چکھا سکیں۔" جوشیلا بندہ ایک بار پھر جوش میں آگیا۔

''نہیں دوست!'' باذل نے نفی میں گردن ہلائی۔
''میری حالت اتنی کھراب (خراب) ہے کہ میں ترنت اتنا لمبا سفر دوبارہ نہیں کرسکتا۔ اس سفر کے لیے مجھے تھوڑے سے آرام اور علاج کی ضرورت ہے اور تم لوگوں کو تیاری کی۔ ان بھکشوؤں نے بہت محفوظ جگہ اپنا ٹھکانا بنا رکھا ہے اور وہاں پہریداری بھی سخت ہے۔ میں ان کے پاس جتنا ایڈوانس ویپن دیکھ کر آیا ہوں، مجھے وشواس ہی نہیں ہو رہا ہے کہ وہ کوئی بھکشو ہیں۔''
''تو کیول بہانے بازی کر رہا ہے۔'' جوشیلے صاحب کو ایک بار پھر غصہ آنے لگا۔
''دھیرج شری! ہمیں اس کی بات سمجھنا چاہیے۔ آؤ، اسے لے کر اپنے ٹھکانے پر چلتے ہیں۔ وہاں سے اوپر والوں سے بات کریں گے اور پھر وہ جو فیصلہ سنائیں، ہمیں وہی کرنا ہوگا۔''
''بالکل ٹھیک۔ پہلے اوپر رپورٹ کرنا ضروری ہے۔''
باری باری سب ہی سمجھانے لگے تو شری نامی بندے کو بادل ناخواستہ ہتھیار ڈالنے ہی پڑے لیکن وہ خوش نظر نہیں آرہا تھا۔ باذل کو اس کی خوشی یا ناخوشی سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اس وقت تو وہ اس بات پر خوش تھا کہ کئی دنوں کی خواری کے بعد کوئی ایسا ٹھکانا ملنے جارہا ہے جہاں وہ اپنے تھکے ہوئے جسم کو آرام دینے کے ساتھ ساتھ ڈھنگ کی خوراک کھاسکے گا۔ اپنی اس خوشی میں اس نے اس بات کو بھی نظرانداز کردیا تھا کہ ان لوگوں نے اسے اپنا ساتھی تسلیم کرلینے کے باوجود اس کا پسٹل اور خنجر واپس نہیں کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ سب کچھ زیادہ عرصے اس طرح نہیں رہے گا۔

☆☆☆

سیاہ شیشوں والی گاڑی نے سڑک چھوڑ کر کثیرالمنزلہ عمارت کی زیریں منزل پر قائم پارکنگ کی طرف رینگنا شروع کیا تو قریب ہی بیٹھا ایک فقیر پھرتی سے اٹھ کر گاڑی کی طرف بھاگا۔ وہ کئی گھنٹوں سے وہاں بیٹھا تھا اور عقبی حصے سے پارکنگ میں آنے اور جانے والی ہر گاڑی کو دیکھ کر ایسے ہی دوڑ لگاتا تھا۔ اس کی اس تگ ودو کے نتیجے میں ابھی تک ایک آدھ ہی گاڑی والے نے رکنے اور خیرات میں کوئی چھوٹا نوٹ دینے کی زحمت کی تھی لیکن وہ پوری دلجمعی سے اپنے کام پر ڈٹا ہوا تھا۔ بالکل اس تاجر کی طرح جسے یقین ہو کہ شروع میں مندی سہی، بالآخر ایک دن کاروبار جم ہی جائے گا۔ ویسے ایک طرح سے دیکھا جاتا تو فقیر نے اپنے دھندے کے لیے کوئی معقول جگہ منتخب نہیں کی تھی۔ سامنے کے مقابلے میں پارکنگ کے عقبی حصے میں گاڑیوں کی آمد و رفت بہت کم تھی اور اس کی صدا پر رکنے والوں کا تناسب تو اس سے بھی بے حد کم۔
سیاہ شیشوں والی گاڑی بھی دیگر بہت سی گاڑیوں کی طرح اس کی صدا پر نہیں رکی اور سیدھی پارکنگ ایریا میں داخل ہوگئی۔ گاڑی والے کی اس حرکت پر فقیر نے دایاں ہاتھ اٹھا کر پیچھے سے لعنت کا اشارہ کیا پھر یوں کمر پر ہاتھ جما کر باہر کھڑا کھڑا ہی پارکنگ کے اندر جھانکنے لگا جیسے دیکھنا چاہتا ہو کہ اسے بھیک نہ دینے والا کنجوس اور بداخلاق شخص کون ہے؟ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے پہلے گاڑی سے ایک باوردی شوفر باہر نکلا جس نے پھرتی سے پچھلا دروازہ کھولا۔ کھلے دروازے سے ایک غیر ملکی عورت چھوٹے بچے کو گود میں لیے باہر نکلی۔ عورت غیر ملکی ہونے کے باوجود اس حلیے پر پوری نہیں اتر رہی تھی جو اسے ذہن نشین کروایا گیا تھا پھر بھی وہ دلچسپی سے اسے اور اس کی گود میں موجود بچے کو دیکھتا رہا۔ بچہ نیند میں تھا اور اس کا سر عورت کے شانے پر ٹکا ہوا تھا۔ عورت اتر کر ایک خاص سمت میں بڑھنا شروع ہوئی تو فقیر کو احساس ہوا کہ بے شک وہ اس کی مطلوبہ عورت نہیں ہے لیکن کوئی اہم عورت ضرور ہے جو اس مخصوص لفٹ کی طرف بڑھتی جارہی ہے جس پر نظر رکھنے کی ہدایت بھی دیگر ہدایات میں شامل تھی۔ اس نے جلدی سے اپنے کشکول کے اندر ہاتھ ڈال کر انگلیوں کو جنبش دی اور کشکول کو تھوڑا سا اوپر کر کے ایسے زاویے سے ترچھا کیا کہ اس کے پیندے کا رخ پارکنگ کی لفٹ کی طرف بڑھتی عورت کی جانب ہوگیا۔ سیاہ پیندے میں موجود چھوٹا سا سوراخ کسی کی نظر میں نہیں آسکتا تھا۔ آ بھی جاتا تو کس کو غرض پڑی تھی کہ اس کے کشکول کے پیندے میں موجود سوراخ پر توجہ دیتا۔ یہ سوراخ یونہی نہیں تھا۔ اس سوراخ کے ساتھ اس جدید موبائل کے کیمرے کا لینس چپکا ہوا تھا جسے بڑی مہارت سے کشکول میں فٹ کیا گیا تھا اور اوپر گہرے سیاہ رنگ کا کپڑا اس انداز سے لگایا گیا تھا کہ موبائل اس کے نیچے چھپ گیا تھا۔ صرف فقیر ہی جانتا تھا کہ کس جگہ انگلیاں ڈال کر وہ کپڑے کو سمیٹنے اور موبائل استعمال کرنے کے لائق ہوسکتا ہے۔ اس وقت اس نے یہی کام کیا لیکن اس کی پھرتی کے باوجود عورت کے چہرے کی تصویر کھینچنا ممکن نہیں تھا۔ وہ لفٹ کی طرف بڑھ رہی تھی اور فقیر کی طرف اس کی پشت تھی۔ پشت پر سے کھینچی گئی تصویر میں عورت کا چہرہ تو نہ آسکا لیکن اس کے شانے سے ٹکے بچے کا چہرہ بہت عمدگی سے کیمرے کی آنکھ نے قید کرلیا۔ تصویر زوم

کر کے کھینچی گئی تھی اس لیے فاصلے کے باوجود رزلٹ عمدہ تھا۔

اس نے اس اکلوتی تصویر پر اکتفا کرتے ہوئے کشکول نیچے کیا تو شوفر بھی گاڑی کی ڈکی میں رکھے سامان کو نکال کر فارغ ہو چکا تھا۔ عورت کے پیچھے لفٹ کی طرف بڑھنے سے پہلے اس نے ایک تیز اور شک بھری نظر فقیر پر ڈالی۔ فقیر کی جوتی کو بھی اس کی نظر کی فکر نہیں تھی۔ اس نے پوری ڈھٹائی سے اس کی نظر کو سہا اور ہاتھ میں پکڑا کشکول آگے کی طرف کرنے کے ساتھ ساتھ دائیں ہاتھ کی انگلی کو یوں آسمان کی طرف اٹھایا جیسے شوفر کو دھمکی دے رہا ہو کہ اگر اب بھی اس نے اس کے کشکول میں کچھ نہ ڈالا تو ڈائریکٹ اس کی اوپر بھیجی گئی بددعا کی زد میں آجائے گا۔ شوفر نے اس کی دھمکی کو خاطر میں لائے بغیر گردن موڑی اور اس لفٹ کی طرف بڑھ گیا جس کے کھلے ہوئے دروازے سے عورت اس کی جانب منتظر نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''اے ہٹ یہاں سے۔'' پارکنگ کے داخلی راستے پر ڈیوٹی دینے والا گارڈ جو شاید کسی ضرورت کے تحت کچھ دیر کے لیے وہاں سے ہٹ گیا تھا، ایک سمت سے نمودار ہوا اور فقیر کو دھتکارا۔

''بڑی ڈھیٹ قوم ہے یہ بھی۔ کتنی بار سالے کو دھتکار چکا ہوں پھر بھی ہر تھوڑی دیر بعد آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ لگتا ہے انتظامیہ کو کمپلین کرنا پڑے گی اس کی۔'' گارڈ بلند آواز میں بڑبڑایا لیکن فقیر نے اس کی بڑبڑاہٹ کا کوئی اثر نہیں لیا اور پلٹ کر اس مخصوص جگہ جا بیٹھا جہاں اس نے ڈیرا جمایا ہوا تھا۔

اب وہ اپنے کشکول پر چہرہ جھکائے بیٹھا منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا۔ کم از کم دور سے دیکھنے والوں کو یہی گمان ہوتا کہ وہ دیوانگی میں ایسا کر رہا ہے لیکن درحقیقت وہ ایک وائس میسج ریکارڈ کر رہا تھا۔ میسج مکمل ہونے کے بعد اس نے کچھ دیر قبل کھینچی گئی تصویر کے ساتھ اسے دو نمبروں پر بھیج دیا۔ ایک نمبر اصغر اور دوسرا پرویز کا تھا۔ پرویز کا جواب فوراً آیا۔

''تو اب وہاں سے ہٹ جا۔ تیری جگہ میں نورے کو ڈیوٹی پر بھجوا رہا ہوں۔'' اس نے سر کے لمبے بالوں میں پوشیدہ کان سے لگی بلیو ٹوتھ میں یہ پیغام سنا اور ذرا سے توقف کے بعد اپنی جگہ چھوڑ دی۔ جاتے جاتے اسے وہ چھابڑی والا دکھائی دے گیا تھا جس کے کندھوں پر جمی لکڑی کے ساتھ دونوں جانب چھابڑیاں لٹکی ہوئی تھیں۔ ان چھابڑیوں میں بھنے ہوئے چنے بھرے تھے۔ چنوں کی گرماہٹ اور خستگی کو قائم رکھنے کے لیے ان کے درمیان رکھی گڑوی میں کوئلے سلگ رہے تھے۔

''چنا گرم......'' چھابڑی والے نے اس کے قریب سے گزرتے ہوئے کراری آواز میں کہا تو وہ زیر لب مسکرا کر رہ گیا۔ وہ اگر کامیابی سے پیشہ ور فقیر ہونے کی اداکاری کرتا رہا تھا تو نورے نے بھی اپنا کردار نبھانے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی تھی۔ اس جگہ سے دور نکل کر اس نے پرویز کو رپورٹ دی۔

''ٹھیک ہے۔ ابھی تو آرام کر۔ جب ضرورت پڑی، میں تجھے کال کرلوں گا۔'' پرویز نے اسے جواب دیا اور ایک بار پھر اپنے موبائل کی اسکرین پر اس کی بھیجی گئی تصویر دیکھنے لگا۔ تصویر میں عورت کی صرف پشت دکھائی دے رہی تھی لیکن بچے کا چہرہ نمایاں تھا۔ گہری نیند سویا ہوا بچہ چہرے مہرے سے ہی کسی اچھے گھرانے کا لگتا تھا لیکن یہ طے تھا کہ وہ مقامی ہے۔ کسی مقامی بچے کا ایک غیر ملکی عورت کے ساتھ میڈم ایکس کے دفتر میں جانا اس کے پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ ساری مصلحتوں کو بھول کر ابھی وہ جادوئی ڈبیا میڈم کے دفتر کی طرف فائر کرے جس کی مدد سے وہ وہاں ہونے والی گفتگو بہ خوبی سن سکتا تھا۔ گفتگو سن کر یہ عقدہ حل ہو سکتا تھا کہ بچہ کون ہے اور وہاں کیوں لایا گیا ہے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اصغر نے آدھی رات سے قبل اس کام سے سختی سے منع کیا تھا۔ بے چینی نے اسے اصغر کو کال کرنے پر مجبور کر دیا۔

''نہیں، بالکل بھی نہیں۔ تجھے میں نے آدھی رات کا بولا ہے تو بس آدھی رات کو ہی کام کرنے کا ہے۔'' اصغر نے اس کا مدعا سن کر فوراً انکار کر دیا۔

''پر تب تک تو ہو سکتا ہے وہ لوگ واپس چلے جائیں۔'' پرویز منمنایا۔

''جانے دے واپس۔ تو نے ادھر جو سالے نورے کو بٹھایا ہے، وہ دیکھ کر اس بھوتنی کے امجد کو اطلاع کر دے گا۔ امجد کو گاڑی دے کر ادھر پاس میں ایسے ہی تو نہیں بٹھایا ہوا ہے نا۔ سب کھوج لگالے گا کہ گاڑی کس کی ہے اور کدھر گئی ہے بچے کو لے کر۔'' اصغر نے اسے اچھا خاصا جھاڑ دیا۔

''ٹھیک ہے استاد! جیسی تمہاری مرضی۔'' پرویز کو مایوس ہو کر ہتھیار ڈالنا پڑے۔

''میرے کو معلوم ہے تجھ سے فارغ نہیں بیٹھا جا رہا پر یاد رکھنا بھوتنی کے، اگر اپنی چال بازی میں کوئی گڑبڑ کی تو الٹا لٹکا دوں گا۔'' اصغر نے اسے دھمکی دینا ضروری سمجھا۔

ظلم و جبر کے سامنے سینہ سپر نوجوان کی داستان جو غلط کاروں کے لیے غضب ناک تھا
باقی واقعات آئندہ ماہ پڑھیے

بے وقوف

شاہ سنان
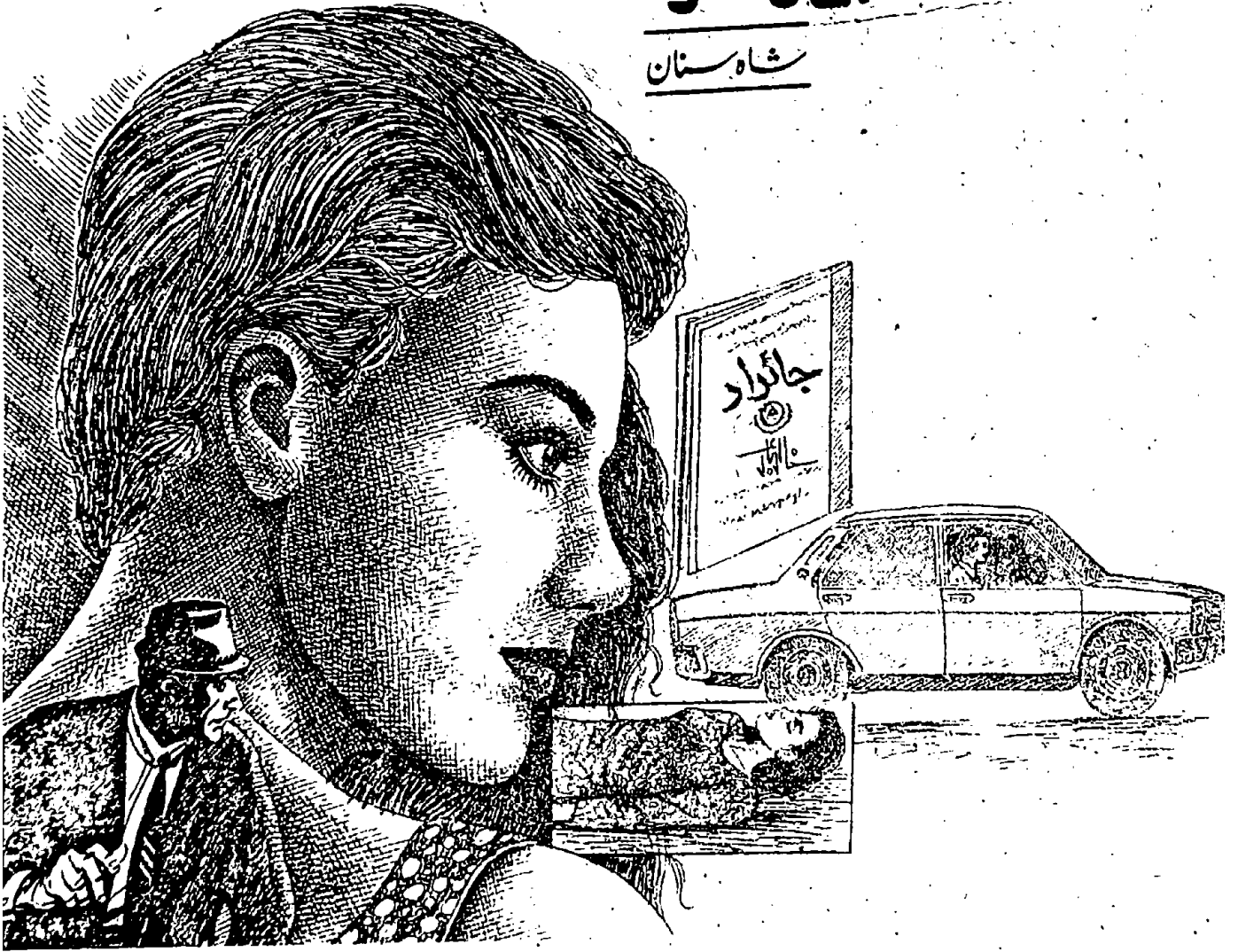
انسان عمر سے اتنا نہیں سیکھتا جتنا تجربہ اسے ہوشیار کردیتا ہے۔ وہ جو بظاہر قدم قدم پر دھوکا کھارہی تھی درحقیقت دھوکے بازوں کو بے وقوف بنارہی تھی کیونکہ وہ ایسا نہ کرتی تو پھر وہ ویسا کرجاتے جیسا کرنے وہ ان کی زندگی میں آئے تھے... لیکن اس نے ایسا کچھ کرنے ہی نہ دیا جس سے اس کی بے وقوفی ثابت ہوجاتی...

ایک ذہین حسینہ کی چالاکیوں کا پُرتجسس احوال

پنک لباس میں ڈیانا بہت پُرکشش لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ وہ سمندر کنارے ریت پر اپنے دونوں ہاتھ زمین پر پہلوؤں کے قریب ٹکائے ٹانگیں سیدھی کیے بیٹھی تھی۔ اس کے خوبصورت سنہری بال ہلکی ہوا میں اڑ رہے تھے۔ شام کا ڈھلتا سورج جہاں سمندر میں عکس ڈال کر اس کی خوبصورتی بڑھا رہا تھا، وہیں اس کی لالی ڈیانا کے چہرے کو مزید حسین بنا رہی تھی۔ اپنی نیلی نیلی آنکھوں سے وہ اردگرد کے لوگوں کو آتا جاتا دیکھ رہی تھی۔ اسے جم کا انتظار تھا۔ جم اور وہ جلد شادی کرنے والے تھے۔ بس اس شہر میں ایک دو کام نمٹانا باقی تھے اس

کے بعد دونوں شہر چھوڑ کر دوسری جگہ جا کر شادی کرنے کا پلان بنائے ہوئے تھے۔

☆☆☆

انتہائی امیر بزنس مین فرینک کی بیوی بن کر وہ بہت نازاں تھی۔ فرینک نہ صرف دولت مند بلکہ ہینڈسم بھی تھا۔ ڈیانا کو بڑی اچھی زندگی مل گئی تھی۔ شاندار گھر، قیمتی گاڑی، مہنگے اسٹائلش ملبوسات لیکن اچانک اس کی زندگی میں بھونچال آ گیا۔ فرینک کو بزنس میں شدید نقصان ہوا۔ اس کی معاشی پوزیشن پہلے کی طرح مستحکم نہ رہی۔ میاں بیوی میں جھگڑے ہونے لگے۔ حتیٰ کہ فرینک نے ان تمام بُرے حالات کا ذمے دار ڈیانا کو قرار دے دیا۔

''تمہاری لاکھوں کی شاپنگ نے میرے بینک اکاؤنٹس میں سے رقم تیزی سے کم کی اور تمہارے آئے روز اِدھر اُدھر کے ممالک میں سیر و تفریح کے شوق نے مجھے کاروبار پر توجہ نہ دینے دی۔ میں تمہیں دنیا جہان کی سیر کرواتا رہا اور میرا بزنس ڈوبتا رہا۔ بہت منحوس ہو تم۔''

اتنا کچھ سن کر ڈیانا کی زبان سے شعلے نکلنے لگے۔

''گھٹیا آدمی! تم اس قابل تھے ہی نہیں کہ تمہاری شادی مجھ جیسی حسین لڑکی سے ہوتی۔ اگر مجھے اندازہ ہو گیا ہوتا کہ تم میں کاروبار چلانے کی عقل نہیں تو میں تم سے ہرگز شادی نہ کرتی۔ نااہل انسان! اب تم بیوی کا خرچ تک اٹھانے کے قابل نہیں رہے۔ اپنی بے وقوفیوں کا ذمے دار مجھے مت ٹھہراؤ۔ نہ جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب میں نے تم سے شادی کرنے کا انتہائی غلط فیصلہ کیا۔''

''میرا خیال ہے کہ اب ہمارا اکٹھے رہنا ممکن نہیں۔'' فرینک نے بھڑک کر فیصلہ سنایا۔

''میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ مجھ سے علیحدہ ہو کر تم کون سا تیر مار لیتے ہو۔''

طلاق ہو گئی اور ڈیانا کو علیحدگی کے بعد بھی گھر، گاڑی اور کچھ رقم مل گئی۔ طلاق کے تقریباً دو ڈھائی ماہ بعد اس کی ملاقات جم سے ہوئی۔ وہ سڑک پر کھڑی کسی مدد کی منتظر تھی۔ اس کی گاڑی نے چلنے سے جواب دے دیا تھا۔ وہ موبائل نکال کر کوئی نمبر ملانے ہی والی تھی کہ دور سے تیزی سے آنے والی بائیک اس کے نزدیک آ کر رک گئی۔

''کیا ہوا میڈم؟'' بائیک والے نے ڈیانا سے پوچھا۔ وہ گاڑی کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ گویا اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ گاڑی میں پرابلم ہے۔

حسین و جمیل ڈیانا نے اکتائے ہوئے لہجے میں اسے بتایا کہ گاڑی خراب ہو گئی ہے۔ جم تیزی سے گاڑی کے قریب آیا اور کچھ دیر بعد اسے اسٹارٹ کر دیا۔ ڈیانا نے اسے تھینک یو کہا تو اس نے جواباً کہا کہ یہ تو اس کا روز کا کام ہے۔ وہ ایک مشہور ورکشاپ چلاتا ہے جہاں گاڑیوں کے ٹھیک کرنے، سروس کا کام ہوتا ہے۔

''یعنی تمہارا کہنا یہ ہے کہ تم ورکشاپ والے ہو اس لیے تمہیں تھینک یو کے بجائے معاوضہ چاہیے؟'' ڈیانا ہلکا سا مسکرائی۔

''اوہ...... نو میم! میرے بتانے کا مقصد یہ ہے کہ آپ کو جب بھی گاڑی کے سلسلے میں کوئی پرابلم ہو تو مجھ سے رابطہ کریں۔ میرے ملازمین فوراً پہنچ جائیں گے۔'' جم بھی مسکرا رہا تھا۔ ڈیانا کو اس نے اپنا نمبر دے دیا تھا۔

دو تین بار گاڑی کے لیے جم سے رابطہ کرنا پڑا۔ اس کے بعد دونوں میں بے تکلفی پیدا ہو گئی اور دونوں اکثر اکٹھے شام کی کافی پینے لگے۔ ڈیانا نے جب اپنا پورا تعارف اس سے کروایا تو وہ حیران رہ گیا۔

''اوہ، تو آپ اس بزنس ٹائیکون فرینک کی بیوی تھیں جس کی شہرت ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ کمال ہے، آپ بھی سامنے نہیں آئیں۔'' اس نے کہا تو ڈیانا ہلکے سے غصے سے بولی۔

''کیا، بزنس ٹائیکون؟ وہ بے وقوف انسان کچھ ہی عرصے میں اپنا کاروبار برباد کر بیٹھا اور مجھے ذمے دار ٹھہرا کر طلاق کا فیصلہ کر لیا۔ یہ شہرت جو ہے، عارضی ہے۔ جلد ہی اس کا بنایا گیا بھرم ختم ہونے والا ہے۔ ہونہہ، احمق انسان!''

جم موضوع بدل کر اپنے بارے میں بتانے لگا۔ ورکشاپ چلانا اس کا شوق تھا کیونکہ اس نے اپنے باپ سے لڑائی اور گھر سے نکالے جانے کے بعد یہیں سے عملی زندگی کا آغاز کیا اور پھر اس کام کو کافی آگے بڑھا لیا۔ اب اس کے باپ کے مرنے کے بعد اسے خاندانی پراپرٹی مل گئی تھی لیکن پھر بھی وہ اس کام کو جاری رکھے ہوئے تھا۔

''کون سا علاقہ بتایا تم نے جہاں تمہارا آبائی گھر اور دیگر پراپرٹی ہے؟'' ڈیانا نے اچانک چونک کر پوچھا۔ جم نے جگہ کا نام بتایا۔ وہ کافی مہنگی جگہ تھی۔

''میم! آپ نے دوبارہ شادی کا نہیں سوچا؟'' ایک روز وہ سمندر کنارے جو دونوں کی فیورٹ جگہ تھی، پرچہل قدمی کر رہے تھے تو جم نے سوال کیا۔

''تم نے مجھے پھر میم کہا؟ تم میرے دوست ہو۔ نام ہی لیا کرو۔ کئی بار کہہ چکی ہوں۔'' کہہ کر ڈیانا نے اس کے سوال کا جواب دیا۔ ''کوئی پُرخلوص ساتھی ملے تو آج کر لوں۔''

''واقعی؟'' جم حیرانی سے بولا۔
''ہاں جم! میں کسی اچھے انسان سے شادی کر کے اس فرینک کو بتانا چاہتی ہوں کہ صرف دنیا میں تم ہی نہیں تھے جس نے مجھ کو پسند کیا۔ مجھے پسند کرنے والے اور بھی ہیں۔''
''تم کیسا شخص چاہتی ہو؟'' جم نے سوال کیا۔
''پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ جو میرے ساتھ مخلص ہو بس...... اور کچھ نہیں چاہیے۔ فرینک سے الگ ہو کر بھی کافی دولت میرے پاس ہے اس لیے زیادہ دولت نہ بھی ہو تو فرق نہیں پڑتا۔'' ڈیانا نے جواب دیا۔
''ڈیانا!'' جم نے اسے پہلی بار نام سے مخاطب کیا۔ وہ چونک گئی۔
''ہاں جم! بولو۔''
''وہ...... تم کل رات کا کھانا میرے ساتھ کھا سکتی ہو؟ تم سے ایک خاص بات کرنا ہے۔'' جم نے تھوڑا توقف کر کے کہا۔
''ہاں...... کیوں نہیں۔ ٹائم بتا دو، کب اور کس ہوٹل میں آنا ہے؟'' ڈیانا نے بڑی جلدی دعوت قبول کی تھی۔ جم کو حیرانی سی ہوئی۔
''ہوٹل نہیں، میرے گھر میں۔ میں بہت اچھا کھانا بنا لیتا ہوں۔'' جم نے بتایا تو ڈیانا ہنس پڑی۔
''او کے! چلو کل تمہاری ایک اور خوبی کا بھی پتا چل جائے گا۔''

☆☆☆

''کیا واقعی میں ایک شادی کے ناکام تجربے کی تلخی کے بعد دوبارہ شادی کر پاؤں گی؟'' ڈیانا نے خود سے سوال کیا۔ اسے چند دنوں سے یہ لگ رہا تھا کہ جم اسے پرپوز کرنا چاہتا ہے۔ اب اس نے ڈیانا کو کھانے پر بلا کر خاص بات کرنے کا کہا تو ڈیانا کو سمجھ آ گئی کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔
جم شکل و صورت میں ڈیانا کے برابر نہ سہی لیکن کافی اچھا تھا اور اس کی پراپرٹی بھی تھی جبکہ ڈیانا کے پاس اب کافی حد تک دکھاوا تھا۔ اچھی گاڑی اور گھر ہی رہ گیا تھا۔ بینک بیلنس تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔ اسے واقعی سہارے کی تلاش تھی۔ ایسے سہارے کی جو اس کے خرچے برداشت کر سکے۔ جم میں یہ خوبی تھی۔ اگرچہ وہ فرینک سے کئی گنا کم امیر تھا لیکن تقریباً خالی ہاتھ ہوتی ڈیانا کے لیے بہت بڑی نعمت تھا۔
کالے لباس کے ساتھ ہلکی سی جیولری میں وہ بے حد خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے میک اپ مکمل کیا، پرس اٹھایا اور جم کے گھر جانے کے لیے گاڑی میں آ بیٹھی۔

☆☆☆

جم نے کھانے کی ٹیبل سجائی اور خود بھی تیار ہو گیا۔ اس نے گھر کو بھی خوب چمکا رکھا تھا اور مختلف جگہوں پر تازہ پھول رکھے تھے۔ 'آج ڈیانا کو شادی کی پیشکش کروں گا اور مجھے امید ہے کہ ہاں ہی ہو گی۔ اتنے دنوں میں یہ اندازہ تو مجھے ہو ہی گیا ہے۔' اس نے ٹیبل کا جائزہ لیتے ہوئے سوچا۔ تبھی ڈور بیل بجی۔ حسب توقع ڈیانا ہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد دونوں کھانا کھا رہے تھے۔
''واقعی، تم کھانا اچھا بنا لیتے ہو۔'' کھانے کے دوران ڈیانا نے مسکراتے ہوئے تعریف کی۔
''کیا واقعی؟'' جم بھی مسکرایا۔
''ہاں...... بالکل...... تم جانتے ہو کہ میں کھانے پینے میں کس قدر محتاط ہوں۔ اپنی فٹنس کے لیے ناپ تول کر اور بہت دھیان سے فوڈ لیتی ہوں لیکن دیکھو اس وقت میں کیسے بے فکری سے پلیٹ ختم کر چکی ہوں اور یہ سب تمہارے ہاتھ کے ذائقے دار کھانے کی وجہ سے ہوا ہے۔'' ڈیانا نے کہا تو جم بہت خوش دکھائی دیا۔
''اوہ...... تھینکس! یہ میرے لیے خوشی کی بات ہے...... ارے، تم رک کیوں گئیں، کچھ اور بھی کھاؤ نا...... اور یہ سویٹ ڈش میں نے خاص ترکیب سے بنائی ہے۔ دیکھو ذرا، یہ بھی کمال کی ہے یا نہیں؟'' جم نے شیشے کا پیالہ اس کے سامنے رکھا جس میں بڑا اعلیٰ قسم کا اور ٹھنڈا، میٹھا بنا ہوا تھا۔
''نہیں...... نہیں...... بھئی سوری، میں اتنا کھا چکی ہوں کہ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آج میٹھا نہ کھاؤں۔ پلیز! اسے رہنے ہی دو۔'' ڈیانا نے نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے جم سے معذرت کی۔
''چلو کوئی بات نہیں۔ آج میں اس ڈش سے پرہیز کرتا ہوں۔ تم پھر کسی دن آنا۔ میں دوبارہ بنا لوں گا پھر اکٹھے کھائیں گے۔'' جم کہتے ہوئے اٹھا اور سویٹ ڈش کو فریج میں رکھ دیا۔
''اچھا...... تو دوبارہ یہ سویٹ ڈش بناؤ گے۔ آج باقی کا مزیدار کھانا کھلایا ہے، کیا وہ دوبارہ نہیں کھلا سکتے؟'' ڈیانا نے مذاقاً کہا۔ وہ دونوں ڈائننگ ٹیبل سے اٹھ کر صوفوں پر آ بیٹھے۔
''دوبارہ کیا، میں تو زندگی بھر تمہیں ایسی ڈشز کھلا سکتا ہوں، اگر تم چاہو تو۔''
جم اسے شادی کی پیشکش کر رہا تھا۔ ڈیانا نے اس کا

جملہ سنا اور کچھ دیر خاموش رہی۔
''کیا بات ہے، تمہیں بُرا لگا؟ شاید میں تمہارے معیار کے مطابق......'' جم بے چینی سے بولا تو ڈیانا نے بات کاٹ دی۔
''نہیں، بُرا نہیں لگا۔ بس تھوڑا وقت چاہیے سوچنے کے لیے۔''
''تو ٹھیک ہے۔ تمہارے پاس پورے پانچ منٹ ہیں سوچنے کے لیے۔'' جم نے مسکرا کر اسے فراخدلی سے ٹائم دیا۔ وہ جانتا تھا ڈیانا کے لیے اتنا ٹائم بھی بہت ہے۔ پانچ منٹ سے پہلے ہی ڈیانا ''ہاں'' کر چکی تھی۔

☆☆☆

''میگی! کہاں ہوتی ہو آج کل؟'' کلارا نے پوچھا۔ وہ میگی سے فون پر بات کر رہی تھی۔ میگی ابھی کام سے واپس آئی تھی اور اپنے لیے کافی بنانے کچن میں آئی ہی تھی کہ اس کی قریبی دوست کلارا کا فون آ گیا۔
''وہی روٹین کے کاموں میں بزی ہوں۔ تم سناؤ، جاب کیسی چل رہی ہے۔ نیا باس کیسا ہے؟'' میگی نے جواب دیتے ہوئے پوچھا۔
''میری چھوڑو...... ذرا اپنے اردگرد دھیان دو۔'' کلارا کا انداز عجیب سا تھا۔
''کیا مطلب؟'' میگی کو بالکل سمجھ نہ آئی۔
''مطلب یہ کہ وہ جم، جس سے تم جلد شادی کرنے والی ہو، جانتی ہو آج کل کس کے ساتھ ہے؟''
''جم کسی کے ساتھ......؟ کلارا! پلیز کھل کر بتاؤ۔'' میگی قدرے پریشان ہوگئی۔ جواباً کلارا اسے تفصیل بتانے لگی۔

☆☆☆

جم، ڈیانا کو رخصت کرنے دروازے تک آیا۔ وہ دونوں ہنس ہنس کر باتیں کرتے باہر آ رہے تھے کہ اچانک میگی آ گئی۔
''فراڈ انسان! یہ کیا کر رہے ہو تم؟'' وہ آتے ہی چلّائی۔ جم کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ کافی گھبرا گیا تھا۔ ڈیانا نے حیرانی سے آنے والی لڑکی کو دیکھا۔
''کچھ نہیں...... بس، کھانا کھا رہے تھے ہم...... یہ ڈیانا ہے، میری دوست۔ میں نے اسے انوائٹ......'' جم، میگی کو صفائیاں دینے لگا۔ ڈیانا آنکھیں پھاڑے اس شخص کو دیکھ رہی تھی جسے اس نے چند منٹ پہلے شادی کے لیے رضامندی دی تھی اور وہ شخص اسے صرف دوست کہہ کر اس کا تعارف کروا رہا تھا۔

''اوہ...... گھر تک بلانے کی نوبت آ گئی...... لعنت ہو تم پر۔ میں خوامخواہ تمہارے ساتھ اپنا وقت برباد کرتی رہی۔'' میگی پھنکار رہی تھی۔
''جم! کون ہے یہ اور تم سے اس کا کیا تعلق ہے؟'' ڈیانا نے پہلی بار زبان کھولی۔ وہ بڑے غور سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔
''میں میگی ہوں، جم کی دوست اور ہم دونوں شادی کرنے والے ہیں، سمجھیں تم...... شاید تم پہلے اس حقیقت سے آگاہ نہیں تھیں لیکن اب تو پتا چل گیا ہے نا تو تم ہم دونوں کی جان چھوڑو اور آئندہ جم کے آس پاس نظر نہ آنا۔'' جم کے بجائے میگی نے جواب دیا۔ وہ شدید غصے میں تھی۔
''شٹ اپ میگی!'' جم چلّایا۔ ''میں تمہیں چھوڑ چکا ہوں۔ یہ بات تم کیوں بھول گئی ہو کہ اب ہم شادی نہیں کر رہے؟ ڈیانا نہیں، تم ہم دونوں کی جان چھوڑو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔'' جم چیخ کر بولا۔
''کیا کہا تم نے؟'' میگی شاکڈ تھی۔
''وہی، جو تم نے سنا ہے۔'' جم بے رخی سے بولا۔ ڈیانا پھر سے خاموش کھڑی تھی۔
''اوکے، میں جا رہی ہوں لیکن تم یاد رکھنا۔'' وہ ڈیانا کی طرف مڑی۔ ''یاد رکھنا، ایک دن یہ تمہیں بھی دھوکا دے گا۔ تمہیں بھی کسی نئی لڑکی کی خاطر چھوڑ دے گا جب تمہارے ہوش ٹھکانے آئیں گے اور تم......'' وہ ہذیانی انداز میں بول رہی تھی کہ جم آگے بڑھا اور اسے بازو سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے باہر لے گیا۔ وہ چند لمحوں بعد واپس آیا۔
''سوری، مجھے تم کو میگی کے متعلق پہلے بتا دینا چاہیے تھا۔ دراصل یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ میں تمہیں ضرور بتاؤں گا لیکن پلیز، میرے بارے میں کچھ غلط مت سوچنا۔'' جم کا لہجہ معذرت خواہانہ تھا۔
''یہ تمہاری دوست تھی نا، کیوں چھوڑا تم نے اسے؟'' ڈیانا نے سوال کیا۔
''ہاں، میری دوست تھی۔ میگی اور میں کچھ عرصہ قبل شادی بھی کرنے والے تھے لیکن پھر مجھے اندازہ ہوا کہ ہم دونوں اکٹھے نہیں چل سکتے پھر ہمارا بریک اپ ہو گیا۔ ہمیں ایک دوسرے سے رابطہ کیے تقریباً ساڑھے تین ماہ ہو چکے ہیں۔ نہ جانے کس نے اسے تمہارے اور میرے بارے میں بتا دیا اور وہ جیلس ہو کر یہاں تماشا کرنے آ گئی۔ میں نے باہر لے جا کر اسے سختی سے کہہ دیا ہے کہ وہ میری زندگی میں دخل اندازی نہ کرے۔ تم یقین رکھو، دوبارہ ایسا نہیں

ہوگا۔'' جم نے کہا۔
ڈیانا نے پوری بات سنی اور بولی۔ ''جم! جو کچھ تم کہہ رہے ہو، واقعی سچ ہے نا؟''
''سو فیصد سچ۔'' جم نے زور دیتے ہوئے کہا۔
''اوکے، میں چلتی ہوں۔ پھر ملتے ہیں۔'' ڈیانا نے مسکرا کر کہا اور اپنی گاڑی کی جانب بڑھ گئی۔
جم سر تھام کر رہ گیا۔ وہ ڈیانا کو رخصت کر کے صوفے پر آ بیٹھا۔ اسے ڈیانا کی آنکھوں میں بے یقینی سی نظر آئی تھی۔ اسے میگی پر غصہ آ رہا تھا۔ نہ جانے اب کیا ہوگا؟ پہلی بار کہنے پر ڈیانا شادی کے لیے مان گئی تھی اور اس میگی نے آ کر کیسے معاملہ بگاڑ دیا۔ وہ پریشانی سے سوچ رہا تھا۔
☆☆☆
ڈیانا کو سمندر کنارے بیٹھنا بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ اکثر یہاں آتی اور گھنٹوں بیٹھی سمندر کی لہروں اور وہاں کی رونق کو دیکھتی۔ آج بھی وہ اکیلی بیٹھی یہی کر رہی تھی۔ اسے جم کے گھر سے آئے تین روز ہو چکے تھے۔ وہ بار بار میگی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ پہلی شادی کی ناکامی نے اسے محتاط کر دیا تھا۔ جم سچ کہہ رہا تھا یا جھوٹ...... یہ کیسے پتا چلے گا؟ اس نے سوچا۔ اس نے اپنے جاننے والوں سے یہ بات چھپا رکھی تھی کہ اب اس کی مالی پوزیشن بہت ڈاؤن ہو چکی ہے۔ اثاثے ختم ہو رہے تھے۔ وہ بہ مشکل اپنا بھرم قائم رکھے ہوئے تھی۔ جم کی صورت میں اس کو ایک مستحکم پوزیشن والا ساتھی مل رہا تھا لیکن میگی کی وجہ سے وہ اس تعلق کے بارے میں بے یقینی سی محسوس کر رہی تھی۔ میگی کو بُری طرح ڈانٹ کر باہر نکال دینے اور اس سے معذرت کر کے بھرپور یقین دلا دینے کے باوجود ڈیانا، جم پر اتنا اعتبار نہیں کر پا رہی تھی۔
رات ہی جم کا فون آیا تھا۔ وہ اس سے شادی کے بارے میں بات کرنا چاہ رہا تھا۔ ڈیانا نے اسے گول مول بات کر کے ٹال دیا اور اب وہ ادھر بیٹھی ہوتی لہروں کو دیکھتے ہوئے کچھ سوچ رہی تھی۔ کافی دیر گزر گئی اور وہ کسی بھی نتیجے پر پہنچے بغیر گھر واپسی کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ راستے میں تھوڑی سی شاپنگ کر کے وہ اپنے پسندیدہ ریسٹورنٹ میں کافی پینے چلی گئی۔ اسے کافی پیتے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ اس کے سامنے ایک حیران کن نظارہ آ گیا۔ وہ کپ ہاتھ میں تھامے اُدھر دیکھنے لگی۔ کئی منٹ اس منظر کو غور سے دیکھنے کے بعد اس نے کافی ادھوری چھوڑی اور ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئی۔
☆☆☆
جم صوفے پر نیم دراز بڑی دلچسپی سے فٹ بال میچ دیکھ رہا تھا کہ موبائل بج اٹھا۔ ''اوہ، ڈیانا!'' اس کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔
''کیسے ہو جم؟ کیا ہو رہا ہے؟'' ادھر سے ڈیانا کی مسکراتی آواز سنائی دی۔ جم کھل اٹھا۔
''چھٹی تھی آج۔ سارا دن گھر پر رہا۔ کچھ گھریلو کام نمٹائے۔ اب میچ دیکھ رہا ہوں۔''
''جم...... کیا میں اور تم رات کا کھانا اکٹھے کھا سکتے ہیں؟'' ڈیانا نے سوال کیا۔
''کیوں نہیں...... کیوں نہیں۔ آ جاؤ، میں تمہارے لیے کھانا بناتا ہوں۔'' جم خوش ہو گیا۔ اس روز کے بعد آج ڈیانا نے ایسے بات کی تھی۔
''نہیں...... تمہارے گھر نہیں، اس بار میرے گھر...... ٹائم پر پہنچ جانا۔'' ڈیانا نے کہا تو جم فوراً مان گیا۔
''لگتا ہے، میں نے جو رات میں اسے کال کی تھی، اس کا اچھا اثر پڑا ہے اس پر۔'' وہ موبائل رکھ کر ریموٹ اٹھاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔
☆☆☆
موبائل بجا اور کال اٹینڈ کی گئی۔ کال اٹینڈ کرنے والے کے چہرے پر موبائل آن کرتے ہوئے بڑی حیرانی تھی، جیسے اسے اس کال کا یقین نہ ہو۔
''ہیلو، کیسے ہو؟'' دوسری جانب سے بڑے دوستانہ انداز میں پوچھا گیا۔
''ٹھیک ہوں...... تم نے آج کیسے کال کر لی؟''
''فوری ملنا ہے تم سے...... بڑی ضروری بات ہے۔''
''ضروری بات؟ مطلب؟''
''مطلب یہ کہ معاملات سلجھائے جا سکتے ہیں۔''
''میں بھی عرصے سے یہی سوچ رہا تھا۔ میں آ رہا ہوں۔ کہاں ملنا ہے؟'' بڑی خوشی سے کہا گیا۔
☆☆☆
ڈیانا اور جم کھانا کھا رہے تھے۔ جم بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ ''میں میگی والے واقعے کی وجہ سے بہت ڈرا ہوا تھا لیکن مجھے خوشی ہے کہ تم نے میرے کہے پر اعتبار کیا۔'' جم نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''میں ایک دو ملاقاتوں کے بعد ہی تم سے شادی کے لیے تیار ہو گئی تھی کیونکہ تم میں مجھے ایک اچھا لائف پارٹنر نظر آ رہا تھا۔ بس میں یہ چاہتی تھی کہ شادی کی آفر تم کرو۔ جب ایسا ہی ہوا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ یہ درست ہے کہ میگی نے آ کر تھوڑی سی گڑبڑ کر دی لیکن میں چونکہ تمہارے ساتھ

زندگی گزارنے کا پکا ارادہ کر چکی تھی اس لیے مجھے اس دن کی باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑا۔'' ڈیانا نے مضبوط لہجے میں بات کی۔

''تو اب ہم کب شادی کر رہے ہیں؟'' جم نے سوال کیا۔

''میرے اپنے سابق شوہر سے چند قانونی معاملات چل رہے ہیں۔ تقریباً ایک ماہ میں وہ ختم ہو جائیں گے۔ اس کے بعد ہم شادی کرلیں گے اور ہاں...... جم! میں اس شہر میں نہیں رہنا چاہتی۔ ہم کسی دور کے شہر میں چلے جائیں گے۔ وہاں جا کر نئے انداز میں زندگی گزاریں گے جہاں میگی کا خطرہ ہوگا نہ میرے سابق شوہر کی طرف سے کوئی قانونی الجھن۔'' ڈیانا نے کہا تو جم ہنس دیا۔

''ارے تم میگی کو بھول جاؤ۔ تمہارے سامنے میں نے اسے گھر سے نکالا تھا۔ اس روز کے بعد وہ مجھے نظر نہیں آئی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ دوبارہ میری جانب آنے کا سوچے گی بھی نہیں۔ [illegible] اگر تمہیں ویسے یہ پسند ہے کہ ہم کہیں اور جائیں تو میں تمہاری خواہش کا احترام ضرور کروں گا۔'' ڈیانا مسکرا دی۔

☆☆☆

موبائل کی بیل بجی۔ وہی حیران کر دینے والا نمبر اسکرین پر جگمگا رہا تھا لیکن کال اٹینڈ کرنے والا اس بار حیران نہیں ہوا تھا کیونکہ اسے اس کال کا انتظار تھا۔ اس نے جلدی سے موبائل آن کر کے پوچھا۔ ''ہاں...... بات کہاں تک پہنچی؟'' جواباً اسے تفصیل بتائی گئی۔ ''اوکے'' کہہ کر اس نے موبائل بند کر دیا۔

☆☆☆

''بہت شاندار انگوٹھی ہے۔ ڈیانا کو پسند آئے گی اور اس کے ہاتھ میں اچھی بھی لگے گی۔'' جم انگوٹھی خرید کر گاڑی میں بیٹھا تھا۔ سگنل پر رکا تو جیب سے نکال کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ ڈیانا کے گھر جا رہا تھا۔ آج صبح ڈیانا کا فون آیا تھا کہ اس کے جو معاملات تھے، وہ حل ہو گئے ہیں۔ اب انہیں شادی کا دن کون کون سا ہوگا اور وہ شادی کے بعد کہاں رہیں گے، طے کر لینا چاہیے۔ جم نے اسے شام کے وقت ملنے کا کہا تھا۔ وہ اب اس کے گھر انگوٹھی لے کر جا رہا تھا۔

ڈیانا نے انگوٹھی پکڑی ہوئی تھی۔ وہ اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ ''جم! میں رنگ پہن لوں گی لیکن اس سے پہلے تمہیں میری ایک شرط ماننا ہوگی۔''

''کون سی شرط......؟ دیکھو ڈیانا! میں ہر حال میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ تم بتاؤ تمہاری ڈیمانڈ کیا ہے؟''

جم پہلے تو چونکا لیکن پھر فوراً ہی سنبھل کر بات کی۔

''وعدہ کرو، انکار نہیں کرو گے کیونکہ اس صورت میں تمہاری اور میری شادی ہرگز نہیں ہوگی اور میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی۔ پلیز مان جانا جم!'' ڈیانا کے لہجے میں لجاجت تھی۔ جم حیران ہو رہا تھا۔

''تم کہو تو سہی، بات کیا ہے؟ میں وعدہ کرتا ہوں مانوں گا۔'' جم نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

''جم...... ! میں اپنا گھر، دو فلیٹس ...... مجھے میرے سابق شوہر سے پیسوں کے علاوہ ملے ہیں اور تینوں گاڑیاں شادی سے پہلے تمہارے نام کرنا چاہتی ہوں۔ اس کے پیچھے ایک بہت بڑی وجہ ہے جو میں تمہیں شادی کے بعد بتاؤں گی کہ کیوں ایک تنہائی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دی جانے والی مطلقہ نے سب کچھ اپنے چھوڑنے والے شوہر کے نام لگا کر خود کو خالی ہاتھ کر لیا تھا۔ فرینک سے شادی نے مجھے بہت سی قیمتی اشیا اور پراپرٹی کا مالک بنا دیا تھا لیکن جلد ہی اس نے مجھے طعنے دینے شروع کر دیے تھے۔ ہماری شادی زیادہ دیر نہ چل سکی۔ اب میں اپنا سب کچھ تمہارے نام کر کے تم سے کوئی بھی ڈیمانڈ نہ کر کے مختلف انداز میں زندگی کا آغاز کرنا چاہتی ہوں۔ اس کے علاوہ ایک بہت بڑی وجہ ہے جو میں تمہیں جیسا کہ پہلے کہہ چکی ہوں، شادی کے بعد ہی بتاؤں گی...... تم جس انداز سے مجھے دیکھ رہے ہو، مجھے تمہاری آنکھوں میں کئی سوال نظر آ رہے ہیں۔ ہاں، واقعی یہ احمقانہ پن اور بہت عجیب ہے لیکن تم مجھ سے وعدہ کر چکے ہو کہ تم میری بات مانو گے اس لیے ان کاغذات پر سائن کر دو اور پھر مجھے رنگ پہنا دو۔'' ڈیانا نے تفصیل سے بات کرتے ہوئے اپنی ڈیمانڈ بتائی اور سائڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی فائل اس کی طرف بڑھا دی۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تھی۔ وہ بہت جذباتی نظر آ رہی تھی۔

جم تو کچھ بولنے کے لائق ہی نہ رہا تھا۔ واجبی سی تعلیم، بس گزارے لائق شکل کے باوجود اسے ڈیانا جیسی لڑکی مل رہی تھی۔ وہ بھی اس انداز میں کہ وہ گنگ سا ہو گیا اور سوچا کہ آخر اس میں ایسا کیا ہے؟

''دیکھو ڈیانا! حالانکہ میں وعدہ کر چکا ہوں لیکن پھر بھی یہ کہوں گا کہ تم جو کر رہی ہو، مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ......''

''نہیں جم، پلیز!'' ڈیانا نے اصرار کیا۔ وہ صوفے کے اوپر ٹانگیں سمیٹے ٹیک لگائے بیٹھی تھی اور بہت اداس سی لگ رہی تھی جیسے کچھ عرصے کی تنہائی اور لوگوں کی نظروں نے

اسے پریشان کر دیا ہو۔ چند جملے دونوں کے درمیان مزید بولے گئے اور جم نے گویا ہار مانتے ہوئے کاغذات پر سائن کر دیے اور ڈیانا کو رنگ پہنا دی۔

ایک ہفتے کے بعد دونوں نے اس شہر کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جانا تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ شادی کے بعد کچھ عرصہ وہیں رہیں گے اور پھر واپس اسی شہر میں آجائیں گے۔

”میں اپنے ایک دو کاروباری معاملات نمٹالوں، ورکشاپ کا کچھ بندوبست کرلوں پھر پرسوں تم سے ملتا ہوں اور پھر شادی اور دوسرے شہر جانے کی تیاری کرتے ہیں۔“

رات کا کھانا ڈیانا کے ساتھ کھانے کے بعد اس کے گھر سے رخصت ہوتے ہوئے جم نے کہا تو ڈیانا نے دلکش مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

موبائل پر گفتگو ہو رہی تھی۔

”تیار رہو، کھیل کا اختتام ہونے والا ہے۔“

”اوکے...... ہم دونوں اس بات کو یقینی بنائیں گے کہ کھیل کا اختتام شاندار اور ہماری توقع کے مطابق ہو۔“

”ایسا ہی ہوگا...... کیونکہ ہم معاملات پر پوری نظر رکھے ہوئے ہیں۔“

☆☆☆

پنک لباس میں ڈیانا بہت پُرکشش لگ رہی تھی۔ شام کا ڈھلتا سورج سمندر میں عکس ڈال کر جہاں اس کی خوبصورتی بڑھا رہا تھا، وہیں اس کی لالی ڈیانا کے چہرے کو مزید حسین بنا رہی تھی۔ اسے جم کا انتظار تھا۔ سمندر کنارے بیٹھی وہ اس کی منتظر تھی۔ یہ اس کی پسندیدہ جگہ تھی۔ تھوڑی دیر میں جم آگیا۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ جم نے قریب بیٹھ کر خوشدلی سے پوچھا۔

”تمہارا انتظار کر رہی تھی۔“ ڈیانا نے اپنی نیلی آنکھوں سے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”ڈیانا! ہم اتوار کو یہاں سے جا رہے ہیں اور شادی بھی ادھر جا کر ہی کریں گے۔ میں نے اپنے یہاں کے سارے معاملات نمٹا لیے ہیں۔ ٹھیک ہے نا؟“ جم بات کرتے ہوئے بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔

”بالکل ٹھیک۔ میں تیاری کر لیتی ہوں تاکہ اس سفر اور زندگی کے نئے سفر کا خوبصورت آغاز کرسکوں۔“ ڈیانا بھی مسکرا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد دونوں کافی پی رہے تھے۔

☆☆☆

واقعی؟ تو یہ پلان بنایا گیا ہے۔“ لہجہ حیرت سے بھرا

حیرت

رات کے وقت ایک عورت باورچی خانے سے خواب گاہ میں آئی تو دیکھا کہ اس کا شوہر بچے کے پالنے کے پاس مبہوت کھڑا ہے۔ بچے کو دیکھ کر اس کے چہرے پر طرح طرح کے جذبوں کے رنگ جھلک رہے ہیں۔ خوشی، فخر، حیرت، تعریف، رشک...... سب کی پرچھائیاں چہرے پر رقصاں ہیں۔ شوہر کی پدری محبت اور مختلف جذبوں کی کشمکش دیکھ کر عورت کے دل میں بچے کے لیے ہی نہیں، شوہر کے لیے بھی پیار امڈ آیا۔ آنکھوں میں محبت کی جوت جگا کر وہ اس کے کاندھے سے لگ کر کھڑی ہوگئی اور پوچھنے لگی۔

”کن خیالوں میں گم ہیں؟“

شوہر نے جواب دیا۔ ”بھئی کمال ہے۔ اتنی دیر سے میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اتنا خوبصورت پالنا کوئی بیس روپے میں کیسے بنا کر دے سکتا ہے؟“

اپنا گھر

ایک سردار جی اپنے گھر میں صرف نیکر پہنے اور ٹائی لگائے بیٹھے تھے۔ ایک دوست آیا۔ اس نے پوچھا۔ ”سردار جی! آپ نے نیکر کیوں پہن رکھا ہے؟“

سردار جی فرمانے لگے۔ ”پھر کیا ہوا۔ اپنے گھر میں ہی بیٹھے ہیں۔“

دوست نے کہا۔ ”پھر ٹائی کیوں لگا رکھی ہے؟“

سردار جی نے جواب دیا۔ ”ارے بھئی کبھی کوئی ملنے جلنے والا بھی تو آجاتا ہے۔“

(مرسلہ: مہتاب احمد، حیدرآباد)

انٹرویو

پریس رپورٹ نے ایک بڑی شخصیت کا انٹرویو لیتے ہوئے کہا۔ ”آپ بہت زیادہ کام کرتے ہیں۔ کبھی تفریح بھی کیا کیجیے۔ مثلاً مچھلی کا شکار وغیرہ تاکہ اس کا ذکر بھی آپ کے انٹرویو میں کرسکیں۔“

بڑے آدمی نے جواب دیا۔ ”آپ شوق سے یہ بات اپنے اخبار میں چھاپ دیں۔ میں کل ہی اپنے سیکریٹری کو مچھلی کے شکار پر بھیج دوں گا۔“

(مرسلہ: نگہت نصیر، ملتان)

ہوا تھا۔

''ہاں، دیکھو کیسا گھٹیا اور چالاک شخص ہے یہ۔''

''کوئی بات نہیں۔ ہم کون سا کم کریں گے۔''

''ہاں، ایسے کے ساتھ اس سے بھی بُرا ہونا چاہیے۔''

☆☆☆

اتوار کی شام کو جم نے ڈیانا سے کہا کہ وہ تیار ہو کر اور اپنا ضروری سامان لے کر اس کے فلیٹ پر آجائے پھر وہیں سے دونوں اپنے نئے سفر کے لیے نکلیں گے۔ ڈیانا نے اپنا ضروری سامان پیک کیا اور جم کے گھر کے لیے روانہ ہوگئی۔ چند منٹ بعد وہ جم کے پاس تھی۔ جم نے بھی اپنا بیگ تیار کر رکھا تھا۔

''میں کافی بنا کر لاتا ہوں، پی کر چلتے ہیں۔ کھانا راستے میں ہی کھائیں گے۔'' اس نے کچن کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

''ضرور...... کافی کی مجھے بھی طلب ہو رہی تھی۔'' ڈیانا نے کہا۔ وہ ایک میگزین کی ورق گردانی کر رہی تھی تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔

''یہ کون اس وقت آگیا؟'' جم کچن سے نکلتے ہوئے بیزاری سے بولا۔ چند لمحوں میں میگی اور جم اس طرح کمرے میں داخل ہوئے کہ جم اسے دھکیل رہا تھا اور وہ زبردستی اندر گھس رہی تھی۔ ڈیانا صورت حال کو دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میگی کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اس کا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا۔

''تو تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئے؟'' اس نے جم کو پرے دھکا دیتے ہوئے چیختے ہوئے کہا۔

''نکل جاؤ، بدتمیز لڑکی! کیوں زبردستی سر پر سوار ہو رہی ہو۔ کتنی بار کہوں کہ میں تمہیں چھوڑ چکا ہوں۔ تم بھی اب جان چھوڑو میری۔'' جم بھی چیخا۔

''تم تو کہتے تھے میگی اب کبھی تمہاری زندگی میں واپس نہیں آئے گی۔ یہ تو پھر آگئی تماشا کرنے۔'' ڈیانا نے شکوہ کیا۔

''بکواس بند کرو گھٹیا عورت! تمہیں شرم آنی چاہیے کسی کے بنے بنائے تعلق کو خراب کرتے ہوئے۔ تم اپنی زبان بند رکھو ورنہ میں تمہارا سر توڑ دوں گی۔'' میگی چلائی۔

''تم ایسے نہیں مانو گی۔'' غصے سے کہتا ہوا جم اس کے قریب آیا اور دونوں بازو دبوچ کر اسے بیرونی دروازے کی طرف گھسیٹنے لگا۔ میگی رو رہی تھی اور اسے اور ڈیانا، دونوں کو گالیاں دے رہی تھی۔ اس نے زور لگاتے ہوئے خود کو چھڑایا اور قریب پڑا ہوا گلدان پوری قوت سے ڈیانا کی جانب پھینکا۔ ڈیانا نے تیزی سے خود کو صوفے پر گرا کر خود کو زخمی ہونے سے بچایا۔ جم اور میگی اب دونوں ایک دوسرے کو مار رہے تھے، بال نوچ رہے تھے۔ ڈیانا بیچ بچاؤ کروانے کے بجائے خود کو بچا کر سائڈ پر کھڑی تھی۔ کمرے کی چیزیں ٹوٹ رہی تھیں۔ شیشے کی ٹیبل کی کرچیاں بکھر گئی تھیں۔ ٹی وی ٹوٹ چکا تھا اور وہ دونوں بھی تھوڑے تھوڑے زخمی ہو چکے تھے۔ لڑتے لڑتے جم کسی چیز سے ٹکرا کر گرا تو میگی نے شیشے کا اسٹول اٹھا کر اس کے سر پر مارنا چاہا۔ جم نے جواباً اسے دھکا دیا اور اسٹول کو ایک سائڈ پر پھینکنا چاہا تو اسٹول میگی کے سر پر لگ گیا اور وہ گر کر یکدم ساکت ہوگئی۔ صوفے اور کرسی کے درمیان گری میگی کو جم نے غور سے دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس کے قریب گیا۔ اس کی نبض چیک کی۔ اس کے ہاتھ سے میگی کا بازو چھوٹ گیا۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ڈیانا کی طرف پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھنے لگا جو کچن کے قریب ڈری ڈری سی کھڑی تھی۔ جم کے خوفزدہ انداز، میگی کے ابھی تک دوبارہ نہ اٹھنے نے ڈیانا پر صورت حال تقریباً واضح کر دی تھی۔

''کک...... کیا ہوا...... تم......؟'' وہ رک رک کر پوچھ رہی تھی۔

''ڈیانا! میگی...... میگی مر چکی ہے...... بہت بُرا ہوگیا...... بہت ہی بُرا ہوگیا۔'' جم کانپتے ہوئے بول رہا تھا۔ وہ لڑکھڑاتے قدموں سے ڈیانا کے قریب پہنچ چکا تھا۔ ڈیانا اسے آنکھیں پھیلائے دیکھ رہی تھی۔

''اب کیا ہوگا؟'' وہ اس کے پاس بیٹھ کر پوچھ رہی تھی۔

''معلوم نہیں۔'' جم نے پسینا صاف کیا۔ ''لگتا ہے، ہم کسی بڑی مصیبت میں پھنسنے والے ہیں۔'' جم ہانپتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

ڈیانا کچن کی دیوار سے ٹیک لگائے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ آہستگی سے اٹھی اور پانی کی بوتل نکال کر جم کے منہ سے لگا دی۔ وہ تیزی سے پانی پینے لگا۔ پانی پی کر اس کے حواس کچھ بحال ہوئے تو جم کچھ بولنے کے قابل ہوا۔

''میں...... میں اس کی لاش کو چھپانے لگا ہوں۔ میرا خیال ہے ہمیں ابھی شادی کو ملتوی کر دینا چاہیے۔ میں اس کی ڈیڈ باڈی کو ٹھکانے لگاتا ہوں۔ تم ابھی واپس جاؤ۔ ہم دونوں اس وقت شہر چھوڑ کر گئے تو اس کی لاش ملنے کے بعد مجھ پر اور تم پر الزام آجائے گا۔ یہ اپنے قریبی دوستوں کو تمہارے اور میرے بارے میں بتا چکی ہے۔ اگر ایسا ہوا

کہ ہمارا نام آیا تو میں نے سوچا ہے کہ میں کیس خود برداشت کروں گا اور یہ ثابت کرنے تک کہ خونخوار لڑائی کے باوجود یہ موت واقعی حادثہ ہی ہے، تم سے نہیں ملوں گا۔ حالانکہ ماضی میں تم اتنے بڑے آدمی کی بیوی ہونے کے باوجود زیادہ مشہور نہیں ہوئیں لیکن پھر بھی بہت سے لوگ تمہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ تم بدنام ہو جاؤ، مجھ سے برداشت نہیں ہوگا اس لیے پلیز، تم چلی جاؤ۔ حالات سازگار ہوتے ہی میں تمہیں خود کال کروں گا۔ یاد رکھنا، اس سارے عرصے میں مجھ سے رابطہ ہرگز نہ کرنا۔'' اس نے بات مکمل کی اور باقی بچا ہوا پانی پینے لگا۔

پانی پی کر وہ اٹھا اور ایک کمبل لے کر آیا اور میگی کی لاش کو اس میں لپیٹا۔ ''میں اسے گاڑی کی ڈکی میں رکھ کر آتا ہوں۔ تم جاؤ، جب ذرا باہر رش کم ہو جائے گا تو میں اسے کہیں پھینک آؤں گا۔'' کہہ کر جم، میگی کی لاش کو لے کر کمرے سے نکل کر گیراج کی طرف چل دیا۔ واپس آکر اس نے ڈیانا سے کہا کہ وہ اپنی گاڑی میں جا کر بیٹھے۔ وہ اس کے بیگز لے کر آتا ہے۔ ڈیانا آہستہ آہستہ سر ہلاتے ہوئے اٹھی اور چلی گئی۔ جم نے ڈیانا کی گاڑی کو دور جاتے دیکھا اور پھر دروازہ لاک کر کے اندر آ گیا۔

☆☆☆

''تیاری مکمل ہے؟''

''ہاں، مکمل ہے۔ تم بتاؤ، سب ویسے ہی ہوا؟'' پوچھا گیا۔

''بالکل ویسے ہی ہوا...... یعنی پلان کے مطابق ہوا۔ اب دو چار دن بعد زوردار جھٹکا لگائیں گے۔'' بتایا گیا۔

''ٹھیک ہے، پھر پہنچو ائرپورٹ پر۔''

''او کے!''

☆☆☆

''آ جاؤ باہر...... چلی گئی وہ۔'' جم نے گاڑی کے پاس آکر کہا۔ ڈیانا کے جاتے ہی وہ تیزی سے گیراج میں آیا تھا۔

''اچھا تو گئی وہ ڈیانا بے وقوف؟'' میگی نے خود پر سے چادر ہٹا کر اٹھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، چلی گئی۔ آؤ، اندر بیٹھ کر آگے کی بات کرتے ہیں۔'' جم نے کہا۔

''میں نے کیا کمال کی ایکٹنگ کی ہے نا؟'' میگی مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''اور کیا، اس ڈیانا کی تو جان نکل گئی تھی۔ کانپتی ہوئی باہر گئی ہے۔'' جم ہنسا۔

''تم نے کاغذات تو قبضے میں کر لیے تھے نا؟'' میگی نے سوال کیا۔

''ارے یہ کام تو بہت پہلے ہو چکا ہے۔'' جم نے جواب دیا۔ تھوڑی دیر بعد دونوں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔

''جب کلارا نے تمہارے اور اس حسین بلا کے بارے میں بتایا تھا تو یقین کرو مجھے آگ لگ گئی تھی لیکن تم نے اسی روز جب میں تم سے لڑنے آئی تھی، مجھے اپنا پلان بتا دیا تھا۔ کلارا حیران تھی۔ اس نے مجھ سے جب ساری حقیقت سنی تو کہہ رہی تھی کیا ڈیانا کو بے وقوف بنا کر اس کی دولت و پراپرٹی ہتھیانا آسان ہوگا؟ تو میں نے اسے بتایا کہ جم بہت ہوشیار ہے۔ وہ آسانی سے اسے شیشے میں اتار لے گا۔ چلو جان چھوٹی اس سے۔ تم مجھے بتاؤ کہ اب میں کیا کروں؟ کیا مجھے کچھ عرصہ روپوش رہنا ہوگا یا کچھ اور پلاننگ ہے تمہارے ذہن میں؟'' میگی نے صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔

''تم ایسا کرو......'' ابھی جم نے بات شروع کی ہی تھی کہ موبائل بج اٹھا۔ ''ارے، ڈیانا کا فون......'' وہ تھوڑا سا گھبرا گیا اور میگی کی طرف دیکھنے لگا جیسے پوچھ رہا ہو کہ کال اٹینڈ کر لوں؟

''بات کرو اس سے۔ رک کیوں گئے؟'' میگی نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے ہمت بندھائی۔

''کہیں اسے پتا تو نہیں چل گیا کہ پراپرٹی کے کاغذات میرے پاس ہیں۔'' جم ڈر رہا تھا۔

''تو...... تو کیا کرے گی وہ...... اس نے خود اپنی پراپرٹی تمہاری محبت میں پاگل ہو کر تمہارے نام کی ہے اور ویسے بھی تم نے کہا تھا کہ اس سلسلے میں تم نے فول پروف پلاننگ کی ہے کہ کیسے اسے ڈرا کر بھگانا ہے پھر کچھ دنوں بعد ہم دونوں نے غائب ہو جانا ہے اور کچھ عرصے بعد ان کاغذات کا بھرپور فائدہ اٹھا لینا ہے پھر کیوں ڈر رہے ہو۔ دیکھو وہ مسلسل کال کیے جا رہی ہے۔ بات کرو اور اگر اسے کوئی شک ہو گیا ہو تو اسے الجھاؤ ورنہ اتنی محنت اور ایکٹنگ اکارت جائے گی۔'' میگی نے اسے سمجھایا تو جم نے سیل فون اٹھا لیا۔

''ہیلو ڈیانا! کیوں فون کیا ہے؟ میں نے کہا بھی تھا کہ......''

''جم...... جم! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار کسی کو یوں اپنے سامنے مرتے دیکھا ہے۔ مجھے تو اپنے سائے سے بھی خوف آ رہا ہے۔ میں نے ایک فیصلہ کیا ہے کہ کچھ عرصے کے لیے یہ شہر چھوڑ دوں اس لیے میں کچھ ہی دیر بعد روانہ ہو رہی ہوں۔ پلیز، جم! ناراض مت ہونا کہ مصیبت کے وقت تمہیں اکیلا چھوڑ کر چلی گئی۔

حالات سازگار ہوتے ہی میں واپس آجاؤں گی پھر ہم شادی کے بارے میں سوچیں گے۔'' ڈیانا کی ڈری ڈری سی آواز سنائی دی تو پوری بات سن کر جم کا چہرہ کھل اٹھا۔

''نہیں، نہیں۔ میں بالکل ناراض نہیں ہوں۔ تم واقعی کچھ عرصے کے لیے شہر سے باہر ہی رہو۔ یہ ٹھیک رہے گا۔'' جم نے کال ختم کی اور وہ اور میگی دونوں خوشی سے قہقہے لگانے لگے۔ جم نے میگی کو پوری بات بتائی تو وہ خوشی سے نہال ہوگئی۔

''یعنی اب مجھے کہیں چھپنے کی ضرورت نہیں۔'' وہ مسکرائی۔ جم بھی مسکرادیا۔ سارا معاملہ اتنی خوش اسلوبی سے حل ہوجائے گا، اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ دونوں آنے والے دنوں کے لیے بھی پُرامید تھے کہ ان کی پلاننگ مکمل کامیاب ہوگی۔

''بے چاری ڈیانا، کیسے بے وقوف بن گئی۔'' جم کمرے کا سامان سمیٹتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''اوہ، بے چاری...... تو تمہیں ترس آرہا ہے اس پر؟'' میگی نے اسے گھورا۔

''ہاں بالکل، اس پر ترس آرہا ہے کیونکہ اس کے علاوہ میرے دل میں اس کے لیے کوئی اور جذبات نہیں ہیں۔'' جم نے کچرا ڈسٹ بن میں ڈالتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

کلارا قدرے اداس سی تھی۔ پچھلے تقریباً ڈیڑھ ماہ سے وہ جو کچھ کررہی تھی، اسے بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن یہ کرنا اس کی مجبوری تھی۔ جو ناپسندیدہ کام وہ کررہی تھی، اس کا آخری حصہ یہ تھا کہ اسے ایک پیکٹ جس میں انتہائی اہم چیزیں تھیں، میگی اور جم کو پہنچانا تھیں۔ اس نے دونوں کو اکٹھے ریسٹورنٹ میں فوری پہنچنے کا کہا۔ کچھ ہی دیر میں وہ بھی وہاں پہنچ گئی جہاں میگی اور جم حیران سے بیٹھے تھے کہ یوں اچانک کلارا کو دونوں سے کون سا کام پڑگیا۔

''آؤ کلارا! ہمیں بڑا تجسس ہورہا ہے کہ تم نے کیا ضروری بات کرنا ہے؟'' میگی نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ کلارا کرسی پر بیٹھ گئی اور کچھ دیر خاموش رہی۔ میگی اور جم کبھی اسے اور کبھی ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

''میں نے جاب چھوڑ دی ہے اور یہاں سے جارہی ہوں۔'' کلارا نے آہستگی سے بتایا۔

''کیوں...... کیوں چھوڑ دی جاب اور کہاں جارہی ہو؟'' میگی نے تشویش سے پوچھا۔

''جاب چھوڑنے کی وجہ اس پیکٹ میں ہے اور میں جا کہاں رہی ہوں، یہ مجھے ابھی خود کو بھی نہیں پتا۔'' کلارا اداس لگ رہی تھی۔ اس نے ایک پیکٹ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

''پیکٹ میں وجہ......؟ کیا مطلب، یہ پہیلی بجھوانے کا کوئی نیا طریقہ ہے کیا؟'' جم واقعی الجھ گیا تھا۔ پہلے دونوں کو اکٹھے ضروری بات کا کہہ کر بلانا پھر جاب چھوڑ دینے کا کہنا اور پھر جاب چھوڑنے کی وجہ پیکٹ میں بتانا۔ واقعی یہ سب کچھ الجھا دینے والا تھا۔

''میں جارہی ہوں۔'' کلارا نے پرس اٹھایا اور یکدم کھڑی ہوگئی جیسے یہاں مزید رکنا نہ چاہ رہی ہو۔ ''تمہارے سوالوں کے جوابات اور بہت کچھ اسی میں ہے۔ تم دونوں اسے کھول کر دیکھ لو...... لیکن یہاں نہیں، گھر جاکر۔'' یہ کہہ کر کلارا تیز تیز قدموں سے ریسٹورنٹ سے باہر چلی گئی۔

''اور بہت کچھ اسی میں ہے۔'' جم نے کلارا کے کہے گئے الفاظ دہرائے۔ ''اور بہت کچھ'' سے کیا مراد ہے؟'' اس کی آنکھوں میں تشویش کے سائے نظر آنے لگے۔ کم و بیش یہی حال میگی کا بھی تھا۔ جم نے پیکٹ اٹھایا اور میگی کو چلنے کا اشارہ کیا۔

گھر پہنچ کر پیکٹ کھولا گیا تو اندر ایک اور لفافہ اور اس کے اوپر ایک چٹ تھی جس پر لکھا تھا۔

''ڈیئر جم! امید ہے خیریت سے ہوگے لیکن مجھے یہ یقین ہے کہ لفافے کے اندر موجود خط پڑھ کر اور ساتھ ہی موجود ویڈیو دیکھ کر تم اور تمہاری کرائم پارٹنر اور مستقبل کی لائف پارٹنر میگی خیریت سے بالکل نہیں رہوگے...... ڈیانا۔''

دونوں نے چٹ پڑھ کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور جم نے بے تابی سے لفافہ کھول کر خط نکالا۔

''منحوس انسان! میں واقعی تم سے شادی کرنے کے لیے سنجیدہ ہوگئی تھی حالانکہ اس شادی کی بڑی وجہ تمہارا کافی دولت مند ہونا تھا لیکن میں تمہیں دھوکا تو نہیں دے رہی تھی نا۔ پہلی بار میگی جب تمہارے فلیٹ پر تم سے لڑکر گئی تو میں نے کافی حد تک تم پر یقین کیا لیکن دو دن بعد ہی میں نے ایک ریسٹورنٹ میں تمہیں اور میگی کو بڑے خوشگوار موڈ میں ہنس ہنس کر باتیں کرتے دیکھا تو میں مشکوک ہوگئی۔ میں نے اسی رات تمہیں فون کیا تو تم نے بتایا کہ تم آج سارا دن گھر پر رہے ہو۔ مجھے یقین آگیا کہ تم مجھے دھوکا دے رہے ہو۔ میرا خون کھول اٹھا کہ تمہارے جیسا گنوار اور عام سی شکل والا میرے ساتھ یہ کررہا ہے۔ میں نے تمہیں سبق سکھانے اور برباد کرنے کی ٹھان لی۔ میں نے اپنے سابق شوہر فرینک سے رابطہ کیا اور اسے کہا کہ ہم دونوں اپنے بگڑے معاملات کو سنوار لیں۔ وہ بھی پہلے ہی سے غالباً یہی

سوچ رہا تھا اس لیے فوراً تیار ہوگیا۔ میں اور وہ دونوں ملے اور تفصیلی ملاقات کی۔ میں نے اسے تمہارے بارے میں پوری بات بتا کر کہا کہ اب میں اسے مزہ چکھاؤں گی اور اس کی ساری جائداد و دولت ہتھیا کر اس فراڈ انسان کو تباہ کردوں گی۔ ہم دونوں نے ایسا شخص ڈھونڈنا شروع کیا جو تمہاری نقل وحرکت کی خبر ہمیں دیتا رہے۔ فرینک نے اپنے کچھ ذرائع استعمال کیے۔ تمہارے شب و روز پر نظر رکھوائی تو پتا چلا کہ کلارا نامی لڑکی میگی کی ایسی دوست ہے جو نہ صرف نقل وحرکت بلکہ ہر بات کی رازدار ہے۔ ہم نے کلارا کو پیسا دے کر خریدنے کی کوشش کی تو اس نے صاف انکار کردیا تو ہم نے اس کی بیمار ماں کو اغوا کر کے اپنے پاس رکھ لیا۔ فرینک نے دھمکی دی کہ پولیس کے پاس جانے کی ہمت نہ کرے کیونکہ وہ اس صورت میں اپنی ماں اور اپنی، دونوں کی جان گنوائے گی۔ وہ بے چاری ہمارے اشاروں پر ناچنے لگی۔ ہم نے کوئی پلان بنانا ضروری سمجھا ہی نہیں بلکہ تمہارے پلان کے مطابق چلنے لگے۔ بس بیچ بیچ میں اپنی طرف سے چھوٹی موٹی چیزیں اس ڈرامے میں ڈالتے رہے۔

جو کاغذات میں نے تم سے سائن کروائے تھے، وہ میری پراپرٹی تمہارے نام نہیں بلکہ تمہاری ساری خاندانی جائداد میرے نام کرنے کے کاغذات تھے جو فرینک نے بنوائے تھے۔ تمہارا کم تعلیم یافتہ ہونا اور اوور کانفیڈنس کا شکار ہونا ہمارے کام کو مزید آسان بنا رہا تھا۔ میں نے فرینک سے کہا کہ ہم دوبارہ شادی کر لیتے ہیں اور جم کی جائداد میری طرف سے تمہیں شادی کا گفٹ ہوگی۔ کلارا ہمیں سب بتاتی رہتی اور میں تمہاری باتوں میں آنے کا ڈراما کرتی رہتی اور پھر میگی کے ''مرنے'' والا دن آگیا۔ اس روز ہم نے کلارا کو تمہارے گھر پر کیمرے لگانے کا کہا۔ تمہیں یاد ہوگا کہ اس صبح وہ تمہارے گھر آئی تھی۔ مختلف جگہ کیمرے لگانے کا مقصد تمہاری اور میگی کی پورے گھر میں ہونے والی ''لڑائی'' اور ''موت'' کی ریکارڈنگ کر کے تمہیں پھنسانا تھا۔'' جم اتنا پڑھ کر ہانپ گیا۔ اس کے ساتھ بیٹھی میگی بھی شدید پریشان ہوگئی تھی۔ وہ بھی ساتھ ساتھ پڑھ رہی تھی۔ جم نے بہ مشکل ہمت مجتمع کر کے خط دوبارہ پڑھنا شروع کیا۔

''سب کچھ تمہارے اور ہمارے پلان کے مطابق ہوا۔ تم اور میگی خوش ہوتے رہے کہ ہم کامیاب ہوگئے، ڈیانا بھاگ گئی۔ اب ہم اس کی دولت پر عیش کریں گے اور وہ بے چاری بدنامی کے ڈر سے زیادہ کچھ نہ کر پائے گی۔ ویسے بھی وہ خود ہی سائن کر چکی ہے کہ اس کا سب کچھ جم کا ہے۔ تم خوش ہو رہے تھے اور ہم ہنس رہے تھے کہ کیسے ہم نے تمہیں بے وقوف بنا دیا۔ میں اور فرینک شادی کر رہے ہیں اور تھوڑا سا گھوم پھر کر واپس آئیں گے۔ تمہارا شکریہ کہ تم نے ہم دونوں کو پھر سے ملا دیا اور ہاں...... خط جلدی ختم کر کے ویڈیو دیکھ لو۔ اگر یہ ریکارڈنگ پولیس تک پہنچ گئی تو تم بُری طرح پھنسو گے۔ اگرچہ تم میگی کو پیش کر کے یہ ثابت کردو گے کہ یہ زندہ ہے اور میں نے ڈراما کیا تھا لیکن ڈراما کیوں کیا تھا؟ کا جواب جب مجھے فراڈ دینا نکلے گا اور تمہاری اور میگی کی میرے متعلق کی جانے والی گفتگو مجھے بے وقوف بنانے پر ہنسی اڑانے کی ویڈیو دیکھی جائے گی تو تم دونوں پر فراڈ کا ایسا کیس بنے گا کہ حشر بُرا ہو جائے گا۔ اگر بُرے حشر سے بچنا ہے تو میرے بارے میں بالکل خاموش رہو اور جو مالی نقصان میں نے تمہیں پہنچایا ہے، اسے برداشت کرو ورنہ بھیانک نتائج کے ذمے دار تم خود ہوگے۔ تمہاری الماری وغیرہ میں وہ کاغذات ضرور ہوں گے جو تم نے اپنی بہت بڑی کامیابی سمجھ کر سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان کو نکال کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دو۔ وہ بالکل فضول سے کاغذات ہیں...... گڈبائی...... ڈیانا۔''

خط پڑھ کر دونوں کے چہرے پھیکے پڑ گئے اور ویڈیو دیکھ کر مزید اوسان خطا ہوگئے۔ جم اور میگی کی مار کٹائی، میگی کو اسٹول سے چوٹ لگوا کر ساکت ہو جانے سے لے کر ''لاش'' گاڑی میں رکھنے تک اور پھر دونوں کے ڈیانا کو دھوکا دینے کی باتیں، مذاق اڑانے کی ویڈیو ریکارڈنگ تھی۔ اسے اس انداز میں ایڈٹ کیا گیا تھا کہ ڈیانا کہیں پر بھی نظر نہیں آرہی تھی۔

''دو روز قبل کلارا آئی تھی اور مجھے کافی بنانے کا کہہ کر گھر میں گھومنے پھرنے لگی تھی۔'' جم نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا۔

''ہاں، ظاہر ہے کیمرے جو اتارنے تھے اس نے۔'' میگی بکھری بکھری سی لگ رہی تھی۔ اپنی رازداں سہیلی کے ہاتھوں اس کا یہ حال ہوگا، اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ ڈراما انہوں نے بنایا تھا کہ جم سے عمر میں بڑی ڈیانا کو بے وقوف بنایا جائے لیکن ہوا یہ کہ ڈرامے کا اختتام دوسروں کی مرضی سے ہوا اور وہ دونوں ردی کے کاغذات سامنے رکھے شکست خوردہ سے بیٹھے تھے۔ واقعی، ڈیانا نے انہیں خوب بے وقوف بنایا تھا۔ دراصل وہ عمر اور تجربے میں ان دونوں سے بڑی تھی نا۔

⌘⌘⌘

عقل بند

ملک صفدر حیات

اکثر شاطر لوگ خود کو عقلِ کُل سمجھتے ہیں جبکہ کُل عقل کا ذرا سا حصہ ہی اُن کے نام ہو پاتا ہے۔ اُس پر اُن کے گھمنڈ کا یہ عالم ہوتا ہے کہ زمانے کو ٹھوکر پر رکھتے ہیں... مگر بھول جاتے ہیں کہ جب قدرت کی لاٹھی رقص کرتی ہے تو ٹھوکر پر رکھنے والے نہ صرف خود ٹھوکر کھا کر منہ کے بل جا گرتے ہیں بلکہ ٹھکرائے جانے کی تکلیف انہیں پھر کبھی چین نہیں لینے دیتی۔

جاتی ہوئی سردی صحت کے لیے کسی ٹانک سے کم نہیں ہوتی اور یہی فارمولا ہر موسم پر منطبق ہے۔ سیانے کہہ گئے ہیں کہ موسم کوئی بھی ہو، اس کی آمد اپنے ساتھ بیماریاں بھی لے کر آتی ہے لہٰذا احتیاط ضروری ہے اور موسم کی رخصتی صحت اور تندرستی کی پیامبر ہوتی ہے چنانچہ اس سے دل کھول کر استفادہ کرنا چاہیے۔

وہ ماہِ فروری کا وسط تھا۔ موسم سرما رخصت ہوتے گلابی ٹھنڈک چھوڑ گیا تھا اور وہ بھی چند دن کی مہمان تھی۔ میں تھانے میں بیٹھا حسبِ معمول روزمرہ کے کام نمٹا رہا تھا کہ تین افراد مجھ سے ملنے آگئے۔ ان کی آمد کی اطلاع کانسٹیبل سیف اللہ نے مجھ تک پہنچائی تھی۔

''ملک صاحب! لاہور سے تین بندے آئے ہیں۔'' کانسٹیبل نے بتایا۔ ''ان میں دو کا تعلق اپنے ہی ڈیپارٹمنٹ سے ہے۔ وہ لوگ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

ان دنوں میری تعیناتی ضلع گوجرانوالہ کے ایک تھانے میں تھی۔ لاہور میرے تھانے سے محض چالیس میل اور لگ بھگ ایک گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ میں نے سیف اللہ سے کہا۔

''انہیں فوراً میرے پاس بھیجو۔''

آئندہ ایک منٹ کے اندر وہ تینوں میرے سامنے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد ان میں سے ایک نے سب کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''ملک صاحب! میں سب انسپکٹر بشارت ہوں اور یہ میرے ساتھ کانسٹیبل حنیف ہے۔'' اس نے اپنے پہلو میں

بیٹھے ہوئے شخص کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ ''جبکہ یہ ہمارے معزز ساتھی علی محمد ہیں۔''

علی محمد اور دونوں پولیس والے اس وقت عوامی لباس میں تھے۔ سب انسپکٹر کی بات مکمل ہونے پر میں نے معتدل انداز میں کہا۔

''آپ لوگوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ بتائیں، میں آپ کے لیے کیا کرسکتا ہوں؟''

''ملک صاحب! ہمیں آپ کی مدد اور تعاون درکار ہے۔'' سب انسپکٹر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''ہم لاہور کے ایک رہائشی کی تلاش میں یہاں آئے ہیں۔''

میں نے ایک کانسٹیبل کو بلا کر مہمانوں کے لیے چائے پانی اور بسکٹ وغیرہ لانے کو کہا پھر اپنے سامنے بیٹھے ہوئے سب انسپکٹر سے پوچھا۔

''آپ کو کس کی تلاش ہے اور وہ بھی میرے علاقے میں؟ میں تفصیل جاننا چاہوں گا اور جہاں تک میری مدد اور تعاون کی بات ہے تو آپ مجھے پیش پیش پائیں گے۔ بتائیں معاملہ کیا ہے؟''

سب انسپکٹر نے علی محمد نامی شخص کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ شروع کریں۔ اگر کوئی بات رہ گئی تو وہ میں ملک صاحب کو بتادوں گا۔''

''تھانیدار صاحب!'' علی محمد براہ راست مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''میرے ایک دوست میاں نذیر نے قلعہ دیدار سنگھ کے چودھری حق نواز سے پچاس ایکڑ زرعی زمین خریدی تھی۔ میاں نذیر اس زمین پر پھلوں کے باغات لگانا چاہتا تھا اور اسی سلسلے میں وہ کئی بار لاہور سے قلعہ دیدار سنگھ آبھی چکا تھا۔''

''ایک منٹ!'' میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''علی محمد! آپ اپنے دوست میاں نذیر کا ذکر کرتے ہوئے ماضی کا صیغہ کیوں استعمال کررہے ہو؟''

''میں اسی طرف آرہا تھا۔'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''میاں صاحب آخری بار جب قلعہ دیدار سنگھ ضلع گوجرانوالہ آئے تو پھر واپس نہیں گئے۔''

''اوہ...... یہ کب کی بات ہے؟'' میں نے تشویش بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''میاں نذیر آخری مرتبہ آٹھ فروری کو یہاں آئے تھے۔'' علی محمد وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''وہ جب بھی قلعہ دیدار سنگھ آئے تو شام میں واپس لاہور ضرور چلے گئے تھے۔ آٹھ فروری کی رات تک جب وہ اپنے گھر نہیں پہنچے تو ان کی بیوی نرگس پریشان ہوگئی۔ اگلی صبح وہ میرے پاس آئی اور میاں صاحب کی عدم موجودگی کے بارے میں بتایا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اس لیے میں بھی فکر مند ہوگیا۔ میں نے نرگس سے کہا کہ وہ آج کا دن یعنی نو فروری کی شام تک اپنے شوہر کا انتظار کرے۔ اگر میاں نذیر واپس نہیں آئے تو میں خود دس فروری کو قلعہ دیدار سنگھ جاکر میاں صاحب کی خیر خبر لوں گا۔ میں دس فروری کی صبح لاہور سے ایک بس میں بیٹھ کر گوجرانوالہ آنے کے لیے روانہ ہوگیا۔ گوجرانوالہ کے بس اسٹینڈ سے میں نے ایک تانگا پکڑا اور چودھری حق نواز سے ملنے سیدھا قلعہ دیدار سنگھ پہنچ گیا۔ اس کے بعد کیا ہوا...... آپ کو یقین نہیں آئے گا تھانیدار صاحب......!'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر عجیب سی نظر سے مجھے تکنے لگا۔

اسی وقت کانسٹیبل مہمانوں کی خاطر تواضع کے سامان کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ جب کانسٹیبل اشیائے خورونوش کو میز پر سجانے کے بعد واپس چلا گیا تو میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔

''گفتگو کا سلسلہ جاری رہے گا مگر پہلے طعام، بعد کلام اور کام......!''

جب ان تینوں کے ہاتھ اور منہ حرکت میں آگئے تو میں نے علی محمد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کی بات کا یقین کرلوں گا۔ آپ بتائیں، کیا ہوا تھا؟''

''دس فروری کو جب میری ملاقات چودھری حق نواز سے ہوئی تو اس نے یہ کہہ کر مجھے حیران کردیا کہ وہ کسی میاں نذیر کو نہیں جانتا اور اس نے اپنی پوری زندگی میں بھی پچاس فٹ زمین فروخت نہیں کی، پچاس ایکڑ زرعی اراضی کو بیچ ڈالنا تو ایسا ہی ہے کہ انسان زمین پر کھڑے ہوکر آسمان کا سودا کرنے کا تصور کرے۔''

''ہاں، یہ تو چودھری نے بالکل ٹھیک کہا تھا۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلائی اور علی محمد سے پوچھا۔ ''پھر آپ نے کیا کیا؟''

''میرے پاس واپسی کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا۔ سو میں نے لاہور جانے والی بس پکڑی اور گھر آگیا۔'' اس نے بتایا۔ ''میں نے یہ تو سن رکھا ہے کہ کوئی زمیندار اپنی جان تو دے سکتا ہے مگر زمین بیچنے کے بارے میں سوچنے کو بھی وہ گناہ سمجھتا ہے اور دوسری جانب میاں صاحب تھا جنہوں نے کبھی مجھ سے غلط بیانی نہیں کی۔''

''کیا آپ نے اپنے گمشدہ دوست میاں نذیر کے

پاس پچاس ایکڑ اراضی کی ملکیت کے کاغذات وغیرہ دیکھے تھے؟'' میں نے ایک اہم سوال کیا۔

''جی، بالکل دیکھے تھے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔''جب انہوں نے مجھے باغات کے لیے پچاس ایکڑ زمین کی خریداری کے بارے میں بتایا تو میں ان کے گھر گیا تھا۔ اس روز میاں صاحب اور بھابی نرگس سے میری خاصی طویل ملاقات ہوئی تھی۔ اسی دوران میں میاں صاحب نے مجھے زمین کی خریداری کے پکے کاغذات بھی دکھائے تھے۔ میں رات کا کھانا ان کے ساتھ کھانے کے بعد ہی واپس آیا تھا۔''

''یہ تو ہو گیا دس فروری کا احوال۔'' میں نے علی محمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔''اور آج ہے فروری کی بارہ تاریخ۔ میں جاننا چاہوں گا کہ کل یعنی گیارہ فروری کو آپ کیا کرتے رہے ہیں؟''

''میاں صاحب کے زیادہ رشتے دار نہیں ہیں۔'' اس نے بتایا۔''پہلی بیوی مرحومہ صفیہ بی بی سے ان کا صرف ایک ہی بیٹا ہے جس کا نام شفیق ہے۔ شفیق عرصہ دراز سے فرانس کے شہر مارسے میں سیٹل ہے۔ وہ مارسے میں ایک ریسٹورنٹ چلاتا ہے اور اس نے ایک فرانسیسی لڑکی سے شادی کر رکھی ہے۔ میاں صاحب کی دوسری بیوی بھابی نرگس ہیں۔ نرگس سے انہوں نے دو سال پہلے شادی کی ہے۔ ابھی ان کی اولاد نہیں ہے۔ یہ تو ہو گئی میاں صاحب کی مختصری فیملی......'' وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے متوقف ہوا پھر اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''دوست احباب اور دیگر میل ملاپ والے لوگوں کا حلقہ بھی محدود ہے۔ میں نے کل شام تک ہر جاننے والے سے پوچھ تاچھ کر لی لیکن کہیں سے بھی میاں صاحب کی اچھی یا بری خبر نہ ملی چنانچہ میں نرگس بھابی کو ساتھ لے کر تھانے پہنچا اور میاں صاحب کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا دی۔''

''ہم اسی سلسلے میں آپ کے پاس آئے ہیں۔'' سب انسپکٹر بشارت نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔''رپورٹ درج ہو جانے کے بعد کارروائی ضروری تھی۔ ہمارے انچارج صاحب نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے تاکہ آپ کو صورت حال سے آگاہ کر سکوں۔ اس پورے معاملے کے ساتھ قلعہ دیدار سنگھ کے چودھری حق نواز کا نام جڑا ہوا ہے اور قلعہ دیدار سنگھ آپ کے تھانے کی حدود میں آتا ہے لہٰذا یہ سارا تفتیشی پروگرام آپ کی نگرانی ہی میں ہونا ہے۔ میں اور کانسٹیبل حنیف آپ کے ساتھ ساتھ رہیں گے۔ وہ بھی اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو...... بصورت دیگر ہم دونوں بھی علی محمد کے ساتھ ہی واپس لاہور چلے جائیں گے۔ تمام معلومات آپ کو فراہم کر دی گئی ہیں۔ جب آپ میاں نذیر کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جائیں تو ہمیں بتا دیجیے گا۔''

''نمبر ایک...... مجھے آپ دونوں کے یہاں رکنے بلکہ آپ کے ساتھ علی محمد کے بھی قیام پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔''آپ لوگوں کے لیے منجی بسترے اور کھانے پینے کا مناسب بندوبست کر دیا جائے گا۔ آپ جب تک چاہیں، مہمان بن کر یہاں رہ سکتے ہیں۔ نمبر دو......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''آپ لوگوں کی فراہم کردہ معلومات ادھوری ہیں۔ میں ان سے مطمئن نہیں ہوں۔ مجھے آپ سے بہت کچھ پوچھنا ہے اور چند دستاویزی ثبوت بھی چاہیے ہوں گے۔ چودھری حق نواز پر پکا ہاتھ ڈالنے کے لیے یہ سب ضروری ہے۔''

''آپ ہم سے جو بھی سوال کریں گے، ہم اس کا سولہ آنے درست جواب دیں گے۔'' سب انسپکٹر نے گہری سنجیدگی سے کہا۔''لیکن دستاویزی ثبوت والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی ملک صاحب!''

''میں سمجھاتا ہوں۔'' میں نے رسان بھرے انداز میں کہا۔''علی محمد نے بتایا ہے کہ اس نے میاں نذیر کے پاس پچاس ایکڑ زرعی زمین کی ملکیت کے کاغذات دیکھے ہیں جو اس امر کا ثبوت ہے کہ چودھری حق نواز نے اپنی پچاس ایکڑ زرعی اراضی میاں نذیر کے ہاتھ فروخت کی ہے۔ اس قانونی دستاویز میں مذکورہ زمین کی قیمت بھی درج ہو گی۔ مجھے وہ کاغذات چاہیے ہوں گے۔''

''زمین کے کاغذات میاں صاحب کے گھر ہی میں ہوں گے۔'' علی محمد نے کہا۔''میں بھابی نرگس سے وہ کاغذات لا کر آپ کو دکھا سکتا ہوں۔ میں نے خود پڑھا تھا، ان کاغذات میں اس زمین کی فی ایکڑ قیمت ایک ہزار روپے لکھی ہوئی تھی۔''

''یعنی پچاس ایکڑ اراضی کو خریدنے کے لیے آپ کے میاں صاحب نے چودھری حق نواز کو پچاس ہزار روپے ادا کیے تھے؟'' میں نے بے یقینی سے علی محمد کی طرف دیکھا اور پوچھا۔''میاں نذیر کرتا کیا ہے؟ میرا مطلب ہے اس کا ذریعہ آمدنی کیا ہے؟''

آج کل پچاس ہزار روپے میں ڈھنگ کی ایک موٹر

سائیکل نہیں آتی اور میں اس رقم کی ادائیگی پر حیرت کا اظہار کر رہا ہوں...... تو اس پر آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ آج سے برسوں پہلے بہت ہی اچھے وقت کا واقعہ ہے۔ وہ سستائی کا زمانہ تھا۔ ایک عام مزدور کی تنخواہ تیس سے چالیس روپے ماہانہ ہوا کرتی تھی جس میں سے وہ بچت بھی کیا کرتا تھا اور اس کا سیدھا سا سبب یہ تھا کہ تب زندگی بہت آسان اور خوشگوار ہوتی تھی۔ ایک تولہ (بارہ گرام) سونا پچاس روپے میں مل جاتا تھا۔ بکرے کا گوشت دو روپے سیر، گندم تین روپے کی من (چالیس سیر) اور چاول پانچ روپے من فروخت ہوتے تھے۔ ایک متوسط چھ افراد کے کنبے کے لیے مہینے بھر کا راشن بیس روپے میں آجاتا تھا۔ اس لحاظ سے زرعی اراضی کی فی ایکڑ ایک ہزار روپے ...... بہت زیادہ قیمت تھی اسی لیے میں چونک اٹھا تھا۔

''میاں صاحب کی ادھر لاہور میں برانڈرتھ روڈ پر ''میاں مکینیکل ورکس'' کے نام سے اپنی دکان ہے۔'' علی محمد نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''جہاں ٹیوب ویل، موٹروں، خراد مشین سے متعلق ہر قسم کا سامان فروخت ہوتا ہے۔ میں نے میاں صاحب سے کہا بھی تھا کہ باغات کے لیے تو پانچ ایکڑ زمین بھی کافی تھی اور وہ زمین آپ کو لاہور کے گردونواح میں بھی مل سکتی تھی۔ اتنی دور جا کر ایک بھاری سرمایہ کاری کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ میرے سوال کے جواب میں وہ مسکرا کر بولے تھے...... یہ بات آپ نہیں سمجھ سکتے۔''

''آپ کا یہ اندازہ تو بالکل درست ہے کہ پانچ سے دس ایکڑ میں بہترین باغات لگائے جاسکتے ہیں۔ پچیس اور پچاس ایکڑ کے منصوبے تو کمرشل ادارے بناتے ہیں جن کی فیکٹریوں میں تیار ہونے والی پروڈکٹس پورے ملک میں سپلائی ہونے کے علاوہ بیرون ملک بھی ایکسپورٹ کی جاتی ہیں لیکن میں اس اماؤنٹ پر حیرت زدہ ہوں جو میاں صاحب نے چودھری صاحب کو ادا کیا۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے خیال میں اس وقت عمدہ قسم کی زرعی زمین ایک ایکڑ دو سو روپے تک میں مل جاتی ہے۔ اس موٹے حساب کے مطابق پچاس ایکڑ زمین دس ہزار روپے سے زیادہ کی نہیں ہونا چاہیے۔ تم لوگ جو بتا رہے ہو، اگر وہ سچ ہے تو پھر میں یہی کہوں گا کہ چودھری حق نواز نے میاں نذیر کو لوٹ لیا تھا۔''

''ملک صاحب! اس وقت سب سے اہم مسئلہ میاں نذیر کی گمشدگی کا ہے۔'' سب انسپکٹر نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں زمین کی مہنگی سستی خرید و فروخت کی بحث میں وقت برباد کرنے کے بجائے میاں صاحب کو تلاش کرنے کے سلسلے میں کوئی مؤثر لائحہ عمل ترتیب دینا چاہیے۔''

''میرا خیال ہے، میں وہی کر رہا ہوں۔'' میں نے سپاٹ آواز میں کہا۔ ''میاں نذیر کو بازیاب کرنے کی کوشش میں ہم چودھری حق نواز آف قلعہ دیدار سنگھ کو اور اس کی پچاس ایکڑ زرعی اراضی کو قطعاً نظرانداز نہیں کرسکتے کیونکہ اسی زمین کو خریدنے کے لیے میاں نذیر لاہور سے گوجرانوالہ کے درمیان چکر لگاتا رہا ہے اور آٹھ فروری والے یعنی آخری چکر کے بعد وہ بندہ واپس اپنے گھر نہیں پہنچا۔ اگر میاں نذیر تک پہنچنا ہے تو ہمیں اپنی تفتیش کا آغاز چودھری حق نواز ہی سے کرنا ہوگا۔''

''لیکن چودھری حق نواز تو میاں نذیر سے اپنی کلی اجنبیت کا اظہار کر چکا ہے؟'' سب انسپکٹر بشارت نے ایک اہم پوائنٹ کی جانب اشارہ کیا۔

''بے شک!'' میں نے ایس آئی کے چہرے پر نگاہ جما کر کہا۔ ''لیکن وہ مکمل ناشناسائی علی محمد کے استفسارات کے جواب میں تھی لیکن آپ جانتے ہو، ہم پولیس والوں کی تفتیش کا انداز وکھری ٹائپ کا ہوتا ہے۔ چودھری حق نواز کوئی عام دیہاتی نہیں ہے کہ جب چاہیں اسے اٹھا کر حوالات میں بند کردیں۔ میں نے عرض کیا ہے نا، میں چودھری پر مضبوط ہاتھ ڈالنا چاہتا ہوں تاکہ اگر وہ میاں نذیر کے غیاب میں ملوث ہے تو میری گرفت سے نکل نہ پائے اور اس مقصد کے حصول کے لیے......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے علی محمد کی جانب دیکھا اور ٹھوس انداز میں اضافہ کردیا۔

''مجھے پچاس ایکڑ زرعی اراضی کی فروخت والی وہ دستاویز چاہیے جو لاپتا میاں نذیر کے گھر میں کہیں رکھی ہونا چاہیے۔''

''آپ کی بات میری سمجھ میں آگئی ہے ملک صاحب!'' سب انسپکٹر میرے دلائل سے قائل ہوتے ہوئے بولا۔ ''میرے خیال میں ہم تینوں کو فی الحال لاہور واپس چلے جانا چاہیے۔ آپ کے پاس گمشدگی کے اس کیس کی کچی رپورٹ تو درج ہو ہی چکی ہے۔ آپ میاں نذیر کی تلاش کا کام شروع کریں۔ میں تین چار روز بعد دوبارہ یہاں آکر تازہ ترین حالات معلوم کرلوں گا۔'' پھر علی محمد کی جانب دیکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ''آپ وہ قانونی دستاویز کب تک ملک صاحب کے حوالے کرسکتے ہیں؟''

''دیکھیں جی...... وہ کاغذات میرے پاس نہیں رکھے ہوئے کہ میں کل ہی تھانیدار صاحب تک پہنچادوں۔''

علی محمد معقولیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے بولا۔ ''میں آج جا کر نرگس بھابی سے بات کرتا ہوں۔ وہ جب مذکورہ کاغذات میرے سپرد کر دیں گی تو میں انہیں حفاظت سے لے کر یہاں آجاؤں گا۔''

''اگر نرگس اپنے خاوند کی بازیابی میں دلچسپی رکھتی ہے تو اسے پہلی فرصت میں یہ کام کرنا ہوگا۔'' سب انسپکٹر نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ''ورنہ پولیس سے عدم تعاون کی بنا پر ہم ایف آئی آر خارج کر کے میاں نذیر کی تلاش سے ہاتھ اٹھا لیں گے۔''

''آپ کی کیا مصروفیات ہیں علی محمد؟'' میں نے گمشدہ میاں نذیر کے دوست سے استفسار کیا۔

''جناب! لاہور کے اردو بازار میں ہمارا کتابوں اور کاغذ کا کاروبار ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''ہم لوگ دادا جان کے زمانے سے یہ کام کر رہے ہیں۔ کبیر اسٹریٹ میں ہماری ایک بڑی دکان ہے جس میں اسکول کالج کے نصاب کے علاوہ دینی کتابیں بھی ہوتی ہیں۔ میں اپنے والد صاحب کے ساتھ ہی دکان پر بیٹھتا ہوں۔ ہم پرنٹنگ پیپرز کے ہول سیلر ہیں۔ ہماری دکان میں دو ملازم بھی کام کرتے ہیں۔''

''ٹھیک ہو گیا۔'' میں نے مطمئن انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے اگر آپ ایک آدھ دن کے لیے دکان کی طرف نہ بھی جائیں تو اس سے آپ لوگوں کا کاروبار متاثر نہیں ہوگا۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں نا؟''

''نہیں جناب! آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔''

''میں آپ کو دو دن دیتا ہوں۔'' میں نے علی محمد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ میاں نذیر کی بیوی کو سمجھا بجھا کر وہ کاغذات نکلوائیں اور انہیں مجھ تک پہنچا دیں۔ اگر نرگس اس بات کے لیے راضی نہ ہو تو اس صورت میں متعلقہ تھانہ چاہے درج شدہ رپورٹ کو خارج کر دے مگر میں کارروائی کرنے سے باز نہیں آؤں گا۔ کوئی رپورٹ پکی ہو یا محض زبانی، میں اسے نظر انداز نہیں کر سکتا اور...... میاں نذیر کی گمشدگی کی رپورٹ میرے ذہن میں درج ہو چکی ہے۔''

سب انسپکٹر بشارت نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

''اس کا کیا مطلب ہوا ملک صاحب؟''

''مطلب بالکل صاف ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر دباؤ ڈالتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنے طور پر میاں نذیر کی تلاش کا کام جاری رکھوں گا۔ اس مقصد کے لیے اگر مجھے لاہور بھی جانا پڑا تو میں ضرور جاؤں گا۔''

وہ تینوں حیرت بھری نظروں سے مجھے تکنے لگے۔ ان کی آنکھوں سے جھلکتے تاثرات سے یہی لگتا تھا کہ ان کے سامنے انسان کے بجائے کسی اور سیارے کی مخلوق بیٹھی ہو۔ بالآخر سب انسپکٹر سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''ہمارے انچارج صاحب نے آپ کے بارے میں بالکل ٹھیک کہا تھا۔ آپ اپنی نوعیت کے بڑے منفرد تھانیدار ہیں۔''

''انفرادیت کا مطلب ہے، معمول سے ہٹ کر اور عام لوگوں سے مختلف۔'' میں نے کہا۔ ''اور اس ٹائٹل کے حصول کے لیے لگے بندھے طور طریقوں سے بغاوت کرنا پڑتی ہے۔ اگر آپ چاہتے ہو کہ محکمہ آپ کی کارکردگی پر ''اوسط'' کا ٹھپا نہ لگائے تو پھر پرائے پھٹے میں ٹانگ پھنسا کر تکلیف کا لطف اٹھانا پڑتا ہے۔ جب تک آپ دوسرے لوگوں سے کچھ الگ نہیں کرو گے تو کون آپ پر دھیان دے گا۔''

سب انسپکٹر احترام اور عقیدت بھری نگاہ سے مجھ پر دھیان دینے لگا۔

☆☆☆

تیرہ فروری کی دوپہر علی محمد ایک بار پھر میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ خالی ہاتھ نہیں آیا تھا۔ نرگس نے پولیس سے تعاون کا مظاہرہ کرتے ہوئے پچاس ایکڑ اراضی کی خریداری کے سلسلے میں تیار کی جانے والی قانونی دستاویز اس کے حوالے کر دی تھی۔ وہ ان کاغذات کو میری جانب بڑھاتے ہوئے فخریہ لہجے میں بولا۔

''میں نے کام کر دیا تھانیدار صاحب!''

''شاباش!'' میں نے ستائشی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''واقعی آپ میاں نذیر کے سچے اور پرخلوص دوست ہیں اور چاہتے ہیں کہ میں جلد از جلد میاں صاحب کو ڈھونڈ نکالوں۔''

''بالکل یہی بات ہے ملک صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''دراصل بھابی نرگس میاں صاحب کی گمشدگی سے بہت پریشان ہیں اسی لیے انہوں نے فوراً یہ دستاویز نکال کر مجھے دے دی۔ وہ تو میرے ساتھ آنے کی ضد کر رہی تھیں لیکن میں راضی نہیں ہوا۔ میں نے بھابی سے کہا کہ پہلے میں آپ سے پوچھ لوں۔ اگر آپ نے اجازت دی تو پھر میں انہیں بھی یہاں لے آؤں گا۔''

''اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں نرگس سے ملاقات کروں گا۔'' میں نے اس کے ہاتھ سے وہ کاغذات لیتے ہوئے سرسری انداز میں کہا۔ ''اس طرح نئی باتیں سامنے آئیں گی جو میاں نذیر کی تلاش میں مددگار ثابت ہوں گی۔''

''چند باتیں تو بھابی نے مجھے بتائی بھی ہیں۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ اس دوران میں، میں نے دستاویز کا مطالعہ اور مشاہدہ شروع کر دیا تھا لہٰذا اس نے جلدی سے اضافہ کر دیا۔ ''آپ پہلے ان کاغذات کا جائزہ لے لیں پھر میں آپ کو بتاتا ہوں۔''

میں نے بغور ان کاغذات کا معائنہ کیا اور مجھے ایک دو مقام پر کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ بعض دستخط جعلی تھے اور ایک آدھ مہر میں بھی نقلی پن صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے علی محمد کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''یہ پچاس ایکڑ زمین کے اصلی کاغذات نہیں ہیں۔ لگتا ہے آپ کے دوست کے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق کسی نے گھر میں بیٹھ کر یہ نقلی دستاویز تیار کی ہے۔ مزید تسلی کے لیے میں پٹواری اور قانون گو کو بھی یہ کاغذات دکھاؤں گا اور رجسٹری آفس میں جا کر بھی چیک کروں گا کہ اس قطعۂ اراضی کے انتقال کا کوئی قانونی ریکارڈ موجود ہے یا نہیں۔ اگر چودھری نے زمین بیچی ہے تو ٹرانسفر کا ریکارڈ لازمی مل جائے گا۔''

''ملک صاحب! یہ دفتری جانچ پڑتال تو ہوتی رہے گی۔'' علی محمد نے کہا۔ ''لیکن چودھری حق نواز تو قلعہ دیدار سنگھ میں موجود ہے۔ اگر واقعی یہ کاغذات بوگس ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میاں نذیر کے ساتھ چودھری نے فراڈ کیا ہے۔ آپ فوری طور پر چودھری حق نواز سے تو پوچھ تاچھ کر سکتے ہیں نا۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر یاددہانی کرانے والے انداز میں بولا۔

''آپ نے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں پچاس ایکڑ اراضی کی ملکیت کے کاغذات لے آؤں تو آپ چودھری حق نواز پر پکا ہاتھ ڈالیں گے۔''

''میں اپنے وعدے پر قائم ہوں۔'' میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''ہم ابھی قلعہ دیدار سنگھ کی طرف جانے والے ہیں۔ چودھری سے جو بھی بات ہوگی، وہ آپ کے سامنے ہی ہوگی لیکن یہ نکتہ ذہن نشین کر لیں کہ......'' میں نے ڈرامائی انداز میں رک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے اضافہ کر دیا۔

''ان کاغذات کے نقلی ثابت ہو جانے سے یہ بات تو روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائے گی کہ میاں نذیر کے ساتھ ایک سنگین دھوکا کر کے کسی شخص نے پچاس ہزار روپے ہتھیا لیے ہیں مگر وہ 'کسی' چودھری حق نواز ہی ہے، اس راز تک رسائی حاصل کرنے کے لیے اچھی خاصی بھاگ دوڑ کرنا پڑے گی اور وہ میں ضرور کروں گا۔ آپ کو اس حوالے سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟''

''سمجھ گیا جناب!'' وہ جلدی سے بولا۔

''تو پھر بتائیں، نرگس نے آپ سے کون سی اہم باتیں کی ہیں؟''

''دو باتیں ہیں ملک صاحب!'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''میاں صاحب کی دکان پر ایک دیرینہ وفادار ملازم کام کرتا ہے۔ اس ملازم کا نام سدھیر ہے۔ میاں صاحب سدھیر پر اندھا اعتماد کرتے تھے۔ سدھیر کی زبانی نرگس بھابی کو پتا چلا ہے کہ چودھری حق نواز کا ایک ملازمِ خاص ارشاد، میاں صاحب کی دکان سے ٹیوب ویل اور موٹروں وغیرہ کا سامان لینے آتا تھا۔ میاں صاحب کی ارشاد سے دوستی ہو گئی تھی اور وہ پہلی بار ارشاد کے ساتھ ہی قلعہ دیدار سنگھ آئے تھے۔ جلد ہی میاں صاحب اور چودھری حق نواز میں گہرے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے۔ اس کے بعد میاں صاحب مہینے میں ایک دو بار قلعہ دیدار سنگھ کا چکر لگانے لگے تھے۔ چودھری نے میاں صاحب کے اندر کاشت کاری کا شوق پیدا کر دیا تھا۔ اسی شوق کا نتیجہ تھا کہ وہ پچاس ایکڑ زمین چودھری سے خرید کر اس پر باغات لگانے والے تھے مگر پھر وہ اچانک غائب ہو گئے۔''

''اور دوسری بات؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''میاں صاحب پروفیسر علوی پر بہت بھروسا کرتے تھے۔'' علی محمد نے بتایا۔ ''وہ کوئی بھی نیا کام شروع کرنے سے پہلے پروفیسر صاحب سے ضرور مشورہ کرتے تھے۔ نرگس بھابی کا کہنا ہے کہ پروفیسر صاحب نے پھلوں کے باغات لگانے کے حوالے سے میاں صاحب کی نہ صرف تائید کی تھی بلکہ یہ بھی کہا تھا کہ اس کاروبار میں انہیں بہت فائدہ ہوگا۔''

''پروفیسر علوی کیا بیچتے ہیں؟'' میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

علی محمد سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میری بات اس کے پلے نہیں پڑی تھی۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''میرا مطلب ہے، پروفیسر صاحب کون سی یونیورسٹی میں کیا پڑھاتے ہیں؟ وہ کس مضمون میں مہارت رکھتے ہیں؟''

''وہ کالج یونیورسٹی میں پڑھانے والے پروفیسر نہیں ہیں ملک صاحب!'' وہ جلدی سے بولا۔ ''وہ ایک عامل کامل

بابا ہیں۔ ادھر بھاٹی گیٹ میں ان کا آستانہ ہے۔''

''سمجھ گیا......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ فراڈستان یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ایک گڑبڑ گھوٹالا پروفیسر ہیں جو سادہ لوح افراد کو اُلّو بنا کر اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں۔''

میرے اس ترش تبصرے پر علی محمد نے کوئی خیال آرائی نہیں کی۔

''آپ کے بتائے ہوئے یہ دونوں کردار لاہور میں رہتے ہیں۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''دو روز بعد مجھے اپنے ایک ذاتی کام سے لاہور کا چکر لگانا ہے۔ تب آپ کے علاوہ میاں نذیر کی بیوی نرگس، اس کے ملازم [illegible] اور اس کے پیرومرشد پروفیسر علوی سے بھی ملاقات ہوجائے گی۔ اس دوران میں، میں زمین کے کاغذات کی حقیقت کا پتا چلاتا ہوں۔''

''اور چودھری حق نواز......؟'' اس نے بات نامکمل چھوڑ کر اُلجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

''ایک گھنٹے کے بعد ہم چودھری کی حویلی میں ہوں گے۔'' میں نے تسلی آمیز انداز میں کہا۔

علی محمد کے چہرے پر اطمینان جھلکنے لگا۔

آئندہ دس منٹ میں، میں نے ایک تانگا منگوایا اور علی محمد کے ساتھ تانگے میں بیٹھ کر قلعہ دیدار سنگھ کی جانب روانہ ہوگیا۔ کانسٹیبل غفور احمد بھی ہمارے ہمراہ تھا۔ میرا تھانہ جی ٹی روڈ (جنرل ٹرنک روڈ) پر لاری اڈے کے ساتھ واقع تھا۔ یہ علاقہ شیخوپورہ روڈ بھی کہلاتا تھا۔ راولپنڈی سے لائل پور (فیصل آباد) جانے والی بسیں اسی موڑ پر جی ٹی روڈ کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتی تھیں۔ شیخوپورہ، لائل پور سے پہلے آجاتا تھا اسی لیے یہ موڑ ''شیخوپورہ موڑ'' کے نام سے مشہور ہوگیا تھا۔ قلعہ شیخوپورہ کی اپنی ایک تاریخ ہے۔ جرم وسزا کی سنسنی خیز کہانیوں سے بھری ہوئی۔ اس زمانے کے سروے کے مطابق صوبہ پنجاب میں جرائم کے لیے سب سے زیادہ مشہور دو ہی علاقے تھے...... اوکاڑہ اور قلعہ شیخوپورہ!

☆☆☆

راستے بھر علی محمد سے میری بات چیت کا عمل جاری رہا تھا جس سے مجھے معلوم ہوا کہ وہ لاہور کے ایک پرانے علاقے کرشن نگر میں رہتا تھا۔ گمشدہ میاں نذیر کی رہائش شادباں کالونی میں تھی۔ ان دونوں کی دوستی کی عمر پندرہ سال تھی۔ اسی نوعیت کی ہلکی پھلکی گفتگو کے دوران میں ہمارا تانگا شاہین آباد، راہوالی، گکھڑ منڈی وغیرہ سے گزر کر قلعہ دیدار سنگھ پہنچ گیا۔

چودھری حق نواز نے ہمارا پُرتپاک استقبال کیا اور ہمیں پرانی طرزِ تعمیر کی سجی سجائی عالیشان بیٹھک میں بٹھایا۔ چودھری کی عمر پچاس کے قریب تھی۔ یہ ہماری پہلی ملاقات تھی تاہم مجھے اس کے بارے میں بنیادی معلومات حاصل تھیں جن میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ بڑے چودھری رب نواز کے انتقال کے بعد دونوں بھائیوں میں زمین و جائداد کا بٹوارا ہوگیا تھا۔ اگرچہ چودھری حق نواز اس علیحدگی کے حق میں نہیں تھا لیکن چھوٹے بھائی چودھری علی نواز نے ایسا رولا ڈالا تھا کہ بڑا بھائی یعنی حق نواز مجبور ہوگیا تھا۔ بٹوارے کے بعد علی نواز نے اپنی رہائش کے لیے نئی حویلی تعمیر کروالی تھی اور آبائی پرانی حویلی حق نواز کے حصے میں آئی جس کی بیٹھک میں اس وقت ہم بیٹھے ہوئے تھے۔

رسمی علیک سلیک کے بعد چودھری حق نواز نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''ملک صاحب! یہ جو لاہوری بندہ آپ کے ساتھ آیا ہے، میں سب سے پہلے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا۔ باقی باتیں بعد میں......!''

چودھری کی بات سن کر علی محمد نے چونک کر پہلے چودھری کو اور پھر مجھے دیکھا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں اُلجھن کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ میں نے علی محمد کی بے یقینی اور اُلجھن کو نظرانداز کرتے ہوئے چودھری سے کہا۔

''آپ اپنی خواہش پوری کرسکتے ہیں چودھری صاحب! لیکن آپ کو اس ''شکریہ'' کی وجہ بھی بتانا پڑے گی کیونکہ علی محمد کو توقع نہیں تھی کہ آپ اس قسم کی کوئی بات کریں گے۔ ان کے تاثرات نے مجھے بھی گہری سوچ میں ڈال دیا ہے۔''

''ضرور...... کیوں نہیں۔'' چودھری نے معتدل انداز میں کہا پھر علی محمد کی طرف دیکھتے ہوئے تشکرانہ لہجے میں بولا۔ ''بھائی! میں تہِ دل سے آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے ملک صاحب کے تھانے میں میرے خلاف کوئی رپورٹ درج کرائی ہے جس کی تفتیش کے لیے انہیں آپ کے ساتھ یہاں آنا پڑا اور اسی بہانے ملک صاحب سے میری ملاقات ہوگئی۔ اس سے پہلے میں نے صرف ان کا نام ہی سنا تھا۔ آپ کی شکایت کی برکت سے آج ان کا دیدار بھی ہوگیا۔'' پھر وہ روئے سخن میری جانب موڑتے ہوئے مستفسر ہوا۔

''ملک صاحب! اتنی وضاحت کافی ہے نا؟''

''وضاحت تو کافی سے کہیں زیادہ ہے چودھری صاحب!'' میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے

بھی آپ سے مل کر بے حد خوشی محسوس ہو رہی ہے لیکن ایک بات کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس خارج کی پھر علی محمد کی سمت اشارہ کرتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔

''علی محمد کے دوست میاں نذیر کی گمشدگی کی رپورٹ لاہور کے متعلقہ تھانے میں درج کرائی گئی ہے۔ ایک روز پہلے علی محمد آپ سے مل کر گیا تھا اور آپ نے کسی میاں نذیر کو پہچاننے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس کے بعد ہی اگلے روز لاہور کے تھانے میں رپورٹ درج ہوئی۔ کل اس تھانے سے دو پولیس والے علی محمد کو ساتھ لے کر میرے پاس آئے [illegible] نے ان لوگوں کی کہانی کو پوری توجہ سے سنا اور کہا کہ پچاس ایکڑ اراضی کی خرید کے حوالے سے جو قانونی دستاویز تیار کی گئی ہے، وہ مجھے لا کر دکھاؤ۔ اس کے بعد ہی میں کارروائی کروں گا۔ آج علی محمد وہ کاغذات لے آیا ہے۔ اسی لیے ہم آپ کے پاس حاضر ہوئے ہیں چودھری صاحب!''

میرے آخری جملے نے چودھری کو چونکا دیا۔ ''یہ تو آپ نے بہت نیک کام کیا ہے ملک صاحب!'' وہ ستائشی نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولا۔ ''ان کاغذات کی موجودگی میں مجھے اپنی صفائی پیش کرنے میں آسانی ہو جائے گی۔ پہلے میں آپ کے لیے کھانے کا بندوبست کراتا ہوں۔ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔''

''اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے چودھری صاحب!'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''آج میں نے ڈبل ناشتا کیا ہوا ہے۔''

''اور میں بھی فل ہوں۔'' میری دیکھا دیکھی علی محمد نے کہا۔

''ملک صاحب! کیا ہوا جو آج سے پہلے ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔ میں نے آپ کی مکمل جانکاری رکھی ہوئی ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں بولا۔ ''آپ صبح جلدی اٹھنے کے عادی ہیں۔ فجر کی نماز کے فوراً بعد آپ ناشتا کرتے ہیں اور پھر تیار ہو کر تھانے میں جا بیٹھتے ہیں۔ آپ نے ڈبل کیا، اگر ٹرپل ناشتا بھی کیا ہو تو اب تک اس کی باقیات بھی پیٹ میں موجود نہیں ہوں گی۔ یہ عین کھانے کا وقت ہے۔ تکلف میں نہیں بلکہ آپ کر رہے ہیں اور آپ......'' وہ علی محمد کی جانب دیکھتے ہوئے معتدل لہجے میں بولا۔ ''آپ لاہور سے آئے ہیں۔ جس بس نے آپ کو گوجرانوالہ پہنچایا ہے، اس بے چاری کا اپنا فیول ٹینک فل نہیں رہا ہوگا پھر آپ کیسے فل ہو سکتے ہیں؟''

چودھری حق نواز کے دلائل کے سامنے ہمیں خاموشی اختیار کرنا پڑی۔ وہ بیٹھک سے اٹھ کر تھوڑی دیر کے لیے باہر گیا اور ہمارے لیے ایک شاندار لنچ کا ''آرڈر'' کرنے کے بعد واپس آ گیا۔ ہمارے درمیان سنجیدہ گفتگو کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

سب سے پہلے چودھری نے ان کاغذات کا جائزہ لیا جو علی محمد لاہور سے اپنے ساتھ لے کر آیا تھا۔ چند لمحات کی خاموشی کے بعد اس نے میرے خیالات کی تائید میں دو ٹوک انداز میں اپنا فیصلہ سنا دیا۔

''ملک صاحب! یہ کاغذات ایک دم نقلی ہیں۔ ان کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہ آئے تو آپ ڈسٹرکٹ رجسٹریشن آفس جا کر ریکارڈ چیک کر لیں۔ آپ کو اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملے گا کہ میں نے کسی میاں نذیر کے ہاتھ اپنی پچاس ایکڑ زرعی اراضی فروخت کی ہے یا کسی میاں نذیر نے مجھ سے مذکورہ اراضی خریدی ہے۔''

''صرف رجسٹری آفس ہی نہیں، میں پٹواری اور قانون گو سے بھی اس معاملے کی چھان بین کراؤں گا۔'' میں نے رسانیت بھرے لہجے میں کہا۔ ''لیکن فی الحال میں یہ جاننے میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہوں کہ آپ نے کس بنیاد پر ان کاغذات کو جعلی قرار دیا ہے؟''

''ایک سے زیادہ وجوہات ہیں۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔

''آپ نمبروار بتاتے جائیں چودھری صاحب!'' میں نے کہا۔ ''میں اسی غرض سے چل کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ آپ مجھے ہمہ تن گوش سمجھیں۔''

میرے ان الفاظ پر علی محمد بھی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

''بات ثبوت کے ساتھ ہو تو مزہ بھی آتا ہے۔'' چودھری اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں دس منٹ میں حاضر ہوتا ہوں ملک صاحب! پھر ہم اس موضوع پر گفتگو کریں گے۔''

چودھری کے بیٹھک سے نکلنے کے بعد علی محمد نے مجھ سے پوچھا۔ ''چودھری کہاں چلا گیا؟''

''آپ نے شاید اس کی بات پر توجہ نہیں دی۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''میرے خیال میں وہ کوئی ایسی شے لینے گیا ہے جو اسے سچا ثابت کر سکتی ہو۔''

''ایسی کیا شے ہو سکتی ہے؟''

''یہ تو اس کی واپسی پر ہی پتا چلے گا۔''

اس کے بعد علی محمد نے مجھ سے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ چند منٹ کے بعد چودھری حق نواز ایک فائل تھامے لوٹ آیا۔ وہ دوبارہ اسی صوفے پر بیٹھا جہاں سے وہ اٹھ کر گیا تھا پھر مذکورہ فائل میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔

''ملک صاحب! اس فائل کے اندر درجن بھر ایسے اہم قانونی کاغذات لگے ہوئے ہیں جن میں سے ہر ایک پر میرے دستخط موجود ہیں۔ آپ ان دستخط کو اس دستاویز پر موجود میرے دستخط کے ساتھ ملا کر دیکھیں۔ فرق آپ کو صاف نظر آ جائے گا اور وہ فرق آپ اس لاہوری بندے کو بھی دکھائیں۔''

میں نے چودھری کی فرمائش پوری کرنے میں... بہ مشکل دو منٹ صرف کیے پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں چودھری صاحب! پچاس ایکڑ اراضی والی دستاویز پر موجود آپ کے دستخط ان فائل والے کاغذات سے کافی مختلف ہیں۔''

''اب میں آپ کے سوال کی طرف آتا ہوں جناب!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''نمبر ایک... جو کاغذات آپ اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں، ان پر نظر آنے والے میرے دستخط جعلسازی کی منہ بولتی تصویر ہیں۔ کسی بدنیت شخص نے میرے دستخط کی نقل کرنے کی کوشش ضرور کی ہے مگر اسے اس مذموم مقصد میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ہاں، البتہ وہ میاں نذیر نامی کسی شخص کو بے وقوف بنانے میں ضرور کامیاب رہا ہے۔ نمبر دو...... اس دستاویز میں زرعی اراضی کی فی ایکڑ جو قیمت درج ہے، وہ ہوشربا اور ناقابلِ یقین ہے۔ زمین کی قیمت کو اس اونچائی تک پہنچنے میں ابھی بیس سے پچیس سال لگ سکتے ہیں۔ نمبر تین...... سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر پھلوں کے باغات سے ہونے والی آمدنی دوسری فصلوں سے زیادہ ہو تو میرے دماغ میں سب سے پہلے باغات لگانے کا خیال آنا چاہیے۔ نمبر چار...... یہ حقیقت آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ اصلاً نسلاً زمیندار شخص اپنی زمین کو بڑھانے کے لیے تو چوبیس گھنٹے مسلسل سوچ سکتا ہے مگر زمین کو فروخت کرنے کا خیال بھولے سے بھی اس کے دماغ میں نہیں گھس سکتا اور وہ بھی کسی غیر زمیندار شخص کے ہاتھ فروخت کرنے کا۔ یہ تو اپنے ہی سینے پر مونگ دلوانے والی بات ہے۔ باہر سے آنے والا زمین کا خریدار اگر کاشت کاری کے بجائے وہاں کوئی اور کاروبار شروع کر بیٹھے تو......؟'' اس نے سوالیہ جملے پر اپنی بات کو ادھورا چھوڑ کر ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے جذباتی لہجے میں بولا۔

''ملک صاحب! تین سال پہلے جب اباجی زندہ تھے تو ہمارے پاس کل تین سو ایکڑ اعلیٰ درجے کی زرعی اراضی تھی۔ اباجی کے اس دنیا سے اٹھتے ہی کسی بدخواہ کی ہمیں نظر لگ گئی۔ اباجی کے چہلم کے بعد چھوٹے بھائی علی نواز نے ایک تنازع کھڑا کر دیا۔ وہ زمین و جائیداد کی تقسیم کا مطالبہ کرنے لگا۔ میں نے حتی الامکان اسے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ بھی سننے کو تیار نہیں تھا۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ میرے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ میری اولادوں اور بڑی حد تک ان کی ماں کا بھی دعویٰ ہے کہ چودھری علی نواز اپنی بیوی کے اشاروں پر ناچتا ہے۔ اس کے اندر نادرہ کی کسی بات کو ٹالنے یا اس سے انکار کرنے کی جرأت نہیں ہے اور یہ بٹوارے والا فتنہ نادرہ ہی کا جگایا ہوا ہے۔ میں اس موضوع پر وقت برباد کرنے کے بجائے آپ کو نمبروار پانچویں اور آخری اہم بات بتاتا ہوں۔'' وہ ایک بار پھر متوقف ہوا اور دو تین گہری سانسیں لینے کے بعد اپنا بیان مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''ہماری تین سو ایکڑ زرعی اراضی ہم دونوں بھائیوں میں ڈیڑھ ڈیڑھ سو ایکڑ تقسیم ہو گئی تو علی نواز اس ضد پر اتر آیا کہ حویلی کے بھی دو حصے ہوں گے۔ میں اس آبائی حویلی کی تقسیم کے حق میں نہیں تھا۔ میں نے واضح الفاظ میں علی نواز سے کہہ دیا کہ یہ حویلی تو میں اپنے پاس ہی رکھوں گا۔ تم اس کے بدلے میں تھوڑی زمین لے لو۔ اس نے میری اس تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ اگر میں اپنی ڈیڑھ سو ایکڑ اراضی میں سے پچاس ایکڑ اسے دے دوں تو وہ حویلی والے معاملے سے دستبردار ہو جائے گا۔ میں نے حویلی کو بچانے کے لیے اپنے چھوٹے بھائی کا مطالبہ تسلیم کر لیا۔ یہ حویلی جس میں اس وقت آپ بیٹھے ہوئے ہیں، میں اس کا بلاشرکت غیرے مالک و مختار ہوں۔ اس کے علاوہ زرعی اراضی کے نام پر میرے پاس صرف ایک سو ایکڑ زمین بچی ہے۔ کیا آپ کی نظر میں، میں اتنا احمق ہوں کہ اپنی سو ایکڑ اراضی میں سے پچاس ایکڑ زمین کسی میاں نذیر کے ہاتھ فروخت کر دوں گا؟''

''مجھے اندازہ تو تھا مگر آپ سے ملاقات کے بعد یقین ہو گیا ہے چودھری صاحب!'' میں نے اس کے تلخی بھرے استفسار کے جواب میں کہا۔ ''زمینی حقائق کی روشنی میں آپ

کی ذات ہر نوعیت کے شک سے بالاتر دکھائی دیتی ہے لیکن اس کے باوجود بھی دو بڑے مسئلے اپنی جگہ پر سر اٹھائے کھڑے ہیں۔‘‘

’’کون سے دو مسئلے؟‘‘ چودھری نے آنکھیں سکیڑ کر سوال کیا۔

’’اول...... کسی چالباز شخص نے نقلی کاغذات تھما کر میاں نذیر سے پچاس ہزار روپے بٹور لیے ہیں۔ وہ جو کوئی بھی ہے، اس کا تعلق قلعہ دیدار سنگھ ہی سے ہے۔‘‘ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ’’دوم...... آٹھ فروری کو جب میاں نذیر یہاں آیا تو پھر وہ واپس لاہور نہیں گیا۔ پانچ دن گزر جانے کے باوجود بھی وہ لاپتا ہے۔ اغلب امکان اس بات کا ہے کہ وہ یہیں کہیں غائب ہوا ہے یا اسے زبردستی غائب کر دیا گیا ہے۔ میں اس امکان پر یوں بھی زور دے رہا ہوں کہ میاں نذیر کے ساتھ دھوکا دہی کا یہ واقعہ آپ ہی کے علاقے میں پیش آیا ہے۔‘‘

’’یہ صرف میرا ہی نہیں، آپ کا بھی علاقہ ہے ملک صاحب!‘‘ وہ ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ سجا کر بولا۔ ’’بلکہ آپ کا کچھ زیادہ ہی ہے کیونکہ آپ کے تھانے کی حدود میں قلعہ دیدار سنگھ کے علاوہ بھی درجن بھر گاؤں دیہات آتے ہیں۔ باقی جہاں تک آپ کے بیان کردہ مسائل کا تعلق ہے تو میں اس میں ایک اپنے ذاتی مسئلے کا اضافہ کرنا چاہوں گا۔‘‘

’’آپ کا مسئلہ؟‘‘ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

’’جی بالکل!‘‘ وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ’’میں آپ کے تھانے میں اس نامراد کے خلاف رپورٹ درج کرانا چاہتا ہوں جس نے جعلی دستخط کر کے میرا نام اور ساکھ کو خراب کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں جلد از جلد اس فراڈ شخص کو جیل کی دیواروں کے پیچھے دیکھنے کا خواہشمند ہوں۔‘‘

’’میں آپ کی یہ انتہائی جائز خواہش بہت جلد پوری کر دوں گا چودھری صاحب!‘‘ میں نے تشفی بھرے لہجے میں کہا۔ ’’سمجھ لیں کہ آپ کی رپورٹ درج ہو چکی۔‘‘

اس کے بعد کھانا لگا دیا گیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت بڑے زور کی بھوک لگی ہوئی تھی لہٰذا میں نے اور علی محمد نے تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر بقول کسے، کھانے سے پورا انصاف کیا۔ کانسٹیبل غفور احمد حویلی کے بیرونی حصے میں تھا۔ اسے وہیں پر کھانا دے دیا گیا تھا۔ پیٹ پوجا کے دوران میں میری کرید کا عمل بھی جاری تھا۔

’’چودھری صاحب! کیا آپ کی حویلی میں کام کرنے والے لوگوں میں ارشاد نام کا کوئی بندہ بھی موجود ہے؟‘‘ میں نے سرسری انداز میں سوال کیا۔

اس نے محتاط نظر سے مجھے دیکھا اور جواب دیا۔ ’’ہاں ہے...... مگر آپ یہ کیوں پوچھ رہے ہیں۔ سب خیریت تو ہے نا؟‘‘

’’پوچھ تاچھ اور جانچ پڑتال کرتے رہنا ہم پولیس والوں کی گھٹی میں ہوتا ہے جناب!‘‘ میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ’’ابھی تک تو سب خیریت ہی ہے۔ آپ کو کسی فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ بس، اتنا بتا دیں کہ کیا ٹیوب ویل اور دیگر موٹروں کا سامان وغیرہ لانے کے لیے آپ ارشاد ہی کو لاہور بھیجا کرتے ہیں نا؟‘‘

’’آپ نے بالکل ٹھیک کہا ہے ملک صاحب!‘‘ وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے تکتے ہوئے بولا۔ ’’اس قسم کے تمام کام ارشاد ہی کے ذمے ہیں لیکن میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ آپ اچانک ارشاد کے بارے میں بات کیوں کرنے لگے ہیں؟‘‘

چودھری کے اضطرار سے لبریز استفسار کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے میں نے پوچھا۔ ’’آپ ارشاد پر کس قدر بھروسا کرتے ہیں؟‘‘

’’وہ میرا سالہا سال کا آزمایا ہوا ملازم ہے اس لیے میں اس پر اعتماد کرتا ہوں۔‘‘ وہ شک زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ’’آخر بات کیا ہے؟ کیا آپ مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں؟‘‘

’’میں آپ کو اندھیرے میں نہیں رکھوں گا چودھری صاحب!‘‘ میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گمبھیر انداز میں کہا۔ ’’لاپتا میاں نذیر کی دکان پر سدھیر نام کا ایک دیرینہ وفادار ملازم کام کرتا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق آپ کا ملازم ارشاد ان کی دکان سے سامان لینے لاہور آتا تھا۔ ارشاد نے پہلے میاں نذیر سے دوستی کی پھر وہ میاں صاحب کو اپنے ساتھ یہاں لانے لگا۔ اس طرح آپ کے اور میاں صاحب کے بیچ خوشگوار تعلقات قائم ہو گئے اور میاں صاحب اکثر آپ سے ملنے قلعہ دیدار سنگھ آنے لگے۔‘‘

’’سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔‘‘ وہ جوش بھرے انداز میں بولا۔ ’’وہ بندہ سدھیر غلط بیانی کر رہا ہے۔ آپ نے میاں نذیر کی دکان کا نام کیا بتایا تھا؟‘‘

’’میاں مکینیکل ورکس!‘‘ میں نے ٹھوس انداز میں جواب دیا اور مزید کہا۔ ’’یہ دکان لاہور کے براندرتھ روڈ پر واقع ہے۔‘‘

’’ارشاد بھی براندرتھ روڈ ہی سے سارا سامان لاتا ہے۔‘‘ چودھری نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ’’مگر

''میاں مکینیکل ورکس'' سے نہیں بلکہ ''نواب ٹیوب ویل'' والوں سے۔ میرے پاس نواب ٹیوب ویل کی درجنوں رسیدیں بھی رکھی ہوئی ہیں۔ اگر آپ کو میری بات کا یقین نہ ہو تو میں آپ کو وہ رسیدیں ابھی کے ابھی دکھا سکتا ہوں۔''

''مجھے آپ پر تو کامل بھروسا ہے چودھری صاحب! اس لیے رسیدیں دکھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے مگر میں دو افراد پر آنکھیں بند کر کے اعتماد نہیں کر سکتا۔ چاہے وہ آپ کا وفادار ارشاد ہو یا گمشدہ میاں نذیر کا نمک خوار سدھیر!'' میں نے واشگاف الفاظ میں کہا۔ ''لہٰذا آپ ایک دن کے لیے ارشاد کو میرے حوالے کریں گے۔''

''وہ کس لیے؟'' اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا آپ اس پر کسی قسم کی سختی کرنا چاہتے ہیں؟''

''بالکل نہیں۔'' میں نے قطعی انداز میں کہا۔ ''دو روز بعد مجھے کسی کام سے لاہور جانا ہے۔ میں ارشاد کو اپنے ساتھ ''میاں مکینیکل ورکس'' پر لے جا کر سدھیر کے سامنے کھڑا کر دوں گا پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔''

''آپ کا یہ تفتیشی منصوبہ مجھے پسند آیا ملک صاحب!'' چودھری ستائشی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ کا جب دل چاہے، ارشاد کو کہیں بھی لے جا سکتے ہیں۔''

میں نے پُرتکلف لذیذ کھانے اور بھرپور تعاون کے لیے چودھری حق نواز کا شکریہ ادا کیا پھر ہم لوگ اس کی حویلی سے نکل کر تھانے کی جانب روانہ ہو گئے۔ راستے میں علی محمد نے مجھ سے کہا۔

''ملک صاحب! چودھری تو خاصا سلجھا ہوا اور سمجھ دار انسان ہے۔''

''ابھی تک تو مجھے بھی ایسا ہی لگ رہا ہے۔'' میں نے گول مول جواب دیا۔ ''آگے آگے دیکھیے، ہوتا ہے کیا۔''

علی محمد خاموش ہو گیا۔ میں نے راستے ہی میں جنرل بس اسٹینڈ سے اسے لاہور جانے والی بس میں سوار کرا دیا اور خود کانسٹیبل غفور کے ساتھ تھانے آ گیا۔

آئندہ دو دن میں نے قلعہ دیدار سنگھ، جنرل بس اسٹینڈ، تانگا اسٹینڈ اور دیگر مقامات پر مختلف لوگوں سے پوچھ تاچھ کی۔ ایک سادہ لباس پولیس اہلکار کو میں نے قلعہ دیدار سنگھ کے اندرونی حالات و واقعات کی خبر گیری پر متعین کر دیا۔ چودھری حق نواز نے تو میاں نذیر سے اپنی مکمل لاعلمی کا اظہار کر دیا تھا لیکن علی محمد، نرگس اور سدھیر کا دعویٰ تھا کہ میاں نذیر کا قلعہ دیدار سنگھ آنا جانا تھا۔ اگر وہ چودھری حق نواز کے پاس نہیں آیا کرتا تھا تو پھر اس نے چودھری کو اس معاملے میں ملوث کیوں کیا؟ اور کیا پتا، وہ کبھی قلعہ دیدار سنگھ آیا ہی نہ ہو۔

یہ اور اس سے جڑے ہوئے دیگر سوالات کے جوابات تلاش کرنا بہت ضروری تھا۔ آپ کو بتاتا چلوں کہ انہی دو روز میں، میں نے رجسٹری آفس جا کر اس بات کی تصدیق کر لی تھی کہ پچاس ایکڑ زرعی اراضی والے ان کاغذات کا کوئی ریکارڈ وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ ایک سو دس فیصد نقلی دستاویز تھی جو کسی خاص مقصد سے تیار کی گئی تھی۔

☆☆☆

سولہ فروری کی صبح میں چودھری حق نواز کے ملازمِ خاص ارشاد کو اپنے ساتھ لے کر لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔ لاہور پہنچ کر سب سے پہلے میں نے اپنا ذاتی کام نمٹایا پھر اس تھانے کا رخ کیا جہاں میاں نذیر کی گمشدگی کی رپورٹ گیارہ فروری کو درج کرائی گئی تھی۔ تھانہ انچارج مشتاق باجوہ مجھے پہچانتا تھا۔ اس نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور رسمی علیک سلیک کے بعد پوچھا۔

''ہم نے جو کیس آپ کے سپرد کیا تھا، اس میں کوئی پیشرفت ہوئی؟''

''میں آج اسی سلسلے میں یہاں آیا ہوں۔'' میں نے متحمل انداز میں جواب دیا۔ ''دو تین بندوں سے ضروری ملاقات کرنا ہے۔ ویسے میں نے چودھری حق نواز اور میاں نذیر کی بیوی نرگس کے فراہم کردہ پچاس ایکڑ زرعی اراضی والے کاغذات کا آپریشن کلین اپ کر ڈالا ہے۔ وہ دستاویز ایک دم بوگس ہے اور اس پر موجود چودھری حق نواز کے دستخط بھی جعلی ثابت ہوئے ہیں۔ علاوہ ازیں رجسٹریشن آفس میں مذکورہ زمین کی خرید و فروخت کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ اس امر میں کسی شک کی گنجائش باقی نہیں کہ کسی شاطر شخص نے چودھری حق نواز کے کندھے پر بندوق رکھ کر اس چالاکی سے چلائی ہے کہ میاں نذیر کے پچاس ہزار روپے گئے کھوہ کھاتے اور چودھری کا نام خراب ہوا اس کے علاوہ......!''

''اور میاں نذیر......؟'' مشتاق باجوہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی معنی خیز انداز میں بولا۔ ''وہ بندہ بھی کہیں غائب ہو گیا ہے۔''

''اگر میاں نذیر زندہ ہے تو میں بہت جلد اسے آپ کے سامنے حاضر کر دوں گا باجوہ صاحب!'' میں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ ''اس گتھی کو سلجھانے کے لیے ہی میں ارشاد کو اپنے ساتھ لے کر آیا ہوں۔'' میں نے اپنے پہلو میں بیٹھے ہوئے چودھری حق نواز کے ملازمِ خاص کی جانب اشارہ کیا

پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ''گمشدہ میاں نذیر کے دیرینہ ملازم سدھیر کا یہ دعویٰ سامنے آیا ہے کہ چودھری حق نواز کا بندہ ارشاد ان کی دکان سے ٹیوب ویل کا سامان لینے آیا کرتا تھا اور ارشاد ہی پہلی مرتبہ میاں نذیر کو اپنے ساتھ گوجرانوالہ کے نواحی موضع قلعہ دیدار سنگھ لے کر گیا تھا۔ اس کے بعد میاں اور چودھری میں دوستی ہوگئی تھی لیکن چودھری حق نواز اور ارشاد ایسے کسی بھی واقعے سے واقف نہیں ہیں۔ چودھری نے مجھے بتایا ہے کہ ان کے ٹیوب ویل اور موٹروں وغیرہ کا سارا سامان ''نواب ٹیوب ویل'' نامی ایک دکان سے جاتا ہے جو کہ لاہور کے برانڈرتھ روڈ پر واقع ہے۔ برانڈرتھ روڈ پر ہی ''میاں مکینیکل ورکس'' بھی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ارشاد اور سدھیر کا سامنا کرانے سے یہ معاملہ کافی حد تک صاف ہوجائے گا۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے باجوہ صاحب؟''

''آپ بہت دور کی کوڑی لائے ہیں ملک صاحب!'' وہ سوچتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''آپ کی حکمت عملی مجھے بہت پسند آئی ہے اور موجودہ حالات میں مجھے بھی چودھری حق نواز بے قصور ہی نظر آرہا ہے۔ اگر چودھری نے میاں کو زمین کی فروخت کے سلسلے میں بے وقوف بنایا ہوتا تو وہ اپنے ملازم کو روبروئی کے لیے کبھی آپ کے ساتھ روانہ نہ کرتا۔ بہرکیف......'' وہ سانس ہموار کرنے کی غرض سے متوقف ہوا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''آپ کو اس مشن کے لیے میرے تھانے کے اسٹاف میں سے جتنے لوگ چاہئیں، آپ اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں۔ میں آپ کی کامیابی کے لیے پُرامید اور دعا گو ہوں۔''

''میں اس کیس کو اپنے حساب سے اکیلے ہی لیڈ کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے تھانہ انچارج کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے معتدل انداز میں کہا۔ ''اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو باجوہ صاحب!''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ملک صاحب!'' وہ دوستانہ انداز میں بولا۔ ''آپ کی آمد میرے تھانے میں رجسٹر ہوچکی ہے۔ میری جانب سے آپ کو فری ہینڈ ہے لیکن چائے اور کیک کھائے بغیر میں آپ کو یہاں سے اٹھنے نہیں دوں گا۔''

''یہ تو آپ کی محبت ہے باجوہ صاحب!'' میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کی خاطر داری والی یہ خواہش ضرور پوری کروں گا۔''

آدھے گھنٹے کے بعد میں تھانے سے نکلا اور ارشاد کے ہمراہ کیبر اسٹریٹ، اردو بازار پہنچ گیا۔ سرکلر روڈ کے نزدیک واقع اردو بازار میں علی محمد کی دکان ڈھونڈنے میں مجھے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اس زمانے میں لاہور کا یہ علاقہ آج کل کی طرح گنجان آباد اور رش والا نہیں ہوا کرتا تھا۔ تعمیراتی توسیع اور آبادی کی تیزی سے بڑھتی ہوئی تعداد نے ان دنوں لاہور کے اردو بازار کو گچھلی بازار کی شکل دے دی ہے۔ اس پر مستزاد ٹریفک کا ازدحام...... خدا کی پناہ!

علی محمد ہماری خاطر مدارات کے موڈ میں تھا لیکن میں نے واضح الفاظ میں کہہ دیا۔ ''فی الحال اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ پہلے ہم اپنا اہم کام نمٹائیں گے۔ اس کے بعد کھانے پینے کے بارے میں سوچا جائے گا۔''

میرے حتمی انداز کو دیکھتے ہوئے اس نے جلدی سے کہا۔ ''جو آپ کا حکم ملک صاحب! مجھے پتا تھا، آج آپ آئیں گے اس لیے میں نے آپ کی آسانی کے لیے سواری کا بندوبست کر رکھا ہے۔''

علی محمد کی بات سن کر میرے ذہن میں یہی آیا تھا کہ اس نے ہمارے لیے کسی سالم تانگے کا انتظام کیا ہوگا لیکن جب ہم اس کی دکان سے باہر نکلے اور میں نے اسے ایک نیلی فیاٹ کی جانب بڑھتے دیکھا تو مجھے حیرت ہوئی۔ اس زمانے میں موٹر کار کسی کسی کے پاس ہی ہوا کرتی تھی۔ ہم نیلی فیاٹ میں بیٹھ کر روانہ ہوئے تو میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''یہ کار آپ کی ہے؟''

''اپنی ہی سمجھ لیں ملک صاحب!'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''یہ فیاٹ میرے ایک قریبی دوست کی ہے۔ ہم ایک دوسرے کی چیزوں کو استعمال کرنے میں کوئی حرج یا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے۔''

''دوستی اسی درجے کی ہونا چاہیے۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لاپتا میاں نذیر بھی آپ کا گہرا دوست تھا اور میں اسی کی گمشدگی کا معما حل کرنے گوجرانوالہ سے لاہور آیا ہوں۔ پروگرام کے مطابق مجھے تین افراد سے پوچھ تاچھ کرنا ہے۔ میاں کی بیوی نرگس، میاں کا ملازم سدھیر اور نام نہاد پروفیسر علوی۔ تو آپ بتائیں ہم اس نیک کام کا آغاز کہاں سے کرنے والے ہیں؟''

میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے اس نے پوچھا۔ ''آپ کو یہاں والے تھانے بھی تو جانا ہوگا ملک صاحب؟''

''تھانے والا کام میں نمٹا کر آیا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میں ابھی تھانہ انچارج مشتاق باجوہ سے مل کر ہی آرہا ہوں۔''

''ٹھیک ہوگیا۔'' وہ ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے

رسانیت بھرے لہجے میں بولا۔ ''پہلے ہم میاں صاحب کی دکان پر چلتے ہیں۔ اس کے بعد بھاٹی گیٹ میں جا کر پروفیسر علوی سے ملاقات کریں گے اور سب سے آخر میں میاں صاحب کے گھر کا رخ کریں گے۔ شادمان کالونی ویسے بھی شہر کے دوسرے حصے میں ہے۔''

''اچھی بات ہے۔'' میں نے مختصر جواب دینے پر اکتفا کیا۔

''میاں مکینیکل ورکس'' پر پہنچنے کے بعد جب میری موجودگی میں سدھیر اور ارشاد کا آمنا سامنا ہوا اور میں نے سدھیر سے پوچھا کہ کیا یہی بندہ میاں نذیر کو چودھری حق نواز سے ملوانے گوجرانوالہ لے گیا تھا تو اس نے بڑا سنسنی خیز جواب دیا۔

''نہیں جناب! یہ بندہ ارشاد نہیں ہے۔''

علی محمد نے وہاں پہنچتے ہی سدھیر کو میرے بارے میں مختصراً بتا دیا تھا اور میری آمد کے مقصد سے بھی آگاہ کر دیا تھا۔ ارشاد سے اس کی ناشناسائی پر میں نے کہا۔

''سدھیر! چودھری حق نواز کا جو ملازم لاہور سے ٹیوب ویل وغیرہ کا سامان لینے آتا ہے، وہ ارشاد یہی ہے اور یہ ہمیشہ نواب ٹیوب ویل والوں سے اپنی ضرورت کا سامان لے کر جاتا ہے۔ تم پتا نہیں کون سے ارشاد کی بات کررہے ہو۔ اس ارشاد کو تو میں گوجرانوالہ سے اپنے ساتھ لے کر آیا ہوں اس لیے یہ غلط نہیں ہوسکتا۔''

''تھانیدار صاحب!'' سدھیر نے منت ریز لہجے میں کہا۔ ''میں نے مرنے کے بعد اپنی قبر میں جانا ہے، نہ کہ کسی دوسرے کی قبر میں اس لیے میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میاں صاحب کے پاس جو ارشاد آیا کرتا تھا، یہ بندہ وہ نہیں ہے۔ آپ کی مرضی ہے کہ میری بات کا یقین کریں یا نہ کریں۔ اگر آپ کہیں گے تو میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔''

میرا مردم شناسی کا تجربہ بتا رہا تھا کہ سدھیر مجھ سے غلط بیانی نہیں کررہا تھا۔ میں چند لمحات تک ٹٹولنے والی نظر سے اسے گھورتا رہا پھر معتدل انداز میں کہا۔

''سدھیر! میں نے کسی قسم اور کسی آزمائش کے بغیر ہی تمہاری بات کا یقین کرلیا ہے۔ اب تم اچھی طرح سوچ کر مجھے بتاؤ کہ جو بندہ ارشاد بن کر اس دکان پر آتا رہا ہے، اس کا حلیہ کیسا تھا؟ اس کا قد کاٹھ، رنگت، جسامت، عمر، نین نقش الغرض...... میں اس کے حوالے سے پوری تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔''

''بتاتا ہوں سرکار!'' وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''اس ارشاد کی عمر چالیس سے کچھ اوپر ہی ہوگی۔ آنکھیں بٹن جیسی چھوٹی، سر سے گنجا، قد بہت کم اور جسم موٹا، توند باہر کو نکلی ہوئی اور رنگ کورے لٹھے کے مانند بالکل صاف۔''

ارشاد ایک دراز قامت اور دبلا پتلا شخص تھا۔ اس کی رنگت سانولی اور عمر تیس کے اریب قریب تھی اور اس کی آنکھیں بھی مناسب سائز کی اور واضح تھیں۔

''تب تو تمہارے پاس آنے والا ارشاد کوئی دوسرا ہی بندہ ہے۔'' میں نے سدھیر کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''کیا تمہیں یاد ہے کہ وہ ارشاد کب سے اس دکان پر آرہا ہے؟''

''میرے اندازے کے مطابق کوئی سال بھر پہلے اس نے ہماری دکان سے سامان لینا شروع کیا تھا۔'' سدھیر نے مضبوط لہجے میں بتایا۔ ''آج کل کی طرح شاید وہ بھی فروری ہی کا مہینا تھا۔''

''تمہیں یہ بھی یاد ہوگا کہ میاں صاحب پہلی بار کب گوجرانوالہ گئے تھے؟'' میں نے سوالات کے سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

اسی دوران میں، میں نے اپنی ڈائری کھول لی تھی اور ارشاد سے حاصل ہونے والی معلومات کے اہم نکات اس ڈائری میں درج کرتا جارہا تھا۔ خصوصاً سدھیر کے ''ارشاد'' کا حلیہ وغیرہ میں نے بالتفصیل نوٹ کرلیا تھا۔

''جی، مجھے یاد ہے۔'' وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''یہ پچھلے سال کی بات ہے۔ وہ مئی یا جون کا مہینا تھا۔ میاں صاحب نے آکر مجھے بتایا تھا کہ ادھر قلعہ دیدار سنگھ میں گندم کی کٹائی کا کام جاری ہے۔ انہوں نے چودھری حق نواز کے اخلاق اور شرافت کی بھی بہت تعریف کی تھی۔ خاص طور پر میاں صاحب، چودھری صاحب کی مہمان نوازی سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔''

''سدھیر! کیا کبھی تمہارا گوجرانوالہ جانا ہوا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں تھانیدار صاحب!'' وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بولا۔ ''لاہور سے باہر جانے کا اتفاق بہت کم ہوتا ہے۔ ہمارے زیادہ تر رشتے دار چونیاں اور کاہنہ کاچھا میں ہیں۔ سال میں ایک آدھ بار ادھر کا چکر لگ جاتا ہے۔ ایک بار میں قصور تک بھی گیا ہوں۔ چونیاں، کاہنہ کاچھا، چھانگا مانگا اور قصور تو ایک ہی روٹ پر ہیں اور قصور کے بعد انڈیا کا بارڈر ہے۔ ویسے میاں صاحب نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ

جب وہ قلعہ دیدار سنگھ میں پھلوں کے باغات لگانا شروع کریں گے تو مجھے بھی اپنے ساتھ لے کر وہاں جائیں گے۔''

''پھلوں کے باغات پر یاد آیا......'' میں نے ٹٹولنے والے انداز میں پوچھا۔ ''کیا تم مجھے بتا سکتے ہو کہ میاں صاحب نے چودھری حق نواز سے وہ پچاس ایکڑ زمین کب خریدی تھی؟''

علی محمد نے مجھے زمین کی خریداری کے حوالے سے جو دستاویز دی تھی، اس کے مطابق مذکورہ زرعی اراضی اسی سال بیس جنوری کو خریدی گئی تھی۔ سدھیر نے میرے استفسار کے جواب میں بتایا۔

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، پچھلے سال اکتوبر یا نومبر میں چودھری حق نواز اور میاں صاحب کے درمیان باغات لگانے کے موضوع پر بات چیت کا آغاز ہوا تھا۔'' وہ پُرسوچ انداز میں بولا۔ ''اور باقاعدہ سودا جنوری کے آخری دنوں میں ہوا ہے۔ مجھے تاریخ یاد نہیں ہے۔ ہاں، جنوری کا آدھا مہینا گزرنے کے بعد کی بات ہے۔''

''سدھیر! آخری مرتبہ تم نے چودھری کے بندے ارشاد کو کب دیکھا تھا؟'' میں نے معتدل انداز میں سوال کیا۔ ''میرا مطلب ہے، اس دکان پر آئے اسے کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟''

''اسی مہینے کی چار تاریخ جناب!''

''تمہارا مطلب ہے چار فروری؟'' میں نے تصدیق طلب نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''آج سے بارہ دن پہلے؟''

''جی، جی...... بالکل!'' وہ اپنے سر کو تائیدی انداز میں ہلاتے ہوئے بولا۔

''اور میاں صاحب اس کے ٹھیک چار دن بعد یعنی آٹھ فروری کو گوجرانوالہ کے نزدیکی گاؤں قلعہ دیدار سنگھ گئے تھے اور وہ ابھی تک واپس نہیں آئے؟''

اس نے دل گرفتہ لہجے میں جواب دیا۔ ''جی تھانیدار صاحب! میں اور بیگم صاحبہ ان کے لیے بہت زیادہ فکرمند ہیں۔ آپ کسی طرح میاں صاحب کو جلدی سے ڈھونڈ نکالیں۔ یہ آپ کا ہم لوگوں پر بہت بڑا احسان ہو گا سرکار!''

میں سدھیر کے خالص جذبات کو بخوبی سمجھ اور محسوس کر رہا تھا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں میاں نذیر کو بازیاب کرنے کی خاطر ہی گوجرانوالہ سے لاہور آیا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ میں بہت جلد میاں صاحب کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جاؤں گا اور میں یہ ساری بھاگ دوڑ تم لوگوں پر احسان کرنے کے لیے نہیں بلکہ اپنا فرض سمجھ کر کر رہا ہوں۔ بس ایک دفعہ وہ بندہ میرے ہتھے چڑھ جائے جسے تم ارشاد سمجھتے ہو تو پھر میاں صاحب تک پہنچنا بہت آسان ہو جائے گا۔''

''اگر آپ کی اجازت ہو تو......'' وہ ہچکچاہٹ بھرے لہجے میں بولا۔ ''اگر وہ دوبارہ ہماری دکان پر آئے تو میں اسے قابو کرنے کی کوشش کروں؟''

''نیکی اور پوچھ پوچھ......!'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔ ''سارے فساد کی جڑ وہی بدذات ہے اور جہاں تک میرا دماغ کہتا ہے، اسی کمینے نے اپنے جیسے کسی دوسرے کمینے کے ساتھ مل کر ایک منظم سازشی منصوبے کے تحت میاں صاحب کو نقلی کاغذات تھما کر ان سے نہ صرف پچاس ہزار روپے بھی ہتھیا لیے ہیں بلکہ انہیں کہیں غائب بھی کر دیا ہے لہٰذا وہ اب ادھر کا رخ نہیں کرے گا اور اگر بہ فرضِ محال وہ مردود اس دکان پر یا پورے لاہور میں تمہیں کہیں بھی نظر آ جائے تو میری طرف سے تمہیں کھلی چھٹی ہے۔ تم اس کے ہاتھ پاؤں توڑ کر بھی اسے اپنے قبضے میں کرنے کے لیے آزاد ہو......اور اس کے بعد تم نے اسے فوراً مقامی پولیس کے حوالے کر دینا ہے۔ باقی سب میں سنبھال لوں گا۔''

''آپ اس سلسلے میں بالکل بے فکر ہو جائیں تھانیدار صاحب!'' وہ جوش بھرے لہجے میں بولا۔ ''میں نے پورے بارہ سال میاں صاحب کا نمک کھایا ہے۔ ان کے ساتھ دھوکا کرنے والے کی میں ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔''

''شاباش! تمہاری یہ ولولہ انگیزی مجھے پسند آئی سدھیر!'' میں نے توصیفی نظر سے اسے دیکھا۔ ''ایک وفادار ملازم کو تمہارے ہی جیسا ہونا چاہیے۔ میں خود بھی اس رذیل کو ڈھونڈنے کی کوشش کروں گا۔ اگر وہ مجھے مل گیا تو اس کی شناخت کے لیے میں تمہیں گوجرانوالہ بلاؤں گا۔ آؤ گے نا......؟''

''آپ ایک بار بلائیں گے، میں دس بار آؤں گا۔'' وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بڑے عزم سے بولا۔ ''میاں صاحب کے لیے میری جان بھی حاضر ہے۔''

میں نے سدھیر کو ضروری ہدایات دیں اور ہم وہاں سے واپس آ گئے۔ ہماری اگلی منزل تھی پروفیسر علوی کا آستانہ بمقام بھاٹی گیٹ!

میں نے ایک بات خاص طور پر محسوس کی کہ جب سے ہمارے ارشاد کا سدھیر سے آمنا سامنا ہوا تھا، وہ چپ چپ سا تھا جیسے گمبھیر خیالوں میں ڈوبا ہوا ہو۔ میں نے اس کی خاموشی کا سبب جاننا ضروری سمجھا اور کہا۔

''کیا بات ہے ارشاد! تم کہاں کھوئے ہوئے ہو؟ کیا

تمہیں بھوک لگ رہی ہے؟''

اس وقت دن کے دو بج رہے تھے اور ظاہر ہے یہ کھانے کا وقت تھا۔ ویسے بھی ہم دونوں علی الصباح گوجرانوالہ سے روانہ ہوئے تھے اور ناشتے کے نام پر ہم نے بس گزارہ ہی کر رکھا تھا۔

''آپ کا اندازہ ایک حد تک تو درست ہے تھانیدار صاحب!'' وہ کار کی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولا۔ ''واقعی اس وقت مجھے زوروں کی بھوک لگی ہوئی ہے۔''

''اور دوسری حد کہاں ہے؟'' میں نے اس کے جواب کے تناظر میں سوال کیا۔

وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''دوسری حد...... میں سمجھا نہیں جناب!''

''تم نے کہا نا، ایک حد تک میرا اندازہ درست ہے یعنی تم بھوک محسوس کر رہے ہو۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''دوسری حد سے میری مراد ہے، بھوک کے علاوہ اور کیا مسئلہ ہے؟ بھوک تو انسان کو خاموشی اختیار کرنے پر مجبور نہیں کرتی بلکہ وہ اپنے پیٹ کی بھرائی کے بندوبست کے لیے اپنی زبان اور ہاتھ پاؤں کو حرکت میں لے آتا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں سرکار!'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں کچھ اور بھی سوچ رہا تھا۔''

''اور کیا؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

''آنکھیں بچ بٹن جیسی، قد چھوٹا، بدن موٹا، پیٹ کا مٹکا باہر کو نکلا ہوا......'' وہ پُرخیال انداز میں بولا۔ ''سر سے گنجا، عمر چالیس سال سے زیادہ اور رنگ کورے لٹھے کی طرح سفید۔''

''یہ تو اس بندے کی تفصیلات ہیں جو چودھری حق نواز کے ملازم خاص ارشاد کی حیثیت سے ''میاں مکینیکل ورکس'' پر آیا کرتا تھا۔'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''یعنی تمہاری حیثیت سے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے میاں نذیر کے ملازم سدھیر نے اس ارشاد کا یہی حلیہ بیان کیا ہے۔ تم اس چالباز شخص کے بارے میں کیا سوچ رہے ہو؟''

''مجھے لگتا ہے میں نے اس بندے کو کہیں دیکھا ہے۔'' ارشاد نے انکشاف انگیز لہجے میں جواب دیا۔ ''مگر یاد نہیں آرہا...... کہاں؟''

''ادھر لاہور ہی میں یا گوجرانوالہ میں کہیں؟'' میں نے تیز آواز میں استفسار کیا۔

''میں یقین سے نہیں بتا سکتا تھانیدار صاحب!'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''جب سدھیر اس بندے کے بارے میں بتا رہا تھا تو اسی وقت مجھے ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ میں نے اس قد کاٹھ اور حلیے کے بندے کو دیکھا ہے مگر باوجود کوشش کے بھی میں ابھی تک یہ یاد نہیں کر پایا کہ...... کب...... ؟ کہاں؟''

''تم اسے یاد کرنے کی کوشش کو مسلسل جاری رکھو۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''جب کسی انسان کے پیٹ میں چوہے ''میراتھن، میراتھن'' کھیل رہے ہوں اور ان کی بھاگ دوڑ سے آنتیں چاروں قل پڑھنے میں مصروف ہو جائیں تو ایسے میں اس انسان کی عقل دماغ سے نکل کر گھٹنوں اور ٹخنوں میں جا بیٹھتی ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

''نہیں جناب!'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے میرے مسئلے کو پکڑ لیا ہے۔''

''کسی بھی مسئلے کو پکڑ لینا کافی نہیں ہوتا ارشاد۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس مسئلے کا حل نکالنا بھی ضروری ہوتا ہے اور میں نے تمہارے مسئلے کا جامع حل سوچ لیا ہے۔''

''وہ کیا جی؟'' ارشاد نے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔

اسی وقت ہماری کار بھاٹی گیٹ پہنچ گئی۔ ''ملک صاحب!'' علی محمد نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے ایک سمت اشارہ کیا اور معتدل انداز میں بتایا۔ ''وہ رہا جناب پروفیسر علوی کا آستانہ!''

''کار کو آپ سائڈ میں روک دیں۔'' میں نے علی محمد سے کہا۔

اس نے میرے حکم کی تعمیل کر دی۔

''علی محمد! میں اکیلا ہی پروفیسر کے آستانے میں جا رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اس دوران میں آپ نے دو کام کرنا ہیں۔''

وہ ہمہ تن گوش ہوتے ہوئے بولا۔ ''جی ملک صاحب! حکم کریں۔''

''یہاں نزدیک ہی ایک ولیِ کامل حضرت علی ہجویریؒ کا مزار ہے جو عرفِ عام میں ''داتا دربار'' کہلاتا ہے اور یہاں کے مرغ چھولے بہت مشہور ہیں۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''آپ دونوں وہاں جا کر کھانا کھائیں۔ یہ تو ہو گیا پہلا کام اور دوسرا کام......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک آسودہ سانس خارج کی پھر اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''کھانا کھانے کے بعد آپ نے ارشاد کو یادگار چوک لے کر جانا ہے اور وہاں سے اسے گوجرانوالہ جانے والی کسی بس پر سوار کرنا ہے۔ علاوہ ازیں ارشاد کے ٹکٹ کے پیسے بھی آپ ہی نے ادا کرنا ہیں۔ آپ میری بات سمجھ گئے نا؟''

''بالکل سمجھ گیا جناب!'' وہ اثبات میں گردن ہلا کر

بولا۔ ''آپ جیسا چاہتے ہیں، وہ ہو جائے گا مگر میں آپ کے ساتھ کھانا کھانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔''

''میرے ساتھ کھانا کھانے کے لیے آپ کو تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں انتظار کرلوں گا۔'' وہ فرمانبرداری سے بولا۔

''تو پھر آپ جا کر وہ کام نمٹالیں جو میں نے آپ کو بتایا ہے۔'' میں نے حتمی انداز میں کہا۔ ''اس دوران میں، میں پروفیسر علوی سے ملاقات کرلیتا ہوں۔''

''تھانیدار صاحب! کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں؟'' ارشاد نے ہچکچاہٹ آمیز انداز میں مجھ سے پوچھا۔

''نہیں تو۔'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیوں، کیا ہوا؟''

''میں آپ کے ساتھ آیا تھا اور آپ مجھے اکیلے ہی واپس بھیج رہے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''اس سے مجھے لگا کہ شاید آپ مجھ سے خفا ہو گئے ہیں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے ارشاد!'' میں نے اس کی تسلی کی خاطر کہا۔ ''تمہیں جلدی واپس بھیجنے کا میرا ایک خاص مقصد ہے۔ تمہارا ذہن اس وقت قلفی ارشاد میں الجھا ہوا ہے۔ تم اس بہروپیے کے بارے میں سوچ رہے ہو کہ وہ تمہیں کب اور کہاں نظر آیا تھا اور میں تمہیں اس نیک کام کو جلد از جلد کرنے کا موقع فراہم کر رہا ہوں کیونکہ میں نے بزرگوں سے سن رکھا ہے کہ تین کاموں کے دوران میں بھولی بسری چیزیں خود بخود یاد آنے لگتی ہیں۔ اول، عبادت...... دوم، رفع حاجت...... سوم، سفر۔ تم لاہور سے گوجرانوالہ تک کے سفر میں اس بہروپیے کے بارے میں سوچو گے تو وہ تمہیں یاد آجائے گا۔ تم کل کسی وقت تھانے آکر مجھے بتانا کہ اس تجربے کا کیا نتیجہ نکلا۔''

اس نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔ میں نیلی فیاٹ سے نیچے اتر گیا۔ علی محمد نے کار آگے بڑھا دی۔

سدھیر نے دھوکے باز ارشاد کی شخصیت کے حوالے سے جو کچھ بتایا تھا، اس کی تفتیشی معاملات میں بہت زیادہ اہمیت تھی اور یہ اہمیت اس وقت میری نگاہ میں ہزاروں گنا بڑھ گئی تھی جب اصلی ارشاد نے اپنے محسوسات کا مجھ سے اظہار کیا تھا۔ اگرا سے ایسا لگ رہا تھا کہ سدھیر کے بیان کردہ بندے کو اس نے کہیں دیکھ رکھا ہے تو یقیناً بار بار کوشش کرنے سے اس کی یادداشت میں کوئی مفید اور مثبت انگڑائی بھی دیکھنے کو مل سکتی تھی۔ اگر مرد مذکور ایک بار میرے ہاتھ لگ جاتا تو میں اس کی زبان کھلوانے کے بعد اس کیس کو چٹکی بجاتے ہی حل کر سکتا تھا۔

☆☆☆

اس زمانے میں ''بھاٹی گیٹ'' نامی علاقے میں عوام کی تفریح کے دو ہی مراکز ہوا کرتے تھے۔ نمبر ایک، پاکستان ٹاکیز...... نمبر دو، ملک تھیٹر۔ اس کے علاوہ تھوڑے فاصلے پر ''بازارِ حسن'' بھی واقع تھا مگر ادھر کا رخ مخصوص مزاج اور قماش کے افراد ہی کیا کرتے تھے۔ عام پبلک کا رجحان ''پاکستان ٹاکیز'' اور ''ملک تھیٹر'' ہی کی طرف تھا اور ان کی نظر میں بازارِ حسن کے بارے میں سوچنا بھی کسی گناہِ بے لذت سے کم نہیں تھا۔

پروفیسر علوی کا آستانہ ملک تھیٹر کی بغل میں واقع تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو پروفیسر اپنے آستانے میں اکیلا ہی بیٹھا ہوا تھا۔ میں اس وقت چونکہ عوامی لباس میں تھا اس لیے وہ مجھے بھی کوئی سائل ہی سمجھا۔ میں اس کے سامنے جا کر بیٹھا تو اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں تو بتاؤ، تمہیں کون سی پریشانی یہاں کھینچ کر لے آئی ہے؟''

پروفیسر علوی کا وہ آستانہ روایتی آستانوں کے مانند فرشی نشست کا حامل نہیں تھا بلکہ اس نے اسے ایک آفس کی طرح میز کرسی وغیرہ سے سیٹ کر رکھا تھا۔ ایک کرسی پر وہ خود براجمان تھا اور دو کرسیاں سائلین کے لیے میز کی دوسری جانب رکھی ہوئی تھیں جن میں سے ایک پر اس وقت میں پروفیسر کے روبرو بیٹھا ہوا تھا۔ مجھ سے سوال کرنے کے بعد اس نے حساب کتاب کی غرض سے کاغذ قلم سنبھال لیا تھا۔

''میرا ایک دوست اچانک گم ہو گیا ہے۔'' میں نے اس کے استفسار کے جواب میں کہا۔ ''بس یہی پریشانی ہے میری۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے دوست کا اتا پتا لگائیں۔''

''تمہارا دوست کب سے لاپتا ہے؟'' اس نے کاغذ پر قلم چلاتے ہوئے پوچھا۔

''آٹھ فروری کی صبح سے۔'' میں نے بتایا۔

''اوہ...... تو اس واقعے کو ایک ہفتہ گزر گیا ہے۔'' اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ''تم نے اپنے دوست کو کہاں کہاں تلاش کیا ہے؟''

''ہر جگہ......'' میں نے گول مول جواب دیا۔ ''تھانے میں اس کی گمشدگی کی رپورٹ بھی درج کرائی ہے مگر ابھی تک کوئی مثبت خبر سننے کو نہیں ملی۔''

''یہ پولیس والے کسی کام کے نہیں ہیں۔'' وہ بُرا سا

منہ بناتے ہوئے بولا۔ ”خیر، اب تم بالکل ٹھیک جگہ پر آ گئے ہو۔ تمہارا وہ لاپتا دوست جہاں کہیں بھی ہوگا، میں اسے چوبیس گھنٹے کے اندر ڈھونڈ نکالوں گا۔“

”آپ کو تو پولیس ڈیپارٹمنٹ جوائن کر لینا چاہیے پروفیسر صاحب! آپ کے علم کی بدولت ان کے بہت سارے پیچیدہ کیسز چٹکی بجاتے میں حل ہو سکتے ہیں۔“ میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جما کر معتدل انداز میں کہا۔ ”اب یہی دیکھ لیں نا، جو کام وہ لوگ آٹھ دن میں نہیں کر سکے، وہ آپ آئندہ چوبیس گھنٹے میں کرنے والے ہیں خیر سے۔“

اس نے شک بھری نظر سے مجھے گھورا اور روکھے لہجے میں دریافت کیا۔ ”کیا تمہیں میری صلاحیتوں پر بھروسا نہیں ہے؟“

”اگر بھروسا نہ ہوتا تو میں آپ کے پاس چل کر نہ آتا۔“ میں نے اسے بانس پر چڑھاتے ہوئے کہا۔ ”آپ لاہور شہر کے جانے پہچانے اور مانے ہوئے عامل کامل ہیں پروفیسر صاحب! ہر قسم کی کاٹ اور لوٹ پلٹ کے ماہر......“ پھر میں نے سچ کے اندر جھوٹ کا تڑکا لگاتے ہوئے ان الفاظ میں اضافہ کر دیا۔ ”میرا ایک رشتے دار ادھر گڑھی شاہو میں رہتا ہے۔ اس کا نام قدیر ہے۔ وہ اپنے ہر کام کے لیے آپ ہی کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے۔ اسی نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا کہ دنیا میں کوئی ایسا کام نہیں ہے جو آپ نہ کر سکتے ہوں۔ میں بڑی امید لے کر آپ کے آستانے پر آیا ہوں پروفیسر صاحب!“

”ہوں۔“ اس نے اثبات میں گردن ہلائی۔ میری وضاحت نے اس کے چہرے پر اطمینان کے تاثرات سجا دیے تھے۔ ایک بار پھر وہ کاغذ قلم کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے مجھ سے مستفسر ہوا۔

”تمہارے گمشدہ دوست کا نام مع والدہ......؟“

”مع والدہ......!“ میں نے مصنوعی الجھن کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

”ہاں!“ وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ”میں پوچھ رہا ہوں کہ تمہارے دوست اور اس کی ماں کا نام کیا ہے۔ اس کا پتا لگانے کے لیے مجھے ان دونوں چیزوں کی ضرورت ہے۔“

”میں آپ کو اپنے اس دوست کا نام تو بتا سکتا ہوں مگر اس کی ماں کا نام مجھے معلوم نہیں اور مجھے یقین ہے کہ آپ اس کی ماں کا نام ضرور جانتے ہوں گے۔“

میرے آخری جملے نے پروفیسر علوی کو چونکا دیا۔ اس نے کڑے لہجے میں استفسار کیا۔ ”تمہیں ایسا یقین کیوں ہے۔ مجھے اس بندے کی ماں کا نام کیسے معلوم ہوگا؟“

”اس لیے کہ......“ میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ”میرا وہ دوست آپ کا گہرا عقیدت مند ہے۔ وہ اپنی زندگی کے ہر معاملے کے لیے مشورہ کرنے آپ ہی کے پاس آیا کرتا تھا۔“

”کک......کون......؟“ وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں مستفسر ہوا۔ ”تم کس کی بات کر رہے ہو؟“

”میاں نذیر کی۔“ میں نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔

”میاں مکینیکل ورکس براندرتھ روڈ لاہور والے میاں صاحب!“

”اوہ......تو تم میاں صاحب کے دوست ہو؟“ وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

”میں ہر اس شخص کا دوست، مددگار اور خیرخواہ ہوں جو کسی بھی قسم کی مصیبت میں گھرا ہو۔“ میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”میرا نام صفدر حیات ہے۔ میں ضلع گوجرانوالہ کے ایک تھانے کا انچارج ہوں اور میاں نذیر کی گمشدگی والے کیس کی تفتیش کے سلسلے میں مجھے گوجرانوالہ سے لاہور آنا پڑا ہے۔ امید ہے آپ میری آمد کا مقصد وضاحت کے ساتھ سمجھ گئے ہوں گے؟“

میری اصلیت کا پتا چلتے ہی وہ پٹری پر آ گیا۔ اس نے میرے انکار کے باوجود بھی ضد کر کے لائٹ ریفریشمنٹ کا بندوبست کر دیا اور میاں نذیر کے حوالے سے مجھے بتانے لگا۔

”مجھے میاں صاحب کی گمشدگی کے بارے میں ان کی بیوی نرگس نے بتایا تھا۔“ اس نے کہا۔ ”وہ اکثر میرے پاس آیا کرتے تھے اور مجھے بہت مانتے تھے۔ میں بھی ان کے لیے سخت پریشان ہوں۔ پتا نہیں، ادھر گوجرانوالہ میں ان کے ساتھ کیا ہوا ہے؟“

میں نے سدھیر سے ہونے والی ملاقات اور پچاس ایکڑ زرعی اراضی کے جعلی کاغذات وغیرہ کے بارے میں پروفیسر کو بتانا ضروری نہ سمجھا اور قدرے تیکھے لہجے میں کہا۔

”مجھے پتا چلا ہے کہ میاں صاحب نے آپ ہی کے مشورے پر گوجرانوالہ کے نواحی علاقے قلعہ دیدار سنگھ میں پھلوں کے باغات لگانے کا فیصلہ کیا تھا اور اس سلسلے میں وہاں کے چودھری حق نواز سے پچاس ایکڑ زمین بھی خرید لی تھی؟“

”آپ کو یہ بات کس نے بتائی ہے؟“ اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

میں نے سادہ لہجے میں پوچھا۔ ”کون سی بات؟“

''کہ میاں صاحب نے میرے مشورے پر وہ زمین خریدی تھی۔''
''کسی نے بھی بتایا ہو، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''
''فرق پڑتا ہے جناب!'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''اس سے چیزوں کے معنی بدل جاتے ہیں۔''
''حقیقت کیا ہے، آپ اپنی زبان سے بیان کر دیں پروفیسر صاحب!'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔
''آپ کی طرح میں بھی اپنے دل میں میاں صاحب کے لیے ہمدردی اور مدد کے جذبات رکھتا ہوں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''جب میاں صاحب نے مجھے بتایا کہ وہ قلعہ دیدار سنگھ میں پھلوں کے باغات لگانے کا ارادہ رکھتے ہیں تو میں نے دوٹوک انداز میں ان سے کہہ دیا تھا...... دکان داری کی بہ نسبت کھیتی باڑی اور زراعت زیادہ منافع بخش اور عزت دار پیشہ ہے۔ اگر آپ نے پھلوں کے باغات لگانے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو پھر لاہور کے گردونواح میں زمین دیکھیں۔ اتنی دور قلعہ دیدار سنگھ جانے کی کیا ضرورت ہے؟ میری اس بات کے جواب میں انہوں نے کہا...... چودھری حق نواز سے میری دوستی ہوگئی ہے اور میں نے باغات کے لیے زمین پسند بھی کر لی ہے۔ آپ بس اتنا بتا دیں کہ اس کام میں مجھے فائدہ ہوگا یا نہیں۔ میں نے کہہ دیا...... اگر آپ نے اپنی لت سے جان نہیں چھڑائی تو باغات کہیں بھی لگائیں، فائدے کے کم اور نقصان کے امکانات زیادہ ہیں...... میری زبان سے یہ کڑوا سچ سن کر وہ چیں بہ جبیں ہوئے پھر موضوع بدل کو دوسری باتیں کرنے لگے تھے۔''
''آپ نے ابھی میاں صاحب کی کسی لت کا ذکر کیا ہے۔'' اس کی بات مکمل ہونے پر میں نے کہا۔ ''میں اس بارے میں جاننا چاہوں گا۔''
''میاں صاحب جوا کھیلنے کے شوقین تھے۔'' پروفیسر علوی نے انکشاف انگیز لہجے میں بتایا۔ ''وہ باتوں ہی باتوں میں ذکر کر چکے تھے کہ چودھری حق نواز کے ڈیرے پر بڑے پیمانے کا جوا بھی ہوتا ہے اور انہوں نے پچاس ایکڑ زمین کی جو قیمت ادا کی ہے، اس میں سے زیادہ رقم انہوں نے چودھری کے ڈیرے پر ہی جیتی تھی۔ میاں صاحب کی یہ بات سن کر میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں اور میں نے کوئی حساب لگائے بغیر ہی یہ جان لیا تھا کہ چودھری حق نواز کوئی پرانا اور تجربہ کار کھلاڑی ہے۔ اس نے میاں صاحب کو شکار کرنے کے لیے یہ سارا کھیل رچایا ہے اور دیکھ لیں...... میں نے کچھ غلط اندازہ نہیں لگایا تھا۔ میاں صاحب اور وہ پچاس ایکڑ زمین سب کچھ غائب ہو چکا ہے۔''
''جب آپ کی چھٹی، ساتویں اور آٹھویں حس نے آپ کو بتا دیا تھا کہ قلعہ دیدار سنگھ میں میاں نذیر کے خلاف کوئی گھناؤنی سازش بنی جا رہی ہے تو آپ نے اپنے عقیدت مند دوست کو اس خطرے سے آگاہ کیوں نہیں کیا تھا؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اس موقع پر میاں صاحب کو سمجھانا آپ کا فرض بنتا تھا۔''
''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں تھانیدار صاحب!'' وہ شاکی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اپنا یہ فرض ادا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی مگر یہ بات آپ بھی جانتے ہیں کہ جوا، شراب اور زنا ایسی عادت خبیثہ ہیں کہ ان میں مبتلا شخص کسی خیر خواہ کی نصیحت پر کان نہیں دھرتا۔ جب میں نے زیادہ سمجھانے کی کوشش کی تو میاں صاحب نے میرے پاس آنا ہی چھوڑ دیا پھر ایک روز ان کی بیوی کی زبانی مجھے پتا چلا کہ وہ پراسرار طور پر کہیں غائب ہو گئے ہیں۔ مقصود مغل اور احسان اللہ بھی میاں صاحب کے لیے بہت فکر مند ہیں۔''
''یہ مقصود مغل اور احسان اللہ کون ہیں؟'' میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔
''میاں صاحب کے پرانے جواری ساتھی۔'' پروفیسر علوی نے ڈرامائی انداز میں جواب دیا۔ ''مقصود مغل لکشمی چوک میں رہتا ہے اور احسان اللہ کی رہائش لوہاری گیٹ کی طرف ہے۔ یہ سب لوگ ہفتے میں ایک بار مل بیٹھ کر جوا کھیلتے تھے۔ مقصود اور احسان نے بھی میاں صاحب کو سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی لیکن کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔ لگ بھگ پچھلے چھ ماہ سے انہوں نے مقصود اور احسان کے ساتھ ایک بھی بازی نہیں کھیلی تھی۔ انہیں جیسے ہی وقت ملتا، وہ سیدھے چودھری حق نواز کے پاس قلعہ دیدار سنگھ پہنچ جاتے تھے۔ آخری بار جب وہ گئے تو پھر واپس نہیں آئے۔''
''آپ کے تعاون کا بہت بہت شکریہ پروفیسر صاحب!'' میں نے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ''اگر ضرورت محسوس ہوئی تو میں دوبارہ بھی آپ کے پاس آؤں گا۔''
''میری خواہش ہے کہ آپ جلد از جلد میاں صاحب کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جائیں۔'' وہ بھی میری تقلید میں کھڑا ہو گیا۔
''میں آپ کی اس خواہش کو ضرور پورا کروں گا۔''

میں نے کہا اور پروفیسر سے مصافحہ کر کے اس کے آستانے سے باہر نکل آیا۔

نیلی فیاٹ میری منتظر تھی۔ میں نے پسنجر سیٹ پر بیٹھنے کے بعد علی محمد سے پوچھا۔ ''کیا آپ نے ارشاد کو روانہ کر دیا؟''

''جی ملک صاحب!'' وہ گاڑی کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''بس پر سوار کرانے سے پہلے میں نے اسے خاصا ٹائٹ کھانا بھی کھلا دیا ہے اور اب ہماری باری ہے۔''

''کیسی باری؟'' میں نے بے ساختہ پوچھا۔

''کھانے کی باری جناب!'' وہ معتدل انداز میں بولا۔ ''تین سے اوپر ٹائم ہو گیا ہے۔ بہت زور کی بھوک لگ رہی ہے۔''

''پہلے میاں نذیر کی بیوی نرگس سے بات نہ کر لیں۔ اس کے بعد اطمینان سے کہیں بیٹھ کر پیٹ پوجا کریں گے۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے آج ہی واپس گوجرانوالہ بھی جانا ہے اور مغرب کے بعد کوئی بس یا ویگن نہیں ملے گی۔ کھانا تو کسی بھی وقت کھایا جا سکتا ہے مگر نرگس سے ملاقات زیادہ ضروری ہے۔ میں نے پچاس ایکڑ زمین کے بوگس کاغذات بھی اس کے حوالے کرنا ہیں۔''

''آپ کے یہ سارے کام اپنے وقت پر ہو جائیں گے ملک صاحب!'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولا۔ ''بھاٹی گیٹ سے اردو بازار زیادہ دور نہیں ہے۔ میں آپ کو اپنی دکان پر لے کر جا رہا ہوں۔ ہم وہیں بیٹھ کر تسلی سے کھانا کھائیں گے۔ اس کے بعد شادمان کالونی کا رخ کریں گے۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ اگر آپ کو واپسی کے لیے کوئی سواری نہ ملی تو میں اسی کار میں آپ کو گوجرانوالہ چھوڑ کر آؤں گا۔''

علی محمد کی اس پُرخلوص پیشکش کو میں ٹھکرا نہ سکا اور اسے شرفِ میزبانی بخشنے کے لیے میں اس کی دکان کی طرف جانے کے لیے آمادہ ہو گیا۔

دورانِ سفر میں اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''پروفیسر علوی سے کوئی کام کی بات معلوم ہوئی؟''

جواب میں، میں نے اسے میاں نذیر کی جوئے کی لت کے بارے میں بتا دیا۔ وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔ ''ہاں، میں یہ بات جانتا ہوں۔ میں نرگس بھابی کو اپنے ساتھ لے کر مقصود مغل اور احسان اللہ سے ملنے گیا تھا۔ پروفیسر علوی نے آپ کو جو کچھ بتایا، وہ غلط نہیں ہے۔ میاں صاحب نے جب سے قلعہ دیدار سنگھ جانا شروع کیا تھا، وہ اپنے پرانے جواری دوستوں کو جیسے بھول

ہی گئے تھے۔ وہ دونوں بھی میاں صاحب کی گمشدگی پر بہت پریشان ہیں۔''

''آپ کو جب میاں صاحب کی جوئے والی عادت کا علم تھا تو یہ بات آپ نے مجھ سے کیوں چھپائی؟'' میں نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

''بہ خدا اس میں میرے کسی ارادے یا بدنیتی کا دخل نہیں ہے ملک صاحب!'' وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''بس، مجھے خیال ہی نہیں رہا۔ میاں صاحب کی اچانک گمشدگی نے مجھے ذہنی طور پر خاصا منتشر کر دیا تھا۔ میرا زیادہ دھیان ان کی بازیابی پر لگا ہوا تھا۔ بس، یہ بات دماغ سے نکل گئی۔''

''خیر ہے......! جب انسان کا ذہن بیک وقت مختلف محاذوں پر نبرد آزما ہو تو ایسی گڑبڑ ہو ہی جاتی ہے۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''آپ کو اس حوالے سے معذرت پیش کرنے یا کسی قسم کے ذہنی دباؤ میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''آپ نے میرے دل و دماغ کا بوجھ ہلکا کر دیا ملک صاحب!'' وہ ایک آسودہ سانس خارج کرتے ہوئے تشکرانہ انداز میں بولا۔ ''آپ ایک عظیم انسان ہیں۔''

میں نے علی محمد کی بات کے جواب میں کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ جب کوئی آپ کو عظمت کے مینار پر چڑھانے کی کوشش کر رہا ہو تو عقل مندی اسی میں ہے کہ خاموش رہا جائے۔ سو میں نے بھی چپ سادھ لی تھی۔

☆☆☆

رات کو میں کافی دیر سے سویا تھا مگر صبح عادت کے مطابق وقتِ روزمرہ پر میری آنکھ کھل گئی۔ فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد میں نے ناشتا کیا اور تیار ہو کر تھانے آ گیا۔ میرے جلدی آنے کی وجہ سے تھانے کا اسٹاف خاصا مستعد اور چاق و چوبند رہتا تھا۔ میں نے حوالدار مرید حسین کو ضروری ہدایات دیں اور کانسٹیبل سلطان علی کو اپنے ساتھ لے کر قلعہ دیدار سنگھ کی جانب روانہ ہو گیا۔

گزشتہ روز گمشدہ میاں نذیر کی بیوی نرگس سے بہت ہی مختصر ملاقات ہو پائی تھی۔ نرگس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ میں نے اسے پچاس ایکڑ زمین کے جعلی کاغذات دینے کے بعد الف سے یے تک تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کر دیا تو وہ میرا شکریہ ادا کرنے کے بعد گلوگیر آواز میں بولی تھی۔

''تھانیدار صاحب! کسی بھی طرح کوشش کر کے آپ میاں صاحب کو ڈھونڈ نکالیں۔ اب تو آپ کو دو پکے اشارے بھی مل گئے۔ ایک وہ بہروپیا ارشاد جو چودھری حق نواز کا بندہ بن کر میاں صاحب سے ملتا رہا ہے۔ دوسرے آپ کے علاقے کا کوئی ایسا زمیندار جو اپنے ڈیرے پر جوا کراتا ہو۔ پروفیسر علوی نے آپ سے کوئی غلط بیانی نہیں کی۔ جوا کھیلنا میاں صاحب کا شوق ہے۔ ان کے ایک دم غائب ہو جانے کے بعد میں ان کے پرانے جواری ساتھیوں احسان اللہ اور مقصود مغل سے بھی جا کر ملی تھی۔ وہ بے چارے دونوں میاں صاحب کے لیے بہت پریشان ہیں۔''

یہ ماننا پڑے گا کہ نرگس خاصی عقلمند عورت تھی۔ اس نے میاں نذیر کی بازیابی کے حوالے سے جن دو اہم اشاروں کا ذکر کیا تھا، وہ ایک طرح سے میری سوچ کی ہی عکاسی تھے۔ ان لمحات میں، میں بھی انہی خطوط پر فوکس کیے ہوئے تھا۔

میں بڑے بھرپور انداز میں نرگس کو تسلی دلاسا دے کر اس کی کوٹھی سے نکل آیا تھا۔ وہ عالیشان کوٹھی نہر کے کنارے پر واقع شادمان کالونی میں تھی۔ نرگس ایک تعلیم یافتہ اور رکھ رکھاؤ والی تیس سالہ خاتون تھی۔ وہ میاں نذیر کی دوسری بیوی تھی۔ میاں کی پہلی بیوی صفیہ کا لگ بھگ تین سال پہلے انتقال ہو چکا تھا۔

میں چونکہ نرگس کی طرف سے جلدی فارغ ہو گیا تھا لہٰذا علی محمد کو مجھے گوجرانوالہ چھوڑنے کی زحمت نہیں اٹھانا پڑی تھی۔ میں لاہور سے گوجرانوالہ آنے والی آخری بس پر سوار ہو کر تھانے آ گیا تھا۔

چودھری حق نواز نے بڑی گرمجوشی سے میرا استقبال کیا اور مجھے اپنے ساتھ حویلی کے اندرونی حصے میں لے گیا۔ ہم آمنے سامنے بیٹھ چکے تو اس نے اضطراری لہجے میں کہا۔

''ملک صاحب! اچھا ہوا آپ آ گئے۔ میں آج آپ کی طرف آنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ بس میں ایک گھنٹے میں حویلی سے نکلنے ہی والا تھا۔''

''آپ کے چہرے کی چمک سے تو لگ رہا ہے کہ آپ مجھے کوئی خاص بات بتانے والے ہیں۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹٹولنے والے انداز میں کہا۔

''آپ کو بالکل ٹھیک لگ رہا ہے جناب!'' وہ جوشیلے لہجے میں بولا۔ ''میں پہلے آپ کی خاطر تواضع کا بندوبست کر لوں پھر سکون سے بات کرتے ہیں۔''

پھر میرے منع کرنے کے باوجود بھی وہ ایک ملازم کو بلا کر احکامات صادر کرنے لگا۔ ٹھیک دس منٹ کے بعد میرے سامنے میز پر انواع و اقسام کی نعمتیں سج چکی تھیں۔ میں نے

رزق کو خاطر خواہ تعظیم دیتے ہوئے چودھری سے کہا۔
''اب بتائیں، وہ کون سی خاص بات ہے؟''
''آپ نے میرے ملازم کو سوچنے اور یاد کرنے کے کام پر لگا دیا تھا۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔''اس اللہ کے بندے نے بھوک، پیاس اور نیند کو تیاگ کر آخر کامیابی حاصل کر ہی لی ہے۔''
''آپ ارشاد کی بات کر رہے ہیں؟'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔''کیا ارشاد کو یاد آ گیا ہے کہ وہ بندہ اسے کب اور کہاں دکھائی دیا تھا جو ارشاد بن کر گمشدہ میاں نذیر کو دھوکا دے رہا تھا؟''
''جی بالکل! میں اسی بندے کی بات کر رہا ہوں۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔''اس کا نام پرویز ہے اور لوگ اسے پیجا کہہ کر پکارتے ہیں۔ اس کی رہائش موضع چندا قلعہ میں ہے۔''
''آپ کا مطلب ہے... چن دا قلعہ؟''
چن دا قلعہ یا چندا قلعہ، لاہور سے گوجرانوالہ آتے ہوئے گوجرانوالہ کی حدود کے آغاز پر واقع تھا۔ اس کے بعد نہر اپر چناب تھی۔ نہر کو عبور کرنے کے بعد کم و بیش ڈیڑھ میل کی دوری پر میرا تھانہ تھا۔ چن دا قلعہ نامی وہ گاؤں جی ٹی روڈ کی دونوں جانب پھیلا ہوا تھا۔
''جی، میں اسی گاؤں کا ذکر کر رہا ہوں۔'' چودھری نے رسانیت بھرے لہجے میں جواب دیا۔
''چودھری صاحب! یہ پرویز عرف پیجا لاہور جا کر میاں نذیر کی دکان پر خود کو آپ کا ملازم ارشاد بتاتا رہا ہے۔'' میں نے چودھری حق نواز کے چہرے پر نگاہ جما کر معتدل انداز میں کہا۔''گویا اس نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت آپ کے خلاف ایک خطرناک سازش بنی ہے۔ آخر اسے آپ سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟''
''یہی تو میری بھی سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' چودھری نے متذبذب انداز میں کہا۔''اس علاقے کا چودھری فرید احمد ہے اور فرید احمد سے ہماری قریبی رشتے داری ہے۔ فرید میرے چھوٹے بھائی علی نواز کا سالا ہے۔ اس کی اکلوتی بہن نادرہ سے علی نواز کی شادی ہوئی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ نادرہ مجھے اور میرے بیوی بچوں کو پسند نہیں کرتی لیکن فرید احمد کے ساتھ ہمیشہ میرے اچھے تعلقات رہے ہیں۔ اس کے علاقے میں بسنے والا ایک معمولی سا انسان میرے خلاف اتنی گھناؤنی سازش کیسے کر سکتا ہے؟''
''کیسے، کیوں، کب... اور انہی جیسے دوسرے سوالیہ الفاظ کے مفصل جواب حاصل کرنے کی سائنس ہے میرے پاس۔ میں پیجا کو آج ہی گرفتار کر کے اپنے تھانے کے ٹرائل روم میں پہنچاتا ہوں۔ اس کی زبان بہتے پانی کے مانند رواں ہو جائے گی۔'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔''اس سے پہلے میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہوں گا۔ امید ہے کہ آپ میرے ہر سوال کا سیدھا اور کھرا جواب دیں گے۔''
''بے شک دوں گا۔'' وہ چٹانی لہجے میں بولا۔''آپ پوچھیں......!''
میں نے پوچھا۔''کیا آپ کو جوا کھیلنے کا شوق ہے؟''
''ہرگز نہیں۔'' وہ پوری قطعیت سے بولا۔''میں نے کبھی یہ کام نہیں کیا۔''
''کیا آپ کے ڈیرے پر ایسا کوئی کام ہوتا ہے؟''
اس نے شدت سے نفی میں گردن ہلا دی۔
''اپنے بھائی علی نواز کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟'' میں نے پوچھا۔
وہ الجھن زدہ لہجے میں بولا۔''میں سمجھا نہیں ملک صاحب......؟''
''مطلب یہ کہ علی نواز کو جوا کھیلنے کی عادت ہو۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔''اور وہ اپنے ڈیرے پر جوا کراتا ہو؟''
''ملک صاحب! اباجی کی زندگی میں ہم دونوں بھائی اسی حویلی میں ایک ساتھ مل کر رہا کرتے تھے۔'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔''اس دوران میں میں نے کبھی علی نواز میں اس قسم کا کوئی عیب نہیں دیکھا۔ تین سال پہلے اباجی فوت ہو گئے تھے۔ اس کے بعد علی نواز نے اپنی بیوی کی ضد سے مجبور ہو کر بٹوارے کا مطالبہ کیا اور جب میرے سمجھانے کے باوجود بھی وہ اسی بات پر اڑا رہا کہ ہم دونوں بھائی ایک جگہ نہیں رہ سکتے تو نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے یہ کڑوا گھونٹ پینا ہی پڑا۔ اب ہم دونوں الگ ہیں۔ اگر ہمارے درمیان بہت اچھے تعلقات نہیں ہیں تو خدانخواستہ دشمنی والی بھی کوئی بات نہیں۔ میری معلومات کے مطابق، علی نواز خود جوا کھیلتا ہے اور نہ ہی اس کے ڈیرے پر ایسی کوئی سرگرمی ہوتی ہے۔ باقی اللہ بہتر جانتا ہے۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے اپنی سانس ہموار کی پھر مجھ سے مستفسر ہوا۔
''ملک صاحب! میں جاننا چاہوں گا کہ اس کیس میں ''جوا'' کہاں سے آن ٹپکا۔ کیا اس کا میاں نذیر کی گمشدگی سے کوئی تعلق واسطہ ہے؟''

''بہت گہرا تعلق اور نہایت ہی اہم واسطہ ہے چودھری صاحب!'' میں نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میاں نذیر نے جس ''قلعہ دیدار سنگھ'' میں پچاس ایکڑ ''زمین'' باغات کے لیے ''خریدی'' تھی، وہاں کے چودھری ''حق نواز'' اپنے ڈیرے پر جوا کراتے ہیں جہاں میاں نذیر نے اچھی خاصی رقم ''جیتی'' تھی۔''

میں نے اپنے جواب میں کئی ایک الفاظ پر زور دیا تھا۔ میرے خاموش ہونے پر وہ متفکر انداز میں بولا۔

''ساری بات سمجھ میں آگئی ملک صاحب! میری ساکھ کو بٹا لگانے اور مجھے پچاس ایکڑ اراضی کی جعلی فروخت میں ملوث کرنے کے لیے کسی چالباز شخص نے یہ سازشی کھیل رچایا ہے۔''

''جب یہ بات آپ کی سمجھ میں آگئی ہے تو پھر اندازہ لگائیں، آپ سے اس قسم کی دشمنی کون کرسکتا ہے؟'' میں نے چودھری کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یقیناً پرویز عرف پیجا کے پیچھے کوئی بہت ہی شاطر اور طاقتور شخص چھپا ہوا ہے۔''

''میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں ملک صاحب!'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن میں سچ کہہ رہا ہوں کہ میرا دھیان کسی کی طرف نہیں جارہا۔''

''آپ اپنے دماغ پر زیادہ دباؤ نہ ڈالیں چودھری صاحب!'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''آپ کے دشمن کو تلاش کرنا میرا کام ہے۔ آپ بس مجھے اتنا بتادیں کہ آلے دوالے کے گاؤں میں کون ایسا طاقتور انسان ہے جو زمیندار بھی ہو اور اسے جوئے وغیرہ کا نہ صرف شوق ہو بلکہ وہ اپنے ڈیرے پر اس کا اہتمام بھی کرتا ہو؟''

''چودھری فرید احمد کے بڑے بیٹے چودھری احسان کو جوئے کی لت ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''احسان کی عمر تیس کے قریب ہے اور وہ اپنے ہم قماش لوگوں کے ساتھ ڈیرے پر ایسی تفریحات کرتا رہتا ہے۔''

''ہم قلعہ دیدار سنگھ کی جگہ چن دا قلعہ اور چودھری حق نواز کی جگہ چودھری احسان احمد کو رکھ کر آگے بڑھتے ہیں۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اس حساب سے پیجا، ارشاد بن کر میاں نذیر سے ملتا رہا اور پھر میاں نذیر کو چودھری حق نواز کی حیثیت میں چودھری احسان احمد سے ملوادیا۔ چودھری احسان نے چودھری حق نواز بن کر اپنی فرضی پچاس ایکڑ زمین جعلی دستاویز کے ذریعے میاں نذیر کے ہاتھ فروخت کردی۔ اگر یہاں تک میری یہ تھیوری درست ثابت ہوجاتی ہے تو پھر میاں نذیر کا سراغ لگانے میں مجھے کسی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔'' اپنی بات مکمل کرتے ہی میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

''آپ کہاں جارہے ہیں ملک صاحب؟'' چودھری نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''پیجا کو گرفتار کرنے۔'' میں نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ ''اور اس مقصد کے لیے مجھے آپ کے ملازم ارشاد کی ضرورت پیش آئے گی کیونکہ وہ پیجا کو پہچانتا ہے۔''

''میں اور میرے تمام ملازمین آپ سے ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''میں نے ہمیشہ حق کا ساتھ دیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ میاں نذیر کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا ازالہ ہو اور میں بھی یہ جان سکوں کہ میرا دشمن کون ہے اور...... کیوں ہے؟''

''ایسا ہی ہوگا چودھری صاحب!'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔

وہ احترام بھری نظر سے مجھے تکنے لگا۔ میں نے اس سے الوداعی مصافحہ کیا اور حویلی سے نکل کر تھانے کی جانب روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

پیجا کی گرفتاری کے لیے میں نے ایک خاص حکمت عملی سے کام لیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ کسی چھوٹی سی غلطی کی وجہ سے ہمارے ہاتھ سے نکل جائے۔ اس کام کے لیے ہم نے ارشاد کے ایک دوست کا استعمال کیا۔ خالد نامی وہ شخص کسی بہانے پیجا کو گاؤں سے باہر جی ٹی روڈ تک لے کر آیا تھا جہاں درختوں کے ایک جھنڈ میں، میں اس کے ''استقبال'' کے لیے موجود تھا۔ آج کل بھی جی ٹی روڈ کی دونوں جانب آپ کو قد آور درختوں کی ایک کبھی نہ ختم ہونے والی قطاریں دیکھنے کو ملیں گی لیکن اس زمانے میں درختوں کی بہتات کسی جنگل کا سماں پیش کرتی تھی اس لیے چھپنا بہت آسان ہوا کرتا تھا۔

جب پولیس اپنے مطلوبہ مجرم پر پکا ہاتھ ڈال دے تو پھر اس کی زبان کھلوانے میں کسی وقت یا پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ میں نے پیجا کو لگ بھگ مغرب کے وقت حوالدار مرید حسین کے سپرد کیا تھا۔ ٹھیک دو گھنٹے کے بعد حوالدار نے آکر مجھے بتایا کہ اس نے ٹیپ ریکارڈ کی مرمت کردی ہے۔ میں جب چاہوں اسے بجا سکتا ہوں۔

''کافی سمجھ دار اور تجربہ کار مکینک ہو مرید حسین!''

میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''بہت جلدی تم نے ٹیپ ریکارڈر کا فالٹ پکڑ لیا ہے۔ لے آؤ اسے میرے پاس۔ میں بھی تو دیکھوں کہ اس میں سے کس درجے کا سرسنگیت خارج ہوتا ہے۔''

حوالدار ''اچھا جی'' کہتے ہوئے میرے کمرے سے نکل گیا۔

دو گھنٹے میں مرید حسین نے پیجا کی ایسی حالت بنادی تھی جیسے وہ کئی روز سے پولیس کی تحویل میں زیرِ تفتیش رہا ہو۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

''دیکھو پیجا! حوالدار ضد کررہا ہے کہ میں آج کی پوری رات تمہیں اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں۔ صبح تک وہ تمہارے اندر سے ایک ایک بات کھود کر نکال لے گا۔''

''اگر میں صبح تک زندہ رہوں گا، تب نا۔'' وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی فریادی لہجے میں بولا۔ ''آپ کا یہ حوالدار کسی قصاب سے کم خطرناک اور بے رحم نہیں ہے۔ یہ تو آپ کی مہربانی ہے کہ مجھے اپنے پاس بلالیا۔ اس اللہ کے بندے نے تو میری کھال اتارنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔''

''ہاں، وہ ایسا ہی جلاد ہے۔ اس کے قبضے میں آیا ہوا بندہ تو موت کی دعائیں مانگنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔'' میں نے پیجا کے ڈر میں اضافہ کرنے کی غرض سے کہا۔ ''میں نے تم پر خوامخواہ مہربانی نہیں کی۔ اس کے بدلے میں مجھے تمہارا دیانت دارانہ تعاون چاہیے۔''

پیجا کو میرے کمرے میں پہنچانے کے بعد مرید حسین واپس چلا گیا تھا اسی لیے پیجا نے حوالدار کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت بھی کی تھی۔ وہ میری بات کے جواب میں منت ریز لہجے میں بولا۔

''تھانیدار صاحب! میں آپ سے ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔ بس، آپ نے مجھے حوالدار کے پاس نہیں بھیجنا۔ آپ جو بھی پوچھیں گے، میں سولہ آنے سچ ہی بتاؤں گا۔''

''دیکھتا ہوں تم اپنے اس وعدے میں کتنے آنے سچے ثابت ہوتے ہو۔'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑتے ہوئے کہا پھر پوچھا۔ ''تم چودھری حق نواز کے ملازم ارشاد کی حیثیت سے لاہور والے میاں نذیر کو بے وقوف بناتے رہے ہو۔ مجھے بتاؤ، تمہاری چودھری حق نواز یا میاں نذیر سے کیا دشمنی تھی؟''

''کوئی نہیں جی۔'' وہ نفی میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں تو بس حکم کا غلام ہوں تھانیدار صاحب!''

''تم کس کے حکم کے غلام ہو؟''

''چھوٹے چودھری صاحب کے جناب!'' اس نے بتایا۔

''چھوٹے چودھری...... مطلب چودھری علی نواز؟'' میں نے تیز لہجے میں دریافت کیا۔

''نہیں سرکار...... میں چودھری احسان صاحب کی بات کررہا ہوں۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔

''اوہ...... تم چودھری فرید احمد کے بڑے بیٹے احسان احمد کا ذکر کررہے ہو؟'' میں نے معتدل انداز میں کہا پھر پوچھا۔ ''چودھری احسان کو میاں نذیر یا چودھری حق نواز سے کیا تکلیف تھی؟''

''میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھانیدار صاحب!'' وہ بے بسی سے بولا۔ ''مجھ سے چودھری احسان نے جو کہا، وہ میں نے کردیا۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔''

''تم یہ تو تسلیم کرتے ہو نا کہ ارشاد کا نام استعمال کرکے تم نے میاں نذیر سے دوستی کی پھر اسے بہلا پھسلا کر چن دا قلعہ لے آئے اور چودھری احسان سے ملوا کر میاں کی چودھری سے دوستی کروادی؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم نے میاں نذیر کو بتایا کہ یہ علاقہ قلعہ دیدار سنگھ ہے اور چودھری احسان کو تم نے چودھری حق نواز کی حیثیت میں میاں نذیر سے متعارف کرایا تھا؟''

''جی، میں مانتا ہوں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا اور یہ سب میں نے چھوٹے چودھری صاحب کے کہنے پر کیا ہے۔''

''کیا تم جانتے ہو کہ چودھری احسان نے چودھری حق نواز بن کر میاں نذیر سے پچاس ہزار روپے ہتھیا کر پچاس ایکڑ زمین کے جعلی کاغذات اسے تھمادیے تھے؟'' میں نے سپاٹ آواز میں پوچھا۔ ''اور آٹھ فروری کو جو میاں نذیر یہاں آیا تھا تو اس کے بعد پلٹ کر لاہور واپس نہیں گیا؟''

''زمین کی خرید و فروخت اور جعلی کاغذات والے معاملے کی مجھے کوئی خبر نہیں ہے۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ ''باقی میں نے آٹھ فروری والے دن میاں نذیر کو اس علاقے میں دیکھا تھا۔ وہ چودھری احسان کے ڈیرے کی طرف گیا تھا۔ وہ جب بھی یہاں آتا تھا تو چودھری احسان اس سے ڈیرے پر ہی ملتا تھا۔ میں تو یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ واپس لاہور چلا گیا ہوگا مگر آپ بتارہے

ہیں کہ وہ آٹھ نو دن سے لاپتا ہے۔ یہ میرے لیے حیرت کی بات ہے۔''

''اگر تم چودھری احسان یا اس کے باپ چودھری فرید کی چودھری حق نواز سے دشمنی کے بارے میں کچھ جانتے ہو تو مجھے ابھی بتادو۔'' میں نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں اس جھمیلے سے نکال لوں گا لیکن اگر بعد میں مجھے پتا چلا کہ تم نے کوئی اہم بات مجھ سے چھپائی ہے تو سمجھ لو، میں تمہیں پھانسی کی سزا یا پھر عمر قید کروا کر ہی دم لوں گا۔''

وہ میرے قدموں میں گر کر گڑگڑاتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا تھانیدار صاحب! آپ چاہیں تو میں اپنے مرے ہوئے ماں باپ کی قسم کھانے کو تیار ہوں۔''

''اٹھ کر کھڑے ہوجاؤ۔'' میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''تم نے مجھے سب کچھ سچ بتایا ہے اس لیے قسم کھانے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے اس کی تسلی کی خاطر کہا اور پوچھا۔ ''مجھے بتاؤ، کیا بڑا چودھری فرید احمد اس بات سے واقف ہے کہ تم نے چودھری احسان کے کہنے پر میاں نذیر سے فریب اور مکاری کا کھیل کھیلا ہے؟''

''میرا خیال ہے بڑے چودھری صاحب اس بارے میں کچھ نہیں جانتے۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''باپ بیٹے میں زیادہ بنتی نہیں ہے۔ چودھری احسان اپنی پھوپی نادرہ کے بہت قریب ہے۔ نادرہ کی کوئی بات وہ ٹالتا نہیں۔''

پیجا کے اس طویل انٹرویو میں بالآخر مجھے کام کی ایک بات مل ہی گئی تھی۔ نادرہ کا نام سامنے آتے ہی سب کچھ روزِ روشن کے مانند مجھ پر عیاں ہوگیا تھا۔ نادرہ، چودھری حق نواز اور اس کے بیوی بچوں سے شدید نفرت کرتی تھی۔ یہ ممکنات میں تھا کہ اس نے اپنے بھتیجے چودھری احسان کے ساتھ مل کر چودھری حق نواز کے خلاف یہ گھناؤنی سازش تیار کی ہوتا کہ وہ قانون کی گرفت میں آجائے اور باقی کی زمین وجائداد بھی متنازع ہوکر رہ جائے۔

میں نے پرویز عرف پیجا کو سلطانی گواہ بنا کر اس کا بیانِ حلفی قلم بند کرلیا پھر اس بیان کی روشنی میں پہلے چودھری احسان احمد اور اس کے بعد اس کی پھوپی نادرہ کو گرفتار کرلیا۔ ان دونوں افراد کی گرفتاری کوئی آسان کام نہیں تھا مگر میں بھی ٹھہرا ایک مشکل پسند...... میں نے چودھری فرید احمد اور چودھری علی نواز کی دھمکیوں کو اپنے جوتے کی نوک پر مارتے ہوئے ان دونوں پھوپی بھتیجے کو کڑی تفتیش سے گزارنے کے بعد ان کی زبانوں سے سچ اگلوالیا۔ حیرت کی بات یہ کہ چودھری فرید اپنے بیٹے اور چودھری علی نواز اپنی بیوی کے اس خفیہ جوائنٹ وینچر سے قطعی ناواقف تھے۔

میری کامیابی پر دو افراد سب سے زیادہ خوش تھے۔ نمبر ایک...... چودھری حق نواز، کیونکہ میں نے اس سازش کو بے نقاب کرکے اسے ذلیل و رسوا ہونے سے بچالیا تھا۔ نمبر دو...... میاں نذیر...... جی ہاں، میاں نذیر کو چودھری احسان نے چارے والے گودام میں قید کررکھا تھا۔ پروگرام کے مطابق چودھری حق نواز کی گرفتاری کے بعد میاں نذیر کو قتل کرکے قلعہ دیدار سنگھ کے علاقے میں پھنکوایا جانا تھا۔ بہر حال ''جسے خدا رکھے، اسے کون چکھے'' کے مصداق میاں نذیر کی زندگی کے دن ابھی پورے نہیں ہوئے تھے اس لیے میں نے اسے زندہ بازیاب کرلیا تھا۔

ہاں...... ایک تیسرا انسان بھی میری کامیابی پر بے حد خوش اور میرا شکرگزار تھا اور وہ تھی میاں نذیر کی بیوی نرگس۔ میں میاں نذیر کو اپنے ساتھ لاہور لے کر گیا تھا کیونکہ وہاں کی قانونی کارروائی باقی تھی۔ اس موقع پر میاں نذیر ضد کرکے مجھے اپنے گھر لے گیا تھا۔

''میاں صاحب خود کو بہت عقل مند انسان سمجھتے ہیں۔'' باہمی گفتگو کے دوران میں نرگس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''لیکن آج سے میں نے ان کا ایک نیا نام رکھ دیا ہے۔''

ہم دونوں نے چونک کر نرگس کی طرف دیکھا۔ میں تو خاموش رہا مگر میاں نذیر پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''وہ کیا......؟''

''عقل بند......!'' وہ زیرلب مسکراتے ہوئے بولی۔

''عقل بند......!'' میں نے چٹخارا لیتے ہوئے دہرایا۔ ''بھئی بہت اعلیٰ!''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' میاں نذیر جزبز ہوتے ہوئے بولا۔ ''بھلا یہ کس قسم کا نام ہے؟'' اس نے سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔

''میاں صاحب! قسم کے بارے میں تو میں کچھ نہیں جانتا۔'' میں نے شرارت بھرے انداز میں کہا۔ ''لیکن آپ نے پچھلے ایک سال میں پے درپے جو اَن گنت حماقتیں فرمائی ہیں، اس کی روشنی میں بڑھاپے کی جوان اور خوب صورت ساتھی کا دیا ہوا یہ ٹائٹل آپ پر بہت پھب رہا ہے۔''

میاں نذیر نے مجھے ایسی نظر سے دیکھا جیسے بہ زبانِ خاموشی کہہ رہا ہو...... بروٹس! یوٹو......؟

میں نے بھی اپنی گردن کو معنی خیز جنبش دینے پر اکتفا کیا۔

(تحریر: حسام بٹ)

اپنے عقبی آئینے میں دیکھتے ہوئے میں دائیں طرف کی خالی لین میں آسانی سے آ گئی۔ چند لمحوں بعد ایک پولیس کروزر لائٹس چمکاتی، سائرن بجاتی میرے پیچھے تھی۔ پہلے تو مجھے لگا کہ وہ صرف گزرنا چاہتی ہے مگر جلد ہی میری یہ خوش فہمی دور ہوگئی۔

وہ پولیس آفیسر اپنی اسموکی بیئر کیمپین ہیٹ ایڈجسٹ کرتے ہوئے میری ڈرائیونگ سائڈ کی کھڑکی پر جھکا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''لائسنس اور رجسٹریشن پلیز!''

اوہ، میرے خیال میں ایک پولیس اہلکار خراب موڈ میں ہے۔ میں اتنی خوش قسمت کیسے ہوسکتی ہوں؟ بہر حال، میں نے اپنی جھنجلاہٹ اپنے اندر ہی چھپاتے ہوئے شائستگی سے پوچھا۔ ''گڈ ایوننگ آفیسر! کیا مسئلہ ہے؟''

''مسئلہ یہ ہے کہ مجھے آپ کا لائسنس اور رجسٹریشن چاہیے اور آپ احمقانہ سوال کر رہی ہیں۔''

''لیکن آپ نے مجھے روکا کیوں؟ میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔''

''جب قانون کا کوئی افسر آپ جیسے کسی کو ہدایت دیتا ہے تو اس کی تعمیل کرنا آپ پر فرض ہے۔ مجھے اپنا لائسنس اور رجسٹریشن دیں اور کوئی مشتبہ حرکت نہ کریں۔'' اس کا لہجہ سخت تھا۔

اگر یہ صورت حال جان بوجھ کر پیدا کی گئی ہے تو مجھے اور زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے...... ورنہ میری حالت بھی فیئر ہیون کے ان دو نوجوان سیاہ فاموں سے زیادہ مختلف نہیں ہوگی جنہیں دو رات پہلے پولیس نے گولی مار دی تھی

انسان چاہے کتنی ناانصافی کرجائے... زیادتیوں کا شمار بھی نہ کرپائے مگر... قدرت کے پاس ایک ایک تنکے کا حساب درج ہوتا ہے۔ یہی فارمولا کچھ یہاں بھی فٹ ہوگیا جب قدرت نے اسے ایک بڑے نقصان سے بچایا تو احساس جاگا شاید کسی نیکی کا بدلہ ملا ہے کیونکہ کبھی اس نے کسی کو ناانصافی اور ظلم سے نجات دلائی تھی۔

زیادتیوں کی تلافی کرنے والے چند لوگوں کا

عبرت اثر قصہ

تلافی

عائشہ نصیر

اور اس وقت میں اسی کیس کی انویسٹی گیشن کے لیے فیئر ہیون جا رہی تھی۔

☆☆☆

میرا نام سیلینا رانبز ہے اور میں ایک سیاہ فام صحافی ہوں۔ فیمنسٹ رجحان کے ساتھ ویسیکس گزٹ کے لیے لکھتی ہوں۔ میرے زیادہ تر اسائنمنٹس معمول کے مطابق یا بورنگ ہوتے ہیں لیکن دوراتے پہلے فیئر ہیون میں جو کہ بورو آف ویسیکس سے پندرہ میل شمال میں ایک مضافاتی علاقہ ہے، ایک سفید فام اکیلی رہنے والی درمیانی عمر کی عورت نے نائن ون ون پر کال کی اور اطلاع دی کہ دو آدمی اس کے گھر میں گھس آئے ہیں اور پندرہ منٹ بعد مشتبہ سیاہ فام افراد فٹ پاتھ پر جوابی پولیس کارروائی کے ذریعے گولی مار کر ہلاک کر دیے جاتے ہیں۔ ان نوجوانوں میں سے ایک ویسیکس ہائی اسکول کا سابق فٹ بال اسٹار تھا جس کا نام لیروے البرٹس تھا اور میرے ایڈیٹر کا خیال تھا کہ اس سے کیس کو ایک نیا موڑ مل سکتا ہے۔

اسائنمنٹ ملنے کے بعد میں نے جو پہلا کام کیا، وہ تھا لیروے کی ماں بیٹسی البرٹس کو فون کرنا...... لیکن جب ان کی جانب سے کوئی جواب نہیں ملا تو میں نے مریم ہیرس کو آزمانے کا فیصلہ کیا۔ وہ عورت جس نے نائن ون ون پر کال کی تھی۔

”مس ہیرس! میں ویسیکس گزٹ سے سیلینا رانبز ہوں۔ کیا آپ کے پاس میرے ساتھ ایک مختصر انٹرویو کے لیے وقت ہوگا؟“

”آں...... نہیں۔ میں آج مصروف ہوں۔ مجھے اپنے والد کے لیے شاپنگ کرنے جانا ہے۔“

”اوہ، مجھے افسوس ہے۔ کیا وہ بیمار ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، مگر وہ بوڑھا اور بہرا ہے۔ وہ سڑک کے پار رہتا ہے اور میں اس کی دیکھ بھال کرتی ہوں۔ اگر آپ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب آسکتی ہیں تو میں اسے کھانا کھلا کر فارغ ہو چکی ہوں گی۔“

”اوہ، یہ ٹھیک رہے گا۔ کاش ہم سب کو اپنے زوال پذیر سالوں میں آپ جیسی بیٹی میسر ہو۔ اوکے مس ہیرس! میں آپ سے آٹھ بجے ملوں گی۔“

مس ہیرس سے انٹرویو کی یقین دہانی کے بعد میں نے ایک بار پھر بیٹسی البرٹس کو کال ملائی۔ اس بار انہوں نے فون اٹھالیا۔

”مسز البرٹس! میں سیلینا رانبز ہوں ویسیکس گزٹ سے...... اور مجھے اس مشکل وقت میں آپ کو پریشان کرنے پر افسوس ہے لیکن مجھے آپ کا کچھ وقت درکار ہے۔ کیا یہ ممکن ہوگا؟“

”یہ سوگ میں گھرا ہوا گھر ہے مس رانبز۔ ہم اس وقت کسی سوال جواب کی پوزیشن میں نہیں۔ براہِ کرم آپ ریجنالڈ بی آرمسٹرانگ، اسکوائر، اٹارنی ایٹ لاء سے رابطہ کریں۔ آپ کی دلچسپی کے لیے آپ کا شکریہ۔“ دھیمے لہجے میں کہتے ہوئے اس نے فون بند کر دیا۔

میں ریجنالڈ آرمسٹرانگ کو ذاتی طور پر نہیں جانتی تھی مگر اس کا بیک گراؤنڈ متاثر کن تھا۔ اس کے والد شہری حقوق کے راہنما تھے جنہوں نے مارٹن لوتھر کنگ جونیئر کے ساتھ مارچ کیا تھا اور اگرچہ آرمسٹرانگ کا دفتر ویسیکس میں ہے لیکن اس نے نوجوان سیاہ فاموں کے ساتھ پولیس کی بدسلوکی کے متعدد واقعات پر کاؤنٹی کیونٹیز میں اپنی آواز اٹھائی تھی۔

شہری حقوق کے ایک مضبوط وکیل کے طور پر شہرت رکھنے والا آرمسٹرانگ اپنے مؤکلوں کو انصاف دلانے کے لیے پردے کے پیچھے خاموشی اور مؤثر طریقے سے کام کرتا تھا۔ میں نے اس کے دفتر فون کیا اور انٹرویو کے لیے ملاقات کا وقت طے کر لیا۔

اور اسی شام جب میں مریم ہیرس کے گھر جانے کے لیے نکلی تو آسوکی ڈرائیور کے تصادم نے میرے خوشگوار موڈ کو غارت کر دیا اور اس کا ٹکٹ اس وقت میرے ڈیش بورڈ میں پڑا میرے زخموں پر مزید نمک چھڑک رہا تھا لیکن پھر مجھے خود کو یاد دلانا پڑا کہ میں کس مقصد کے لیے جا رہی ہوں۔

تھوڑی دیر بعد میں مس ہیرس کے دروازے کی گھنٹی بجا رہی تھی۔ دروازہ کھلنے پر تیس سے بتیس سال کی ایک خوبصورت عورت سامنے آئی۔

”مس ہیرس؟ گزٹ سے سیلینا رانبز! ہم نے پہلے بات کی تھی۔ میں کوشش کروں گی کہ آپ کا زیادہ وقت ضائع نہ کروں۔ مجھے یقین ہے آپ کے والد ٹھیک ہوں گے؟“

”براہِ کرم اندر آئیں اور پوچھنے کے لیے شکریہ۔ ہاں وہ اب ٹھیک ہیں۔“ وہ مجھے اپنے ساتھ ہال وے سے گزار کر ڈرائنگ روم میں لے آئی اور کرسی کی جانب اشارہ کیا۔

”بیٹھیں مس رانبز! آپ کچھ پینا پسند کریں گی؟“

”مجھے سیلینا کہو پلیز...... اور میں تمہیں کوئی تکلیف نہیں دینا چاہوں گی۔“

”یہ کوئی تکلیف نہیں ہے۔ میں ایک انگریز گھرانے میں پلی بڑھی ہوں جہاں چائے کی کیتلی ہمیشہ چولہے پر رہتی

تھی۔'' وہ مسکرائی۔

''پھر چائے کا ایک کپ ٹھیک رہے گا۔'' میں نے کہا۔ ابھی اس سے سوالات کرنا باقی تھے اور میں اسے ناراض نہیں کرسکتی تھی۔

اور جیسے ہی اس نے چائے پیش کی، میں نے اس سے کہا کہ وہ مجھے بتائے کہ اس رات کیا ہوا تھا؟

''میں نے باہر شور سنا۔ پہلے کوئی گیراج کا دروازہ کھینچ رہا تھا لیکن جب میں نے دو آدمیوں کو پیچھے سے اندر داخل ہوتے دیکھا تو میں نے گھبرا کر نائن ون ون پر کال کی پھر میں نے تمام لائٹس بجھا دیں اور اپنے بیڈ روم کی الماری میں چھپ گئی۔''

''کیا اس وقت تم نے یہ نوٹس کیا تھا کہ وہ سیاہ فام تھے؟''

''نہیں، میں نے واقعی اس بارے میں نہیں سوچا۔ یہ سفید فاموں کا علاقہ ہے اور عام طور پر کوئی بھی پریشانی پیدا کرنے یا توڑ پھوڑ کرنے والے اکثر سفید فام نوعمر لڑکے ہوتے ہیں جو شراب نوشی کرتے ہیں یا منشیات لیتے ہیں۔''

''تو پھر کیا ہوا؟''

''پھر میں نے گولیوں کی آوازیں سنیں اور پھر تھوڑی دیر بعد میرے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ یہ پولیس تھی جو مجھے بتا رہی تھی کہ گھر میں گھسنے والوں کو قابو کرلیا گیا ہے اور وہ اندر آکر گھر کی تلاشی لینا چاہیں گے۔ مجھے اگلے دن ہی پتا چلا کہ وہ مرچکے تھے۔''

جب میں اس کے گھر سے نکل رہی تھی تو مجھے اچانک ہی کچھ خیال آیا اور میں نے مڑکر اسے دیکھا۔

''ایک اور بات مریم! اس سارے ہنگامے پر تمہارے والد کا کیا ردعمل تھا؟'' میں نے آس پاس کے گھروں کا جائزہ لیا۔ ''ویسے ان کا گھر کون سا ہے؟''

مریم نے اپنا بازو مبہم انداز میں سڑک کے اس پار بائیں طرف ایک گھر کی طرف لہرایا۔ ''اس نے کچھ نہیں سنا۔'' وہ بولی۔ ''جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا، وہ بہرا ہے۔ امید ہے آپ کی شام اچھی گزرے۔'' اور اس کے ساتھ ہی اس نے اپنا دروازہ بند کرلیا۔

میں اپنی کار میں آکر بیٹھی اور گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے چند لمحے مریم کے والد کے گھر کو گھورتی رہی۔

'وہ کیوں نہیں چاہتی کہ میں اس سے بات کروں؟ کیا وہ بھی متعصب قسم کا سفید فام ہے؟'

میں کچھ دیر الجھتی رہی پھر سر جھٹک دیا۔ ابھی مجھے صرف ان سوالات کے بارے میں سوچنا چاہیے جو آرمسٹرانگ سے پوچھنے ہیں۔ میں نے خود کو سمجھایا اور گاڑی اسٹارٹ کردی۔

☆☆☆

''گڈ مارننگ، مس رائنز! میں حیران ہوں کہ ہم پہلے کبھی نہیں ملے۔ میرا خیال تھا کہ میں زیادہ تر مقامی صحافیوں کو جانتا ہوں اور کئی مواقع پر آپ کے ایڈیٹر سے بھی ملا ہوں مگر انہوں نے کبھی یہ نہیں بتایا کہ ان کے عملے میں آپ جیسی کوئی خوبصورت لیڈی بھی ہے۔'' ریجنالڈ آرمسٹرانگ نے سفید چمک دار مسکراہٹ دیتے ہوئے گرمجوشی سے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''آپ خود بھی کافی گڈ لکنگ ہیں مسٹر آرمسٹرانگ!'' میں نے جوابی مسکراہٹ کے ساتھ اسے تعریف لوٹائی۔ اس کا انداز متاثر کن تھا مگر میں بہرحال یہاں اپنا میچ ڈھونڈنے نہیں آئی تھی۔

''کیا ہم کام کی بات پر آئیں؟ دو سیاہ فام نوجوان مرچکے ہیں اور آپ البرٹس کے خاندان کی نمائندگی کررہے ہیں۔ مسز البرٹس کو آپ سے رابطہ کرنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟''

''اس نے مجھے فون کیا، کیونکہ کوئی بھی اسے اپنے بیٹے کی لاش دیکھنے کی اجازت نہیں دے رہا تھا پھر میں اسے اپنے ساتھ مردہ خانے لے گیا۔ جب ہم نے لاش دیکھی تو پتا چلا کہ اس کے سر اور جسم پر تشدد کے نشانات تھے۔ اسے بُری طرح مارا پیٹا گیا تھا۔''

''واقعی؟'' میں چونکی۔ ''کیا ان پر تشدد بھی ہوا تھا؟''

''بالکل...... مگر کوئی نہیں جانتا۔ پولیس کسی غلط رویے کا اعتراف نہیں کررہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ پوسٹ مارٹم رپورٹ کا انتظار کررہے ہیں جو میں سمجھتا ہوں کہ ہفتے کے آخر تک جاری کردی جائے گی۔''

''کونسلر! آپ کے خیال میں کیا ہوا ہوگا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''صاف کہوں تو ان کی لاشیں دیکھ کر مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بار کی کسی لڑائی میں مارے گئے ہوں۔ میں حیران ہوں۔''

''کیا اسپتال میں کسی پولیس اہلکار کی ٹریٹمنٹ بھی رپورٹ ہوئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن میرے خیال میں ان دو لڑکوں کو گن پوائنٹ پر تشدد کا نشانہ بنایا گیا ہوگا۔''

''شاید مجھے کچھ پڑوسیوں سے بات کرنی چاہیے۔ ہوسکتا ہے انہوں نے کچھ دیکھا یا سنا ہو۔ میں ایسا کروں گی کہ پولیس کے زخمیوں کے لیے اسپتال کے ریکارڈز بھی

چیک کروں گی۔ اس کے علاوہ ہم ابھی کچھ نہیں کر سکتے۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ کس ڈیپارٹمنٹ نے نائن ون ون کال کا جواب دیا تھا؟"

"یہ کاؤنٹی شیرف کا ڈیپارٹمنٹ تھا۔ فیئر ہیون کے پاس اپنی پولیس فورس نہیں ہے۔"

"کل میرا ان کے ایک نائب کے ساتھ ٹاکرا ہوا۔" مجھے یہ بات یاد کر کے پھر سے غصہ آیا تھا۔ "وہ کافی غیر مہذب تھا اور مجھے بغیر سگنل دیے لین بدلنے کے لیے ایک بالکل غیر ضروری ٹکٹ ملا۔ کیا آپ شیرف کو جانتے ہیں؟ وہ کیسا ہے؟"

"میں اس سے ملا ہوں۔ اس کا نام اولاف پیٹرسن ہے اور وہ سیاہ فاموں کے لیے غیر ہمدرد ہونے کی وجہ سے شہرت رکھتا ہے۔ اگر اس کے آدمیوں نے یہ کیا ہے، جو کہ لگ رہا ہے کہ انہوں نے کیا ہے، تو وہ اور اس کا ڈیپارٹمنٹ دونوں کورٹ میں ہوں گے مگر جب تک پوسٹ مارٹم رپورٹ نہیں آجاتی، تب تک یہ صرف قیاس آرائیاں ہیں۔ آپ بتائیں مس رانبز! کیا آپ مقامی ہیں؟"

"میری والدہ ویکسکس بورو میں پیدا ہوئیں اور میں بچپن میں یہاں رہتی تھی۔ جب میں نے ڈارٹ ماؤتھ سے گریجویشن کیا تو میں واپس چلی آئی۔ مجھے یہاں رہنا پسند ہے۔"

"کیا آپ کے پاس صحافت کی ڈگری ہے؟" اس نے سوال کیا۔

میں بتاتے ہوئے تھوڑا جھجکی۔ "نہیں، یہ اصل میں کری ایٹیو رائٹنگ ہے۔ یہ کام صرف تب تک ہے جب تک میں گریٹ امریکی ناول نہ لکھ لوں۔"

"آپ کا مطلب گریٹ بلیک امریکی ناول؟" وہ شرارت سے مسکرایا۔

"سچ کہوں تو کالج میں بھی اس بلیک اینڈ وائٹ کے تنازع سے دور ہی رہتی تھی۔ میرا زیادہ رجحان ویمن رائٹس کی جانب تھا اور میں اسی کے لیے کام کرنا چاہتی تھی مگر...... کل کے واقعے نے میری آنکھیں کھول دیں۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔

"تو آپ نے ابھی تک ناول لکھنا شروع نہیں کیا؟" وہ کافی دلچسپی لے رہا تھا۔

"نہیں...... لیکن اب کم از کم میں نے اس بارے میں سوچنا شروع کر دیا ہے۔ یہ ایک آغاز ہے۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"اگر ہم یہ کیس کورٹ میں لے کر جاتے ہیں اور جیتتے ہیں مس رانبز، تو میں آپ کو ڈنر پر لے جا کر ناول لکھنے میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔" اس نے گھما پھرا کر بات کی تھی مگر میں سمجھ گئی۔

میں نے بہ مشکل اپنی مسکراہٹ چھپائی۔

"ہاں...... مجھے لگتا ہے کہ آپ ناول لکھنے میں میرے لیے کافی مددگار ثابت ہوں گے۔"

☆☆☆

اگلی صبح میں مریم ہیرس کے پڑوسیوں سے انٹرویو کرنے کے لیے فیئر ہیون واپس آئی۔ میں اس کے گھر کے دروازے سے کچھ دور کھڑی سوچ رہی تھی کہ کہاں سے شروع کروں اور جب میں فٹ پاتھ پر قدم رکھنے ہی والی تھی کہ مریم کے والد کے گیراج کا دروازہ کھلا اور ایک ونٹیج آرمی جیپ نکل کر باہر آئی۔ وہ دائیں طرف سے جاتی ہوئی سڑک کے آخر میں بزنس ڈسٹرکٹ کی طرف مڑگئی۔

جو کچھ میں نے دیکھا وہ حیران کن تھا۔ ڈرائیور یقیناً ایک بوڑھا اور شریف آدمی لگ رہا تھا لیکن مجھے اس پر حیرت نہیں ہوئی۔ جھریوں زدہ چہرہ لیکن جبڑے مضبوط۔ اس نے بیس بال کیپ پہن رکھی تھی۔ سیاہ، بغیر آستین والی ٹی شرٹ میں اسٹیئرنگ وھیل کو پکڑنے والے اس کے ٹیٹوز سے ڈھکے مضبوط بازوؤں کی مچھلیاں ابھری ہوئی تھیں۔ یہ کوئی کمزور بوڑھا آدمی نہیں تھا جسے کسی کی مدد یا دیکھ بھال کی ضرورت ہو۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں پاپائے دا سیلر مین کا ریٹائرڈ ورژن دیکھ رہی ہوں۔

اب فوری طور پر میں نے اپنی کار اسٹارٹ کی اور اس کے پیچھے لگا دی۔ جیپ تین بلاکوں سے آگے جھیل کی سمت گئی اور ایک کافی شاپ کی پارکنگ میں جا کر رک گئی۔

میں نے بھی اپنی گاڑی روک کر چند لمحے انتظار کیا۔ جب وہ اپنی گاڑی سے نکل کر کافی شاپ کے داخلی دروازے کی طرف بڑھا تو میں نے دیکھا، اس کا قد اوسط تھا لیکن وہ سیدھا اور چست تھا۔ کمزوری کی کوئی علامت اس کے جسم اور چال میں نظر نہیں آرہی تھی۔

میں پارکنگ میں کافی دیر تک انتظار کرتی رہی کہ شاید وہ صرف کافی خریدنے آیا ہو مگر جب وہ باہر نہیں نکلا تو میں بھی اپنی کار لاک کر کے اس کافی شاپ میں چلی آئی۔

پاپائے ...... ڈنر کاؤنٹر پر بیٹھی ایک چنچل قسم کی بلونڈ ویٹریس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ میں مصروف تھا۔ وہ اسے پیار سے چارلی اور ڈارلنگ کہہ کر مخاطب کر رہی تھی اور ظاہر ہے کہ وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے تھے۔

میں کاؤنٹر کے دوسرے سرے پر جا کر بیٹھ گئی۔

''یہ دیکھ کر اچھا لگا کہ تم یہاں بیٹھ گئیں۔ یعنی مجھے میری آج کی ایکسرسائز مل گئی۔'' سنہری بالوں والی نے جس کے نیم ٹیگ پر لزی لکھا ہوا تھا، میری جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''اوہ، سوری...... کیا تم چاہتی ہو کہ میں دوسرے سرے پر جا کر بیٹھوں؟'' میں نے کہا۔

''اگر تمہیں زحمت نہ ہو تو...... لیکن چارلی کے زیادہ قریب مت بیٹھنا...... وہ میرا ہے۔'' اس کے انداز میں شرارت تھی۔

میں نے کاؤنٹر کی طرف دیکھا جہاں پاپائے ہم دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

''اس کی بات مت سنو ہنی! میں تم دونوں کے لیے کافی بڑا ہوں۔'' وہ اپنے برطانوی لہجے میں بول اٹھا۔

میں نے ہنس کر اسے دوستانہ تاثر دیا اور اٹھ کر اس کے ساتھ والے اسٹول پر بیٹھ گئی۔

''میرا نام سیلینا ہے۔ تم سے مل کر اچھا لگا۔ کیا میں تمہیں چارلی کہوں؟''

''سب کہتے ہیں ڈیئر! کیا میں تمہیں ناشتا آفر کرسکتا ہوں؟'' چارلی ایک خوش مزاج انسان تھا۔ میں خود بھی اس سے بات کرتے ہوئے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

''نن...... نہیں...... میرے خیال میں ہمیں لزی کو جیلس نہیں کرنا چاہیے۔''

لزی نے میرا آرڈر لیتے ہوئے ایک قہقہہ لگایا۔

''کیا تم صرف یہی کھاؤ گی...... بس، ایک انگلش مفن؟'' چارلی نے میرا آرڈر سن کر حیرت کا اظہار کیا۔

''تم نے تو سنا ہی ہوگا، لڑکیاں اپنی جسامت کے بارے میں کچھ زیادہ ہی حساس ہوتی ہیں بلکہ میں تو تمہارے ناشتے پر حیران ہوں۔ یہ سب جاتا کہاں ہے کیونکہ تم پر کہیں بھی ایک اونس اضافی چربی نہیں ہے۔'' میں واقعی متاثر تھی۔ یہ دکھاوا نہیں تھا۔

''جب میں یہاں سے نکلوں گا تو دو گھنٹے کے لیے جم جاؤں گا۔'' اس نے بتانا شروع کیا۔ ''اور وہاں سے فارغ ہونے کے بعد گھر جانے سے پہلے میں جھیل کے گرد چہل قدمی کروں گا۔ پہلے میں دوڑتا تھا لیکن چند سال پہلے میرے گھٹنے میں چوٹ لگ گئی۔''

''میں جم جوائن کرنا چاہتی تھی مگر قریب میں کبھی کوئی اچھا جم ملا ہی نہیں۔ آپ کا والا کہاں ہے؟''

''یہ پلینیٹ فٹنس ہے۔ یہ یہاں سے تقریباً دو میل دور ہائی وے پر ہے۔'' اس نے اپنا ناشتا ختم کرلیا تھا۔

''اوہ......'' میں نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ''یہ میرے لیے بہت دور ہے۔ میں ویسیکس میں رہتی ہوں۔''

''ایسا مت کہو لڑکی! تم میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں وہاں کی مشینیں دکھاؤں گا اور انہیں استعمال کرنے کا طریقۂ کار بھی......''

''ارے واہ...... اب یہ ایک ایسی آفر ہے جس سے میں انکار نہیں کرسکتی۔'' میں خوشی سے چہکی۔

''کل کا دن کیسا رہے گا؟ ہم یہیں مل کر پہلے ناشتا کریں گے، اس کے بعد نکلیں گے۔'' اس نے تائید کے لیے میری سمت دیکھا۔

''پرفیکٹ ہے۔'' میں دل ہی دل میں اطمینان محسوس کرتے ہوئے مسکرائی۔ میں یہی تو چاہتی تھی۔

''تم یقین کرو گی...... وہ چوراسی سال کا ہے۔'' ادائیگی کرتے ہوئے لزی کی اس بات پر میں حیرانی سے بس سر ہلا کر رہ گئی۔

☆☆☆

میرا اگلا اسٹاپ ایمرجنسی روم تھا جہاں سے اس بات کی تصدیق ہوئی کہ بائیس اکتوبر کی شام کو کسی بھی زخمی پولیس اہلکار کا علاج نہیں کیا گیا تھا۔

واپس آفس آنے کے بعد میں نے کورونر کے دفتر کو یہ دیکھنے کے لیے فون کیا کہ آیا ان کی پوسٹ مارٹم رپورٹ جاری کردی گئی ہے۔ ان کی جانب سے تصدیق کرنے کے بعد میں ویسیکس ایونیو پر واقع کاؤنٹی شیرف کے محکمہ ہیڈ کوارٹر میں چلی آئی۔

میں نے اپنا کارڈ ریسپشنسٹ کو دیتے ہوئے شیرف پیٹرسن سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔

تھوڑی دیر بعد مجھے اندر جانے کا اشارہ کرتے ہوئے اس نے بتایا کہ شیرف کے پاس میرے لیے صرف دس منٹ ہیں۔

شیرف ایک درمیانی عمر کا لمبے قد والا نارویجن تھا اور جب میں اس کے آفس میں داخل ہوئی تو وہ پہلے ہی اپنی سیٹ سے کھڑا ہو چکا تھا۔ اس کے چہرے پر مجھے کہیں بھی نرم خیر مقدمی تاثر نہیں ملا پھر مجھے خود کو یاد دلانا پڑا کہ وہ شیرف پیٹرسن ہے، چارلی نہیں۔

''میں آپ کے لیے کیا کرسکتا ہوں؟'' ایک نشست کی طرف اشارہ کرنے کے بعد اس نے مجھ سے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

پہلے میں نے وضاحت کی کہ میں کون ہوں اور کس چیز پر کام کر رہی ہوں۔ اس کے بعد یہ سوال کیا کہ کیا اس نے لیروے البرٹس اور مائیکل ایلس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ دیکھی ہے؟

اس نے سر ہلایا۔ ''میں نے ابھی اسے پڑھا ہے۔ اس میں ایسا کچھ بھی نہیں جو غیر متوقع ہو۔ وہ گولی لگنے سے مرے ہیں۔''

''وہ تو ظاہر ہے۔'' میرا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی طنزیہ ہو گیا۔ ''لیکن کیا انہیں گولی مارنا ضروری تھا؟ کیا آپ انہیں صرف گرفتار کر کے اپنی تحویل میں نہیں لے سکتے تھے؟''

''مجھے آپ جیسے لوگوں کو اپنے محکمے کی کارروائیوں کی وضاحت دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' اس کا انداز سخت تھا۔ ''وہ بھاگنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایسے میں اگر وہ پولیس کے روکنے پر بھی نہیں رکتے تو میرے آدمیوں کو تربیت دی جاتی ہے کہ ایسی صورت حال سے انہیں کیسے نمٹنا ہے۔''

''لیکن ان کے دوسرے زخموں کا کیا ہوگا۔ ان کی سوجی آنکھیں، ایک کی ٹوٹی ہوئی ناک، دوسرے کا ٹوٹا ہوا جبڑا؟'' میں نے سوال کیا۔

وہ مجھے گھورنے لگا۔ ''میرے تمام افسران قسم کھاتے ہیں کہ ان کو کسی نے انگلی بھی نہیں لگائی اور یہ کہ ان کو جو بھی چوٹیں پہنچی ہیں، وہ پہلے سے موجود تھیں۔ میرے پاس ان کی بات پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے اور میں کسی بھی عدالت میں ان کی حمایت کروں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ میں نے سنا ہے کہ البرٹس کا خاندان مقدمے کی تیاری کر رہا ہے۔'' میں نے بات سمیٹی۔

اس کے چہرے کے تاثرات مزید سخت ہوئے۔ ''میرے پاس اس موضوع پر کہنے کے لیے مزید کچھ نہیں ہے مس رانز ......! آپ کا دن بخیر ہو۔''

☆☆☆

اگلے دن میں لیک کائی ہاؤس جلدی پہنچ گئی۔ میرے پاس لزی کے لیے کچھ سوالات تھے۔

''ہیلو، ہنی!'' اس نے مجھے دیکھتے ہی ایک خوبصورت مسکراہٹ اچھالی۔ ''چارلی لیٹ ہے۔''

''جانتی ہوں۔ میں اصل میں تم سے کچھ باتیں جاننا چاہ رہی تھی۔ کیا تم اس کی بیٹی مریم کو جانتی ہو؟''

''اوہ، ہاں۔ وہ اس کے ساتھ وقتاً فوقتاً آتی رہتی ہے۔ کیوں، تم اسے کیسے جانتی ہو؟'' وہ الجھے ہوئے لہجے میں پوچھنے لگی۔

مجھے اسے تفصیل بتانا پڑی کہ میں مریم سے کس طرح ملی۔ ''وہ اس کی اتنی حفاظت کیوں کرتی ہے؟ چارلی ایک ایسے آدمی کی طرح لگتا ہے جو اپنی دیکھ بھال بہت اچھی طرح سے کر سکتا ہے۔''

''چارلی اصل میں ڈسلیکسیا کا شکار ہے۔ اس کے علاوہ وہ تقریباً دس سال تک ایک پروباکسر تھا لہٰذا ڈسلیکسیا اور سر میں پڑنے والے ایک گھونسے کی وجہ سے اسے پڑھنے، لکھنے اور اپنے بل ادا کرنے میں دشواری ہوتی ہے اور یقیناً سننے میں بھی۔ جب اس کی بیوی زندہ تھی تو یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا لیکن وہ پچھلے سال انتقال کر گئی اور مریم اس کے قریب رہنے کے لیے واپس اس علاقے میں چلی آئی۔ ویسے چارلی اپنے مسائل کو خود پر سوار کرنے والا شخص نہیں ہے۔''

''ہیلو، لڑکیو! کہیں تم دونوں میرے لیے لڑ تو نہیں رہیں نا؟'' چارلی آ گیا تھا۔ میرے گال پر بوسہ دیتے ہوئے وہ میرے ساتھ والے اسٹول پر بیٹھ گیا۔

''نہیں، چارلی! ہم نے تمہیں شیئر کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور ہم یہی بات کر رہے تھے۔'' میں نے پیار سے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

اگلے دو گھنٹے میں نے چارلی کو مشینوں پر ایکسرسائز کرتے ہوئے دیکھتے اور اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے میں گزارے۔ اس نے ایک مشکل زندگی گزاری تھی۔ لندن بلٹز اور ایسٹ اینڈ اسٹریٹ گینگ سے بچنے کے بعد اس نے ایک پولیس اہلکار کو زخمی کرنے کے جرم میں چند ماہ جیل کاٹی پھر باکسنگ کا آغاز کیا اور اس کا دس سالہ کیریئر کافی کامیاب رہا۔ اس کے بعد وہ اپنے خاندان کے ساتھ امریکا آیا اور گرمیوں کی تپتی دھوپ اور برفانی سردی دونوں میں چھتوں پر کیلیں ٹھونکیں۔ وہ ایک سخت جان مگر دوستانہ مزاج کا بوڑھا تھا۔ مجھے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اس کی بیٹی کے گھر کے باہر کیا ہوا ہوگا۔ حالانکہ میں نے چارلی سے تب تک کچھ بھی نہیں پوچھا تھا جب تک کہ میں نے مسلسل تین ہفتوں تک اس کے ساتھ اپنی دوستی مزید گہری نہیں کر لی تھی۔

اس وقت تک یہ اسٹوری قومی خبر بن چکی تھی۔ خاص طور پر جب ڈیسیکس کاؤنٹی ڈسٹرکٹ اٹارنی نے کیس کا جائزہ لیا اور فیصلہ کیا کہ فائرنگ کے ذمے دار دو ڈپٹیز کے خلاف مقدمہ نہ چلایا جائے۔

ڈیسیکس بورو میں ہونے والے اس واقعے کی وجہ سے ریاست بھر کی سیاہ فام کمیونٹی میں غم و غصہ پھیلنے لگا تھا۔

اسی دوران لزی سے مجھے چارلی کی برتھ ڈے کا پتا چلا اور یہ دن سیلیبریٹ کرنے کے لیے میں اسے فائٹنگ دکھانے اسپورٹس ہارلے آئی تھی اور جب ہم اپنی تیسری بیئر کھول رہے تھے تو میں نے اس سے سوال کیا۔

''تو...... چارلی...... اس رات مریم کے گھر میں کیا ہوا تھا؟''

☆☆☆

میں ویسیکس کاؤنٹی شیرف ڈیپارٹمنٹ کے خلاف البرٹس خاندان کے مقدمے کے پہلے دن عدالت میں موجود تھی اور اپنے آپ کو سانس روکے ہوئے پا رہی تھی جب مدعی کے وکیل ریجنالڈ آرمسٹرانگ جیوری کے سامنے اپنے ابتدائی ریمارکس سے خطاب کرنے کے لیے اٹھے۔

''میں آج یہاں البرٹس کے خاندان کی جانب سے ہوں جو لیروے البرٹس کے لیے انصاف کی تلاش میں ہیں جو کہ ایک ہائی اسکول کا فٹ بال اسٹار تھا۔ ایک ایسا نوجوان جس کی زندگی کو نہایت ظالمانہ طریقے سے مختصر کر دیا گیا۔'' اس نے رک کر توقف کیا اور جیوری کے ارکان کے چہروں کی طرف دیکھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہمدردی کے آثار تلاش کر رہا تھا۔

''اس مقدمے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ البرٹس خاندان لیروے کو بالکل بے گناہ مانتا ہے لیکن وہ جوان اور توانائی سے بھرپور تھا اور انہیں یقین ہے کہ موقع ملنے پر اس نے اپنی زندگی کا رخ موڑ دیا ہوتا۔ حکام کی جلد بازی اور بغیر سوچے سمجھے اقدامات نے اس سے یہ موقع چھین لیا۔ شیرف کا ڈیپارٹمنٹ بضد ہے کہ لیروے فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ وہ اس کے جسم پر موجود زخموں کی توجیہہ دینے سے بھی قاصر ہیں جو مار پیٹ کے دوران آئے اور جن کی وجہ سے لیروے کے لیے فرار ہونا تقریباً ناممکن تھا۔'' آرمسٹرانگ نے ایک بار پھر توقف کیا اور پھر اپنے ریمارکس کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ اسے جیوری کی غمزدہ البرٹس خاندان کے نقصان کی تلافی اور ایک منصفانہ فیصلے پر پہنچنے کی صلاحیت پر پورا بھروسا ہے۔

جب ابتدائی ریمارکس مکمل ہوئے تو جج رینالڈس نے کونسلر آرمسٹرانگ سے اپنے پہلے گواہ کو بلانے کو کہا۔

''میں مسٹر چارلس ہیرس کو اسٹینڈ پر بلانا چاہوں گا۔'' وہ کہتے ہوئے مڑا اور مجھ سے نظر ملتے ہی ہلکا سا مسکرایا۔

چارلی سر اٹھائے بہت پُراعتماد اور پُروقار انداز میں کمرائے عدالت میں داخل ہوا تھا۔ نیلے رنگ کی ٹائی لگائے چارکول سوٹ میں ملبوس جو اس کے لیے میں نے پسند کیا تھا۔ اس کے بال نفاست سے جمے ہوئے تھے اور ڈاڑھی کی بہترین انداز میں تراش خراش ہوئی تھی۔ مجھے اس لمحے اس پر فخر محسوس ہوا۔

''کم آن چارلی ڈارلنگ! اپنے کام پر لگو۔'' میں خود سے دھیرے سے بڑبڑائی تھی۔

چارلی کے حلف اٹھانے کے بعد کونسلر آرمسٹرانگ نے تاثر قائم کرنے سے پہلے کچھ غیر متعلق سوال کیے اور پھر اس نے اس سے بائیس اکتوبر کی شام کے واقعات کو اپنے الفاظ میں بیان کرنے کو کہا۔

''ویل، میری بیٹی نے مجھے بلایا کہ دو آدمی اس کے گھر میں گھسنے کی کوشش کر رہے ہیں......''

''کیا آپ براہِ کرم عدالت کے لیے یہ بتانا پسند کریں گے کہ آپ کی بیٹی کون ہے؟'' آرمسٹرانگ نے مداخلت کی۔

''مریم ہیرس، یقیناً۔'' چارلی نے اسے دیکھتے ہوئے نرمی سے جواب دیا۔

''اور وہ گھر کی مالک ہے؟''

''آپ بھی جانتے ہیں...... میں بھی جانتا ہوں۔'' چارلی اب قدرے ناراض نظر آنے لگا۔

''اور اس نے کس وقت فون کیا؟'' اس نے اگلا سوال کیا۔

''میں نہیں جانتا لیکن اس نے کہا کہ وہ نائن ون ون پر بھی کال کرنے والی ہے اور آپ کے پاس اس کا ریکارڈ ہونا چاہیے۔'' چارلی کا انداز منہ بنانے والا تھا۔

''مجھے یقین ہے کہ ہمارے پاس ہوگا مسٹر ہیرس! تو پھر کیا ہوا؟''

''تو میں وہاں بھاگ کر گیا۔ میں نے دو سایوں کو حرکت کرتے ہوئے دیکھا مگر اس سے پہلے کہ میں کچھ کرتا، انہوں نے مجھ پر چھلانگ لگا دی۔''

''ایک منٹ مسٹر ہیرس! آپ نے کہا، انہوں نے آپ پر چھلانگ لگائی لیکن آپ کی صحت قابلِ رشک ہے۔ آپ کے چہرے یا جسم پر کسی قسم کی چوٹ کا کوئی نشان نہیں ہے۔''

''میں نے کہا کہ انہوں نے چھلانگ لگائی۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ انہوں نے مجھے کوئی نقصان بھی پہنچایا۔'' چارلی کو اس بار بھی آرمسٹرانگ کی مداخلت پسند نہیں آئی۔

آرمسٹرانگ نے اسے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

''میں نے تھوڑی ہی دیر میں انہیں نمٹا دیا، یوَر آنر!

لیفٹ ہک، رائٹ کراس، ایک دو، ایک دو۔ مریم دروازے پر آئی اور مجھے بتایا کہ پولیس بس پہنچنے ہی والی ہے تو میں نے اس سے پوچھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اس نے کہا کہ میں گھر واپس جاؤں اور دروازہ لاک کر دوں۔ وہ پولیس سے بات کرے گی اور کوشش کرے گی کہ مجھے اس معاملے سے دور رکھے۔ مجھے اس پر بھروسا ہے اس لیے میں نے بالکل ایسا ہی کیا اور جیسے ہی میں نے اپنا دروازہ بند کیا، میں نے پولیس کی کاروں کا سائرن سنا اور میں بس اتنا ہی جانتا ہوں۔''

''مسٹر ہیرس! کیا آپ عدالت کے سامنے یہ واضح کریں گے کہ جب آپ جا رہے تھے تو وہ دونوں درانداز کس حال میں تھے؟''

''میں نے تعمیراتی جوتے پہن رکھے تھے اور جانے سے پہلے میں نے ان دونوں کے گھٹنوں میں لات ماری۔ اس کے بعد وہ کہیں جانے کے قابل نہیں رہے تھے۔'' چارلی نے کمرائے عدالت پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال کر بتایا۔

''تو، مسٹر ہیرس! آپ عدالت کو بتا رہے ہیں کہ پولیس کے پہنچنے سے چند لمحے پہلے دونوں مشتبہ افراد معذور، یہاں تک کہ بے ہوش بھی تھے۔ کیا یہ درست ہے؟'' آرمسٹرانگ نے سوال کیا۔

''ہاں، میں ایسا ہی مانتا ہوں۔'' چارلی نے کہا۔

''اور ان کو پولیس سے بھاگنے میں بہت مشکل پیش آتی؟''

''کوئی ریفری اگر ایک سو پچاس تک گنتی گنتا، وہ تب بھی اٹھ نہ پاتے۔'' چارلی کا لہجہ یقین سے پُر تھا۔

آرمسٹرانگ جج کی جانب مڑا۔ ''دیٹس آل یور آنر! مجھے اس گواہ سے اور کچھ نہیں پوچھنا۔''

جج رینالڈس نے سر ہلایا اور جوناتھن راجرز کی طرف متوجہ ہوا جو شیرف کے ڈیپارٹمنٹ کا وکیل تھا۔

''کیا آپ اس گواہ سے جرح کرنا چاہتے ہیں کونسلر؟''

''اس نئے گواہ سے جرح کرنے سے پہلے میں اپنے کلائنٹس سے بات کرنے کا وقت چاہوں گا، یور آنر!''

''او کے مسٹر راجر!''

جج رینالڈس نے دیوار پر لگی گھڑی پر نظر ڈالی اور پھر عدالت اگلے روز صبح دس بجے تک کے لیے برخاست کردی۔

☆☆☆

چند ہفتوں بعد عدالت کا فیصلہ آ گیا جس میں دونوں ڈپٹیز کو جان بوجھ کر اپنے قیدیوں کے شہری حقوق کی خلاف ورزی کا قصوروار پایا گیا اور البرٹس کے خاندان کو پانچ ملین ڈالرز معاوضہ ادا کرنے کی فوری ہدایت کی گئی۔

آرمسٹرانگ اور چارلی دونوں اپنے طور پر میڈیا کے اسٹار بن گئے تھے حالانکہ چارلی جلد ہی مارننگ نیوز شوز کے لیے تیار ہو کر تھک گیا تھا اور اب پھر سے اپنی سابقہ غیر معروف مگر پُرسکون زندگی کی طرف فرار ہونے کی خواہش رکھتا تھا۔

دوسری طرف آرمسٹرانگ خوشی سے اپنے نسلی ایجنڈے کو فروغ دے رہا تھا۔ میں اسے اتوار کی صبح کے نیوز شوز میں باقاعدگی سے دیکھتی تھی لیکن اس نے میرا فون اٹھانے میں بھی زیادہ وقت نہیں لیا۔

''ہے...... کیا تم نے اپنا ناول لکھنا شروع کر دیا؟'' اس نے فون اٹھاتے ہی پہلا سوال یہ کیا تھا۔

''ابھی تک تو نہیں مگر تم کہاں تھے؟'' میں کسی فکر مند اور پریشان بیوی کی طرح استفسار کرنے لگی۔

''میں میڈیا کے چکر میں پھنسا ہوا تھا اور نکل نہیں پا رہا تھا۔'' اس نے ایک گہری سانس لے کر بتایا۔

''نکل نہیں پا رہے تھے یا نکلنا نہیں چاہتے تھے؟''

''کیا فرق پڑتا ہے۔'' وہ ہنسا۔ ''میں نے وہی کیا جو مجھے کرنا تھا لیکن میں اب ڈیسکیس واپس آ گیا ہوں اور میں نے سوچا تھا کہ تمہیں کال کروں۔ چارلی کیسا ہے؟''

''وہ چھپا ہوا ہے۔ آخری بار جب میں نے اس سے بات کی تھی تو اس نے مجھے بتایا کہ اسے ایک پبلشنگ ہاؤس کی طرف سے یادداشت کے لیے پچاس ہزار ڈالرز کی پیشکش ہوئی ہے اور کوئی اور چاہتا ہے کہ وہ بزرگوں کے لیے فٹنس ویڈیو بنائے لیکن وہ کہتا ہے کہ وہ اسپاٹ لائٹ سے تنگ آ چکا ہے۔ اس لیے اس نے دونوں آفرز ٹھکرا دیں۔'' میں نے تفصیل بتائی۔

''اس کے لیے یہ یادداشت تمہیں لکھنی چاہیے سیلینا۔ اس سے تمہیں وہ نظم و ضبط ملے گا جس کی تمہیں اپنی کتاب کو لکھتے ہوئے ضرورت ہوگی۔''

''یہ پہلا مشورہ ہے جو کتاب کے سلسلے میں تم سے سن رہی ہوں۔'' مجھے ہنسی آ گئی۔

''ہاں...... گرل فرینڈ کے طور پر ایک کامیاب رائٹر کو رکھنے کا آئیڈیا برا نہیں ہے۔ اب بتاؤ کیا تم میرے ساتھ ڈنر پر جانے کے لیے تیار ہو؟'' اس نے وہی خواہش ظاہر کی جس کا اظہار وہ پہلے بھی ایک بار کر چکا تھا۔

''آں...... سوچ کر بتاؤں گی۔'' میں نے کھنکتے ہوئے لہجے میں کہا تھا جس سے یقیناً اسے اپنا جواب مل گیا ہوگا۔

✖✖✖

ایک مکمل گھر کی خواہش میں اعتبار کی بازی ہارنے والی حسینہ کا قصہ

قدرت بھی کیا چیز ہے... جو راستہ مشکل دکھائی دیتا ہے، وہ کتنی آسانی سے کٹ جاتا ہے اور جو راستہ آسان لگتا ہے گویا تمام مشکلات اسی سفر میں در آتی ہیں۔ وہ جو اس کا مان تھی... جانے کس گمان میں بے ایمانی کر گئی... پھر تو مان کے ساتھ ساتھ دل کو بھی ٹوٹنا تھا سو... ٹوٹ گیا۔ پھر کیسے اس کا مان اور اپنا ایمان دونوں کو وہ ہار نہ جاتی۔

وارث

کرن نعمان

لرزتے ہاتھوں سے دروازہ کھول کر وہ اسپتال کے اس پرائیویٹ روم میں داخل ہوا تھا جہاں اس کا دل، اس کی زندگی، اس کی جنونی محبت اور اس کی نصف بہتر گل مینا موجود تھی۔ آج صبح ہی اس نے ایک بے حد خوب صورت اور گل گوتھنے بچے کو جنم دیا تھا۔ اس کی شادی کے بعد یہ ایک اور بڑی خوشی اعظم خان کی حویلی میں آئی تھی۔ اس بچے کی صورت اعظم خان کو اپنا پوتا اور حویلی کا وارث مل گیا تھا کیونکہ زمان خان کے ہاں تین بیٹیوں کی ولادت نے انہیں

مایوس کر دیا تھا۔ انہوں نے بہت دعائیں مانگی تھیں کہ خدا زمان خان کو اولادِ نرینہ سے نواز دے لیکن خدا کی رضا کے آگے وہ بے بس تھے۔

ولی خان کی شادی کے بعد ان کے دل میں پھر سے اس خواہش نے سر اٹھایا تھا لیکن جب شادی کے دو سال بعد بھی ولی کے ہاں اولاد نہیں ہوئی تو وہ دل شکستہ ہو گئے تھے اور اب جبکہ انہیں اپنا وارث مل گیا تھا، وہ خوشی سے بے حال تھے اور اس خوشی میں وہ یہ بھی نہ دیکھ پائے کہ ولی کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ انہی پتھرائی آنکھوں سے اس نے گل مینا کو دیکھا جس کے چہرے پر خوشی شگوفوں کی طرح پھوٹے پڑ رہی تھی۔ بارِ حیا سے اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ اگر اس لمحے وہ اس کی سرخ پتھرائی آنکھیں دیکھ لیتی تو شاید کچھ پوچھے، کچھ جانے بغیر ہی دم توڑ دیتی۔ ایک لرزہ تھا جو اندر ہی اندر اسے ہلائے ڈال رہا تھا۔ اس کے سامنے وہ عورت تھی جو پیدا ہوتے کے ساتھ ہی اس سے منسوب کر دی گئی تھی۔ جو اس کی سب سے زیادہ اپنی تھی۔ جسے اس سے محبت کا دعویٰ تھا۔ جسے ہوا چھو جاتی تو وہ ہوا سے بھی لڑ جاتا۔ آج وہی گل مینا اسے اولادِ نرینہ کا تحفہ دے کر شاداں و فرحاں تھی۔ وہ چاہ کر بھی اس پر سے نگاہ ہٹا نہیں پا رہا تھا۔ تبھی بی بی جان نے نیلے کمبل میں لپٹے اس نرم و گلابی سے بچے کو اس کی طرف بڑھایا تھا۔ اس کی ہلکے نیلے کانچ جیسی آنکھیں کھلی تھیں۔ باریک پتلی پتلی انگلیاں مٹھی کی صورت بند تھیں جنہیں وہ اپنے عنابی ہونٹوں پر رگڑ رہا تھا۔ اسے تھامنے کے لیے اس کے بازو اوپر نہیں اٹھے لیکن وحشت زدہ نگاہیں اس کے نقوش میں کچھ کھوج رہی تھیں۔

بی بی جان کو اس کے رویے پر حیرت ہوئی تھی لیکن انہوں نے ولی کے سرد رویے کو اس کی تھکن سے تعبیر کیا۔ آخر کو سات سمندر پار کر کے لوئر دیر سوات پہنچنا آسان تو نہیں تھا۔

''تم بہت تھکے ہوئے ہو ولی! گھر جا کر آرام کرو۔''

ایک لمحے کو اسے لفظ تھکن پر پیار آیا جس نے اس کا پردہ رکھا تھا۔ آج سے پہلے اس نے اپنا آپ کبھی اتنا اجنبی محسوس نہیں کیا تھا جتنا وہ اس لمحے کر رہا تھا۔ اسے حیرت ہوئی جب کل بی بی جان نے اس سے فون پر کہا تھا۔ ''اب وقت قریب ہے۔ تم جتنی جلدی ہو سکے واپس آجاؤ۔''

وہ سمجھا تھا شاید بابا جان...... کیونکہ دو دن پہلے ہی زمان خان نے اسے بتایا تھا کہ بابا جان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ دل میں اس خیال کے آتے ہی وہ ممکنہ طور پر پہلی فلائٹ لے کر لندن سے پشاور پہنچا تھا اور پھر ایک

پرائیویٹ کار کے ذریعے لوئر دیر میں واقع اپنے گاؤں چکدرہ۔ بیرونی گیٹ پر موجود ملازم نے اسے بتایا کہ سب لوگ اسپتال گئے ہیں۔ اس نے اپنا بیگ ملازم کے حوالے کیا اور اسی کار میں بیٹھ کر اسپتال پہنچ گیا مگر یہاں اپنے سامنے اعظم خان کو چاق و چوبند، پُرمسرت اور لوگوں میں مٹھائی بانٹتا دیکھ کر ولی کو پُرمسرت حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ ساتھ ہی اس نے اپنے بدترین خدشے کے غلط ثابت ہونے پر دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا تھا۔

سب سے پہلے زمان خان کی نگاہ اس پر پڑی تھی۔

''ولی آگیا بابا جان!''

اس کی نگاہ کے تعاقب میں اعظم خان نے ولی کو دیکھا تو بے اختیار خوشی سے بانہیں وا کر دیں اور ولی خان تقریباً بھاگتے ہوئے ان کی بانہوں میں سما گیا۔

''مبارک ہو میرے بیٹے! بہت بہت مبارک ہو۔''

ساتھ ہی اعظم خان نے زمان خان کے ہاتھ سے مٹھائی کا ڈبا لے کر ایک لڈو اس کے منہ میں ڈالا تھا۔

''کس بات کی مبارک باد بابا؟ کیا ہوا ہے؟'' میٹھا لڈو اندر نگلتے ہوئے اس نے پوچھا۔

''ارے بیٹا ہوا ہے، بیٹا۔ تم باپ بن گئے اور میں دادا۔'' شاید انہیں اس کے باپ بننے کی خوشی کم اور اپنے دادا بننے کی خوشی زیادہ تھی اس لیے وہ جان نہ پائے تھے کہ لڈو کی مٹھاس زہریلی کڑواہٹ بن کر ولی کے اندر اتری تھی۔ ایک بم تھا جو اس کی سماعتوں پر پھٹا تھا جس نے اس کی ذات کے پرخچے اڑا دیے تھے۔

''مبارک ہو ولی!'' اس نے پھٹی آنکھوں سے بھائی کو دیکھا۔ ''گل مینا تمہاری منتظر ہے۔'' انہوں نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ اگر یہ اس کی حقیقی خوشی کا لمحہ ہوتا تو وہ اڑ کر گل مینا کے پاس پہنچ جاتا مگر اب اس کا ایک ایک قدم من بھر کا ہو رہا تھا۔

''ہمیں کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دیں بی بی جان!''

اس کی بات سن کر گل مینا کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ بی بی جان نے ہنستے ہوئے ہلکی سی چپت اس کے سر پر لگائی اور بچے کو گود میں لیے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ وہ اپنے مردہ قدم گھسیٹتے ہوئے بیڈ کے پاس آگیا۔

''مبارک ہو تمہیں۔'' اسے اپنی ہی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔

''آپ کو بھی مبارک ہو۔'' گل کی آواز پر حیا کا غلبہ تھا۔

''کیوں...... مجھے کیوں؟'' اس کے اجنبی انداز پر

پہلی بار گل نے اسے حیرت سے دیکھا۔
''آپ کا بچہ جو ہوا ہے۔''
''میرا بچہ...... ہونہہ!'' ایک زہر خند مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو کر گزر گئی۔ ''بچہ اس کا ہوتا ہے جس میں باپ بننے کی صلاحیت ہو اور مجھ میں یہ صلاحیت نہیں ہے۔''
گل کی آنکھوں میں بے یقینی سی بھر گئی۔ ''کیوں مذاق کر رہے ہیں۔'' اس کی آواز میں لرزش تھی۔
''یہ مذاق نہیں، حقیقت ہے۔ میں نے لندن میں اپنا ٹیسٹ کروایا تھا جس سے ثابت ہوا تھا کہ میں باپ نہیں بن سکتا۔ پہلی دفعہ میں یقین نہیں آیا تو دوبارہ مزید کروایا مگر ہر بار نتیجہ منفی آیا۔ ان تینوں ٹیسٹوں کی رپورٹس وہاں میرے بیڈ کی دراز میں موجود ہیں۔ میں نے سوچا تھا کہ اولاد کے بغیر ہمارے لیے جینا مشکل ہوگا لیکن اس کمی کو میں اپنی بے انتہا محبت سے دور کر دوں گا۔ اتنا چاہوں گا تمہیں کہ اولاد کی چاہت ثانوی رہ جائے گی۔ ان نو مہینوں میں وہاں ایک ایک پل، ہر ہر سانس میرے اندر تم تھیں مگر وہ کون تھا جس نے تمہیں لمحوں میں مجھ سے چھین لیا؟'' اس نے سخت ہاتھوں سے اسے کاندھوں سے تھام لیا۔ اس کی وحشت زدہ آنکھوں میں خون اتر آیا۔ ''بتاؤ گل! وہ کون تھا جس کے ساتھ مل کر تم نے میری غیرت اور محبت کا خون کر دیا؟ بتاؤ مجھے وہ کون تھا جس کا گناہ تم نے پیدا کیا؟ بتاؤ مجھے......'' اس کے ہاتھوں کی سختی اور سرگوشی نما غراہٹ نے گل کے حواس چھین لیے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی وحشت جھیل رہی تھی تبھی دروازے پر دستک دے کر نرس اندر آئی۔
''ڈاکٹر راؤنڈ پر آرہی ہیں۔ آپ باہر چلے جائیے پلیز!'' نرس کی آمد غنیمت تھی ورنہ گل مینا کا قتل ولی کے سر ہوتا۔ وہ تیزی سے باہر نکلا اور پھر اسپتال سے بھی نکلتا چلا گیا۔

☆☆☆

اپنے کمرے کے وسط میں کھڑے ہو کر وہ ایک ایک چیز کو غائب دماغی سے دیکھ رہا تھا۔ گرمیوں کی صبح میں کتنی کتنی دیر دونوں کمرے کی کھڑکی سے تازہ ہوا اپنے اندر اتارتے تھے اور سردیوں کی شاموں میں برف کے سفید گالوں کو اپنے پھیلے ہاتھوں پر روکتے تھے۔ سنگھار میز کے آئینے میں جب وہ سج سنور کر اپنا آپ دیکھتی تو وہ کہتا۔
''جھوٹ بولتا ہے یہ آئینہ۔ اپنے آپ کو میری آنکھوں سے دیکھو۔ تمہارے حسن کی صحیح پہچان صرف انہیں ہے۔'' دیوار پر لگی شادی کی تصویر میں وہ اس کے سینے پر ہاتھ رکھے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ یہ وہ دن تھا جسے وہ اپنی زندگی کا حاصل کہتا تھا۔ جس دن وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کے ہو گئے تھے۔ وہ بستر جس پر انہوں نے محبت کا جہان تسخیر کیا تھا، اس کے اندر وحشت جگا رہا تھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ ایک ایک چیز کو آگ لگا دے۔ بالکل ویسے ہی جیسے اس کے احساس میں آگ لگی تھی۔
کیوں، آخر کیوں؟ کیا کمی تھی اس کی محبت اور مردانگی میں جو وہ اس کے جاتے ہی بے وفا ہو گئی تھی؟ پچھلے ایک گھنٹے میں ہزار بار وہ خود سے یہ سوال کر چکا تھا۔ ہر بار ایک سوالیہ نشان اس کی آنکھوں میں آٹھہرتا تھا۔ اس نے اپنے بال نوچ ڈالے۔ گھٹنوں کے بل زمین پر گر کر سینے میں قید چیخوں کو آزاد کر ڈالا۔ تڑپ تڑپ کر روتے ہوئے وہ وہیں فرش پر ایک گٹھڑی کی صورت ڈھیر ہو گیا اور آنکھیں بند کر کے سسکیاں بھرتے نہ جانے کب نیند کی وادی میں کھو گیا۔

☆☆☆

اعظم خان لوئر دیر کے سرکردہ لوگوں میں سے ایک تھے۔ نیک نامی اور بلند بختی ان کا طرۂ امتیاز تھی۔ لوگ انہیں ان کی سخاوت کی وجہ سے جانتے تھے۔ چکدرہ گاؤں میں ان کی حویلی دور سے دیکھی جا سکتی تھی۔ اللہ نے دو بیٹوں سے نوازا تھا جو سعادت مندی میں اپنی مثال آپ تھے۔ ان کی کوئی بیٹی نہیں تھی اس لیے جب بھائی کے گھر زرینہ پیدا ہوئی تو اسے زمان خان سے منسوب کر دیا۔ ولی خان، زمان خان سے پانچ سال چھوٹا تھا اور جب وہ پانچ سال کا ہوا تو اس کے ماموں کے گھر گل مینا پیدا ہوئی۔ اس وقت بی بی جان نے اس کی نسبت گل مینا سے طے کر دی۔ یہ کہتے ہوئے کہ......
''آج سے یہ چاند کا ٹکڑا میرے ولی کا نصیب ہوا۔''
ولی خان پیدائشی طور پر حساس طبیعت کا مالک تھا۔ کچھ پانے کے لیے کبھی کسی سے جھگڑا نہیں مگر جو اسے مل جاتا اس کی حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کرتا تھا اور گل مینا میں تو جیسے ان کی جان تھی۔ کانٹا بھی اس کے پاؤں میں چبھتا تو تڑپ اٹھتا تھا۔ وہ اسے دنیا جہان سے زیادہ عزیز تھی۔ یہ بات سبھی جانتے تھے اور وہ تو ولی کی محبت کو اپنے بخت کا ستارہ سمجھتی تھی۔ اس کی محبت میں ولی خان جیسی شدت نہیں تھی مگر اس کا ہر احساس اس سے جڑا تھا۔ دونوں کی محبت ان کے ساتھ پروان چڑھی۔ زمان خان، اعظم خان کے ساتھ زراعت اور زمینوں کے معاملات سے جڑا تھا مگر ولی نے انسانیت کا مسیحا بننا پسند کیا تھا۔ جس دن اس کی ہاؤس جاب مکمل ہوئی، اسی دن اعظم خان اور بی بی جان نے اس کی

شادی طے کر دی۔ وہ خود بھی اب گل مینا سے دور نہیں رہنا چاہتا تھا لیکن اس کا ایک اور خواب بھی تھا۔ وہ اسپشلائزیشن کے لیے باہر جانا چاہتا تھا۔۔مگر ماں باپ کی آرزو دیکھتے ہوئے اپنے دل پر بھی مزید بند نہ باندھ سکا اور یوں گل مینا زرتار جھلملاتے سرخ جوڑے میں ملبوس اس کی زندگی میں چلی آئی۔ دن پُر بہار اور راتیں فروزاں ہوگئیں۔ لمحہ لمحہ گلاب ہوگیا۔ بعض دفعہ اسے ڈر لگتا کہ کہیں اس کی زندگی کو اس کی اپنی ہی نظر نہ لگ جائے لیکن زندگی کے بعض معاملات نظر سے کہیں بڑھ کر عجیب ہوجاتے ہیں۔ وقت کا دھارا انسان کی مرضی کے مطابق نہیں بہتا بلکہ اس دھارے میں انسان خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتا ہے۔ تیسری بیٹی کی پیدائش کے وقت کچھ ایسی پیچیدگیاں ہوئیں کہ ڈاکٹرز نے کہہ دیا کہ زرمینہ اب ماں نہیں بن سکتی۔ زمان خان کو دکھ ہوا لیکن اعظم خان کو بہت زیادہ دکھ ہوا۔ وہ پوتے کی آس میں تھے۔ زمان خان سے انہیں یہ خوشی نہیں مل سکتی تھی اس لیے اب ان کی امید ولی خان سے جڑی تھی۔ ولی کی شادی کے بعد ہر گزرتے دن کے ساتھ ان کا انتظار بڑھ رہا تھا۔ سال گزرا تو بی بی جان کو بھی تشویش ہونے لگی۔ انہوں نے در پردہ دائیوں سے مشورے شروع کیے۔ انہوں نے سب ٹھیک ہے کا اشارہ دیا۔ چھ ماہ مزید گزرے تو انہوں نے ولی کو کہنا شروع کیا کہ گل مینا کا میڈیکل چیک اپ کروائے۔ اولاد کی خواہش ولی کو بھی تھی مگر وہ گل مینا کی محبت میں ایسا کھویا تھا کہ اسے اولاد کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ بی بی جان کے مسلسل اصرار پر اس نے گل مینا کے ٹیسٹ کروائے جو سب صحیح تھے۔ اُس نے بی بی جان کو اطمینان دلا دیا کہ سب ٹھیک ہے۔ بس اللہ کے حکم کی دیر ہے لیکن اس کے اپنے اندر ایک بے چینی کا وائرس پیدا ہوگیا۔ اس کے کچھ ڈاکٹرز دوستوں نے اسے اپنا ٹیسٹ کروانے کا مشورہ دیا۔ وہ ایک قابل ڈاکٹر تھا۔ طبی معاملات کو سمجھتا تھا مگر وہ یہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا کہ کمی اس میں بھی ہوسکتی ہے۔ انہی دنوں اسے لندن کی ایک میڈیکل یونیورسٹی کی طرف سے اسپشلائزیشن کے لیے بلوایا گیا۔ شادی کے ٹھیک دو سال بعد وہ لندن کے لیے عازمِ سفر ہوگیا۔

گل مینا سے دوری اس کے لیے سوہانِ روح تھی اور وہ بھی رو رو کر جان ہلکان کیے دے رہی تھی مگر جانے سے روک بھی نہیں رہی تھی کیونکہ شریکِ سفر کو ایک کامیاب بڑے انسان کی صورت دیکھنا چاہتی تھی۔ ولی خان کو اس بات کا یقین تھا کہ ان کے بیچ چند سالوں کی یہ دوری ان کی محبت کو اور بڑھا دے گی۔ وہ لندن آیا تو تعلیمی شیڈول بہت سخت تھا اس لیے پاکستان بات کم کم اور مختصر ہوتی تھی۔ لندن میں بھی اس کے دوستوں نے اسے اپنا ٹیسٹ کروانے پر زور دیا تو وہ سنجیدہ ہوا۔۔۔ اور پھر ٹیسٹ کروا ہی لیا جس کا نتیجہ منفی تھا۔

ان نو مہینوں میں وہ ایک بار بھی گل مینا سے ڈھنگ سے بات نہیں کر پایا۔ کچھ اپنی کمی کا احساس بھی اس پر غالب رہتا۔ گل مینا نے بھی کبھی اس سے زیادہ دیر بات کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ شاید وہ اس کے ٹف شیڈول کا خیال کرتے ہوئے مختصر بات کرتی ہے لیکن نو ماہ بعد ہی جو کچھ اس کی زندگی میں ہوا، وہ ناقابلِ یقین تھا۔

سنگی فرش کی ٹھنڈک اور فضا میں خنکی کے باوجود وہ کتنی دیر دنیا سے بے خبر وہیں فرش پر ہی پڑا رہا۔ اسے اس حال میں دیکھ کر زمان خان کا دل کٹ سا گیا۔

"ولی! اٹھو میرے بھائی۔" ولی نے آنکھیں کھولیں تو بھائی کا آنسوؤں سے تر چہرہ اس کے سامنے تھا۔ وہ چہرہ دیکھ کر بھول گیا کہ دو گھنٹے پہلے وہ کس کرب و اذیت سے دوچار تھا۔ بس یک ٹک زمان خان کو دیکھے گیا۔ اس نے اپنے ہوش میں کبھی زمان خان کو روتے نہیں دیکھا تھا پھر اب ایسا کیا ہوا تھا؟ وہ تو اسپتال میں بہت خوش تھے۔ اس بات سے انجان کہ بچہ ولی کا تھا یا نہیں۔ وہ اور بابا حویلی کا۔۔ وارث ہونے کی خوشی میں جشن منا رہے تھے۔

"آپ رو رہے ہیں زمان لالہ؟ کیوں...... کیا ہوا ہے؟" زمان نے اسے سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ انہیں لگا تھا شاید ولی کو خبر ہوگئی مگر اب انہیں بتاتے ہوئے سخت تکلیف اٹھانا پڑ رہی تھی۔ ولی کو وحشت سی ہوئی۔ وہ ان سے الگ ہوا اور سوالیہ آنکھیں بھائی کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔

"ولی، میرے بھائی...... ! گل مینا......" یہ نام ولی کے لیے گلابوں کی نرمی جیسا تھا مگر آج کانٹے جیسا اس کے دل میں چبھ رہا تھا۔ وہ چپ چاپ بھائی کو دیکھ رہا تھا۔ "گل مینا کا ہارٹ فیل ہوگیا۔ وہ ہم سب کو چھوڑ گئی۔"

ولی کو شاید سکتہ ہوا تھا مگر کچھ ہی دیر کے لیے۔ اس کا جسم اب مردہ ہوا تھا مگر روحانی طور پر وہ اس کے لیے اسی وقت مر گئی تھی جب اس نے اسے اپنے ٹیسٹ کے منفی آنے کا بتایا تھا اور یہ جان کر جو خوف اس کی آنکھوں میں ابھرا تھا، وہ اسے اس بات کا یقین دلا گیا تھا کہ وہ بے وفائی کی مرتکب ہوئی تھی۔ کاش اس کی آنکھوں میں بے یقینی ابھرتی۔ وہ ایک بار کہہ دیتی کہ نہیں، یہ بچہ تمہارا ہی ہے تو وہ

اپنے تینوں ٹیسٹ کی رپورٹس کو جھوٹا مان لیتا مگر اس کے خوف نے اس کے اعتماد کا خون کر دیا تھا اور اب اس کی موت بھی اسی خوف کے باعث حرکت قلب بند ہو جانے کے باعث ہو گئی تھی۔ اس نے بھائی کی گرفت سے خود کو آزاد کروایا اور قریبی صوفے پر ڈھے گیا۔ زندگی اس کے لیے ایک سوالیہ نشان بن گئی تھی۔ کیوں، آخر کیوں؟ شدید معاملات میں ہمارا دماغ شدید ری ایکشن دیتا ہے۔ گل مینا سے اس کی محبت کوئی عام بات نہیں تھی۔ اس کا چہرہ بچپن سے لے کر جوانی تک اس کی زندگی کا واحد محور رہا تھا۔ پورے اخلاص کے ساتھ، کسی کھوٹ یا ملاوٹ سے پاک...... اور ایسا ہی اخلاص اسے اس سے بھی مطلوب تھا۔ اس کی موجودگی میں اسے کبھی گل مینا کے کردار میں بے وفائی کی ایک چھینٹ بھی نہیں ملی تھی۔ اس کی محبت بھی پاک تھی پھر کیوں اس کے جاتے ہی...... اسے یقین تھا کہ جو کچھ ہوا، وہ کسی زبردستی کا پیش خیمہ نہیں تھا کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو وہ اپنی جان دے دیتی یا اس کا اعتراف کر لیتی۔ میت کے گھر آنے سے لے کر تدفین کے سارے مراحل تک وہ ایک سرد خاموشی کے ساتھ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کچھ ہوتا دیکھتا رہا۔ ہر کوئی اس کے اس رویے کو اس کی دل شکستگی سے تعبیر کر رہا تھا۔ اس کے اندر کی تو سوائے رب کے اور کسی کو خبر ہی نہ تھی۔ وہ خدا سے ہی شکوہ کناں ہونے لگا کہ آخر اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟
اس رات جب سب گھر والے مل بیٹھے اور اس کی باتیں کرنے لگے تو وہ خالی نگاہوں سے سب کو دیکھتا رہا مگر جیسے ہی بی بی جان نے نرم آٹے جیسے گندھے وجود کو ولی کی گود میں دینا چاہا تو وہ کرنٹ کی تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے دیکھتے ہی اس کے دل و دماغ میں ایک تصور ابھرا تھا جس میں اس کی محبت کسی اور کی بانہوں میں جھول رہی تھی۔ اس تصور کے آتے ہی اس کے وجود پر ایک وحشت وارد ہو گئی۔

''ولی! یہ معصوم تمہارا بیٹا ہے۔'' بی بی جان کے حیرت سے کہنے پر وہ چلا اٹھا۔

''نہیں، یہ...... یہ میرا بیٹا......'' وہ کہہ دینا چاہتا تھا، دل پر دھرا بھاری پتھر پھینک دینا چاہتا تھا مگر نہ جانے کس چیز نے اس کے الفاظ اس کے حلق میں ہی گھونٹ دیے۔ اسے اپنی محبت کی رسوائی منظور نہیں تھی یا شاید اپنے اندر کی کمی کا احساس اسے چپ کروا گیا۔ جو کچھ بھی تھا، وہ اسے اپنے ہی اندر چھپا کر اپنے کمرے میں لے آیا۔

اعظم خان، بی بی جان سے کہہ رہے تھے۔ ''اس بچے کی پیدائش کے ساتھ گل مینا کی موت بھی جڑی ہوئی ہے اس لیے شاید وہ اتنی جلدی اس کا ہونا قبول نہ کر سکے۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم اسے سنبھلنے کا موقع دو۔'' مگر یہ خیال ان کا خیال ہی رہا۔ ولی خان پھر کبھی نارمل زندگی نہ گزار سکا۔

☆☆☆

شاید رات وہ کھڑکی پر پردہ ڈالنا بھول گیا تھا۔ سورج کی کرنیں اس کی آنکھوں پر پڑیں تو وہ کسمساتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا...... یخ بستہ ہوا سے بچنے کے لیے اس نے گرم شال سے اپنے بڑھاپے کی طرف مائل ہوتے وجود کو ڈھانپ لیا۔ کھڑکی میں کھڑے ہو کر اس نے باہر کا منظر دیکھا۔ وادی سوات کے بلند و بالا پہاڑ سفید برف کی چادر اوڑھے کھڑے تھے۔ اس نے کچھ آگے کو جھک کر نیچے دیکھا۔ کچھ افراتفری سی تھی۔ حویلی کے ملازموں میں معمول سے ہٹ کر چہل پہل زیادہ تھی۔ صفائیاں زور و شور سے جاری تھیں۔ کچن سے مختلف پکوانوں کی خوشبوئیں اٹھ رہی تھیں۔ اس کی پیشانی پر گہری لکیریں ابھر آئیں اور ہونٹ سختی سے بھینچ گئے۔ کل ہی تو زرینہ نے انہیں اس کے آنے

تعلیم

ایک سرمایہ دار نے دوسرے سرمایہ دار سے کہا۔ ''تم نے اپنے بیٹے کو بھی اپنی فرم میں رکھ لیا ہے۔ اس کی کالج کی تعلیم تو اس کے کچھ کام آ رہی ہو گی؟''

''ہاں...... یقیناً......'' دوسرے سرمایہ دار نے جواب دیا۔ ''دفتر میں جب بھی کوئی میٹنگ وغیرہ ہوتی ہے تو کولڈ ڈرنکس اور برگر وغیرہ وہی لاتا ہے۔''

سوال

اٹھارہ سالہ بوبی اپنے دوستوں کو اپنا فیملی البم دکھا رہا تھا۔ اس کے دوست جمی نے ایک تصویر دیکھ کر پوچھا۔ ''یہ دبلا پتلا، اسمارٹ، گھنگرالے بالوں والا آدمی کون ہے جو ساحل پر کھڑا ہے؟''

''یہ میرے ابو کی شادی سے پہلے کی تصویر ہے۔'' بوبی نے بتایا۔

''یہ تمہارے ابو ہیں؟'' جمی حیرت سے بولا۔ ''تو پھر وہ موٹا سا گنجا سا آدمی کون ہے جو تمہارے گھر میں رہتا ہے؟''

مرسلہ: عمران شیروانی لاہور

کی خبر دی تھی۔ وہ آ رہا تھا جس کے وجود میں آتے ہی اس کی زندگی برباد ہو گئی تھی۔ جس سے اسے شدید نفرت تھی۔ وہ ہلکا پھلکا ناشتا کر کے حویلی سے باہر نکل آیا۔ اس کے قدم سوات کے دودھیا پانی کی طرف اٹھ رہے تھے۔ سرسبز و شاداب گھنے درختوں سے گزرتے وہ راہ میں آتے چھوٹے چھوٹے پتھروں کو پیروں کی ٹھوکروں سے راہ سے ہٹاتا جا رہا تھا۔ شاید وہ اندر ہی اندر یہ ٹھوکریں کسی اور کو لگا رہا تھا۔ ایک ایسے وجود کو جسے اس نے کبھی دیکھا نہ تھا مگر جو پچھلے بائیس سال سے اس کے دل و دماغ پر حاوی تھا اور اگر پتا چل جاتا تو وہ اس کی جان لینے میں ایک پل کی تاخیر نہ کرتا۔ چلتے چلتے وہ اپنے مخصوص مقام تک آ پہنچا۔ یہ دریائے سوات کے کنارے پڑا ایک بہت بڑا پتھر تھا جس پر وہ روز آ بیٹھتا تھا اور کتنی کتنی دیر اپر دیر کی طرف سے آتے بپھرے جھاگ اڑاتے پانی کو دیکھتا رہتا۔ جب سے اس کے آنے کا سنا تھا، اس کے ذہن کے پردے پر ماضی کی فلم چلنے لگی تھی۔ گل مینا کے مرنے کے بعد اس نے اس کا وجود قبول نہیں کیا تھا جس کا نام اعظم خان نے گل ریز خان رکھا تھا۔ ہر شخص اسے سمجھا سمجھا کر تھک گیا تھا مگر اس کی خاموشی ٹوٹ کر نہیں دے رہی تھی۔ گزرتا وقت اس خاموشی کو توڑ نہیں پا رہا تھا۔

گل ریز خان جانتا تھا کہ اس کی ولدیت ولی خان سے منسوب ہے مگر اس کی سرد نگاہیں اور سرد رویّہ کبھی اسے اس کے قریب نہ لا سکے۔ شعور کی پہلی سوچ کے ساتھ ہی اسے ان سے ڈر لگنے لگا تھا۔ دوسروں سے تو وہ ضرور تا کبھی کبھار بات کر بھی لیتا تھا مگر گل ریز سے کبھی نہیں کی۔ وہ مہربان دادا، دادی کی آغوش میں پلتا رہا۔ اعظم خان، ولی کے رویّے سے انتہائی مایوس ہو گئے تھے اس لیے مرتے وقت زمان خان کو وصیت کر گئے کہ ان کے بعد ہمیشہ گل ریز کا خیال رکھے۔ زمان خان کا کوئی بیٹا نہیں تھا اس لیے وہ ہمیشہ اسے اپنے بیٹے کی طرح ہی چاہتا رہا۔ اسے زمان خان سے خاصی عقیدت ہو گئی تھی۔ باپ کے ہوتے ہوئے بھی وہ اس کی محبت اور شفقت سے محروم تھا اس لیے جو اس کے ساتھ ہر قدم پر کھڑا ہو رہا تھا، وہ اس سے زیادہ قریب تھا۔

زمان خان کے کہنے پر وہ اکثر ولی خان سے قریب ہونے کی کوشش کرتا مگر اس نے حوصلہ افزائی تو درکنار، ایسی نفرت سے اسے نوازا تھا کہ وہ دنگ رہ گیا۔ بدلے میں اس کے دل میں بھی اب اس کے لیے نفرت ہی پل رہی تھی لیکن ایک بات وہ ضرور جاننا چاہتا تھا کہ اس کی ماں سے ولی خان کو محبت تھی تو اس سے اتنی شدید نفرت کیوں تھی؟ وہ کوئی اَن پڑھ جاہل انسان نہیں تھا۔ ایک قابل ڈاکٹر تھا اور ایک ڈاکٹر کبھی طرح جانتا ہے کہ ایک پیدا ہونے والا بچہ اپنی ماں کی موت کا ذمے دار نہیں ہوتا پھر اس نفرت کی وجہ کیا تھی؟ یہی سوال لے کر زمان خان، ولی کے پاس آیا تھا۔ جب گل ریز کی دسویں سالگرہ تھی، وہ اسے بلانے آیا تھا لیکن اس نے اسے دھتکار کر کمرے سے باہر نکال دیا تھا۔ اس کے اس رویّے پر زمان خان تلملا اٹھا تھا۔

”کیوں کیا تم نے اس کے ساتھ ایسا؟“ اس...... کے سوال پر وہ ہمیشہ کی طرح خاموش رہا۔ ”آج میں یہ بات جان کر ہی رہوں گا ولی...... اور اگر تم نہیں بولے تو قسم ہے بابا جان کی، میں اپنی جان لے لوں گا۔“

ایک استہزائیہ سی ہنسی اس کے لبوں کو چھو گئی۔ ”آپ اپنی جان کیوں لیتے ہیں زمان لالہ؟ آپ کا کیا قصور؟“

”تو پھر بتاؤ اس کا کیا قصور ہے۔ اپنے سرد رویّے سے اس معصوم کی جان کیوں لیتے ہو؟“

”ہونہہ، معصوم! اگر آپ کو حقیقت کا پتا چل گیا تو آپ اپنے ہاتھوں سے اس معصوم کی جان لے لیں گے۔“

”اگر ایسا ہے ولی تو آج میں جان کر رہوں گا کہ آخر ایسی کیا بات ہے؟“

وہ سمجھ گیا تھا کہ زمان خان قسم کھا چکا ہے اور اب جانے بغیر نہیں ٹلے گا اس لیے اس نے سب کچھ بتا دیا۔ شاید وہ خود بھی دل پر اس بات کا بوجھ اٹھائے تھک گیا تھا اس لیے زمان خان سے لپٹ کر رو دیا اور زمان خان سکتے کی کیفیت میں کھڑا اسنتا رہا۔ سینے سے لپٹے بھائی کو حوصلہ دینے کے لیے اس کے پہلو میں گرے ہاتھ اٹھ نہ سکے۔

☆☆☆

کچھ وقت کے بعد جب بی بی جان کا بھی انتقال ہو گیا تو ولی خان نے زمان خان سے کہا کہ وہ گل ریز کو حویلی سے نکال دے۔ زمان خان نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ”یہ کیسے ممکن ہے؟“

اس کی حیرت پر ولی نے اس سے کہا۔ ”گل ریز اس حویلی کا وارث نہیں ہے۔“

”مگر سب یہی جانتے ہیں۔“

”سب کی وجہ سے ہم کسی کے گناہ کو خود پر مسلط نہیں کر سکتے۔“

”مجھے اس بات کا یقین نہیں ہے ولی!“

ولی خان نے تعجب سے اسے دیکھا۔ ”میں آپ کو سب کچھ سچ بتا چکا ہوں۔“

زمان خان نے نرمی سے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''رپورٹ جھوٹی بھی ہو سکتی ہے۔ تمہارے جانے کے بعد ہم نے کبھی اس کے کردار میں برائی نہیں دیکھی تھی پھر ہم کیسے مان لیں کہ وہ گناہ گار تھی؟''

''وہ یقیناً تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں پڑھ لیا تھا۔''

''یہ سب جذباتی باتیں ہیں ولی جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ تمہارا غصہ اور نفرت دیکھ کر اس کا خوفزدہ ہو جانا لازمی امر تھا۔''

''آپ کو میری بات کا یقین کرنا ہوگا۔ وہ میری اولاد نہیں ہے۔ میں اسے کبھی قبول نہیں کروں گا۔'' اس کی بات سن کر زمان خان کچھ دیر خاموش رہا۔

''قبول تو تم نے اسے کبھی کیا ہی نہیں مگر یہ حویلی اسے قبول کر چکی ہے۔ سارا زمانہ اسے اعظم خان کے پوتے کی حیثیت سے جانتا ہے۔ اب اسے تمہاری جذباتی باتوں کی وجہ سے حویلی سے دور کر کے میں سارے زمانے کو خود پر ہنسنے کی دعوت نہیں دوں گا۔'' ولی خان کے لیے یہ ایک متوقع جواب تھا۔

''وہ اگر یہاں رہا تو کبھی بھی میرے ہاتھوں سے مر جائے گا۔'' سرد لہجے میں یہ کہہ کر وہ اس کے کمرے سے نکل آیا۔ اس دن کے بعد وہ اسے نظر آنا بند ہو گیا تھا۔ چند دن بعد اسے پتا چلا کہ زمان خان نے اس کا داخلہ مری کے کانوینٹ اسکول میں کروا دیا تھا اور وہ وہیں ہاسٹل میں رہنے لگا تھا۔ سات سال بعد وہ اچانک ایک روز ان کے کمرے میں آ گیا۔ اس نے نفرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''میں لندن جا رہا ہوں بابا! ایک بار، صرف ایک بار مجھے سینے سے لگا لیں۔'' اس کے پیچھے ہی زمان خان آ گیا تھا۔

''اسے میری نظروں سے دور کر دیں لالہ ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔'' اس نے آنسو بہاتے گل ریز کو کمرے سے باہر دھکیل دیا۔

''خدا تم پر رحم کرے ولی!'' زمان خان نے غصے اور ترحم بھری نظروں سے ولی خان کو دیکھا۔

''آمین...... مگر آپ فکر نہ کریں۔ ایک نہ ایک دن سچ ضرور کھلے گا اور اس کا اپنا چہرہ وہ سچ بتا دے گا۔''

زمان خان نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''کیا مطلب؟''

ولی خان خاموشی سے نگاہ موڑ گیا۔ اس نے زمان خان سے کہہ تو دیا تھا مگر اپنی بات کا مطلب وہ خود بھی نہیں سمجھا تھا۔ چند لمحوں کو ہی سہی، اس نے اس کا چہرہ دیکھا تو کچھ جانا پہچانا سا لگا تھا مگر وہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ اس کے چہرے میں کس کی جھلک تھی۔

☆☆☆

رات اس کے حویلی میں داخل ہونے سے پہلے ہی پوری وادی تاریکی میں ڈوب چکی تھی۔ وادی کے قریب ہی کوئی گلیشیئر گرا تھا جس کی ہوا بجلی کے کھمبوں کو اکھاڑ گئی تھی۔ گہرے سرمئی بادلوں سے ڈھکے آسمان پر بجلی کڑک کڑک کر خلقت کو ہراساں کیے دے رہی تھی۔ حویلی کے اکثر حصوں میں گیس لیمپ روشن ہو گئے تھے۔ لالٹین کی تلاش میں وہ سیدھا کچن کی طرف آیا۔ لالٹین روشن کر کے وہ پلٹا ہی تھا کہ کچن میں زرمینہ آتی دکھائی دی۔

''ارے ولی تم یہاں ہو۔ ہم سب کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ اپنے بیٹے سے ملو۔ ماشاء اللہ برسوں بعد لندن سے ڈگری لے کر آیا ہے۔''

کچھ جھجکتا ہوا گل ریز، زرمینہ کے پیچھے سے سامنے آیا تو ولی کی نگاہ جیسے اس کے چہرے پر گڑ سی گئی۔ اس کے چہرے پر وہ کسی اور کا چہرہ کھوج رہا تھا۔ اس کی یہ مشکل زرمینہ نے ہی ہنستے ہنستے آسان کر دی۔ ''دیکھو تو بالکل زمان خان پر گیا ہے۔''

زرمینہ کی بات مکمل ہوتے ہی ایک اور گلیشیئر گرا تھا جو اس کے دل کی زمین برباد کر گیا۔ اس کی ہستی کے ستون اکھڑ گئے۔ ولی کی سکڑی ہوئی آنکھیں اپنے آخری کناروں تک پھیل گئیں۔ دل کی دھڑکن پہلے بند ہوئی پھر اتنی تیزی سے چلنے لگی گویا دل پسلیاں توڑ کر باہر آ جائے گا۔ وہ ایک دم اسے دھکا دیتے باہر نکل گیا۔ پیچھے دونوں اس کے رویے پر ششدر رہ گئے تھے۔

گل ریز ہمیشہ اس کے نفرت انگیز رویے پر حیران ہوا تھا کہ کیوں آخر اس کا باپ اس سے اتنی نفرت کرتا تھا؟ سب کہتے تھے کہ تمہارا باپ تمہیں تمہاری ماں کی موت کا ذمے دار سمجھتا ہے کیونکہ جب تم پیدا ہوئے تو وہ مر گئی تھی مگر اسے یقین نہیں آتا تھا۔ بھلا کب تک کوئی اس بات پر اتنی نفرت کر سکتا تھا۔ موت تو برحق ہے۔ وہ تو راہ چلتے بھی جسے آنی ہو، آ جاتی ہے۔ پھر کیوں اس کے باپ کا رویہ اس کے ساتھ نفرت اور ہتک آمیز تھا؟ وہ لندن سے تہیہ کر کے آیا تھا کہ اس بار یہ جان کر ہی رہے گا۔ جتنی تیزی سے وہ نکلا تھا، وہ بھی اتنی ہی تیزی سے اس کے پیچھے لپکا مگر اس کے کمرے کے کچھ قریب پہنچ کر اس کے قدم رک گئے۔ وہ اپنے ذہن میں ان جملوں کو ترتیب دینے لگا جن کی مدد سے اس نے ان کے نفرت آمیز رویے کی وجہ جاننا تھی۔ ابھی وہ اس عمل سے گزر

ہی رہا تھا کہ ولی خان اپنے کمرے سے نکلا اور تیزی سے لائبریری کی طرف بڑھ گیا۔ گل ریز نے اس کے ہاتھ میں کچھ دیکھ لیا تھا مگر وہ اندھیرے کے باعث اسے نہ دیکھ سکا۔

''کیا ہونے والا ہے آج کی رات؟'' اس کے دماغ کی سوئی اس بات پر اٹک گئی۔ اس کے ہاتھ میں جو اس نے دیکھا تھا، وہ دیکھ کر پریشان ہو گیا تھا۔ وہ بھی اس کے پیچھے چل دیا مگر لائبریری کے باہر اسے رک جانا پڑا۔ اس نے اندر جا کر دروازہ بند کر لیا تھا۔ وہ گھبرا کر پچھلے صحن کی طرف بھاگا جہاں لائبریری کی کھڑکیاں کھلتی تھیں۔ تیز بارش شروع ہو چکی تھی جس نے اسے سر سے پیر تک بھگو دیا مگر آج اسے کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ اس نے اپنے کان کھڑکی سے جوڑ دیے تھے۔ زمان خان رات دیر تک مطالعے کا عادی تھا۔ پہاڑی علاقوں میں اکثر ہی لائٹ چلی جاتی تھی اس لیے وہ ہمیشہ اپنی ٹیبل پر لالٹین رکھتا تھا۔ اس نے حیرت سے ولی خان کو لائبریری میں داخل ہو کر دروازہ لاک کرتے دیکھا۔

''خیریت تو ہے ولی! سب ٹھیک ہے نا؟''

ولی خان کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔

''خیریت میری زندگی سے تئیس برس قبل رخصت ہو گئی زمان خان۔''

زمان خان کو اس کا نام لے کر مخاطب کرنا عجیب لگا۔

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟ یہ کس انداز میں بات کر رہے ہو آج؟''

''اسی انداز میں کر رہا ہوں جس انداز میں تم جیسے پیٹھ میں چھرا گھونپنے والے بھائی سے کی جاتی ہے۔''

''ولی!'' زمان خان اپنی پوری طاقت سے چلایا۔

''چلاؤ مت۔ میں نے اس کے چہرے میں تمہارا چہرہ دیکھ لیا ہے۔'' کچھ دیر کو دونوں بھائیوں کے درمیان گہری خاموشی چھا گئی۔ ''کیا اب بھی تمہارے پاس کہنے کو کچھ ہے رذیل انسان۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی میری بے بسی اور اذیت سے مزہ لیتے رہے۔ بڑے بھائی تھے۔ ایک لمحے کو بھی خیال نہیں آیا کہ وہ تمہارے چھوٹے بھائی کی عزت تھی۔''

زمان خان کا دل چاہا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے۔ کچھ عرصے سے اسے لگ رہا تھا کہ یہ بات اب وہ زیادہ دیر تک چھپا نہیں پائے گا۔ ولی خان نے تو آج دیکھا تھا، وہ اس کے چہرے میں اپنا چہرہ بہت پہلے دیکھ چکا تھا۔ اس نے بہت چاہا کہ وہ اس کے سامنے نہ آئے لیکن آخر کب تک وہ اسے حویلی آنے سے روکے رکھتا۔ آخر کو وہ حویلی کا اکلوتا وارث تھا اور شاید کاتب تقدیر کو یہ راز اسی طرح فاش کرنا تھا۔

زمان خان نے ولی کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر ایک لمبی سانس بھری۔ ''تم میرے ساتھ جو کرنا چاہتے ہو کر لو ولی! مگر ایک بار میری اتنی سی بات سن لو کہ جو کچھ بھی ہوا وہ میں نے جانتے بوجھتے نہیں کیا۔ وہ بھی معصوم تھی۔ ہم دونوں مر کر بھی ایک دوسرے کے ساتھ ایسا تعلق نہیں بنا سکتے تھے لیکن ایک جذباتی لمحے میں بہہ گئے۔ یہ اس دن کی بات ہے جس دن تم لندن گئے تھے اور میں تمہیں پشاور ائرپورٹ چھوڑ کر آیا تھا۔'' اس کے لب ہل رہے تھے اور آنکھیں ماضی میں کہیں بھٹک رہی تھیں۔

اس دن جب وہ ولی کو پشاور ائرپورٹ پر الوداع کہہ کر حویلی واپس آیا تب شام کے سائے گہرے ہو چکے تھے۔ ملازم نے اسے بتایا کہ اچانک معظم خان (جو اس کے حقیقی چچا اور سسر تھے) کی طبیعت خراب ہو گئی تھی اس لیے زرینہ، بابا جان اور بی بی جان انہیں دیکھنے چلے گئے۔ حویلی میں صرف گل مینا تھی۔ اس نے جلدی جلدی ہاتھ لیا اور معظم خان کی طرف جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ کمرے سے نکلتے ہوئے اس کی نگاہ ان کتابوں پر پڑی جو ولی کو سامان کا وزن زیادہ ہو جانے کی وجہ سے چھوڑنا پڑی تھیں۔ اس نے وہ کتابیں اٹھائیں اور گل مینا کے کمرے کی طرف چل دیا.... ارادہ تھا کہ کتابیں اس کے حوالے کر کے چلا جائے گا مگر کمرے کے باہر ہی اسے اس کی سسکیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ دستک دے کر وہ کمرے میں آ گیا۔ گل مینا ولی کی تصویر سینے سے لگائے بیڈ پر لیٹی رو رہی تھی۔

''گل مینا! کیا ہوا بچے؟'' وہ کتابیں ٹیبل پر رکھ کر اس کے قریب آ بیٹھا۔ وہ اس سے عمر میں دس سال چھوٹی اور سگی خالہ زاد تھی۔ گھر بھر کی لاڈلی بھی تھی اس لیے وہ اکثر اسے ایسے ہی مخاطب کرتا تھا۔ اسے اپنے قریب دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھی۔ آنکھوں سے آنسو بدستور بہہ رہے تھے۔ اس نے دوپٹا سائڈ سے اٹھا کر خود پر پھیلا لیا۔

''ولی کو یاد کر کے رو رہی ہو؟'' اس نے چپ چاپ سر جھکا لیا۔ اس نے ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ ''پاگل لڑکی! ابھی وہ لندن پہنچا بھی نہیں اور تم نے رو رو کر اپنا برا حال کر لیا ہے۔ بھلا یہ دو تین سال کیسے گزارو گی اس کے بنا۔''

دو تین سال کا سن کر وہ بلک بلک کر رو دی۔ زمان کو اسے سنبھالنا مشکل لگ رہا تھا۔ وہ چھوٹے بچوں کی طرح

حوصلہ چھوڑ کر رو رہی تھی۔ بے اختیاری میں اس نے گل کا سر سینے سے لگالیا۔ گل کا دل بھی صاف تھا۔ اسے سینے سے لگائے لگائے ہی اس نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔

''گل مینا بچے! ایسے حوصلہ کھودو گی تو جینا مشکل ہوجائے گا۔ چلو شاباش چپ کرو اور میری طرف دیکھو۔ دیکھو میری طرف۔'' اور پھر جیسے ہی اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھا، اسی لمحے شیطان اپنا کاری وار کرگیا۔

اس کی نبض تھم گئی تھی۔ دل کی دھڑکن کے سُر تال بدل گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتے، جذبات کا ریلا انہیں بہا کر لے گیا اور اس نے گل مینا کو بھی اس میں بہنے پر مجبور کردیا۔ خمار اترا تو سمجھ آیا کہ وہ دونوں کیا کر بیٹھے تھے۔

گل کی حالت بھی دگرگوں تھی۔ احساسِ شرمندگی دونوں کو ہی پریشان کررہا تھا۔ گل مینا کو ولی کی دوری کے ساتھ ساتھ احساسِ گناہ بھی تڑپا رہا تھا۔ ہر گزرتے دن اس پر قنوطیت سوار ہورہی تھی۔ چند دن بعد وہ کچن سے نکلتے ہوئے چکرا کر گرگئی۔ تب پتا چلا کہ وہ امید سے تھی۔ کوئی نہیں سوچ سکتا تھا کہ یہ بچہ ولی خان کا نہیں، زمان خان کا ہوگا۔ خود زمان اور گل مینا کو بھی یہ سوچ نہیں آئی تھی۔ اگر ولی خود اپنی کمی کا ذکر نہ کرتا تو آج وہ نہ ہوتا جو ہورہا تھا۔

''تمہاری جذباتی کہانی سن کر تمہیں معاف نہیں کیا جاسکتا زمان خان! وہ میری بیوی تھی، میری عزت۔ اگر زندہ ہوتی تو آج اسے بھی میری طرف سے یہی سزا ملتی جو میں تمہیں دینے جارہا ہوں اور یہ یاد رکھنا کہ یہ سزا اس سزا کا ایک فیصد بھی نہیں جو میں بےقصور ہونے کے باوجود چوبیس سال سے بھگت رہا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے ولی خان نے فائر کیا اور گولی سیدھی زمان خان کے دل میں پیوست ہوگئی۔ بےیقینی سے ولی خان کو دیکھتے وہ فرش پر ڈھیر ہوگیا۔ ولی خان کا ارادہ بھانپ کر گل ریز بھاگا چلا آیا اور آتے ہی دروازہ دھڑدھڑا دیا مگر جب تک ولی خان اپنا ارادہ پورا کرچکا تھا۔

اس نے دروازہ کھول دیا۔ گل ریز تیزی سے اندر آیا مگر سامنے زمان خان کی خون میں لت پت لاش دیکھ کر دم بخود سا رک گیا۔ وہ جان گیا تھا کہ جو شخص اس کے سامنے لاش کی صورت پڑا تھا، اس نے اسے باپ بن کر پالا ہی نہیں تھا بلکہ وہی اس کا حقیقی باپ بھی تھا پھر وہ آہستہ آہستہ اس شخص کی طرف مڑا جسے وہ ہمیشہ اپنا باپ سمجھتا رہا مگر آخر میں وہ اس کے باپ کے قاتل کے سوا کچھ بھی نہیں رہا اور اب ولی کے پستول کا رخ گل ریز کی طرف تھا۔ ولی خان اسی نفرت سے اسے دیکھ رہا ہے۔

''چلادیں بابا! ماردیں مجھے کیونکہ یہ جان کر کہ ایک گناہ کی پاداش میں پیدا ہوا ہوں، میں جینا نہیں چاہتا۔ میں ساری عمر آپ کی طرح زندہ لاش بن کر جینا نہیں چاہتا۔ خدارا ماردیں مجھے بھی۔'' گل ریز کا چہرہ دکھ اور اذیت کی آماجگاہ بن گیا۔ چند لمحوں بعد پھر ایک فائر ہوا اور گل ریز کی سانسیں رک گئیں۔

☆☆☆

رات ایک بجے کا وقت تھا۔ حویلی میں عورتیں بین کر... رہی تھیں۔ اس اثنا میں حویلی کے باہر پولیس کی گاڑیاں آکر رکی تھیں۔ پولیس اہلکاروں نے آتے ہی جگہ کو گھیرے میں لے کر سب کو باہر نکال دیا، سوائے اس شخص کے جس کے بال اور کپڑے اب بھی بھیگے ہوئے تھے۔ جس کی پتھرائی آنکھیں اب بھی دونوں لاشوں پر جمی تھیں جن میں ایک اس کا باپ تھا، دوسرا حقیقی باپ۔ لاشوں کا بغور معائنہ کرکے انسپکٹر اس کے قریب آیا۔

''ایک کا مرڈر ہوا ہے، دوسرے نے خودکشی کی ہے۔ دونوں سے آپ کا کیا رشتہ تھا؟''

اس نے کھوئی کھوئی سی نگاہ انسپکٹر پر ڈالی۔ ''باپ کا۔''

''ہوں...... اور دوسرا؟''

اب کے پھر اس کے منہ سے یہی نکلا۔ ''باپ کا۔''

''دوسرا تایا تھا جی۔'' سب انسپکٹر، اعظم خان کی فیملی کو اچھی طرح سے جانتا تھا اور یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ گل ریز اس وقت صدمے میں ہے۔

''ایک بھائی نے دوسرے کا مرڈر کرکے خودکشی کرلی۔ کیا دونوں کے بیچ کوئی تنازعہ تھا؟'' انسپکٹر اپنے پیشہ ورانہ انداز میں اس سے سوال کررہا تھا۔

''جی۔'' وہ کسی اور ہی کیفیت میں جواب دے رہا تھا۔

''کیا وراثت کا معاملہ تھا؟''

''نہیں، وارث کا۔'' یہ کہہ کر گل ریز دونوں لاشوں پر گہری نگاہ ڈالتا لائبریری سے باہر نکل گیا۔ پیچھے انسپکٹر نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''وراثت کا ہی تنازعہ ہوگا سر جی! ورنہ اکلوتا وارث تو یہ خود ہے۔'' انسپکٹر نے غور سے سب انسپکٹر کی بات سنی اور آخری بار لاشوں پر نظر ڈالی۔

''ہوں۔ ٹھیک ہے۔ ایف آئی آر میں لکھ دو اور لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوادو۔''

✻✻✻

محفلِ شعر و سخن

❋ حرا اطہر......کراچی

تھکن سے چُور پاس آیا تھا ان کے
گرا سوتے میں مجھ پر یہ شجر کیوں

❋ ناہید یوسف......اسلام آباد

ہل جائیں گے اک بار تو عرشوں کے در و بام
یہ خاک نشیں لوگ جو بولیں گے کسی دن
آپس کی کسی بات کا ملتا ہی نہیں وقت
ہر بار یہ کہتے ہیں کہ "بیٹھیں گے کسی دن"

❋ شاہین تبسم......کراچی

جنہیں محسوس انسانوں کے رنج و غم نہیں ہوتے
وہ انساں بھی تو ہرگز پتھروں سے کم نہیں ہوتے

❋ لبنیٰ وکیل......کوئٹہ

دکھائے پانچ عالم اِک پیامِ شوق نے مجھ کو
الجھنا، روٹھنا، لڑنا، بگڑنا، دور ہوجانا

❋ نوشتہ گلزار......بھکر

کیا لوگ ہیں کہ دل کی گرہ کھولتے نہیں
آنکھوں سے دیکھتے ہیں مگر بولتے نہیں

❋ باسط علی......نوشہرہ فیروز

کچھ ہوش بھی ہے دستِ جنوں دیکھ کیا ہوا
دامن تک آگیا ہے گریباں پھٹا ہوا

❋ عاصم علی......ملتان

دل کی تنہائی کا مجھ کو خود بھی اندازہ نہیں
یہ اک ایسا گھر ہے جس کا کوئی دروازہ نہیں

❋ وہاب احمد......ملتان

واعظ نہ ڈرا مجھ کو قیامت کی سحر سے
دیکھی ہے ان آنکھوں نے قیامت کی سحر بھی

❋ آذین رضوان......کراچی

بلا کی افراتفری ہے میری ذات میں لیکن
ہمیں تو بے دھیانی میں بھی تیرا دھیان رہتا ہے

❋ نادیہ ریاض......نواب شاہ

مت چھین اپنا نام میرے لب سے اس طرح
بے نام زندگی میں تیرا نام ہی تو ہے

❋ پرویز خان......پشاور

کم سے کم قیمت پہ بک جاتے ہیں لوگ
ظرف انساں کی ہے ارزانی بہت

❋ مہتاب احمد......حیدرآباد

افلاک کا سایہ ہے جو کچھ بھی زمیں پر ہے
ہے خواب کہیں میرا، تعبیر کہیں پر ہے
کچھ ایسی نظر ڈالی ہنگامِ وداع اس نے
میں خود تو چلا آیا دل اب بھی وہیں پر ہے

❋ جنید ملک......کراچی

میں کس کے ہاتھ بھیجوں اسے آج کی دعا
قاصد، ہوا، ستارہ، کوئی اس کے گھر نہ جائے

❋ عارف انصاری......کوئٹہ

ہم نے دیکھا ہے کہ دولت کے حسین شانوں پر
لوگ آرام سے غیرت کو سلادیتے ہیں

❊ حنظلہ شاہد۔۔۔۔۔سکھر

تجھے تنہا محبت کا یہ دریا پار کرنا ہے
ندامت ہوگی اس کے حوصلوں کو آزمانے سے

❊ شاہینہ مہتاب۔۔۔۔۔چنیوٹ

اسے کہو کہ بہت نامراد شے ہے جنوں
اسے کہو کہ مجھے ہے بہت جنوں اس کا

❊ زریان سلطان۔۔۔۔۔کراچی

ہماری یاد کی خوشبو ضرور آئے گی
تم اپنے دل کا دریچہ ذرا کھلا رکھنا

❊ عمیر رضا۔۔۔۔۔چکوال

میرے دل سے تری نگاہوں تک
درد نے راہ کیا نکالی ہے
کہہ رہی ہے چمک ستاروں کی
درد کی رات ڈھلنے والی ہے

❊ وسیم اختر۔۔۔۔۔ملتان

اے غمِ ہجرِ یار، یہ تو بتا
کیا تجھے کوئی کام کاج نہیں
وہ ہے ہرجائی، یہ بجا، لیکن
دل بھی تو مستقل مزاج نہیں

❊ کامران شاہد۔۔۔۔۔میرپورخاص

تنی ہے دائرہ در دائرہ وہ تاریکی
کسی طرف کو کوئی راستہ نہیں جاتا
زمیں سے کون کہے اب کہ ہم سے بات تو کر
رگوں کو توڑ نہ ڈالے کہیں یہ سناٹا

❊ صبا حمید۔۔۔۔۔ٹنڈوالہیار

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

❊ صبا سحر۔۔۔۔۔کراچی

اک دن بنوں گا میں بھی صحیفے کا اک ورق
اطلس میں تم بھی دیکھو گے جس کو لپیٹ کر

❊ ناصر خان۔۔۔۔۔کوئٹہ

غفلت کی نیند سوئے ہیں میرے وطن کے لوگ
یارب! انہیں جگا کسی آفت سے پیش تر

❊ امجد پرویز۔۔۔۔۔سرگودھا

دیکھے گی زمیں، روز نیا ایک تماشا
جب تک ہے فلک، لوگ جھمیلے میں رہیں گے
مرجائیں گے ہم تو، مگر گیت ہمارے
اے دوست رواں، وقت کے بیلے میں رہیں گے

❊ دلاور خان۔۔۔۔۔مانسہرہ

جن چراغوں کو جلایا تھا اُجالوں کے لیے
ان چراغوں کے اُجالوں نے بجھایا ہے مجھے

❊ سنبل۔۔۔۔۔گلگت

گزرے کل سا لگتا ہو جب آنے والا کل
ایسے حال میں رہنے سے تو بہتر ہے کہ چل
کرتی ہیں ہر شام یہ بنتی، آنکھیں ریت بھری
روشن ہو اے امن کے تارے، ظلم کے سورج ڈھل

❊ بینش صدیقی۔۔۔۔۔حیدرآباد

گلوں پہ ڈولتا پھرتا تھا اوس کی صورت
صدا کی لہر تھا اور نغمگی میں رہتا تھا
نہیں تھی حسنِ نظر کی بھی کچھ اسے پروا
وہ ایک ایسی عجب دلکشی میں رہتا تھا

❊ احسن جمال۔۔۔۔۔فیصل آباد

مقدر سعد کیا شے ہے کوئی بھی تو نہیں سمجھا
کسی کی ہتھکڑی ہے یہ کسی کے ہاتھ کا گہنا

❊ فیاض خان۔۔۔۔۔اوکاڑہ

بظاہر سادگی سے مسکرا کر دیکھنے والے
کوئی کم بخت ناواقف اگر دیوانہ ہوجائے

❊ جواد خان۔۔۔۔۔میانوالی

شرمندہ میری روح کی سچائیاں ہوئیں
وہ تبصرہ ضمیر نے کردار پر کیا

❊ ممتاز چودھری۔۔۔۔۔منڈی بہاالدین

آندھی چلی تو نقشِ کفِ پا نہیں ملا
دل جس سے مل گیا ہمیں وہ پھر نہیں ملا

❊ محمود احمد۔۔۔۔۔ٹنڈوالہیار

بچے کی طرح چیختا رہتا ہے مسلسل
کیا خوف میرے شہر کو سونے نہیں دیتا

❊ ذیشان تبسم۔۔۔۔۔پنڈی گھیب

تشنگی موج کے ہونٹوں پہ مچلتی دیکھی
ہم جو ساحل پہ کبھی پیاس بجھانے نکلے

❊ زبیر خان۔۔۔۔۔لیہ

جن کو دیا گیا تھا گلستاں پہ اختیار
پھولوں کو ڈس رہے ہیں وہ خاروں کے روپ میں

❊ شہزاد خان۔۔۔۔۔مری

نہیں ہے تم سے گلہ کچھ یہ ہے خطا میری
سکھا رہی ہے جفائیں تمہیں وفا میری

❁ عالیہ جہانگیر......لاہور
اب جس کے جی میں آئے، وہی پائے روشنی
ہم نے تو دل جلا کے سرِ عام رکھ دیا
❁ مہناز......لاڑکانہ
ہم سفر اور بھی سرگرمِ سفر تھے لیکن
مجھ کو صیاد نے رفتار سے پہچان لیا
❁ یاسر احمد......بی
مجھ سے بچھڑ کے تُو بھی تو روئے گا عمر بھر
یہ سوچ لے کہ میں بھی تیری خواہشوں میں ہوں
❁ میمونہ علی......فیصل آباد
خوشی کے آنکھوں میں آنسو سنبھال کر رکھنا
بُرے زمانے کبھی پوچھ کر نہیں آتے
❁ عبدالحکیم......خانیوال
حسابِ عمر کا بس اتنا گوشوارہ
تجھے نکال کے دیکھا تو سب خسارہ
❁ یوسف قریشی......گجرانوالہ
کتنے لہجوں کے غلافوں میں چھپاؤں تجھ کو
شہر والے میرا موضوعِ سخن جانتے ہیں
❁ شاہد نواز......خانیوال
ہو کے انساں تو محبت سے بچے گا کیونکر
اس خطا پر تو فرشتوں نے سزا پائی ہے
❁ شہناز مغل......کراچی
اتنا حصہ تو ہمارا ہو تیری سانسوں میں
دل کی صورت تیرے سینے میں دھڑکتے جائیں
❁ مسرت جعفری......خیر پور
خوشبو کے جزیروں سے ستاروں کی حدوں تک
اس شہر میں سب کچھ ہے مگر تیری کمی ہے
❁ عاصم سعید......مظفر گڑھ
اب کے امید کے شعلے سے بھی آنکھیں نہ جلیں
جانے کس موڑ پہ لے آئی محبت ہم کو
❁ محمد الطاف......آزاد کشمیر
دستانے اتارو تو لہو رنگ ہیں پنجے
یہ ظاہری انسان درندے کی طرح ہے

❁ امتیاز احمد......پھالیہ
ضمیر و ظرف کی اب ان کے آزمائش ہے
خلوص بانٹ چکا میں تو آشناؤں میں
❁ ڈاکٹر فرحت......ساہیوال
آپ محشر میں بنیں قول کے سچے کیا خوب
انگلیاں اٹھیں گی، وہ آئے مکرنے والے
❁ قیصر مسعود......بہاولپور
دل تک پہنچوں آنکھ سے ہو کر یا پھر سوچ کے رستے سے
ہر صورت میں اس کا سایہ میرے ساتھ گزرتا ہے
❁ خرم نقوی......سرگودھا
سمندر کے سفر رکھے ہوئے ہیں
مرے اندر بھنور رکھے ہوئے ہیں
❁ گلزار حمید......کراچی
ہم تو اس کی گلی کی خاک ہوئے
کس طرف کو گیا نہ جانے دل
❁ عظیم احمد ......جھنگ
خواب میں سر کو پھوڑتا تھا کوئی
خون میں تر مری جبیں کیوں ہے
❁ مرزا وقار......جہلم
رقص کرتے میں دیکھتا ہوں اسے
وہ جو شعلہ سا ہے خلاؤں میں
❁ راشدہ پروین......روہڑی
پھر ہوا سونگھتی ہے دروازے
پھر کوئی بات ہونے والی ہے
❁ عارفہ جمال......کراچی
تمہارے ہاتھ سے لکھے ہوئے دکھ
مرے سینے میں چاقو ڈھونڈتے ہیں
❁ نورین شارب......پنڈ دادن خان
چاند چمکا نہ مرے ساتھ سویرا نکلا
رات کی اوٹ سے بیمار اندھیرا نکلا
❁ اسد احمد......حیدر آباد
دھوپ سائے بچھائے بیٹھی تھی
میں ہی دیوار تک نہیں پہنچا

کوپن برائے شمارہ دسمبر 2022

محفلِ شعر و سخن

نام :------------------------------

پتا :------------------------------

سگ بیتی

فاطمہ جام

ہر معاشرے کا چلن دوسرے سے الگ ہوتا ہے... ایسے ہی ایک معاشرے میں بھی انسان کی اپنی الگ جگہ اور کتوں کا اپنا الگ مقام تھا۔ دنیا میں بعض جگہوں پر انسانوں کی قدر نہیں اور کچھ لوگ کتوں کے حقوق بھی ایمانداری سے ادا کرنے میں کسی غفلت کا شکار نہیں ہوتے... بس یہی تضاد اس کائنات کی بنیاد ہے۔

کسی قیمتی اثاثے کی طرح کتوں کی تلاش کا عجیب ماجرا

میں ایک پرائیویٹ سراغ رساں ہوں۔ میں نے بڑی محنت اور کوشش سے اپنا نام بنایا ہے۔ اس پیشے نے مجھے دولت، شہرت اور سب کچھ دیا ہے مگر کچھ عرصے سے میرے کام میں مندی کا رجحان ہے۔ ایک میں ہی کیا، اس وقت ہر شخص کووڈ نائنٹین سے متاثر دکھائی دیتا ہے۔ اس وبا سے پہلے میرے پاس نصف درجن کیس لائن اپ رہتے تھے لیکن اب ہفتہ ہفتہ بھر کلائنٹ کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی دل پر بھاری پتھر رکھ کر وہ کیس پکڑ لیا تھا۔

آنے والے نے اپنا تعارف ہنری کے نام سے کرایا

تھا۔ صرف ''ہنری'' نہ کچھ آگے اور نہ پیچھے۔ وہ ایک عمر رسیدہ شخص تھا۔ میں نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے اس کا استقبال کیا، اسے کافی پیش کی اور شائستہ لہجے میں استفسار کیا۔

''یس مسٹر ہنری! بتائیں، میں آپ کے لیے کیا کرسکتا ہوں؟''

اس نے کافی کے مگ کو بے دلی سے اپنے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں میں گھمایا۔ اس کی یہ اضطراری حرکت ظاہر کرتی تھی کہ وہ اس سے بھی زیادہ کسی گرم شے کی طلب محسوس کر رہا تھا اور میں اس سلسلے میں اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتا تھا کیونکہ آفس میں بوتل کھول کر بیٹھنا میرے اصول کے خلاف تھا۔

''میں نے سنا ہے کہ تم لوگوں کے کام آتے ہو؟'' چند لمحات کے تذبذب کے بعد اس نے کہا۔

''ہاں، میں لوگوں کی مدد کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' میں نے معتدل انداز میں جواب دیا۔ ''آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟''

''میں ڈینسی کی ایک پرابلم لے کر یہاں آیا ہوں۔'' وہ کافی کا بڑا سا گھونٹ لینے کے بعد بولا۔ ''اس کے پاس ایک کتا تھا۔ بہت ہی وفادار اور پیارا کتا۔ اس کا نام ''اسٹار'' ہے۔ اسٹار، ڈینسی کا بیسٹ فرینڈ تھا۔ وہ اسٹار کے بغیر خود کو ادھورا محسوس کر رہی ہے۔ اس نے اسٹار کو کبھی خود سے جدا نہیں کیا تھا مگر اب...... اسٹار غائب ہوچکا ہے۔''

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ اسٹار خود ہی کہیں فرار ہوگیا ہو؟'' میں نے ایک امکان کی جانب اشارہ کرتے ہوئے خیال آرائی کی۔ ''وہ مسز ڈینسی کے ساتھ مزید نہ رہنا چاہتا ہو۔''

''نہیں۔'' وہ نفی میں گردن جھٹکتے ہوئے بڑے اعتماد سے بولا۔ ''اسٹار اپنی مالکن کو چھوڑ کر جانے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ ضرور کوئی کم بخت اسے چرا کر لے گیا ہے۔ اسٹار کو بازیاب کر کے واپس لانا ہے۔''

میں نے ابتدا میں بادل ناخواستہ یہ کیس لینے کی جو بات کی، اس سے میری مراد یہی تھی کہ میں پالتو جانوروں کی گمشدگی کے کیس نہیں لیا کرتا تھا۔ موجودہ حالات میں تو اچھے خاصے سفید پوش بھیک مانگنے پر مجبور ہوگئے تھے۔ اس کے مقابلے میں کسی ''مسنگ پیٹ'' کا کیس پکڑ لینا کوئی شرمندگی کی بات بہرکیف نہیں تھی۔

''کیا تم نے ڈاگ وارڈن کے ہاں اسٹار کو چیک کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''ڈاگ وارڈن جیسا کہ تمہیں بھی معلوم ہوگا، ادھر اُدھر آوارہ گھومنے والے لاوارث اور بے سہارا کتوں کو اپنے پاس پناہ دیتا ہے۔''

''ڈاگ وارڈن یہاں سے کافی فاصلے پر ہے اور کار کے بغیر وہاں پہنچنا ممکن نہیں۔'' ہنری نے مایوسی سے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میرے پاس کار نہیں ہے۔ تمہارا آفس بس کے روٹ پر پڑتا ہے اس لیے میں تمہارے پاس آگیا ہوں، اس امید کے ساتھ کہ تم ضرور ہماری مدد کرو گے۔''

''اس وقت مسز ڈینسی کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں تمہیں ڈینسی کے پاس لے چلتا ہوں۔'' اس نے بتایا پھر اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر چند کرنسی نوٹ برآمد کیے اور انہیں میری جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میرے خیال میں یہ کافی رہیں گے۔''

ان نوٹوں کی حالت بتاتی تھی کہ انہیں کسی بہت ہی تنگ سی جگہ پر گھسا کر اور چھپا کر رکھا گیا تھا۔ وہ اماؤنٹ اگرچہ میری عمومی فیس سے خاصا کم تھا مگر کسی پالتو جانور کی گمشدگی کا معاملہ حل کرنا میرے لیے ایک نیا تجربہ ثابت ہوتا۔ اوپر سے کڑکی کا دور بھی چل رہا تھا سو میں نے وہ کیس اپنے ہاتھ میں لینے کا فیصلہ کرلیا۔

''آپ اس رقم کو ابھی اپنے پاس ہی رکھیں۔'' میں نے ہنری سے کہا۔ ''میرا اصول ہے کہ میں کام ختم کرنے کے بعد اپنی فیس وصول کرتا ہوں۔''

حالات چاہے کیسے بھی ہوں، انسان کو اپنے اصولوں کی حفاظت کرنا چاہیے۔ اس سے انا اور خودداری کی جو تسکین ہوتی ہے، اس کا کوئی نعم البدل نہیں ہے۔ میں نے ہنری سے غلط نہیں کہا تھا۔ میں واقعتاً اپنی سروس کا معاوضہ مشن کی تکمیل پر ہی وصول کیا کرتا تھا۔ دوسرے پرائیویٹ سراغ رساں میرے اس اصول کو پاگل پن اور بے وقوفی سمجھتے تھے مگر مجھے کسی کی پروا نہیں تھی۔

☆☆☆

ڈینسی کی قیام گاہ زیادہ دور نہیں تھی۔ میں اپنی کار میں ہنری کے ہمراہ وہاں پہنچ گیا۔ وہ چھوٹا سا مکان بھی ڈینسی کی طرح عمر رسیدہ اور بوسیدہ سا تھا۔ ہنری نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''یہ مارٹن ہے۔ ایک پرائیویٹ سراغ رساں!''

ڈینسی نے میرے عقب میں نگاہ دوڑائی اور قدرے خفگی آمیز لہجے میں کہا۔ ''ہنری! کیا تم پولیس کے پاس نہیں گئے تھے؟ مجھے ادھر کوئی کانسٹیبل دکھائی کیوں نہیں دے رہا؟''

''اسٹار کو تلاش کرنے کے لیے پولیس کی ضرورت

نہیں ہے۔'' ہنری نے کہا۔ ''یہ کام پرائیویٹ ڈیٹیکٹیو کا ہے۔ مسٹر مارٹن بہت ہی قابل انسان ہیں۔ آپ انہیں اسٹار کے بارے میں تفصیلاً بتائیں۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ یہ آپ کے اسٹار کو ڈھونڈ نکالیں گے۔''

ہنری نے آخری جملہ اپنی طرف سے ٹانک دیا تھا۔ میں نے اس سے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ وہ بڈھا خاصا شاطر اور موقع پرست بھی تھا۔ میں اپنے کلائنٹس سے اس قسم کے وعدے کرنے کے بجائے پوری تندہی سے کام میں جت جاتا تھا اور صحت مند نتائج لے کر آتا تھا۔

ہنری کی تسلی بھری وضاحت نے ڈینیسی کو مطمئن کر دیا تو وہ مجھ سے بات کرنے کے لیے آمادہ ہوگئی۔ میں نے اپنی پاکٹ میں سے ڈائری اور پین برآمد کیا اور ڈینیسی کی طرف دیکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔ ''مجھے اسٹار کے بارے میں بتائیں۔''

ڈینیسی کے بدن پر موجود کوٹ بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔ وہ ایک دبلی پتلی اور نحیف و نزار خاتون تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس نے کوٹ کو نہیں بلکہ کوٹ نے اسے پہن رکھا ہے۔

''اسٹار بہت ہی تمیز دار کتا ہے۔'' وہ اداسی بھری آواز میں بولی۔ ''وہ کسی اجنبی کو دیکھ کر بھونکنا شروع نہیں کر دیتا۔ اسے کاٹنے کی بھی عادت نہیں ہے۔ بھوک لگے تو دوسرے کتوں کی طرح وہ اودھم نہیں مچاتا۔ وہ نہایت صابر و شاکر کتا ہے۔ گھر میں کہیں گندگی نہیں کرتا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے ہیں......''

وہ اپنے پیٹ (پالتو جانور) کا ذکر کرتے ہوئے زمانہ حال کا صیغہ استعمال کر رہی تھی جیسے اسے یقین ہو کہ اس کا اسٹار جلد ہی اس کے پاس ہوگا۔

''اسٹار کی کوئی خاص نشانی؟'' میں نے ڈائری کے صفحے پر قلم چلاتے ہوئے استفسار کیا۔

''اس کا رنگ پیلا ہے۔'' ڈینیسی نے بتایا۔ ''اور اس کے دائیں کندھے پر ایک سیاہ دھبا ہے جو کسی ستارے کے مانند دکھائی دیتا ہے۔ اسی لیے میں نے اس کا نام ''اسٹار'' رکھ چھوڑا ہے۔''

''بہت خوب!'' میں نے ستائشی نظر سے مسز ڈینیسی کو دیکھا اور پوچھا۔ ''آپ کے پاس اسٹار کی کوئی تصویر تو یقیناً ہوگی؟''

''میرے سیل فون میں اسٹار کی کئی تصاویر ہیں۔'' وہ دونوں ہاتھوں کو ملتے ہوئے بولی۔ ''مگر سردست سیل فون خراب ہے۔ میں ایک آدھ روز میں اپنے سیل فون کو ٹھیک کروالوں گی۔ اس کے بعد ہی وہ تصاویر آپ کو دکھا سکوں گی۔''

''اچھی بات ہے۔'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''بس، اسٹار کی کوئی ایک واضح تصویر ہی کافی ہوگی جس میں اس کا چہرہ اور کندھے والا نشان صاف نظر آتا ہو۔''

''میں ایسی تصویر آپ کے نمبر پر سینڈ کر دوں گی۔''

''شکریہ!'' میں نے کہا اور دریافت کیا۔ ''آپ نے اسٹار کو آخری بار کب دیکھا تھا؟''

''ایک ہفتہ پہلے۔'' وہ افسردہ لہجے میں بولی۔ ''جب مجھے کسی ایسی دعوت میں جانا ہوتا ہے کہ جہاں کتوں کو ساتھ لانے پر پابندی ہو تو میں اسٹار کو اپنے گھر کے باہر ایک درخت کے نیچے بٹھا جاتی ہوں۔ وہ بہت ہی فرمانبردار کتا ہے۔ میری مجبوری کو سمجھتے ہوئے پورا تعاون کرتا ہے اور میں جب واپس آتی ہوں تو اسٹار کو اسی درخت کے نیچے اپنا منتظر پاتی ہوں۔ میں اس کی پسند کی ڈھیر ساری کھانے کی چیزیں بھی ساتھ لاتی ہوں جس سے وہ خوش ہو جاتا ہے اور میری وقتی جدائی کو فراموش کر دیتا ہے لیکن گزشتہ پیر کی رات جب میں ایک پارٹی سے لوٹی تو اسٹار کو درخت کے نیچے نہ پا کر مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے آس پاس اور گھر کے اندر ہر جگہ اسے جھانک لیا لیکن وہ مجھے کہیں نہ ملا۔ تب میری حیرت، پریشانی میں بدل گئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسٹار نے خود کو غائب کر دیا تھا۔'' لمحاتی توقف کرکے اس نے اپنے استخوانی ہاتھوں کو اس جادوگر کے انداز میں حرکت دی جو کسی مجمع کے سامنے جادو کے زور پر کبوتر یا خرگوش کو غائب کر دیتا ہو۔

''میں نے اسٹار کو بہت آوازیں دیں۔'' ڈینیسی اپنی بات کو مکمل کرتے ہوئے بولی۔ ''مگر وہ مجھے کہیں نہ ملا۔ میں اسے بہ آوازِ بلند پکارتی چلی گئی اور اب بھی میں مسلسل اسی کی تلاش میں ہوں۔''

بات کی تکمیل پر شدتِ جذبات سے اس کی آواز رندھ گئی تھی۔

☆☆☆

آئندہ روز میں ''اسٹار'' کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا اور میرا پہلا ٹارگٹ تھا ''پی سی اے ایس''...... بے گھر اور آوارہ کتوں کی حفاظت اور نگہداشت کا مرکز ''پیرائن سٹی اینمل شیلٹر'' یعنی پی سی اے ایس۔ ڈینیسی نے اسٹار کی ایک تصویر مجھے بھیج دی تھی۔ مذکورہ تصویر کی پکچر کوالٹی اگرچہ بہت اچھی نہیں تھی تاہم اس کی صورت اور کندھے کا سیاہ اسٹار نما نشان صاف پہچان میں آ رہا تھا۔

اس ڈاگ ہاؤس (پی سی اے ایس) کی نگران اسٹیسی مجھے وہاں موجود تمام کتے دکھانے لے گئی۔ وہ جگہ...... خدا کی پناہ! بہت ہی بدبودار اور ناقابلِ برداشت تھی۔ میں نے جیسے تیسے ان کتوں کا جائزہ لیا۔ اسٹار ان کے درمیان کہیں نہیں تھا۔

''ہم بے گھر، بے سہارا اور گمشدہ کتوں کو اپنے پاس پناہ دیتے ہیں۔'' اسٹیسی نے مجھے بتایا۔ ''ہم یہاں ہر طرح سے ان کا خیال رکھتے ہیں۔ کھلانا پلانا، نہلانا دھلانا اور دیگر تمام کام ہماری ذمے داری میں شامل ہیں اور اس کے لیے گورنمنٹ ہمیں فنڈز دیتی ہے پھر جب کوئی شخص اپنے مسنگ پیٹ کو ڈھونڈتے ہوئے ہمارے پاس آتا ہے تو ہم اس کا کتا تصدیق کے بعد اس کے سپرد کر دیتے ہیں۔ ایک ڈالر بھی وصول کیے بغیر لیکن افسوس کہ آپ کا مطلوبہ کتا یہاں موجود نہیں ہے۔''

''مجھے جس کتے کی تلاش ہے، اس کا نام اسٹار ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کتے کا رنگ پیلا ہے اور اس کے دائیں کندھے پر ایک سیاہ دھبا بھی ہے جو کسی اسٹار کے مانند نظر آتا ہے۔ اس کی مالکن ڈینسی پیٹرسن نے اسی وجہ سے اس کا نام ''اسٹار'' رکھا ہے۔ میرے پاس اسٹار کی ایک تصویر بھی ہے۔''

''بہت خوب۔'' اسٹیسی نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''اتنی تفصیل کافی ہے۔ آپ میرے ساتھ آفس میں آئیں۔ میں چیک کرتی ہوں۔ ہوسکتا ہے ہمارے ریکارڈ میں کہیں اسٹار موجود ہو۔''

میں نے اسٹیسی کا شکریہ ادا کیا اور اس کے پیچھے چل پڑا۔ آفس میں آکر اسٹیسی نے کمپیوٹر پر کتوں کا تمام ریکارڈ چیک کیا اور مجھ سے کہا۔

''لگ بھگ چھ ماہ پہلے اسٹار چند گھنٹوں کے لیے ہمارے سینٹر پر آیا تھا۔ یہ اس کا ایک حادثاتی ''وزٹ'' تھا۔ وہ راستہ بھول کر ادھر آنکلا تھا مگر ہم اس کی زیادہ دیکھ ریکھ نہیں کر سکے تھے کیونکہ مسز ڈینسی جلد ہی اسٹار کو ڈھونڈتے ہوئے یہاں پہنچ گئی تھیں اور ہم نے اسٹار کو ان کے حوالے کر دیا تھا۔'' وہ لمحے بھر کو رکی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''یہ آخری مرتبہ تھا جب ہم نے اسٹار کو دیکھا۔ وہ دوسرے کتوں سے بہت مختلف ہے۔ وہ جتنی دیر بھی ڈاگ ہاؤس میں رہا، اس نے کچھ کھایا اور نہ ہی پیا۔ وہ چپ چاپ ایک طرف بیٹھا رہا جیسے وہ ہم سے بلکہ پوری دنیا سے خفا ہو لیکن جیسے ہی اس نے ڈینسی کی صورت دیکھی، گویا اس کے اندر کوئی کرنٹ سا بھر گیا تھا۔ وہ یکا یک جوشیلا اور زندگی سے بھرپور نظر آنے لگا تھا پھر جب ہم نے اسے ڈاگ کیج سے نکال کر مسز ڈینسی کو سونپا تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اسے اس کی کھوئی ہوئی جنت مل گئی ہو۔ مسز ڈینسی کا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ ہم نے اسٹار کو رخصت کرنے سے پہلے خون چوسنے والے جانوروں کے مخصوص کیڑوں سے بچاؤ کا انجکشن اور ریبیز کی ویکسین بھی لگا دی تھی۔''

''اسے سنبھال کر رکھ لیں۔'' میں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ اسٹیسی کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میرے جانے کے بعد جب بھی آپ کو کہیں اسٹار نظر آئے تو آپ فوراً مجھے اطلاع کریں گی۔''

اس نے میرا کارڈ لے لیا اور اپنے کمپیوٹر کے ریکارڈ سے اسٹار کی ایک کرسٹل کلیئر پکچر کا پرنٹ آؤٹ نکال کر مجھے تھما دیا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور آفس سے نکل کر اپنی کار کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے ''پی سی اے ایس'' میں موجود کتوں کی جو حالتِ زار دیکھی تھی، اس سے میں دل گرفتہ ہوگیا تھا۔ ایک انسان اگر کسی تکلیف میں مبتلا ہو تو وہ دوسرے انسان کو اپنی مشکل کے بارے میں بتا کر دل کا بوجھ ہلکا کرسکتا ہے مگر ایک بے چارہ کتا......

☆☆☆

میری اگلی منزل ڈاگ وارڈن کا ٹھکانا تھی۔ یہ شخص بنیادی طور پر ایک مارشل آرٹس کا استاد تھا اور اپنا ایک ٹریننگ سینٹر چلاتا تھا سائیڈ بزنس کے لیے یہ آوارہ کتوں کو پکڑ کر اپنے پاس قید کر لیتا تھا اور جب کسی کتے کا مالک اپنے کتے کو ڈھونڈتے ہوئے وارڈن کے پاس پہنچتا تھا تو وہ کچھ رقم لے کر مذکورہ کتا اس کے حوالے کر دیتا تھا۔ وارڈن کی شخصیت ہمیشہ سے متنازع رہی تھی۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ بے سہارا کتوں کو اپنی پناہ اور تحفظ میں لے کر ایک نیک کام کر رہا ہے جبکہ کچھ لوگ سمجھتے تھے کہ وہ ایک ناٹک باز کتا چور ہے وہ دوسروں کے کتوں کو بہلا پھسلا کر اپنے سینٹر پر لے جاتا ہے اور بعد میں ان کے مالکان سے رقوم بٹورتا ہے۔ انسانوں پر جانوروں کے حقوق کا ادارہ ''اے آر او ایچ'' بھی وارڈن سے خفا ہی رہتا تھا۔

جب میں وارڈن کے پاس پہنچا تو وہ اپنے آفس میں موجود تھا۔ اس کے مختلف ایوارڈز اور ٹرافیز ایک بڑے سائز کی شیشے کی الماری میں ترتیب سے سجے ہوئے تھے۔ وہ پُروقار شخصیت کا مالک ایک جسیم اور چاق و چوبند انسان تھا۔ رسمی علیک

سلیک کے بعد میں نے اسے اس کے اصلی نام سے پکارا۔
''مارکس! میں ایک گمشدہ کتے کے بارے میں تم سے بات کرنے آیا ہوں۔''
''کتے'' کے ذکر پر وہ چونکا پھر ایک گہری سانس خارج کرنے کے بعد کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگالی اور گہری نظر سے مجھے تکنے لگا۔
''اس کتے کا نام اسٹار ہے۔'' میں نے اسٹیسی کی فراہم کردہ تصویر اس کے سامنے رکھ دی اور کہا۔ ''اسے غور سے دیکھو اور اگر یہ کتا تمہارے اسٹاک میں ہے تو مجھ پر اور اس کی مالکن پر مہربانی کرو۔ اسٹار کی مالکن کا نام ڈینسی پیٹرسن ہے۔''
وہ آگے کو جھکا۔ ایک سرسری سی نگاہ اسٹار کی تصویر پر ڈالی اور کندھے اچکاتے ہوئے بے پروائی سے بولا۔
''میں نے اس کتے کو کہیں نہیں دیکھا۔''
''تم اپنے اسٹاک کو چیک کیے بغیر اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو؟'' میں نے زور دے کر کہا۔ ''پلیز مارکس! تھوڑی زحمت کرلو۔ میں بہت دور سے آیا ہوں۔''
''مارٹن! کیا تم جانتے ہو کہ میں ایک ڈاگ کو واپس لوٹاتے ہوئے کتنے پیسے لیتا ہوں؟'' اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔
میں سمجھ گیا کہ وہ کس میٹر بینڈ پر مجھ سے مخاطب تھا۔ میں نے اس کے کھیل کا حصہ بنتے ہوئے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔
''میں نہیں جانتا۔''
''پورے دو سو ڈالرز۔'' وہ اپنے ہاتھ کی دو انگلیوں سے وکٹری کا نشان بناتے ہوئے بولا۔
میں نے کہا۔ ''مارکس! یہ کچھ زیادہ نہیں ہیں؟''
''بالکل نہیں...... کیونکہ مجھے ان لاوارث کتوں کے ساتھ بہت جان ماری کرنا پڑتی ہے۔'' وہ تقریر کرنے والے انداز میں بولا۔ ''ان کے پیچھے گلیوں گلیوں بھاگنا پڑتا ہے۔ انہیں گھیرنے میں پسینے چھوٹ جاتے ہیں اور جب انہیں قابو کرنے لگو تو یہ کاٹنے میں کسی تکلف سے کام نہیں لیتے۔ یہ کام ہر کسی کے بس کا نہیں ہے مارٹن!...... اور اس پر لوگوں کی تلخ اور ترش سننا پڑتی ہیں۔ ''اے آر او ایچ'' والے بھی میرے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ کوئی ایک مصیبت تھوڑی ہے۔''
''ہاں۔ میں نے بھی ایسی کہانیاں سنی ہیں۔'' میں نے ہمدردی بھرے انداز میں کہا۔ ''یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ

نگینہ سازی کا کمال

دلی کے مشہور محلہ کوچۂ چیلاں میں اگلے وقتوں میں ایک کرخندار رہتے تھے اور کسی طرح تنگی ترشی سے اپنی زندگی کے دن پورے کر رہے تھے۔ انہیں اپنی بیٹی کے بیاہ کے لیے روپیہ درکار تھا۔ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی جو اسی کوچۂ چیلاں سے کامریڈ پریس لگا کر انگریزی میں ''کامریڈ'' اور اردو میں ''ہمدرد'' اخبار شائع کرتے تھے اور رہائش بھی ان دونوں علی برادران کی یہیں تھی۔ ان کے پاس یہ کرخندار گئے اور جب دیکھا کہ یہ دونوں اتنی رقم نہیں دے سکتے جتنی ان کی بیٹی کی شادی کے لیے درکار تھی تو آخر ہار کر انہوں نے کوزے کی مصری کی ڈلی لی اور اسے اس طرح تراشا کہ بادشاہوں اور جوہریوں کی آنکھ دھوکا کھا جائے۔ اصل عالی ظرف یہی کرخندار تھے جن کے باپ دادا نے 1857ء کے بعد زردوزی سے لے کر قلعی گری تک کے کام اس لیے شروع کردیے کہ کہیں انہیں اونچے خاندان کا سمجھ کر پھانسی کے تختے پر نہ چڑھا دیا جائے۔ ان شرفاء نے اپنی اولاد تک کو نہ بتایا کہ اصل میں وہ کیا تھے اور کیوں ان حالوں کو پہنچے۔ اپنی اور اپنے بال بچوں کی جان بچانے کے لیے بھڑ بھونجے بن گئے اور کوئی ہنر اپنے بچوں کے ہاتھ میں ایسا ڈال گئے کہ مصیبت میں ان کے کام آئے۔ چنانچہ ان کرخندار نے اسی ہنر کی بدولت وہ ترشا ہوا مصری کا ٹکڑا ایک جوہری کے پاس ہیرے کے مول میں گروی رکھا اور بیٹی کی شادی دھوم دھام سے کردی۔ سال بعد جب انہوں نے نگینہ سازی اسی جوہری کی دکان میں کرکے قرض کے روپے اتار دیے، تب اپنا وہ ہیرا اس سے واپس مانگا اور اس کے ساتھ ہی ایک کٹوری میں پانی بھی منگوالیا اور جب سب کے سامنے اس ماہر فن کرخندار نے وہ ہیرا پانی کی کٹوری میں ڈالا اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے بتاشے کی طرح گھل گیا تب جوہری کی آنکھیں کھلیں کہ کیا تراشا تھا ظالم نے، مصری کی ڈلی کے ایک ایک ریزے کو۔ تو جناب بے ایمانیاں بھی تھیں اگلے وقتوں میں تو ہنرمندی کے ساتھ۔ اپنے ہنر کا سب کھاتے تھے۔
(مرسلہ: نبیلہ خان، ساہیوال)

اے آر او ایچ (اینیمل رائٹس اوور ہیومنز) والوں کو تم سے کیا دشمنی ہے۔ وہ تمہارے خلاف زہر افشانی کیوں کرتے رہتے ہیں؟''

''یہ ان کے نکمے پن اور ہڈ حرامی کی دلیل ہے۔'' وہ نفرت بھرے لہجے میں بولا۔ ''یہ ادارہ حکومت نے جانوروں کے تحفظ کے لیے قائم کیا تھا مگر انہیں صرف تنخواہ لینے سے مطلب ہے۔ وہ ایک پیسے کا کام نہیں کرتے۔ لوگ اپنے مسنگ پیٹس کی رپورٹس ان کے پاس درج کراتے ہیں اور اس کے بعد پھیرے پر پھیرے لگاتے رہتے ہیں۔ اگر کسی گمشدہ جانور کا کوئی مالک ان کی ناقص کارکردگی پر برس پڑے تو اس سے کہتے ہیں کہ جا کر وارڈن کے شیڈ میں چیک کرو۔ اس شہر کا سب سے بڑا ''پالتو جانور چور'' وارڈن مارکس ہی ہے۔ وہ لوگوں کے پیٹس کو اغوا کر کے اپنے پاس قید کر لیتا ہے اور پھر بھاری معاوضہ لے کر اس کے مالک کو واپس کر دیتا ہے۔''

''میں تمہارے دکھ کو سمجھ سکتا ہوں مارکس!'' میں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ ''اگر تمہارے اسٹاک میں اسٹار موجود ہے تو مجھے دے دو۔ میں تمہیں تھوڑے پیسے دے دوں گا۔ میں درحقیقت ایک پریشان حال بڑھیا کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ اسٹار کے سوا اس کا اس دنیا میں اور کوئی بھی نہیں ہے۔''

''دیکھو مارٹن!'' وہ آگے کو جھکتے ہوئے جذباتی لہجے میں بولا۔ ''اگر تمہارا مطلوبہ کتا میرے پاس ہوتا تو اسے بلا معاوضہ تمہارے سپرد کر دیتا۔ میں تمہاری خاطر اتنا تو کر ہی سکتا ہوں۔''

مجھے اس کے الفاظ سے سچائی جھلکتی دکھائی دی۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں استفسار کیا۔ ''تو مجھے بتاؤ، میں اسٹار کی تلاش میں کدھر کا رخ کروں؟''

''اسٹیسی......!'' اس نے سپاٹ آواز میں کہا۔

''میں اس سے ملاقات کر چکا ہوں۔'' میں نے بتایا پھر اسٹار کی تصویر پر دستک دیتے ہوئے کہا۔ ''یہ تصویر اسٹیسی نے ہی مجھے اپنے ریکارڈ سے نکال کر دی ہے۔ اس کے شیڈ میں جو کتے ہیں، میں انہیں بغور چیک کر چکا ہوں۔ اسٹار وہاں موجود نہیں ہے۔''

''اوہ......!'' اس نے ایک گہری سانس خارج کی پھر کہا۔ ''کیا تم لزارس سے مل چکے ہو؟''

''نہیں!'' میں نے نفی میں گردن ہلا دی۔

''وہ ''ہوپ فل ہارٹس'' کے نام سے کام کر رہا ہے۔'' وارڈن نے بتایا۔ ''یہ لوگ کتوں کو اور دوسرے جانوروں کو ریسکیو کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے اس نے ڈینسی کے اسٹار کو کہیں دیکھا ہو۔''

''ٹھیک ہے۔ میں لزارس سے بات کر کے دیکھتا ہوں۔'' میں نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا پھر مارکس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد اس کے آفس سے نکل آیا۔

''ہوپ فل ہارٹس'' میرے راستے میں پڑتا تھا۔ واپسی کے سفر میں، میں نے ہوپ فل ہارٹس پر کارروکی اور جا کر لزارس سے ملا۔ اس نے میری بات پر زیادہ توجہ نہیں دی اور بیچ ہی میں بول پڑا۔

''تمہاری یہ ڈینسی پیٹرسن کوئی پاگل بڑھیا لگتی ہے۔''

میں نے خفگی بھرے انداز میں پوچھا۔ ''وہ کیسے؟''

''ایک کتے کی گمشدگی پر بھلا کوئی کسی پرائیویٹ ڈیٹیکٹو کو ہائر کرتا ہے؟'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اور تم بھی اپنی فیس کھری کرنے چل نکلے؟ خدا کے بندے، پالتو جانوروں کو تلاش کرنا تو ''اے آر او ایچ'' کا کام ہے۔ ڈینسی کو سمجھاؤ کہ وہ ''اے آر او ایچ'' کے آفس میں اپنے لاپتا کتے کی رپورٹ درج کرا دے۔''

لزارس کے اس خشک بلکہ غیر اخلاقی رویّے کے بعد مزید بات چیت کی گنجائش نہیں نکلتی تھی لہٰذا میں اس کا شکریہ ادا کیے بغیر ہی واپس آ گیا۔

اب دن ڈھل رہا تھا۔ آج دن بھر کی دوڑ دھوپ نے مجھے تھکا دیا تھا۔ ان لمحات میں، میں خاصا اداس بھی تھا کیونکہ سخت محنت اور کوشش کے باوجود اسٹار کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ میں نے دل کے بوجھل پن کو دور کرنے کے لیے اپنی کار میں تیز موسیقی آن کر دی۔

☆☆☆

وارڈن مارکس کی زبانی یہ بات میرے علم میں آ چکی تھی کہ ''اے آر او ایچ'' نامی حکومت کا قائم کردہ ادارہ اپنی نااہلی کو چھپانے کے لیے کالج کے اسٹوڈنٹس کا استعمال کر رہا تھا۔ یہ ادارہ بننے کے بعد سے گھریلو پالتو جانوروں کی چوری اور گمشدگی کے واقعات میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا تھا کیونکہ یہ لوگ کالج اسٹوڈنٹس کی مدد سے خود ہی پالتو جانوروں کو اغوا کرا رہے تھے تا کہ ان کی موجودگی کا جواز زندہ رہے۔

عین ممکن ہے کہ مارکس اس ادارے کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے چکر میں کچھ زیادہ ہی بول گیا ہو کیونکہ وہ لوگ بھی اس کی جان اور کاروبار کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑے ہوئے تھے اور اگر مارکس کا کہا سو فیصد درست تھا

تو پھر یہ بڑی تشویش ناک بات تھی۔

میں ضعیف العمر ڈینسی کے بارے میں سوچنے لگا جس کا عزیز از جان کتا پچھلے ایک ہفتے سے لاپتا تھا۔ میں نے ڈینسی کے چہرے پر اسٹار کی جدائی کا صدمہ دیکھا تھا۔

کتا ایک ایسا جانور ہے جو اپنے مالک سے غیر مشروط محبت کرتا ہے۔ اگر انسان کی کار یا جیولری چوری ہو جائے تو اس کی جگہ دوسری کار اور دوسری جیولری لی جا سکتی ہے مگر ایک وفادار کتے کا کوئی نعم البدل نہیں ہوتا کیونکہ وہ انسان کا سچا ہم سفر ہوتا ہے۔

کئی بار میں نے یہ بھی سوچا کہ اس مہم سے باز آجاؤں۔ میں نے کون سی ڈینسی سے کوئی فیس لے رکھی ہے جو اس کام کو مکمل کرنے کے لیے پابند رہوں لیکن یہ خیال لمحے بھر کے لیے ہی میرے ذہن سے گزرتا تھا کیونکہ اس میں میری مرضی شامل نہیں ہوتی تھی۔ میں تو اپنے اصولوں پر کار بند رہنے والا انسان ہوں۔ ہنری نے تو مجھے فیس دینے کی کوشش کی تھی مگر میں نے خود ہی اسے منع کر دیا تھا۔

میں نے گھر پہنچ کر خود کو فریش کیا اور ڈنر کے بعد اپنے کمپیوٹر کے سامنے جم کر بیٹھ گیا۔ میں سرکاری ادارے ''اے آر او ایچ'' کے علاوہ نیم سرکاری اور پرائیویٹ اداروں کو بھی سرچ کرنے لگا۔ ان سب اداروں کا تعلق گھریلو پالتو جانوروں کی پرورش، نگہداشت اور حفاظت سے تھا۔ ان میں ''ہوپ فل ہارٹس'' مجھے سب سے زیادہ سرگرم دکھائی دیا۔ یہ ادارہ بنیادی طور پر مصیبت زدہ جانوروں کی مدد کرتا تھا۔ ان لوگوں نے ایسے جانوروں کے لیے شہر سے باہر ایک فارم ہاؤس بنا رکھا تھا جہاں پر لاوارث کتوں اور دیگر پیٹس کو رکھا جاتا تھا۔ لزارس اسی ادارے کے لیے کام کرتا تھا مگر اس نے مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کی تھی۔ اس کا رویّہ مجھے عجیب سا بلکہ خاصا مشکوک لگا تھا۔ لزارس کے پاس مجھے وارڈن مارکس نے بھیجا تھا۔ میں نے سوچا، اسی سے لزارس کی شکایت کروں گا۔

یہ موقع مجھے آئندہ روز مل گیا۔ میں اپنے آفس میں بیٹھا ہوا تھا کہ ہنری آن ٹپکا۔ اس کے چہرے سے سنجیدگی اور بردباری ٹپکتی تھی۔ وہ میرے چہرے پر نگاہ جما کر مستفسر ہوا۔

''اسٹار کا کچھ پتا چلا؟''

سچی بات تو یہ ہے کہ میں ابھی تک ڈینسی کے کتے کے بارے میں کچھ بھی نہیں جان پایا تھا لیکن میں نے ہنری کو مایوس کرنا مناسب نہ سمجھا اور خاصے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

''میں اسٹار کے بہت نزدیک پہنچ چکا ہوں۔ ایک دو روز میں، میں اسے بازیاب کر کے مسز ڈینسی کے حوالے کر دوں گا۔''

میرا یہ جواب بلاشبہ منافقت اور غلط بیانی سے بھرپور تھا لیکن بعض نازک مواقع پر ہم پرائیویٹ سراغ رسانوں کو اپنے کلائنٹس کی تسلی اور اطمینان کی خاطر اس قسم کی چھوٹی موٹی دروغ گوئی کرنا پڑتی ہے اور ظاہر ہے اس میں ہماری بدنیتی شامل نہیں ہوتی۔

ہنری نے میرے جواب پر کسی طرح کا ردعمل ظاہر نہیں کیا اور اپنی جیب سے دو تصاویر نکال کر میرے سامنے میز پر رکھ دیں۔ ان میں سے ایک کتے اور ایک کتیا کی تصویر تھی۔ دونوں پالتو جانور نہایت ہی اسمارٹ اور خوبصورت اور قیمتی تھے۔ بالکل اسٹار کی طرح۔ میں نے نگاہ اٹھا کر ہنری کی طرف دیکھا۔ میرے دیکھنے کے انداز میں سوال واضح طور پر پڑھا جا سکتا تھا۔

''دونوں تصاویر مسز ڈینسی نے آپ کے لیے دی ہیں۔'' ہنری نے سپاٹ آواز میں کہا۔

میں پوچھے بنا نہ رہ سکا۔ ''کیا یہ دونوں پیٹس بھی مسنگ ہیں؟''

''ہاں..... مگر انہیں تلاش کرنا تمہاری ذمّے داری نہیں ہے۔''

''تو پھر یہ تصاویر مجھے دینے کا مقصد کیا ہے؟''

''ان میں سے یہ پیٹی ہے۔'' وہ فیمیل ڈاگ پر انگلی رکھتے ہوئے بولا۔ ''اس کا تعلق مسز للی سے ہے اور یہ دوسرا بارنی ہے۔ بارنی، فریڈی نامی ایک شخص کی ملکیت ہے۔ للی اور فریڈی خاصے امیر لوگ ہیں۔ اگر اسٹار کی تلاش میں تم پیٹی اور بارنی تک بھی پہنچ جاتے ہو تو تمہیں بہت زیادہ مالی فائدہ ہو سکتا ہے۔ مسز ڈینسی تمہیں پسند کرنے لگی ہیں اور وہ تمہارا بھلا چاہتی ہیں اسی لیے انہوں نے یہ تصاویر تمہارے لیے بھجوائی ہیں۔''

''تم واپس جا کر مسز ڈینسی کو میرا تھینکس بولنا۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''ایسے نیک دل لوگ اب خال خال ہی نظر آتے ہیں۔''

ہنری نے اثبات میں گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔

میں نے پوچھا۔ ''پیٹی اور بارنی کب سے لاپتا ہیں؟''

''پیٹی پچھلے دس دن سے مسز للی کے ساتھ دیکھی نہیں گئی۔'' اس نے بتایا۔ ''اور بارنی بھی کم و بیش اتنے ہی عرصے سے غائب ہے۔ دونوں کے مالکان نے ''اے آر او ایچ'' میں ان کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا رکھی ہے مگر

ابھی تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔''

میں ہنری سے اس سرکاری ادارے کی ناقص کارکردگی پر بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس سے خوامخواہ مایوسی پھیلتی۔ ویسے میں نے سوچ لیا تھا کہ اسٹار کی بازیابی کے بعد میں مذکورہ ادارے کے خلاف ایک بھرپور مہم چلاؤں گا اور ان تمام افراد کو اپنی اس مہم کا حصہ بناؤں گا جن کے پیٹس کو ابھی تک یہ ادارہ ڈھونڈ نہیں پایا ہے۔ مجھے امید ہے کہ جب ٹھوس ثبوت کے ساتھ بات کی جائے گی تو اس نالائق ادارے کے خلاف گورنمنٹ ضرور ایکشن لے گی۔ یا تو یہ لوگ سدھر جائیں گے اور یا پھر اپنے گھروں کو جائیں گے۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے ہنری سے کہا۔ ''میں دیکھتا ہوں اس سلسلے میں کیا ہوسکتا ہے۔''

وہ مجھ سے مصافحہ کرنے کے بعد رخصت ہوگیا۔

☆☆☆

اسٹیسی ہیملٹن کا ڈاگ یارڈ میں وزٹ کرچکا تھا۔ مجھے وہاں اسٹار دکھائی نہیں دیا تھا۔ اس ڈاگ ہاؤس میں موجود کتوں کی صورتیں میرے ذہن میں نقش ہوگئی تھیں۔ ابھی ہنری نے مجھے جو پیٹی اور بارنی کی تصاویر دی تھیں، یہ دونوں بھی اسٹیسی کے ڈاگ یارڈ میں نہیں تھے۔ میں نے اپنی یادداشت پر بھروسا کرنے کے بجائے ایک بار پھر اسٹیسی سے ملنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے کمپیوٹر سسٹم میں تمام کتوں کا ریکارڈ موجود تھا۔ میں پیٹی اور بارنی کو وہاں چیک کرسکتا تھا۔ ہنری نے مجھے بتایا تھا کہ للی اور فریڈی بہت پیسے والے لوگ ہیں اور ان دنوں مجھے پیسوں کی اشد ضرورت تھی۔ اگر میں اسٹار کے ساتھ ہی پیٹی اور بارنی کو بھی ڈھونڈ نکالتا تو یہ میرے موجودہ حالات کے لیے ایک ''کک''...... ایک بگ شاٹ ہوتا۔

اسٹیسی نے ایک بار پھر خوش دلی سے میرا استقبال کیا۔ میں نے جب اسے اپنی آمد کا مقصد بتایا تو وہ تعاون کے لیے آمادہ ہوگئی لیکن بدقسمتی سے اس کے ڈاگ یارڈ کے ریکارڈ میں پیٹی اور بارنی کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔

میں قدرے مایوس تو ہوا مگر میں نے ہمت نہیں ہاری اور اسٹیسی کو ''بائے'' کرنے کے بعد وارڈن مارکس کے پاس پہنچ گیا۔

''کیا تمہاری لزارس سے ملاقات ہوگئی؟'' اس نے مجھے دیکھتے ہی سوال داغ دیا۔

''ہاں، ہوگئی تو ہے۔'' میں نے بددلی سے جواب دیا۔ ''مگر بے سود......!''

''اوہ......!'' وہ متاسفانہ انداز میں بولا۔ ''کیا کہا اس نے؟''

''یہ بندہ مجھے بالکل پسند نہیں آیا مارکس!'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ایک دم بکواس اور بے ہودہ۔''

''کچھ بتاؤ گے بھی یا یونہی جھنجلاتے رہو گے؟''

جواب میں، میں نے مارکس کو لزارس سے ہونے والی مختصر مگر طبیعت مکدر کردینے والی ملاقات کی تفصیل سنادی۔

''وہ سالا بدمعاش ایسا ہی ہے۔'' میری بات سننے کے بعد مارکس نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''بھاڑے کا ٹٹو۔ وہ کاغذات میں تو 'ہوپ فل ہارٹس' کے لیے کام کرتا ہے مگر اس کے ''اے آر او اینج'' کے ساتھ بھی گہرے روابط ہیں۔ خیر، تم لزارس پر لعنت بھیجو اور مجھے بتاؤ کہ دوبارہ کیسے آنا ہوا؟ تم صرف لزارس کی شکایت کرنے تو اتنی دور نہیں آسکتے...... ہیں نا؟''

''تمہارا اندازہ درست ہے مارکس!'' میں نے ایک بوجھل سا سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''پچھلے دس بارہ روز میں اسٹار کے علاوہ دو اور بھی ڈاگ غائب ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام پیٹی اور دوسرے کا بارنی ہے۔ میرے پاس ان دونوں کی تصاویر بھی ہیں۔''

''مارٹن! پلیز...... میں تمہیں بتاچکا ہوں کہ میں یہ کام پھوکٹ میں نہیں کرتا۔'' وہ میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔ ''تم ایک اسٹار کو تو تلاش کر نہیں سکے اور اب دو نئے کتوں کی گمشدگی کا معلہ لے کر میرے پاس آگئے ہو۔''

''اسٹار کو میں اس لیے نہیں ڈھونڈ پایا کہ تم نے مجھ سے بالکل تعاون نہیں کیا مارکس!'' میں نے بھی دل کا غبار دھوتے ہوئے قدرے تلخ لہجے میں کہا۔ ''باقی جہاں تک تمہارے بزنس کا تعلق ہے تو سمجھ لو کہ پیٹی اور بارنی کے مالکان مسز ڈیسی پیٹرسن کی طرح غریب غربا نہیں ہیں۔ وہ اپنے کتوں کی وصولی کے لیے دو سو کیا، تمہیں پانچ سو یا ایک ہزار ڈالرز بھی دے سکتے ہیں۔ اس کو پھوکٹ کا کام سمجھ کر ہلکے میں نہ لو۔''

''ایسا کیا......!'' مارکس کی آنکھوں میں ایک توانا چمک پیدا ہوئی۔ اس نے پیٹی اور بارنی کی تصاویر کو میز پر سے اٹھالیا اور میری طرف دیکھے بغیر بولا۔ ''مارٹن! مجھے ان کتوں کے بارے میں تفصیلاً بتاؤ۔''

مارکس کو زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کا جنون بلکہ ہوس تھی اور میں نے اس کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی تھی۔ ہنری نے مجھے صرف یہ بتایا تھا کہ مسز للی اور مسٹر فریڈی بہت پیسے والے ہیں۔ میں ان کی ٹھیک ٹھیک مالی حیثیت سے واقف نہیں تھا۔ بہرکیف، میں نے مارکس کو اپنے شیشے میں اتارنے کے لیے للی اور فریڈی کی امارت اور سخاوت کے بلند وبالا قصے سنا ڈالے۔

میری یہ چال انتہائی کامیاب رہی اور مارکس اپنا کمپیوٹر آن کر کے ریکارڈ کی ''چیکنگ'' میں مصروف ہوگیا۔

میں دل ہی دل میں دعا کرنے لگا کہ کام بن جائے لیکن یہ ضروری نہیں کہ انسان کی ہر دعا قبول بھی ہو جائے۔ چند منٹ کی محنت کے بعد مارکس نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے خاصا حوصلہ شکن جواب دیا۔

''آئی ایم سوری مارٹن! یہ دونوں کتے میرے ریکارڈ میں کہیں بھی موجود نہیں ہیں۔''

''تمہارا سسٹم تو اس وقت آن ہی ہے۔'' میں نے منت ریز لہجے میں کہا۔ ''لگے ہاتھوں اس غریب ڈینسی کا کتا ''اسٹار'' بھی چیک کرلو۔''

''لگتا ہے، تم نے میری بات کا یقین نہیں کیا۔'' وہ شاکی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ادھر میرے پاس آجاؤ۔ میں تمہارے سامنے چیک کر لیتا ہوں۔''

''بات بے اعتباری کی نہیں ہے مارکس!'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''انسان کی یادداشت دھوکا دے سکتی ہے۔ اگر تم اسٹار کی تصویر سامنے رکھ کر ایک بار اپنا ریکارڈ چیک کرلو گے تو اس میں تمہارا کیا چلا جائے گا؟''

''ٹھیک ہے۔'' وہ تعاون آمیز لہجے میں بولا۔ ''تمہاری تسلی کی خاطر میں یہ بھی کر لیتا ہوں۔''

آئندہ پانچ منٹ میں وارڈن مارکس نے مجھے جو اطلاع دی، اس سے موجودہ صورتِ حال میں رتی بھر تبدیلی نہیں آئی تھی۔ مارکس کے اسٹاک میں اسٹار کہیں بھی نہیں تھا۔ میں ایک طویل بوجھل سانس خارج کر کے رہ گیا۔

''اب تم کیا کرو گے ڈیٹیکٹو؟'' وارڈن نے تیکھے لہجے میں دریافت کیا۔ ''کسی جانور کا سراغ لگانے کا یہ تمہارا پہلا تجربہ ہے۔ کیا تم اسے اپنا آخری تجربہ سمجھ کر ''ہینڈز اپ'' ہو جاؤ گے؟''

''نہیں!'' میں نے پوری قطعیت سے کہا۔ ''تلاش انسان کی ہو یا کسی جانور کی، اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں جس کام میں ایک بار ہاتھ ڈال دیتا ہوں پھر اسے

تکمیل تک پہنچائے بغیر.... سکون سے نہیں بیٹھتا۔ میں مسز ڈینسی کو مایوس نہیں کروں گا اور جہاں تک اسٹار کا معاملہ ہے تو......'' میں نے ڈرامائی انداز میں توقف کیا پھر ٹھوس لہجے میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔

''اسٹار سے مجھے محبت ہوگئی ہے۔ اس کا تصور کرتے ہی میرے ذہن میں ریڈ سرکل جلنے بجھنے لگتا ہے۔''

''ریڈ سرکل......؟'' اس نے الجھن زدہ انداز میں دہرایا اور بولا۔ ''میں کچھ سمجھا نہیں مارٹن؟''

''ریڈ سرکل یا سرخ دائرہ بدھ ازم میں اپنی ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا۔ ''یہ ایک ایسا ریڈ سرکل ہے جس کا دائرہ ایک مقام پر تھوڑے گیپ کے ساتھ رک جاتا ہے۔ اس گیپ کو میٹنگ پوائنٹ کہا جاتا ہے۔ بدھ فلاسفی کے مطابق، جس بھی شخص کے تصور میں کسی مخصوص انسان کے ساتھ یہ سرخ دائرہ روشن ہو جائے یا اسے خواب میں ریڈ سرکل نظر آئے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ دونوں فریق ایک دائرے میں سفر کر رہے ہیں اور عنقریب ''میٹنگ پوائنٹ'' پر ان کی ملاقات ہونے والی ہے۔''

''اوہ...... یہ ریڈ سرکل اور اس کا فلسفہ تو بہت دلچسپ اور عجیب ہے۔'' وارڈن کا حیرت بھرا اظہارِ خیال میری سماعت تک پہنچا۔ ''میں اس کے بارے میں آج پہلی بار تمہاری زبان سے سن رہا ہوں۔''

''مجھے یقین ہے کہ میں اسٹار سے زیادہ دور نہیں ہوں۔'' میں نے ٹھوس انداز میں کہا۔ ''ہم بہت جلد ملنے والے ہیں۔''

''تمہارے ذہن میں کوئی خاص منصوبہ ہے؟''

مارکس نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''اگر تم مجھے اعتماد میں لو تو ہوسکتا ہے کہ میں تمہاری مدد کر پاؤں۔''

''لزارس کی طرف سے میرے ذہن میں حد سے زیادہ شکوک و شبہات ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اس کے رویے سے میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ اسٹار کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔ میں اس کے اسٹاک کو چیک کرنا چاہتا ہوں۔''

''تو کیا لزارس تمہیں اس کی اجازت دے گا؟''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' میں نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''جو شخص اسٹار کے حوالے سے میری بات سننے کا روادار نہیں ہے، وہ بھلا مجھے اپنے اسٹاک تک کیونکر رسائی دے گا لیکن میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔''

''میں تمہارا آئیڈیا سننا چاہوں گا۔'' وہ گہری دلچسپی سے بولا۔

انسان اپنے معاشرے کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ اکیلے انسان کی کوئی زندگی نہیں ہے اس لیے ایک انسان کو دوسرے انسان پر بھروسا کرنا ہی پڑتا ہے۔

''مجھے پیٹس سے کبھی زیادہ دلچسپی نہیں رہی۔'' میں نے وارڈن پر اعتماد کرنے کا فیصلہ کرنے کے بعد صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن جب سے میں نے اسٹار کا کیس پکڑا ہے، میں غیر محسوس انداز میں کتوں کی زندگی کے اندر گھستا چلا جارہا ہوں۔ رات میں پیٹس کی پروٹیکشن کے حوالے سے گوگل کررہا تھا تو ''ہوپ فل ہارٹس'' کا پیج کھل گیا پھر میں اس کی تفصیلات میں کھو گیا۔ لزارس بھی ''ہوپ فل ہارٹس'' کے لیے کام کرتا ہے اور اس کی کسلڈی میں جو کتے ہیں، انہیں شہر سے باہر ایک الگ تھلگ فارم ہاؤس میں رکھا گیا ہے۔ میں آج رات میں کسی وقت اس فارم میں گھس کر حقیقت کا سراغ لگانا چاہتا ہوں۔ اگر اسٹار یا پٹی اور بارنی یا ان میں سے کوئی ایک بھی پیٹ اس فارم ہاؤس میں موجود ہے تو ہم پولیس کی مدد سے انہیں بازیاب کرسکتے ہیں۔''

''تم اسے جتنا آسان سمجھ رہے ہو، یہ کام اتنا سیدھا اور آسان ہے نہیں۔'' میرے خاموش ہونے پر مارکس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں اس فارم ہاؤس کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں اور یہ بھی کہ اس کے اندر داخل ہونا جوئے شیر لانے جیسا ہے۔''

''میں جب کسی کام کو کرنے کی ٹھان لیتا ہوں تو پھر مشکل اور آسان کا حساب نہیں کرتا۔'' میں نے پُرعزم انداز میں کہا۔ ''تم مجھے مذکورہ فارم ہاؤس کی مکمل معلومات فراہم کردو۔ باقی سب میں دیکھ لوں گا۔''

''ٹھیک ہے، جیسی تمہاری مرضی۔'' وہ ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولا پھر اپنی کرسی کی پشت گاہ سے چپک کر مجھے بتانے لگا۔ ''وہ فارم ہاؤس ''پیرائن سٹی اینیمل شیلٹر'' سے شمال میں کم و بیش بیس میل کے فاصلے پر شہر سے باہر ہے۔ وہاں پر رکھے گئے کتوں کی حفاظت کے لیے مسلح گارڈز تعینات ہیں جو رات و دن چوکنا انداز میں پہرا دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں فارم ہاؤس کے گردونواح میں دور تک درجنوں حساس آلات نصب کیے گئے ہیں۔ مذکورہ فارم ہاؤس گھنے درختوں کے اندر گھرا ہوا ہے اور آس پاس میلوں جنگلی گھاس اور جھاڑیاں ہیں جن کے بیچوں بیچ وہ حساس آلات چھپائے گئے ہیں۔ اگر کوئی شخص فارم ہاؤس کے عملے کی اجازت کے بغیر آگے بڑھنے کی کوشش کرے تو وہ کسی نہ کسی آلے کی پکڑ میں آجاتا ہے جس کے بعد خطرناک الارم بج اٹھتا ہے اور تمام مسلح گارڈز اس ''گڑبڑ'' کی تلاش میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ کچھ سمجھ میں آیا یا میں ایسے ہی بکواس کیے جارہا ہوں؟''

اس نے آخری جملہ بڑی بیزاری سے ادا کیا تھا۔ میں نے فوراً جواب دیا۔ ''میں نے تمہاری بات پوری توجہ سے سنی ہے مارکس! فارم ہاؤس کے اندر داخلے کی تم فکر نہ کرو۔ میں ان حساس آلات کو اندھا اور الارم وغیرہ کو گونگا کرنے کا کوئی راستہ نکال ہی لوں گا۔ تم مجھے لزارس کے بلڈی بزنس کے بارے میں بتاؤ۔ میں نے کسی بھی ڈاگ ہاؤس میں ایسے کڑے پہرے کے بارے میں کبھی نہیں سنا۔ تمہاری باتوں سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ لزارس جس فارم ہاؤس کا نگران ہے، وہاں بڑے پیمانے پر کوئی غیر قانونی کھیل کھیلا جارہا ہے ورنہ اتنی سیکیورٹی کا کوئی جواز سمجھ میں نہیں آتا۔''

''نارٹن! تمہارا اندازہ بالکل درست ہے۔'' مارکس اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''تم نے ابھی جس غیر قانونی کھیل کا ذکر کیا ہے، اسے میں ''خفیہ خرید و فروخت'' کا نام دوں گا۔''

''خفیہ خرید و فروخت؟'' میں نے سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں، بالکل!'' وہ قطعی لہجے میں بولا۔ ''میری معلومات کے مطابق اس فارم ہاؤس پر ''ہوپ فل ہارٹس'' کی جاب کے ساتھ ہی لزارس نے اپنا الگ سے دھندا بھی شروع کررکھا ہے۔ جن کتوں کو ریسکیو کرکے فارم ہاؤس میں رکھا جاتا ہے، وہ سب لوگوں کے پالتو گھریلو کتے ہوتے ہیں جن میں بعض اعلیٰ نسل کے قیمتی کتے بھی شامل ہوتے ہیں۔

لزارس ان کتوں کو الگ کرلیتا ہے اور ''ہوپ فل ہارٹس'' کے ریکارڈ میں ان کا اندراج نہیں کرتا بلکہ ان کی موویز اور پکچرز بنا کر انہیں اپنے طور پر دولت مند لوگوں کے ہاتھ فروخت کردیتا ہے۔ وہ یہ ڈرٹی بزنس ''ہوپ فل ہارٹس'' کے آفس ہی میں بیٹھ کر چلا رہا ہے۔ مذکورہ کتے ایک ہزار سے تین ہزار ڈالرز تک میں بہ آسانی بک جاتے ہیں۔ یوں لزارس ہزاروں ڈالرز کما رہا ہے اور ''ہوپ فل ہارٹس'' والوں کو اس کی بھنک بھی نہیں ہے۔''

''او مائی گاڈ!'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''بس یا اور کچھ......؟''

''فی الحال اتنا ہی کافی ہے مارکس!'' میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ''یہ سب میرے ذہن میں بھی تھا۔ لزارس کے خشک اور جان چھڑاؤ رویے نے مجھے شک میں ڈال دیا تھا اور تم نے میرے شک پر مہر تصدیق ثبت کردی ہے۔ تمہارا بہت شکریہ۔ اب میں چلوں گا۔ مجھے رات والے مشن کے لیے خصوصی تیاری بھی کرنا ہے۔''

''آل دی بیسٹ!'' مارکس نے بہ آوازِ بلند کہا۔ ''میں تمہاری کامیابی کے لیے دعا کروں گا۔''

میں نے دوبارہ اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کے آفس سے نکل کر اپنی کار کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

کلونی ایک نوجوان اور ابھرتا ہوا سافٹ ویئر انجینئر تھا اور سائبر کرائم اس کا خصوصی میدان تھا۔ وہ اپنی فیلڈ کے الٹے سیدھے کاموں میں بھی بہت دلچسپی رکھتا تھا۔ سب سے دلچسپ اور اہم بات یہ کہ کلونی کے دماغ میں سراغ رسانی کا کیڑا بھی موجود تھا۔

''آپ سینئر لوگ ہم نوجوانوں کو کسی قابل نہیں سمجھتے ہو۔'' وہ اکثر مجھ سے کہا کرتا تھا۔ ''اور ہمیں اپنی قابلیت منوانے کا موقع بھی نہیں دیتے ہو۔ یہ تو سراسر ناانصافی ہے۔''

میں اس کے اشاروں کو بہ خوبی سمجھتا تھا اور ہر بار اس کے لیے میرا ایک ہی جواب ہوتا تھا۔

''کلونی! میری بات کا برا نہیں مانانا۔ میں نے کبھی تمہیں ہلکے میں نہیں لیا لیکن ائرکنڈیشنڈ آفس میں بیٹھ کر کی بورڈ کے بٹنوں سے کھیلنا اور فیلڈ کی سختیوں کو جھیلنا دو مختلف باتیں ہیں۔ تمہیں بالکل اندازہ نہیں ہے کہ کسی چھوٹے سے سراغ کے حصول کی خاطر ہم ڈیٹیکٹیوز کو اپنی جان کون کون سے جوکھم میں ڈالنا پڑتی ہے۔''

''یہ کہانی میں پہلے بھی کئی بار آپ کی زبان سے سن چکا ہوں مسٹر مارٹن!'' وہ جھنجلاہٹ بھرے انداز میں

آگہی

رابرٹ دفتر پہنچا تو تھکا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ آنکھیں سرخ تھیں۔ ایک ساتھی نے کہا۔ ''لگتا ہے رات جاگ کر گزاری ہے اور خوب عیش کی ہے؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ دراصل ایک لڑکی تمام رات میرا دروازہ پیٹتی رہی۔ اس نے سونے نہیں دیا۔'' رابرٹ بولا۔

''تو تم نے اٹھ کر پوچھ لیا ہوتا کہ وہ کیا چاہتی تھی؟''

''وہ تو مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔ وہ باہر جانا چاہتی تھی۔''

مرسلہ: عمران شیروانی، لاہور

جواب دیتا۔ ''کسی کتاب کے سرورق کو دیکھ کر اس کے اندر موجود مواد کے بارے میں درست اندازہ قائم نہیں کیا جاسکتا۔ اگر آپ نے کبھی مجھے اپنے ساتھ کام کرنے کا موقع فراہم کیا تو میں ثابت کردوں گا کہ میں ائرکنڈیشنڈ آفس میں بیٹھ کر چِل مارنے والا نوجوان اتنا بھی نرم و نازک اور نکما نہیں ہوں جتنا کہ آپ نے مجھے سمجھ رکھا ہے۔''

اور...... آج کی رات میں نے کلونی کو یہ موقع فراہم کردیا تھا۔ وہ اس وقت میری کار میں موجود تھا اور اپنی تمام تر ماڈرن ٹیکنالوجی کے ساتھ جو مختلف قسم کے گیجٹس پر مشتمل تھی۔ میں نے کلونی کو اس مشن کے بارے میں سب کچھ بتادیا تھا۔

مارکس کی زبانی فارم ہاؤس کی سیکیورٹی کے بارے میں سن کر مجھے کلونی کا خیال آیا تھا۔ وہاں نصب حساس آلات اور الارم وغیرہ سے کلونی بہ آسانی ''نمٹ'' سکتا تھا۔ باقی کام میں خود دیکھ لیتا۔ ویسے بھی ہم وہاں تھرڈ ورلڈ وار لڑنے والے نہیں تھے۔ مجھے بس اس امر کی تصدیق کرنا تھی کہ اسٹار، پیٹی، بارنی...... وغیرہ میں سے کون کون اس فارم ہاؤس میں موجود ہے۔ اس کے بعد پولیس کا کام شروع ہوتا تھا۔ متذکرہ بالا کتوں کی تصاویر میں نے اپنے سیل فون میں بھی محفوظ کررکھی تھیں تاکہ میرے پاس موجود رہیں اور... بہ وقتِ ضرورت کام آئیں۔

جب ہم اپنے مطلوبہ فارم ہاؤس پہنچ گئے تو کلونی نے مجھ سے کہا۔ ''آپ دو، تین سو فٹ کا فاصلہ رکھ کر فارم ہاؤس کے گرد ایک سست رفتار چکر لگائیں۔ میں کچھ چیک

کرنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’او کے!‘‘ میں نے کہا۔

کلونی اپنے گیجٹس کے ساتھ مصروف ہو گیا۔ وہ میرے پہلو میں پسنجر سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کی ہدایت اور اپنی احتیاط کے مطابق لگ بھگ چار سو فٹ کے گرد اس ... فارم ہاؤس کا چکر لگایا۔

’’بات بن گئی مسٹر مارٹن!‘‘ وہ خوشی سے معمور لہجے میں بولا۔

میں نے کار کو روک دیا اور اس سے پوچھا۔ ’’مجھے بھی بتاؤ، کون سی بات بن گئی ہے؟‘‘

’’اس فارم ہاؤس کی حفاظت اور نگرانی کے لیے سیکیورٹی کیمروں کے علاوہ موشن لائٹس اور انتہائی حساس نوعیت کے آلات کا استعمال کیا گیا ہے۔‘‘

’’یہ سب میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں بچے!‘‘ میں اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی بول پڑا۔ ’’مسلح سیکیورٹی گارڈز اس کے علاوہ ہیں۔ اب بتاؤ، تم اس فیلڈ میں میری کیا مدد کر سکتے ہو؟‘‘

’’میں سیکیورٹی کیمروں کو ہیک کر سکتا ہوں۔‘‘ اس نے جواب دیا۔ ’’ادھر اُدھر نصب مختلف سینسرز کو جام کر سکتا ہوں۔ الارم کی بولتی بھی بند کر سکتا ہوں......بس!‘‘

’’یہ بھی بہت ہے۔‘‘ میں نے تعریفی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ ’’باقی سب کچھ میں سنبھال لوں گا۔ موشن لائٹس اور سیکیورٹی گارڈز کو جل دینا مجھے اچھے سے آتا ہے۔‘‘

’’مجھے اس کام کے لیے ایک پُرسکون جگہ چاہیے ہوگی۔‘‘ اس نے کہا۔

’’جیسا کہ تمہارا ائر کنڈیشنڈ روم......؟‘‘ میں نے بے ساختہ کہا۔

’’آپ غلط سمجھے مسٹر مارٹن!‘‘ وہ خفگی بھرے لہجے میں بولا۔ ’’میرا مطلب تھا، ہمیں کار کو کسی محفوظ مقام پر روکنا ہوگا تاکہ میں کسی کی مداخلت کے بغیر اطمینان سے اپنا کام کر سکوں۔‘‘

’’سوری بوائے!‘‘ میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ’’وہ ’’ایئر کنڈیشنڈ روم‘‘ والی بات میں نے مذاق میں کہی تھی۔‘‘

’’اٹس او کے مسٹر مارٹن!‘‘ وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔ ’’اپنی اہلیت اور قابلیت کا لوہا منوانے کے لیے ایسی باتیں تو سننا ہی پڑتی ہیں۔‘‘

اس نے مجھ پر ایک کاری ضرب لگائی تھی لیکن اب کی بار میں نے اسے کوئی تیکھا یا طنزیہ جواب نہیں دیا اور کسی محفوظ مقام کی تلاش میں کار آگے بڑھا دی۔

جیسا کہ میں نے بتایا، اس علاقے میں درختوں اور سبزے کی بہتات تھی لہٰذا جلد ہی مجھے اپنی مطلوبہ جگہ مل گئی۔ میں نے کار کو درختوں کے جھنڈ کے نیچے پارک کیا اور کلونی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

’’یہ جگہ کیسی ہے؟‘‘

’’پرفیکٹ......!‘‘ اس نے جواب دیا۔

’’تو پھر کام سے لگ جاؤ۔‘‘ میں نے کہا۔

’’مجھے جن فریکوئنسیز اور جی پی ایس سگنلز کی ضرورت ہے، وہ سب یہاں آسانی سے مل رہے ہیں۔‘‘ اس نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ’’مسٹر مارٹن! مجھے یقین دلائیں کہ ہم کچھ بھی غیر قانونی نہیں کرنے جا رہے۔ اگر کوئی گڑبڑ ہوگئی تو میرا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔‘‘

’’تمہارا مستقبل محفوظ اور روشن ہے بچے!‘‘ میں نے کلونی کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے تسلی بخش لہجے میں کہا۔ ’’اس بات کا یقین رکھو کہ اس فارم ہاؤس میں ایک غیر قانونی کام ہو رہا ہے اور ہم ان کے مذموم کاروبار کو بے نقاب کر کے قانون کی مدد کر رہے ہیں۔ اس وقت ہم قانون کے رکھوالے اور وہ کمبخت لزارس ایک خطرناک مجرم ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہونا......؟‘‘

’’گاٹ اٹ!‘‘ اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔ ’’اتنے فاصلے سے میں صرف آدھے گھنٹے کے لیے تمہیں سیف پیسج دے پاؤں گا۔ اسی مدت کے دوران میں تمہیں اپنا کام مکمل کر کے واپس آنا ہوگا۔‘‘

’’ٹھیک ہو گیا۔‘‘ میں نے بے پروائی سے کہا۔ ’’اتنی مہلت میرے لیے کافی سے زیادہ ہوگی۔ تم اپنا کام شروع کرو۔ میں جا رہا ہوں۔‘‘

وہ اپنے گیجٹس کے ساتھ مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

کلونی نے سیکیورٹی کیمروں اور مداخلت کار کی نشاندہی کرنے والے آلات کو اپنے بس میں کر لیا تھا۔ جب بھی کوئی میری طرح کا بن بلایا مہمان یعنی مداخلت کار ان سینسرز کے نزدیک سے گزرتا تو الارم فوراً بج اٹھتا تھا جس سے مسلح سیکیورٹی گارڈز ریڈ الرٹ ہو جاتے تھے لیکن ابھی ایسی کوئی دقت یا پریشانی نہیں تھی۔ مجھے صرف سیکیورٹی گارڈز اور موشن لائٹس کی نظر میں نہیں آنا تھا۔ مذکورہ موشن لائٹس تھوڑے تھوڑے فاصلے پر نصب تھیں اور دھیمی رفتار

سے گھومتی رہتی تھیں جس کے نتیجے میں اردگرد کا ماحول روشن ہوجاتا تھا۔ ''ہوپ فل ہارٹس'' والوں نے لاوارث کتوں کی حفاظت کا بڑا معقول انتظام کر رکھا تھا جس کا نامعقول لزارس ناجائز فائدہ اٹھا رہا تھا۔

سامنے کی نسبت عقبی جانب سے فارم ہاؤس میں داخل ہونا زیادہ محفوظ تھا۔ میں تاریکی میں آگے بڑھتا گیا اور پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں فارم ہاؤس کی عقبی دیوار تک پہنچ گیا۔ خدا کا شکر ہے کہ یہاں تک خیریت رہی تھی۔ اگلا مرحلہ فارم ہاؤس کے اندر داخل ہونے کا تھا۔

عقبی دیوار خاصی موٹی اور مضبوط تھی۔ اس کی بلندی کم وبیش آٹھ فٹ رہی ہوگی۔ جوانی کا زمانہ بہت پیچھے رہ گیا تھا جب میں اتنی اونچی دیواروں کو بہ آسانی پھلانگ جایا کرتا تھا مگر اب بھی ایسا نہیں تھا کہ میں اس دیوار کی دوسری جانب نہ جاسکوں۔

میں نے اپنے گردوپیش میں نگاہ دوڑائی اور اچک کر دیوار کے کنارے کو اپنے ہاتھوں کی گرفت میں لے لیا۔ اس کے بعد میرے بازوؤں اور کمر کی کارکردگی کا امتحان تھا اور میرے یہ اعضا اس آزمائش میں کامیاب رہے۔ میں نے اپنے جسم کو دیوار کے اوپر پہنچایا اور اگلے ہی لمحے میں کسی بلی کے مانند فارم ہاؤس کے اندر کود گیا۔

اندر، باہر جیسا گھپ اندھیرا نہیں تھا بلکہ اندر کے ماحول میں ملگجا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ میں سنگی دیوار سے پیٹھ لگائے دبے قدموں آگے بڑھتا رہا۔ جلد ہی اس سنگی دیوار نے مجھے کتوں والے پنجروں تک پہنچا دیا۔ ایسے ہی آہنی پنجرے میں نے اس خوبصورت خاتون اسٹیسی ہیملٹن کے ڈاگ ہاؤس میں بھی دیکھے تھے۔

میں خود کو درختوں اور دیوار کے درمیان چھپا کر نہایت ہی احتیاط کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے ایک ایک پنجرے میں بند کتوں کا جائزہ لینے لگا۔ دو منٹ کی کوشش کے بعد کامیابی نے میری قدم بوسی کی۔ ایک الگ تھلگ پنجرے میں وہ تینوں مجھے نظر آگئے۔ میں نے اسٹار، پیٹی اور بارنی کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔

انہیں شاید دوسرے پیٹس سے علیحدہ اس لیے رکھا گیا تھا کہ کمینہ لزارس ایک آدھ روز میں ان کی ڈیلیوری کسی امیر شخص کو دینے والا تھا۔

میں نے اپنے کیمرے کی فلیش لائٹ کو آف موڈ پر رکھ کر مختلف زاویوں سے ان تینوں اسمارٹ کتوں کی تصاویر بنا ڈالیں۔ ہر تصویر میں وہ فارم ہاؤس کے پنجرے کے اندر بند دکھائی دیتے تھے۔

میرا کام ختم ہوگیا تھا۔ اب مزید وہاں رکنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کلونی نے مجھے آدھے گھنٹے کی مہلت دی تھی جس میں سے بیس منٹ گزر چکے تھے لہٰذا میں نے واپسی کی راہ لی۔

فارم ہاؤس سے واپس ٹاؤن کی طرف آتے ہوئے میں نے اپنی کار کا اسٹیئرنگ کلونی کے حوالے کر دیا تھا کیونکہ مجھے کئی ایک ضروری فون کرنا تھے جو ڈرائیونگ کے دوران میں ممکن نہیں تھے۔ جب ہم محفوظ فاصلے پر پہنچ گئے تو میں نے اپنا سیل فون سنبھال لیا اور یکے بعد دیگرے سٹی پولیس چیف، وارڈن مارکس اور دلکش و دلنشیں حسینہ اسٹیسی کو علی الترتیب فون لگانے میں مصروف ہوگیا۔

☆☆☆

میرے اور کلونی کی کاوشوں نے بدذات لزارس کی کمینگی کا پردہ فاش کر دیا تھا۔ اس معاملے میں چونکہ پولیس شامل ہوگئی تھی اس لیے مین اسٹریم نیوز چینلز اور سوشل میڈیا نے خوب بڑھ چڑھ کر اس ایشو کو کوریج دی تھی جس کے نتیجے میں کلونی اور میں ہیروز کا درجہ حاصل کر چکے تھے۔ پولیس نے اسٹار، پیٹی اور بارنی کے علاوہ بعض دوسرے قیمتی پیٹس کو بھی بازیاب کر کے ان کے مالکان کے حوالے کر دیا تھا۔

لزارس تمام ثبوتوں کے ساتھ پکڑا گیا تھا لہٰذا اس کی بچت یا بچاؤ کا کوئی امکان نہیں رہا تھا۔ اس پر مقدمہ چلا اور ایک بھاری جرمانے کے علاوہ اسے آٹھ سال کی جیل بھی ہوئی۔ لزارس جیسے بدفطرت لوگوں کا ایسا ہی انجام ہوتا ہے۔

آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میں نے مسز ڈیفنی پیٹرسن سے اپنی فیس وصول نہیں کی کیونکہ مسز للی اور مسٹر فریڈی نے اپنے عزیز از جان کتوں پیٹی اور بارنی کی بازیابی کی خوشی میں مجھے خاصی تگڑی رقم کے چیک دے دیے تھے۔ ایسے میں غریب ڈیفنی کے مڑے تڑے کرنسی نوٹ لینا مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔

اسٹار کی تلاش کے دوران میں غیرمحسوس انداز میں مجھے کتوں سے محبت ہوگئی تھی۔ یہ سلسلہ یہیں پر تھما نہیں بلکہ آنے والے دنوں میں میری یہ محبت کتوں سے ہوتے ہوئے کتوں والی تک جا پہنچی تھی۔

جی ہاں...... میں سچ کہہ رہا ہوں۔ ایک ماہ کے اندر ہی میری اس جادوئی محبت نے اسٹیسی ہیملٹن کو اسٹیسی مارٹن بنا دیا ہے۔

✖✖✖

جنگ باز

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط: 9

مقدر کا عروج ہو یا نصیب کا زوال... جانے کن خاموش لمحوں میں زندگی میں شامل ہوجاتے ہیں... لیکن کچھ لوگ تقدیر سے زیادہ تدبیر پر بھروسا کرتے ہیں... وہ جو حالات کی زنجیر میں قید بوسیدہ درو دیوار تک محدود تھا تمام تر معصومیت کے ساتھ شب و روز کی ہنگامہ خیزیوں میں مصروف تھا کہ اچانک حرص و طمع اور لالچ کے مارے... چہروں پر شرفا کا نقاب ڈالے عبرت و مکر کے تمام حربے آزمانے اس کے راستے میں چلے آئے... وہ جو رنگین شاموں... سنگین ہنگاموں اور تحیر انگیز چالوں سے ناآشنا تھا... ایسا بازی گر بن گیا کہ تمام پردہ داروں کی ڈوریاں الجھ کر رہ گئیں... اس کے ذہن میں قید ناآسودہ خواہشوں کا بھنور اسے کسی کل چین سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ تقدیر کے سہارے چلنے والا... کچھ اس انداز سے تدبیروں سے اپنی کایا پلٹتا چلا گیا کہ چال بازوں کی تمام چالیں لڑکھڑا گئیں۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خوں ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان۔
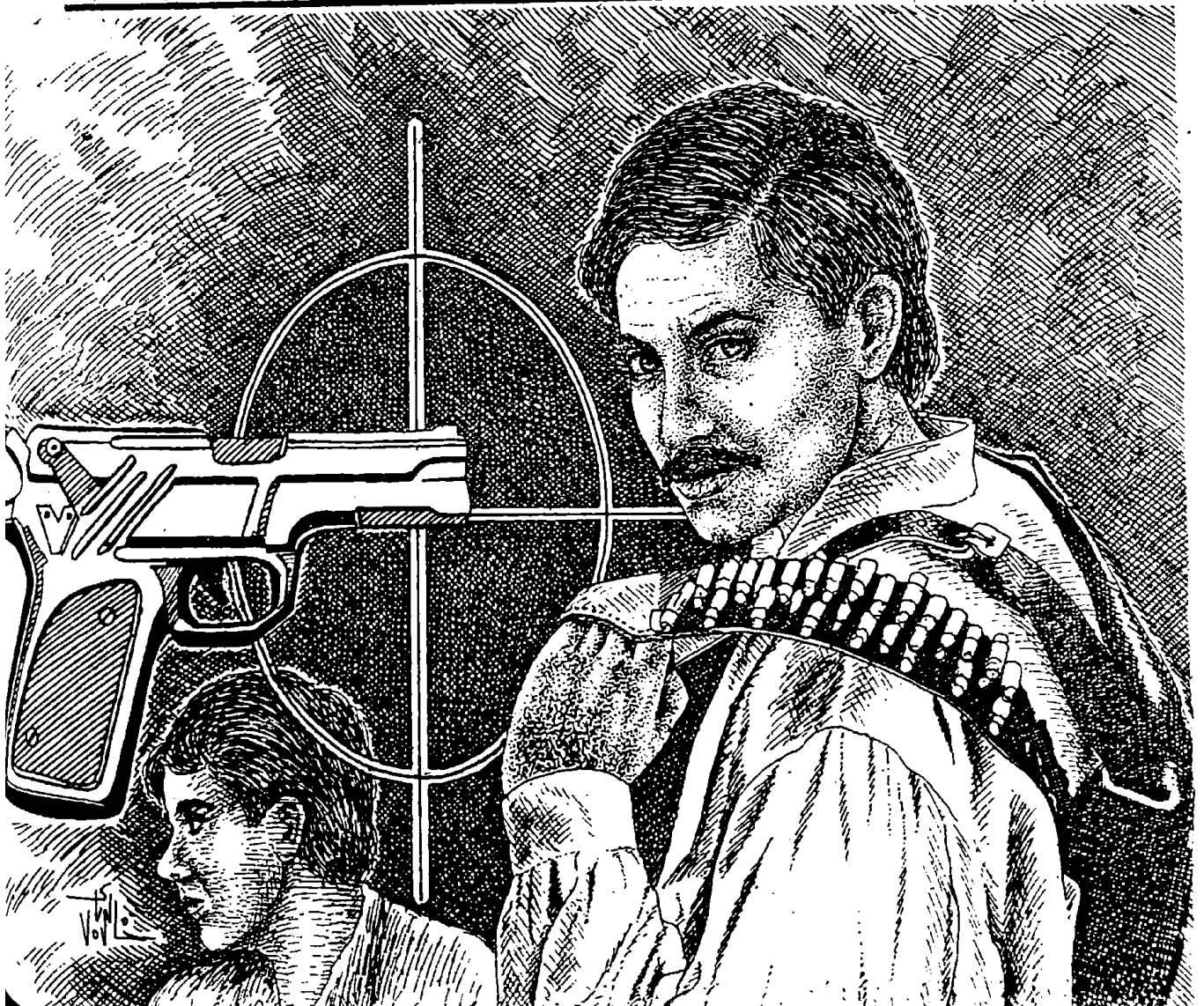
سدرہ اپنی والدہ کی وجہ سے بہت فکرمند تھی۔ وہ سیالکوٹ آ تو گئی تھی مگر اب واپسی کی فکر میں مبتلا تھی۔ وہ اپنے آنے کی تفصیل بتا کر چپ ہوگئی۔ کمرے میں یکلخت خاموشی چھا گئی۔ سدرہ کی نگاہیں میرے چہرے پر تھیں اور میں فوزیہ اور راحیلہ کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ دونوں سدرہ کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھیں۔

''یہ دونوں یہاں محفوظ رہیں گی؟'' میں نے سکوت کا پردہ چاک کیا اور سوالیہ نظروں سے سدرہ کی طرف دیکھا۔

''بالکل، اسی لیے تو میں نے انہیں یہاں پہنچانے کا تمہیں مشورہ دیا تھا۔'' سدرہ جلدی سے ان کی جانب دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ مکان ہمارا ہی ہے۔ یہاں انہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ رحیم اور جنت ان دونوں کا پورا خیال رکھیں گے۔''

''بات ہماری تکلیف کی نہیں ہے۔'' فوزیہ نے درمیان میں سنجیدگی سے کہا۔ وہ سدرہ سے مخاطب تھی پھر ایک نگاہ مجھ پر ڈالتے ہوئے دوبارہ سدرہ سے بولی۔

''سہراب کی طرف سے مجھے اور راحیلہ کو پریشانی اور فکر تولاحق رہے گی۔''

''فوزیہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' راحیلہ نے بھی لب کشائی کی۔ ''سہراب کے بغیر ہمیں کہاں چین ملے گا۔''

''آپ ایسا کیوں نہیں کرتیں سدرہ صاحبہ کہ کراچی سے آپ ہمیشہ کے لیے یہاں شفٹ ہوجائیں؟'' فوزیہ نے آخر میں مشورہ دینے کے انداز میں کہا تو میں ان کی طرف دیکھ کر سمجھاتے ہوئے بولا۔

''یہ تم دونوں کو اب یہاں آکر کیا ہوگیا ہے؟ کراچی میں تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھیں اور اب ارادہ ہی بدل گیا؟''

''یہ دونوں ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' سدرہ نے ہولے سے کہا۔ ہم اس کی طرف دیکھنے لگے۔ سدرہ کے چہرے پر حزن وملال کی سی کیفیات نمودار ہونے لگیں۔

''سچے اور پیار ومحبت سے گندھے ہوئے یہ رشتے ناتے ایک زنجیر ہی کی طرح ہوتے ہیں۔ اگر ایک کڑی الگ ہوجائے تو پوری زنجیر ہی ٹوٹ کر بکھر جاتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں سہراب کہ اب فوزیہ اور راحیلہ کا دنیا میں تمہارے سوا اور کوئی بھی نہیں ہے۔ ان دونوں کا تمہارے لیے فکرمند اور پریشان ہونا فطری امر ہے۔'' سدرہ اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی۔

''لیکن میں نے بھی تو کسی کی بات کا پاس کرنا ہے۔ میرے کاندھوں پر بھی تو ایک فرض، قرض کی طرح سوار ہے۔ اس کا کیا کروں؟'' میں نے کہا۔ ''سیٹھ سکندر کا میں ہی نہیں میرا باپ بھی نمک خوار تھا اور پھر ان کا مرنے سے پہلے وہ خط...... اس کی عبارت کا ایک ایک لفظ...... ان کا مجھ پر اندھا اعتماد ظاہر کرتا ہے۔''

''میں تو خود چاہتی ہوں کہ تمہیں ایسے کسی اور امتحان میں نہ ڈالوں سہراب!'' سدرہ ایک دم دکھی ہوکر بولی۔ ''لیکن...... ڈیڈی کا وہ خط اور تمہارا حسنِ ظن مجھے خاموش کرا دیتا ہے۔''

''ہم بلاوجہ ہی موضوع کے ٹریک سے اتر گئے ہیں۔'' میں نے ایک دم گہری متانت سے کہا۔ ''یہ وہم، وسوسے، فکریں انسان کی زندگی کا حصہ ہیں۔ ایک پریشانی سے دوسری اور پھر تیسری۔ یہ کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ مصائب ومسائل سے ہر انسان کا پالا پڑتا ہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ معاملات ذرا گمبھیر نوعیت کے ہوتے ہیں مگر ان کا سامنا تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ کیا یہ اچھا نہیں کہ قدرت اگر مجھے کسی کی مدد کرنے کا، اپنا نمک حلال کرنے کا موقع دے رہی ہے تو مجھے بھی اس نیک مقصد سے پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے۔ زندگی تو یوں بھی اللہ کی امانت ہے۔ اچھا نہیں کہ یہ امانت دیانت داری سے رکھی جائے۔'' میں چند ثانیے سانس لینے کو رکا اور پھر بولا۔

''اور پھر اب تو یوں بھی میرا پیچھے ہٹنا ممکن نہیں رہا۔ اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ بار بار اس موضوع کو نہ چھیڑا جائے اور مصائب کا ہمت اور حوصلے سے مقابلہ کیا جائے۔ سیاہ رات کے بعد ایک اچھی اور خوشگوار سحر ضرور طلوع ہوتی ہے۔ تم دونوں کو اللہ سے میری کامیابی کی دعائیں کرنا چاہئیں۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے دلوں میں سکون رہے گا، پریشانی اور خوف کے بادل چھٹتے رہیں گے۔'' میں نے آخر میں پیار بھری رسانیت کے ساتھ فوزیہ اور راحیلہ سے کہا تو ان دونوں نے خاموشی اختیار کرلی۔

سدرہ بولی۔ ''تم لوگوں کے کراچی سے روانہ ہونے کے بعد میرے دل میں بھی یہی خیال آیا تھا کہ مجھے بھی کراچی ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر یہاں آباد ہوجانا چاہیے لیکن اب شاید یہ بھی ممکن نہیں رہا۔ حالات ایک دم ہی اس قدر بگڑ چکے ہیں جس کا تمہیں بھی اندازہ ہوگا کہ اب ان سے مفر کی کوئی راہ نہیں بچی، ماسوائے اس کے کہ ہمیں ہمت سے ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔''

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی۔ ماحول کے تکدر اور بوجھل پن کو کم کرنے کے لیے ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے

رہے۔ اس کے بعد سدرہ اور میں نے کل شام ہی کراچی لوٹ جانے کا پروگرام بنالیا۔

اس شام فوزیہ اور راحیلہ آرام کرنے لگیں۔ سدرہ، محمود کے ساتھ کہیں نکلی ہوئی تھی۔ یہ جون کی ایک گرم اور عجیب ٹھہراؤ پن کا احساس دلاتی شام تھی۔ میں گھر سے باہر نکلا۔ یہ گھر کچھ زیادہ پوش علاقے میں تو نہیں تھا البتہ صدر بازار کے قریب واقع ہونے کے سبب پُررونق علاقہ ضرور تھا۔ چوڑی گلیاں، چھوٹے بڑے ریسٹورنٹ، مصروف چوراہے، مکانات بھی بنے ہوئے تھے۔

بقول سدرہ کے ان کے والد کا تعلق سیالکوٹ سے ہی تھا۔ ان کے دو بڑے بھائی بھی ادھر ہی رہتے تھے۔ ایک بھائی کی کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ لاہور شفٹ ہو گئے تھے۔ دوسرے کے ایک بیٹا اور بیٹی تھی۔ ان کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ بیٹی لاہور میں بیاہی گئی تھی اور بیٹا نوکری کے سلسلے میں فیصل آباد جا کر آباد ہوا تھا اور وہیں اس نے شادی کر لی تھی۔ اب سدرہ کے دونوں تایا انتقال کر چکے تھے۔ یہ ان کا آبائی مکان تھا اور سدرہ کے والد نے ماں باپ کی نشانی کے طور پر اسے فروخت نہیں ہونے دیا تھا اور اپنے دونوں بھائیوں کو حصہ دے کر پورا مکان اپنے نام کروالیا تھا۔

سیالکوٹ سے مقبوضہ جموں وکشمیر صرف اڑتالیس کلومیٹر ہونے کے سبب کشمیر کے برف زار پہاڑوں سے ٹکرا کر آنے والی ہوائیں جب یہاں مست خرام ہوتی ہیں تو سیالکوٹ کا موسم ایک دم بدل جاتا ہے۔ یہاں بارشیں بھی بہت ہوتی ہیں۔ اس شہر کو ایک جانب سے نالا ڈیک اور دوسری جانب سے دریائے چناب نے گھیر رکھا ہے۔

ہیڈ مرالہ یہاں کا معروف سیاحتی اور تفریحی مقام ہے۔ لوگ اکثر سیر اور پکنک کے لیے اور بالخصوص مچھلی کھانے کے شوقین وہاں ضرور جاتے ہیں۔

سدرہ نے ہم سے ابھی دوپہر میں وہاں کی سیر پر جانے کے لیے کہا بھی تھا مگر حالات ہی کچھ ایسے تھے کہ تفریح کا موڈ بالکل بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔

میں باہر نکلا تو ٹھہری ٹھہری گرم شام کے تھپیڑے میرے چہرے سے ٹکرانے لگے۔ میں مکان کے قریب ہی کھڑا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ ایک اندازے کے مطابق یہ مکان چار پانچ مرلے سے کم کا نہیں تھا۔ دیگر چھوٹے بڑے مکان بھی تھے۔ ان کی کوئی ترتیب یا ایک قطار نہ تھی تاہم ان کی بناوٹ اور مکانیت بے ڈھنگی نہیں لگتی تھی۔

ہمارا گھر ''فرنٹ اسٹریٹ'' کا گھر کہلاتا تھا۔ یہ بات مجھے ادھیڑ عمر ملازم شیخ رحیم نے بتائی تھی۔

میں یونہی چہل قدمی کے انداز میں تھوڑا اور آگے بڑھا تو ہمارے مکان کے بالکل پچھواڑے ایک اور مکان نظر آیا۔ یہ مجھے بمشکل دو مرلے کا ہی لگا۔ پرانی وضع کا اور کچھ بوسیدہ سا مغلیہ طرز کا لگتا تھا جیسے کوئی تاریخی عمارت ہو۔ بادی النظر میں اس کی پرانی دیواروں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے یہاں کوئی رہتا ہی نہیں۔

اچانک میں چونکا۔ میں نے مین بازار کی طرف سے آنے والی دو برقع پوش خواتین کو آتے دیکھا۔

گلی نما حصہ ہونے کے سبب یہاں کم ہی لوگوں کی آوک جاوک نظر آتی تھی۔ میں دوسری طرف دیکھنے لگا بلکہ واپس گھر کی جانب پلٹنے ہی والا تھا کہ میں نے آخری سرسری نظر ان پر ڈالی تو چونک سا گیا۔

یہ دونوں خواتین اسی بوسیدہ سے گھر کے سامنے رک گئیں۔ پتا نہیں کیوں ایکا ایکی میں پرانے مکان اور ان دونوں برقع پوش خواتین میں دلچسپی لینے پر مجبور ہو گیا۔ وجہ اس کی یہی تھی کہ اس چھوٹے سے بوسیدہ اور پرانی وضع کے مکان میں کیا واقعی کوئی رہتا بھی ہوگا؟ اور اب یہ حقیقت میری آنکھوں کے سامنے تھی۔

دونوں خواتین میں ایک ذرا بڑی عمر کی اور دوسری نوجوان تھی۔ بڑی عمر والی نے برقع ٹائپ فل ٹاپ چادر... اوڑھ رکھی تھی جبکہ نوجوان لڑکی نے عبایا۔ قدوقامت سے ہی میں ان کی عمروں کا کچھ اندازہ لگا پایا تھا۔

ایک بات جو خاص طور پر صرف میں ہی ایک لڑاکا کی حیثیت سے محسوس کر سکتا تھا وہ یہ تھی کہ بڑی عمر کی خاتون کی چال تو عام سی تھی لیکن نوجوان عبا پوش لڑکی کی چال میں مجھے مخصوص انداز کی چابکدستی محسوس ہوئی تھی۔ ایک پھرتیلا پن تھا اس میں۔ ایک تربیت یافتہ لڑاکے کی نظر اسے ''چوکنا پن'' کا نام دے سکتی تھی جو میں اسے دے چکا تھا۔

بڑی عمر والی نے چابی نکال کر دروازے پر لگے تالے میں گھمائی اور پھر دونوں اندر داخل ہو گئیں۔ مکان ایک منزلہ ہی تھا۔

میں سر جھٹک کر پلٹنے ہی والا تھا کہ یکدم ایک بائیک ''گھوں...... گھوں'' کرتی تیزی سے میرے قریب سے کراس کر گئی۔ ذرا سی چُوک پر وہ مجھ سے ٹکرا سکتا تھا۔ بائیک پرانی سی تھی اور اس پر ٹائٹ جینز اور ٹی شرٹ پہنے ایک نوجوان لڑکا بیٹھا نظر آیا تھا۔

میں زور سے بدکا تھا لیکن اس نوجوان کو میری کوئی

پروانہ تھی۔ مجھے اس کی حرکت پر طیش سا آ گیا۔ میں رک کر اس کی جانب دیکھنے لگا اور چاہتا تھا کہ دوڑ کر اس نامعقول کا پیچھا کر کے اسے جا لوں کیونکہ آگے بھی تنگ سی گلیاں تھیں اور وہ کہیں نہ کہیں بائیک آہستہ ضرور کرتا۔ اس سے پہلے کہ میں اسے غصیلے انداز میں پکارتا، میں چونک پڑا۔

وہ لڑکا بائیک لیے سیدھا اسی مذکورہ مکان کے دروازے پر جا کھڑا ہوا پھر اس نے دو بار ہارن دیا۔ مجھے اس کے ہارن دینے کا انداز کچھ خاص قسم کا لگا تھا۔ وہ تقریباً میری ہی عمر کا اور گورا چٹا تھا۔ اس نے بہت ٹائٹ جینز اور چست سی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ پیروں میں مخصوص سول کے جوتے تھے۔ بیلٹ کا بکل کافی چوڑا تھا اور اس پر کراٹے کے انداز میں بروس لی کی تصویر کندہ تھی۔ ایسی ہی تصویر اس کی شرٹ کے آگے اور پشت پر بھی بنی ہوئی تھی۔ وہ قد میں البتہ مجھ سے دبتا ہوا تھا۔ وہ خاصا کسرتی بدن کا مالک تھا اور اس کے مسلز بھی نظر آ رہے تھے۔

اب میں تجسس میں ٹھہر گیا۔ ذرا ہی دیر بعد دروازہ کھلا۔ اندر سے کسی نے جھانکا پھر مخروطی انگلیاں نمودار ہو کر اس طرح متحرک ہوئیں کہ جیسے اس بائیک والے نوجوان کو مخصوص اشارہ کر رہی ہوں۔

لڑکے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ذرا ہی دیر بعد وہی عبا پوش نوجوان لڑکی برآمد ہوئی اور بائیک والے لڑکے کے پیچھے جا بیٹھی۔ بائیک اسٹارٹ ہوئی اور وہ دوبارہ میری جانب آنے لگی۔ اس بار وہ ذرا انسانیت سے چلا رہا تھا۔

میرے قریب گلی کا موڑ تھا۔ وہ آہستہ ہوا اور تب ہی میرے کانوں سے اس لڑکے کی پُرشوخ آواز ٹکرائی۔ وہ لڑکی سے کہہ رہا تھا۔

''ارے بابا! آخر کو تم کراچی کے ایک بڑے ڈان کی بیٹی ہو۔ تم سے نہیں ڈروں گا تو اور کس سے ڈروں گا؟''

وہ آگے نکل گیا اور مجھے یوں لگا جیسے میں بھی اس کے پیچھے دوڑنے لگا ہوں۔ میرے کان بُری طرح سائیں سائیں کرنے لگے۔

''کراچی کے ڈان کی بیٹی...... کراچی کے ڈان کی بیٹی......'' یہی گردان میرے اندر بار بار ہوتی رہی۔

''کیا یہ لڑکے نے اس لڑکی سے مذاق میں کہا تھا یا پھر واقعی ایسا کچھ تھا؟'' میں نے خود سے سوال کیا کیونکہ ''ڈان'' کے حوالے سے میرے ذہن میں ایک ہی نام ابھرا تھا۔

''باس اقبال......''

''تو کیا یہ اقبال کی بیٹی تھی؟''

''نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔''

''تو پھر؟''

''ڈان کی بیٹی، ایسے سالخوردہ مکان اور سفید پوشی کی زندگی کبھی نہیں گزارتی۔''

میں خود ہی سے سوال کرتا اور خود ہی جواب دینے لگتا تھا۔ خود سے میرے سوال بھی عجیب تھے اور جواب بھی۔

میں الجھن زدہ سا گھر کے دروازے کی جانب پلٹا ہی تھا کہ دروازے کے اندر سے میں نے شیخ رحیم کو نمودار ہوتے دیکھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ہولے سے مسکرایا۔

''محلے کی سیر ہو رہی ہے جناب؟'' رحیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہاں، بابا! کچھ ایسا ہی ہے۔'' میں نے بھی ہولے سے مسکرا کر جواب میں کہا اور پھر اس طرف اشارتاً اپنی گردن موڑتے ہوئے رحیم سے بولا۔

''اس مکان میں کون رہتا ہے؟'' میرا اشارہ اسی بوسیدہ مکان کی جانب تھا۔

''اوہ، اس مکان میں...... ماں بیٹی رہتی ہیں۔ کیا کوئی بات ہے؟'' رحیم ایک دم سنجیدہ سا ہو گیا۔

''کوئی خاص تو نہیں، بس یونہی پوچھ لیا۔'' میں نے کہا۔ ''مکان ذرا عجیب مغلیہ طرز تعمیر کا ہے نا، خاصا پرانا اور بوسیدہ بھی، اسی لیے مجھے کچھ تجسس سا ہوا تھا کہ بھلا اس میں کون رہتا ہوگا؟''

''آپا شگفتہ اور ان کی جوان بیٹی نگہت کافی عرصے سے یہاں تنہا رہتی چلی آ رہی ہیں۔ بے چاری دونوں ماں بیٹی دکھی ہیں لیکن باپردہ اور شریف ہیں۔'' رحیم یونہی بتانے لگا اور میں بظاہر بے پروائی لیکن درونِ خانہ غور سے اس کی باتیں سنتا اور سر ہلاتا رہا۔

''کمال ہے، دونوں خواتین اکیلی رہتی ہیں؟ کوئی مرد تو ہوگا ان کے ساتھ؟'' میں نے پوچھا۔

''تھا بھی لیکن پھر عرصہ ہوا وہ ایک دن اچانک غائب ہو گیا۔ وہ اس کا شوہر تھا۔ بالا...... کہتے تھے اسے سب لوگ۔ میں تو خود اس محلے میں نیا ہی ہوں مگر سنا میں نے بھی یہی ہے کہ شگفتہ جو آپا کے نام سے مشہور ہیں، ان کی اپنے شوہر سے نہیں بنی تھی اسی لیے وہ ان دونوں ماں بیٹی کو چھوڑ کر چلا گیا۔ بیٹی شاید اس وقت گود کی تھی۔ اب یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ وہ بیوی کے لیے نہیں مگر اپنی بیٹی نگہت کی محبت میں کبھی کبھار یہاں اس سے ملنے آتا ضرور ہے۔'' رحیم نے بات مکمل کی اور میرے دماغ میں ''بالا......

بالا......'' اور ساتھ ہی ''اقبال...... اقبال'' گونجنے لگا پھر یونہی میں نے سر جھٹک دیا۔

ضروری تو نہیں کہ ہر اقبال نامی شخص ایک ہی ہو۔ اگرچہ بالا، اقبال کا ہی بگڑا ہوا نام تھا۔ میں اپنی سوچ پر ایک لمحے کے لیے خود ہی مسکرا دیا۔

''تم مسکرا دیے صاحب؟'' رحیم نے حیرت سے کہا۔

''ہاں، بابا!'' میں نے قدرے جھینپ کر کہا۔ ''بس یونہی، ایسی روایتی کہانیوں پر مجھے ہنسی اور کبھی رونا آجاتا ہے۔ آؤ اندر چلیں۔''

رحیم تو کسی کام سے نکلا تھا اسی لیے وہ بازار کی طرف نکل گیا جبکہ میں اندر آگیا۔

راحیلہ اور فوزیہ کچھ دیر آرام کے بعد جاگ چکی تھیں۔ جنت نے انہیں چائے دی۔ مجھے دیکھ کر اس نے مجھ سے بھی پوچھا اور میں نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

کچھ دیر بعد ہم دونوں چائے پینے اور آپس میں ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ اسی اثنا میں سدرہ اور محمود بھی آگئے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ چائے پینے لگے۔ سات بج چکے تھے۔ میرے دماغ میں وہی دونوں خواتین آپا شگفتہ اور اس کی نوجوان بیٹی نگہت کا تذکرہ ہی گونجتا رہا۔

آج سدرہ اور محمود کے ساتھ میری رات دس بجے والی ٹرین میں کراچی روانگی تھی۔ فوزیہ اور راحیلہ اداس اور چپ چپ سی تھیں جبکہ حقیقت یہ تھی کہ خود میرا بھی اب اس نئی ''اڑچن'' کے بعد یہاں سے جانے کا ارادہ بدلنے لگا تھا۔

میں شگفتہ آپا اور اس کی نوجوان بیٹی کا یہ معما حل کرنا چاہتا تھا۔ جیسا کہ میں سوچ رہا تھا اگر وہی درست تھا تو پھر ہمارا ایک اہم دشمن ہماری بغل میں ہی موجود تھا۔

اگرچہ ان دونوں ماں بیٹی کو میں دشمن تو نہیں کہہ سکتا تھا لیکن اگر ان کا کسی بھی حوالے سے اقبال سے تعلق نکلنے لگتا تو پھر یہ اس کے خلاف میرے ہاتھ ایک اہم ہتھیار ثابت ہوسکتا تھا۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ میں عارضی طور پر ہی سہی کراچی جانے کا اپنا پروگرام سردست ملتوی کرتا بھی تو وہاں کے معاملات کا کیا بنتا؟ میں اس پر غور کرنے لگا۔

مختلف زاویوں سے سوچ بچار کے بعد اچانک میرے ذہن میں اس مسئلے کا بھی حل آہی گیا۔

میں نے سدرہ اور محمود سے جب ان دونوں مذکورہ خواتین کا ذکر کیا تو انہیں بھی حیرانی ہوئی۔ وہ بھی سوچ میں پڑ گئے۔

''میں تو اتنا عرصہ یہاں کبھی رہی بھی نہیں اسی لیے میں یقین سے یہ بات نہیں کہہ سکتی کہ آیا کبھی وہ مردود اقبال یہاں آیا ہوگا۔'' سدرہ نے کہا۔

''میرا خیال ہے رحیم اور جنت سے پوچھ لیتے ہیں۔'' محمود نے مشورہ دیا۔

''وہ میں ان سے پوچھ چکا ہوں۔ انہوں نے اس حلیے کے کسی آدمی کو نہیں دیکھا البتہ ایک نوجوان ضرور آتا جاتا رہا ہے جس کے ساتھ اس لڑکی نگہت کی دوستی ہے۔''

''لیکن کراچی والے مسئلے کا کیا کیا جائے؟ مما کی جان خطرے میں ہے۔'' سدرہ نے پریشانی سے کہا تو میں بولا۔

''میرا خیال ہے آپ اور محمود صاحب کراچی چلے جائیں۔ آپ کی موجودگی وہاں ضروری ہے۔ اب جبکہ آپ کی مما کو بھی اپنے سوتیلے بھائی کی اصلیت کا علم ہو ہی چکا ہے تو اور زیادہ محتاط رہتے ہوئے اور سجاد بیگ پر کچھ بھی ظاہر کیے بغیر اسے مزید کوئی اور گل کھلانے کا موقع نہ دیا جائے۔ وہ بہرحال آپ کے گھر کا مالک نہیں ہے اور نہ ہی کسی قسم کی زبردستی کرسکتا ہے۔ تاہم اس کے ڈھکے چھپے شر اور کسی قسم کی بدمعاشی سے بچنے کے لیے مجھے ایک شخص چھوٹا خان سے بات کرنا ہوگی۔ وہ میری غیر موجودگی میں ضرور آپ کی مدد کرتا رہے گا۔''

''چھوٹا خان!'' سدرہ زیر لب بڑبڑائی۔ ''کہیں یہ وہی شخص تو نہیں جس نے......''

''میری ضمانت کروائی تھی۔'' میں نے درمیان میں اس کی بات کاٹ کر ہولے سے کہا۔ ''یہ اس شخص کا مجھ پر ایک بڑا احسان تھا جس نے مجھے اس راشی اور ظالم پولیس انسپکٹر تیمور سے جان چھڑوائی تھی ورنہ وہ خبیث تو مجھے تھانے میں ہی ماورائے قانون ہلاک کرنے کا ارادہ کر چکا تھا۔''

''اس کا کوئی رابطہ نمبر؟'' سدرہ نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''ہے میرے پاس۔''

''تو پھر اس سے بات کرلو۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''لیکن آخر یہ چھوٹا خان ہے کون؟'' دفعتاً راحیلہ درمیان میں بول پڑی۔ ہم اس کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ خاصی دور کی کوڑی لانے کے انداز میں مزید بولی۔

''اس پراسرار آدمی کی خود اپنی ذات سات پردوں کے پیچھے چھپی ہوئی ہے۔ نہ جانے یہ کون آدمی ہے اور کیوں سہراب کا اتنا ہمدرد بنا ہوا ہے۔ میں اور فوزیہ بارہا اس آدمی کے متعلق تبادلہ خیال کرتی رہی ہیں۔ لگتا ہے یہ بھی کوئی

خطرناک آدمی ہے اور ضرور اقبال کی طرح یہ بھی کوئی بڑا کرمنل یا کسی بڑے ڈان کا حواری ہے۔"

"اس کے متعلق ہمارا ایک گمان یہ بھی ہے کہ یہ اقبال کا کوئی مخالف یا دشمن گروہ ہے جو ہماری مدد کی آڑ میں سہراب کو اپنے احسان تلے دباتے ہوئے اسے مستقبل میں اپنے مطلب کے لیے کیش کرسکتا ہے۔"

فوزیہ نے بھی راحیلہ کی بات کے تناظر میں یہ کہا تو میں مسکرا کر بولا۔

"یہ بات میرے ذہن میں پہلے سے ہے لیکن میرا خیال ہے کہ اس کے لیے ابھی سے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ پھوٹا خان یا درِ پردہ اس کا کوئی باس ایسا کچھ سوچے ہوئے بھی ہے تو اسے یہ علم ضرور ہوگا کہ میں بہرحال کوئی کرمنل نہیں ہوں اور نہ ہی قانون شکنی کرنا میرا بھی مقصد رہا ہے۔ ہاں، یہ ضرور ہے کہ اپنے مخالف گروہ کے سربراہ اقبال کی بیخ کنی کے سلسلے میں اگر میری وجہ سے اسے کوئی موقع ہاتھ آیا ہے تو اس میں کیا قباحت ہے کہ اس کی مدد لے لی جائے بلکہ وہ مدد میں لے ہی چکا ہوں۔"

القصہ...... میں نے پھوٹا خان سے فون پر رابطہ کیا۔ اس نے مجھے نمبر دے رکھا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ٹھٹھہ میں رہتا ہے اور کراچی میں بھی اس کی سکونت رہتی ہے۔

یہ ٹیلی فون نمبر اس کی کراچی والی کسی رہائش گاہ کا تھا۔ دوسری طرف جانے والی تیسری بیل پر کسی نے فون اٹھایا۔

"ہیلو!" ایک سپاٹ سی مردانہ آواز دوسری جانب سے ابھری تھی۔

"پھوٹا خان سے بات ہوسکتی ہے؟" میں نے بھی اسی لہجے میں پوچھا۔

"تم کون ہو بابا؟" دوسری جانب سے بھی اسی لہجے میں پوچھا گیا۔

"میرا نام سہراب ہے اور پھوٹا خان میرا دوست ہے۔"

میرے یہ کہنے کی دیر تھی کہ دوسری جانب اچانک تھوڑی دیر کے لیے خاموشی طاری رہی پھر جب دوبارہ وہ شخص بولا تو اس کا لہجہ سپاٹ یا رعب دار ہونے کے بجائے ایک دم خفیف سا ہوگیا اور فوراً بولا۔

"اچھا، اچھا...... سہراب سائیں! میں پہچان گیا آپ کو...... سائیں پھوٹا خان نے مجھے تمہارے بارے میں بتا رکھا تھا کہ جیسے ہی تمہارا کوئی فون آئے، انہیں اطلاع کردوں۔ بس تسلی کے لیے مجھے فقط اتنا بتادو کہ کیا آپ وہی سہراب علی خان ہو جسے سائیں پھوٹا خان نے تھانے سے ضمانت پر رہا کروایا تھا؟"

"میں وہی ہوں سائیں!" میں نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔ اس کی تسلی ہوگئی تو وہ بولا۔

"بہترین ہوگیا۔" وہ بولا۔

"کیا مطلب؟"

"میرا مطلب ہے سائیں کہ میری تسلی ہوگئی۔ اب بات یہ ہے کہ وہ تو اس وقت یہاں موجود نہیں ہیں لیکن انہوں نے مجھ سے کہہ رکھا تھا کہ جیسے ہی سہراب کا کوئی فون آئے، انہیں خبر کردوں۔ آپ اپنا نمبر بتادیں جہاں سے فون کررہے ہو۔ وہ آئیں گے تو خود ہی آپ سے رابطہ کریں گے۔"

میں نے اسے یہاں کا نمبر بتادیا اور یہ بھی کہ میں زیادہ دیر اس نمبر پر نہیں مل سکوں گا۔ اس شخص نے اپنا نام منٹھار بتایا تھا۔

"بہترین ہوگیا سائیں!" وہ بولا۔ اس کے بعد رابطہ منقطع ہوگیا۔

سدرہ اسی رات دس بجے والی ٹرین میں محمود کے ساتھ کراچی کے لیے روانہ ہوگئی۔ مجھے ابھی آپا شگفتہ اور اس کی بیٹی نگہت کی تھوڑی بہت جاسوسی کرنا تھی۔

راحیلہ اور فوزیہ میرے کراچی نہ جانے پر خوش ہوگئی تھیں۔ مجھے پھوٹا خان کے فون کا بھی انتظار تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جیسے ہی وہ آئے گا یا منٹھار کے ذریعے اسے میرا پیغام ملے گا تو وہ فوراً مجھ سے ٹیلی فون پر رابطہ کرنے کی کوشش ضرور کرے گا۔

رات دس بجتے ہی میں گھر سے باہر نکل آیا۔ قریب نکڑ پر دودھ والے کی دکان تھی۔ وہاں لوگ ٹھنڈی کھوئے والی بوتلوں کا دودھ پیتے یا میٹھی لسی۔ میں بھی اسی طرف چلا گیا۔

وہاں گاہکوں کا رش دیکھنے میں آرہا تھا۔ زیادہ تر تعداد نوجوانوں کی تھی۔ مختصر سے احاطے میں بھی کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ باقی لوگ کھڑے کھڑے دودھ یا میٹھی لسی پینے میں مشغول تھے۔ چند لوگ بائیک پر بھی تھے اور ان کے ہمراہ کوئی خاتون یا لڑکی بھی ہوتی۔

میں نے بھی دودھ کی بوتل لے لی اور کھڑے ہوکر پینے لگا۔ یہاں سے مجھے آپا شگفتہ کے گھر کا ایک حصہ نظر آرہا تھا۔ دروازے والی دیوار دوسری جانب تھی لیکن اگر کوئی وہاں آتا جاتا تو مجھے نظر آجاتا جبکہ دروازے پر کھڑا کوئی دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔

اچانک ایک بائیک بھوں...... بھوں کرتی آئی اور قریب سے گزر گئی۔ میں نے چونک کر دیکھا اور یکلخت

میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ یہ وہی نوجوان لڑکا تھا جسے میں نے آج تقریباً سہ پہر میں دیکھا تھا۔

وہ سیدھا اسی مکان کے سامنے جا کر رکا اور دو بار مخصوص انداز میں ہارن بجایا۔

میں دودھ کی بوتل پیتے ہوئے اسی سمت تکتا رہا۔ ذرا دیر بعد ہی وہ لڑکی اندر سے برآمد ہوئی۔ اس نے اب کے عبایا نہیں پہنا ہوا تھا۔ ایک چادر سی ضرور اوڑھ رکھی تھی۔ وہ اسی پھرتی اور چابکدستی سے اچھل کر اس کے پیچھے بائیک پر بیٹھ گئی جیسا کہ میں اس کو پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔

مجھے شبہ ہوا کہ یہ دونوں کسی فائٹ کلب کے ممبر ہو سکتے تھے کیونکہ ایک بڑی اور نامعلوم تربیت گاہ کا میں بھی ممبر رہ چکا تھا۔ بھلا ایسی باتیں میں کیسے دوسروں میں فوری طور پر محسوس نہیں کر لیتا۔

میری دودھ کی بوتل ختم ہو گئی۔ بختیارے کی دی ہوئی پرانے ماڈل کی کرولا کار کی چابی میری جیب میں تھی۔ میرا ارادہ ان کے تعاقب میں جانے کا ہوا۔ ابھی میں دوڑ کر گھر کے سامنے کھڑی کار میں سوار ہونے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ انہیں ادھر ہی آتے دیکھ کر پُرسکون ہو گیا۔

میں سمجھ گیا تھا کہ یہ دونوں یہاں لسی یا دودھ پینے کا ارادہ کیے ہوئے تھے۔ میں نے فوراً ان کی جانب سے نظریں ہٹا کر ایک عدد میٹھی لسی کے گلاس کا بھی آرڈر دے دیا۔

وہ دونوں آپس میں باتیں کرتے ہوئے میرے قریب آ کر رک گئے۔ لڑکے نے ایک دو بار بلاوجہ شوخی میں بائیک کے ایکسلریٹر کو زور سے ”بھوں..... بھوں“ کیا اور سوئچ آف کر دیا۔ دونوں بائیک سے اتر گئے۔

میں نے بظاہر سرسری نظر ان پر ڈالی اور دودھ والے سے لسی کا گلاس لے لیا۔

لڑکے نے بائیک کو سائڈ اسٹینڈ پر کھڑا کیا اور لڑکی اس پر ٹک کر بیٹھ گئی۔ لڑکے نے دودھ والے کو ہانک لگائی۔

”چودھری صاحب! دو گلاس میٹھی لسی۔“

”ابھی حاضر کرتا ہوں۔“ اونچے تخت پر بڑا سا چوبی پٹڑا رکھے ایک پہلوان نما لنگی پہنے شخص نے کہا اور پھر لسی گڑ کنا شروع کر دی۔

میں بظاہر ان دونوں سے لاتعلق اور دانستہ لسی کے گلاس کے آہستہ آہستہ گھونٹ بھرنے لگا کہ یہ جلدی ختم نہ ہو جائے۔ وہ دونوں آپس میں باتیں کرنے لگے۔ لڑکی بائیک کی گدی پر ٹکی بیٹھی رہی اور لڑکا اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”تم امی جان کی فکر نہ کرو، وسیم! بس، میرے پاپا ذرا.....“ لڑکی نے کہتے ہوئے دانستہ جملہ ادھورا چھوڑا۔ وہ بہت آہستہ باتیں کر رہے تھے۔ میں ان سے چند ہی قدموں کے فاصلے پر لاتعلق سا کھڑا گلاس ہلا ہلا کر لسی پیتا رہا۔

”سمجھ میں نہیں آتا، جب تمہارے پاپا کا تم دونوں ماں بیٹی کی زندگی میں کوئی دخل ہی نہیں تو پھر آخر تمہیں کیوں ان کی اتنی فکر ستاتی ہے؟“ لڑکے نے جس کا نام وسیم معلوم ہوا، قدرے جھلا کر کہا۔

”ہے تعلق..... کیسے نہیں ہے۔“ لڑکی نے کہا۔

”امی جان سے نہیں تو یہ ان کا آپس کا معاملہ ہے۔ میرے تو وہ بہرحال پاپا ہیں اور رہیں گے۔ وہ مجھے بھولے ہیں نہ میں انہیں بھلا سکی ہوں۔“

”تو کیا انہیں انٹرویو دینے کے لیے مجھے کراچی جانا پڑے گا؟“ لڑکے نے کہا تو لڑکی ہنس دی۔ اسی وقت انہیں لسی کے دو گلاس تھما دیے گئے۔ دونوں نے چند گھونٹ بھرے۔ اس دوران ایک وقت دونوں نے میری جانب بھی دیکھا تھا اور میں فوراً ان سے نظریں ہٹا کر اپنے گلاس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”ارے نہیں بابا! میں نے بتایا تو تھا تمہیں۔ پاپا صرف مجھ سے ملنے کے لیے اتنی دور کا سفر کر کے آتے ہیں۔ کبھی اپنے کسی آدمی کو بھیج دیتے ہیں میری خیر خیریت کے لیے..... اور کچھ قیمتی تحفے دینے کے لیے۔“

”تمہاری امی جان کو اقبال چوک والے بنگلے کا علم ہے جہاں تم دونوں باپ بیٹی کی ملاقات ہوتی ہے؟“

”بالکل ہے۔ انہیں سب معلوم ہے مگر وہ باپ بیٹی کی محبت کے درمیان حائل ہونے کی کوشش نہیں کرتیں۔ امی جان کی یہ بات مجھے بے حد پسند ہے۔“

”اچھی بات ہے۔ تو اس کا مطلب ہے کہ مجھے اقبال چوک والے بنگلے میں ہی انٹرویو دینا ہو گا؟“

”یہ تم نے کیا انٹرویو..... انٹرویو کی رٹ لگا رکھی ہے؟“ لڑکی مصنوعی خفگی سے بولی۔

اسی وقت تین اوباش سے لڑکے دو بائیکس پر وہاں آ پہنچے۔ ایک نے لڑکی پر کوئی جملہ کسا۔ تینوں اتر گئے۔ وسیم نامی لڑکا طیش میں آ گیا۔ لڑکی نے اسے پنگا لینے سے منع کر دیا۔

بظاہر معاملہ ٹھنڈا ہو گیا۔ ان تینوں لڑکوں نے لسی اور دودھ کا آرڈر دیتے ہوئے پھر لڑکی پر جملہ کسا۔ اس بار بہت ہی ناگوار اور بے ہودہ جملہ تھا جسے سن کر وسیم ہی نہیں، اس کی دوست لڑکی بھی بری طرح طیش میں آ گئی۔

”تم ٹھہرو وسیم! اس نے مجھ پر جملہ کسا ہے، اسے مزہ بھی میں ہی چکھاؤں گی۔“ لڑکی نے غصے سے دانت پیتے

ہوئے کہا اور میری نظروں نے حیرت ناک منظر دیکھا۔ لڑکی نے لسی کا گلاس اپنے دوست کو تھمایا اور چادر اتار کر اسے گھما کر رول کرتے ہوئے اپنی کمر پر بیلٹ کی طرح کس لی۔

تب ہی میں نے دیکھا وہ اندر سے خاصی چست پینٹ اور اسی طرح کی قمیص پہنے ہوئے تھی۔ ایسے میں وہ مزید اسمارٹ اور خوبرو نظر آ رہی تھی۔

وہ ان تینوں اوباشوں کے قریب گئی اور پھر اگلے ہی لمحے میری ہی نہیں، دکان پر کھڑے لوگوں کی بھی آنکھیں پھیل گئیں۔ لڑکی نے رائٹ کک کو اس طرح گھما کر ایک اوباش لڑکے کے سینے پر رسید کیا کہ وہ اچھل کر سڑک پر جا گرا۔ دوسرے لڑکے نے اس پر حملہ کرنا چاہا تو وہ لڑکی دوسری ٹانگ پر گھومی اور رائٹ ہک کی ضرب اس کی پسلیوں میں رسید کر ڈالی۔ دوسرے اوباش لڑکے کے منہ سے اوغ کی کریہہ آواز خارج ہوئی اور تیسرے نے دودھ کی بوتل پھینکی اور بائیک کی جانب دوڑا۔

''ارے رے...... رے...... اب کہاں جا رہے ہو۔ ساری شوخی نکل گئی ایک زنانی کی مار سے۔'' وسیم نامی لڑکا چہک کر بولا۔ ''ابھی تو میں نے ہاتھ نہیں دکھایا۔''

باقی دو مضروب لڑکوں نے بھی وہاں سے بھاگ جانے میں ہی عافیت جانی۔

''انہوں نے غلط جوڑے سے پنگا لے لیا۔ اب انہیں کون بتاتا کہ اپنے وسیم باؤ اور نکہت بی بی کیا شے ہیں۔'' پہلوان دودھ والے نے بھی ہانک لگائی۔ لوگ ستائشی نظروں سے ان دونوں کی جانب دیکھنے لگے۔

دودھ والا کسی کو بتا رہا تھا کہ یہ نوجوان جوڑا کراٹے کلب کا ممبر ہے۔ یہ آواز میرے کانوں میں پڑی اور میں نے بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس لی جبکہ میری مشاق اور گھاگ نظروں نے پہلے ہی ان کی چال کی چابک دستی سے یہ بات تاڑ لی تھی کہ دونوں عام لڑکا لڑکی نہیں ہیں۔

وہ دونوں ایک بار پھر آرام سے لسی پینے لگے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ میری لسی کا گلاس ختم ہو چکا تھا لیکن میں ابھی ان دونوں کی مزید باتیں سننے کو بے قرار تھا مگر مجبوری تھی اسی لیے میں نے بل دیا، گلاس رکھا اور پلٹ گیا۔

رات کی تاریکی میں گلی کی سڑک سنسان ہونے لگی تھی۔ میں ذرا آگے جا کر ایک چھپر اسی دکان کے تھڑے کے پاس کھڑا ہو گیا۔

اب میرے سامنے لڑکی کا گھر تھا اور بائیں جانب سدرہ کا۔ لڑکا اور لڑکی کے نام مجھے معلوم ہو چکے تھے۔ دیکھا جاتا تو ابھی تک یہ بات واضح نہیں ہوئی تھی کہ آیا نکہت نامی لڑکی واقعی باس اقبال کی بیٹی تھی یا کچھ اور۔

دفعتاً بائیک کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی۔ میں تاریک گوشے میں دبکا رہا۔ وہ دونوں گھر کی طرف ہی آ رہے تھے۔ میرے قریب سے گزرے ہی تھے کہ بائیک کا انجن بند ہو گیا۔ نکہت اتر گئی۔ اس کا گھر قریب تھا۔ وسیم کک مارتا رہا مگر بائیک نے اسٹارٹ ہونے کا نام نہیں لیا۔

''اوہ...... یہ کیا مصیبت پڑ گئی اسے۔'' وسیم نے جھلا کر بائیک کو کوسا۔

''اوکے، نکہت! تم جاؤ۔ کوئی تار وار ہل گئی ہوگی۔ میں دیکھ لوں گا۔'' وسیم نے اس سے کہا۔

''نہیں، تم دیکھ لو، کیا پتا کسی شے کی ضرورت پڑ جائے تمہیں۔'' نکہت نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ دونوں میں پکا یارانہ لگتا تھا۔ میں ابھی تک تاریک گوشے میں کھڑا تھا۔ وہ اگر غور سے اس طرف دیکھتے تو میرا ہیولا انہیں نظر آ جاتا۔

مجھے ایک بار پھر امید ہو چلی تھی کہ شاید اب میرے مطلب کی کوئی بات کریں مگر بائیک........ کے سوا اور کوئی موضوع اب ان کے پاس نہ رہا تھا۔

بالآخر میں کچھ سوچ کر ان کی مدد کے لیے تاریک گوشے سے نکل کر ان کے سامنے آ گیا۔

''میں کچھ مدد کر سکتا ہوں؟''

مجھے اچانک سامنے سے نمودار ہوتے دیکھ کر دونوں ہی چونک کر میری جانب متوجہ ہوئے۔

''آپ کی تعریف؟'' وسیم نے خشک لہجے میں مجھ سے کہا۔ نکہت بڑے غور اور تیز نگاہوں سے مجھے تکے جا رہی تھی۔ میرا قد وسیم سے نکلتا ہوا تھا اور ڈیل ڈول بھی اس سے سوا ہی تھا۔ پینٹ شرٹ اور پیروں میں جوگر ٹائپ بوٹ میں نے بھی چڑھا رکھے تھے۔

''تم وہی تو نہیں جو ابھی کچھ دیر پہلے پہلوان کی دکان پر......''

''میں وہی ہوں۔'' میں نے نکہت کی بات کاٹ کر جواب میں کہا۔

''تم یہاں کھڑے کیا کر رہے تھے؟'' اس نے ترش لہجے میں پوچھا۔

''لو، نیکی برباد گناہ لازم...... آپ نے تو الٹا مجھ سے سوال جواب کرنا شروع کر دیے۔ معاف کرنا، مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں اپنا راستہ لیتا ہوں۔'' کہتے ہوئے میں جانے کے لیے ایک طرف کو بڑھا۔

''اے مسٹر! ٹھہر جاؤ۔'' اچانک عقب سے وسیم نے

تیز آواز میں مجھے پکارا۔ میں رک گیا مگر اس کی جانب پلٹنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ تب ہی میں نے نکہت کو وسیم سے کہتے سنا۔

''یہ ہمارے مکان کی جاسوسی کر رہا ہے۔ جوجی کا آدمی لگتا ہے۔''

''ادھر آؤ......'' وسیم کا لہجہ تحکمانہ اور خاصا اکھڑا ہوا تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا نہ ان کی جانب گھوما اور اسی طرح دوسری جانب منہ کیے بولا۔

''میں آگے بڑھتے ہوئے قدم پیچھے نہیں اٹھاتا اور پیٹھ پیچھے آواز کو خاطر میں نہیں لاتا۔ جو کہنا ہے ادھر آ کر اور میرے سامنے کھڑے ہو کر بولو۔ میں صرف تین سیکنڈ تک تمہارے آنے کا انتظار کروں گا۔''

''وہی ہے۔ ورنہ کس کی جرأت ہے ہمیں للکارنے کی۔'' نکہت نے پھر وسیم سے کھسر پسر کی۔

ٹھیک اسی وقت کسی گاڑی کی تیز ہیڈ لائٹس سے تاریک سڑک کا یہ گوشہ چندھیانے لگا۔ بغیر ہڈ والی ایک جیپ تیزی سے ایک موڑ کاٹ کر آئی اور اس کے ٹائر چر چرائے۔

میں نے دیکھا۔ اس میں سوار چار تنومند لڑکے نن چکو پکڑے اور ہاتھوں میں کلپ لگائے کدکڑے مار کر نیچے اترے۔

میں گھوم گیا۔ جیپ وسیم اور نکہت کے قریب کھڑی تھی۔ ان چاروں نے آناً فاناً ان دونوں کو گھیرے میں لے لیا تھا۔

میں نے دیکھا، وسیم اور نکہت بھی ایک لمحے کو پریشان سے نظر آنے لگے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ان کا دونوں سے کوئی پرانا ''حساب کتاب'' چل رہا تھا جیسا کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے نکہت نے وسیم سے میرے بارے میں کہا تھا کہ یہ جوجی کا آدمی لگتا ہے۔

بہرکیف، میری رگوں میں خون کی گردش یکلخت تیز ہوگئی۔ میں ان سب سے چند قدموں کے فاصلے پر اب ان کی جانب رخ کیے دونوں ٹانگیں پھیلائے کھڑا تھا۔

لڑکوں میں ایک نسبتاً قد آور اور کسرتی جسم کے مالک لڑکے نے میری جانب ہانک لگاتے ہوئے چٹکی بجا کر کہا۔

''اوئے، تو جا یہاں سے...... پرائے جھگڑے میں بلاوجہ خرچ ہو جائے گا۔''

''نہیں، میں تماشا دیکھنا چاہتا ہوں۔'' میں نے وہیں کھڑے کھڑے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''اوئے تیری تو......'' وہی لیڈر نما لڑکا نن چکو گھماتا ہوا میری جانب بڑھا۔

''ان دونوں پر نظر رکھو، پہلے میں اس تاریک گلی کے لوسی کتے کو لٹا دوں۔''

مجھے کتے والی گالی نے نیچے سے اوپر تک بری طرح سنسنا کر رکھ ڈالا۔

وہ تیزی اور مہارت سے نن چکو گھماتا ہوا میری جانب بڑھ رہا تھا اور میں اسی طرح اپنے دونوں ہاتھ پہلوؤں پر رکھے بظاہر مطمئن انداز میں ٹانگیں پھیلائے کھڑا رہا اور پھر جیسے ہی وہ قریب آیا اور اس نے نن چکو کا وار مجھ پر کیا تو میں نے کھڑے کھڑے فقط اپنی ایک ٹانگ اس مہارت سے بلند کر کے اس کے گردش کرتے نن چکو میں اڑا دی کہ وہ زنجیر سمیت میری ٹانگ میں لپٹ گیا۔

مجھے نن چکو کی زنجیر کی جکڑن سے تکلیف تو پہنچی تھی مگر وہ اس تکلیف سے زیادہ نہ تھی جو کتے والی گالی سے مجھے پہنچی تھی۔

میں نے اپنی ٹانگ کو ایک جھٹکا دیا اور نن چکو اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر میری ٹانگ میں لپٹا رہ گیا۔ میں نے ابھی تک اپنے دونوں ہاتھ پہلوؤں سے نہیں ہٹائے تھے۔

لیڈر لڑکے کی ہی نہیں بلکہ وسیم اور نکہت سمیت اس کے باقی تینوں جنگجو نظر آنے والے ساتھیوں کے چہروں پر حیرت اور کچھ ''دلچسپی'' سی لہرائی تھی۔

''میں تم جیسے آوارہ اور سڑک چاٹنے والے کتوں سے اپنے ہاتھ گندے کرنا مناسب نہیں سمجھتا کیونکہ انہیں صرف لاتوں سے بھگایا جاتا ہے۔''

یہ کہتے ہوئے میں نے نن چکو سے لپٹی ہوئی ٹانگ کو پھر اٹھایا۔ ایک لمحہ ہکا بکا سے کھڑے لیڈر لڑکے کے چہرے کے سامنے چند سیکنڈ تک کچھ انچ فاصلے پر کیے رکھا اور پھر اسی سے اس کے سینے، گردن اور چہرے پر بجلی کی سی تیزی سے ضربات رسید کرتا چلا گیا۔ ہاتھوں سے چلانے والے نن چکو کو میں صرف ایک ٹانگ سے چلا رہا تھا اور یہ مظاہرہ ان متوقع فائٹر کلب کے ممبران کے لیے نیا ہی تھا۔

یوں نن چکو کے دونوں موٹے اور لمبے دستے تالیاں پیٹتے اس کی تواضع کرتے رہے اور وہ اپنے بچاؤ کے لیے بہتیرے جتن کرتا رہا مگر میرے اندر تو جیسے پارہ دوڑ رہا تھا۔ اس کا چہرہ لہولہان ہو گیا تھا۔

اپنے لیڈر کا یہ حشر دیکھ کر اس کے باقی تینوں ساتھی اپنے ''اصل'' دشمنوں (وسیم اور نکہت) کو بھلا کر میری جانب لپکے ہی تھے کہ تب وسیم اور نکہت بھی بیک وقت میری مدد کو حرکت میں آئے اور پھر اچھا خاصا جنگ کا سماں طاری ہو گیا۔

اردگرد اور گھروں سے کچھ لوگ نکل آئے اور تب ہی اچانک پولیس سائرن کی آواز ابھری۔ شاید کوئی گشتی پولیس موبائل اس طرف کو نکل آئی تھی۔

دشمنوں کے بعد پولیس والوں سے تو مجھے خدا واسطے کا بیر تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سائرن کی آواز سنتے ہی میں نے راہِ فرار کی ٹھانی اور دوڑ لگانے کے بجائے نہایت ہوشیاری اور مستعدی سے تاریکی میں کھسک گیا۔

یہاں تنگ سی گلی تھی۔ میں اندر داخل ہو گیا اور تیز تیز چلنا شروع کر دیا۔ عقب میں سائرن کی آواز بدستور سنائی دیتی رہی پھر اس کے بعد ٹائروں کی چرچراہٹ اور بائیک کے اسٹارٹ ہونے کی بھی آواز ابھری۔

پولیس اور وہ سب لڑکے ان میں ''مصروف'' ہو گئے اور میں اب گلیوں کی راہ لیتا ہوا مین روڈ پر آ گیا۔

اب میرے چلنے کا انداز مٹرگشت کرنے کا سا تھا۔ اگرچہ پولیس کا خطرہ اپنی جگہ تھا تاہم فوری طور پر ٹل ضرور گیا تھا۔ میں ایک چکر گھوم کر گھر کی طرف چل دیا۔ گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ چھوٹا خان کا فون آیا تھا۔

''تم کہاں چلے گئے تھے؟ دو بار چھوٹا خان کا فون آ چکا ہے۔'' راحیلہ بولی۔

''میں ذرا قریبی چوک پر میٹھی لسی پینے چلا گیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''تم سے کیا بات کی اس نے؟''

''یہی کہ ہم اس وقت کہاں ہیں اور باقی خیریت معلوم کرتا رہا۔''

''تم نے کیا بتایا اسے؟'' میں نے کہا۔

''اب یہ تو اسے بھی پتا ہی تھا کہ ہم سیالکوٹ پہنچ چکے ہیں۔'' راحیلہ بولی۔ ''باقی اقبال وغیرہ کے بارے میں بوچھتا رہا کہ اس کے کسی آدمی سے کوئی ٹکراؤ وغیرہ تو نہیں ہوا لیکن میں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ اس کی تفصیل سہراب ہی آ کر بتا سکتا ہے۔''

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ ''اسی کا فون ہوگا۔'' راحیلہ بولی۔ فوزیہ کمرے میں آرام کر رہی تھی۔ رات کافی ہو چکی تھی۔ راحیلہ نے بھی کمرے کا رخ کیا۔ میں فون کی جانب بڑھا اور ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔

''ہیلو۔''

''اڑے بابا، سہراب خان! کیا حال ہے تمہارا؟ سب خیریت ہے نا؟ مجھے تمہاری بڑی فکر ہو رہی تھی۔ ملنطمار نے مجھے بتایا کہ تم نے فون کیا تھا۔ سب ٹھیک ہے نا؟'' وہ ایک ہی سانس میں بولتا چلا گیا۔

''فی الحال سب ٹھیک ہے سائیں!'' میں نے سکون سے کہا اور پھر مختصراً اسے بتا دیا کہ ہم سیالکوٹ پہنچ چکے ہیں اور باقی تفصیل سردست بتانا مقصود نہیں سمجھا۔

''اچھا ہوا تم نے رابطہ کیا، مجھے تسلی ہو گئی۔'' وہ بولا۔

''اب کراچی کب واپسی ہے؟'' اس نے آخر میں پوچھا۔

''کچھ ہی دن میں متوقع ہے۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔ ''مگر آپ سے ایک ضروری کام تھا۔''

''اڑے بابا! حکم کرو۔ کیا بات ہے؟'' چھوٹا خان نے حسبِ عادت فراخ دلی سے کہا۔

میں نے اسے سیٹھ سکندر مرحوم کی بیوہ اور اس کی بیٹی کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔

''بس سائیں! اسی سلسلے میں آپ سے تھوڑی مدد چاہیے تھی، جب تک میں یہاں ہوں۔ جلد کراچی پہنچ گیا تو پھر میں سنبھال لوں گا۔''

''بے فکر ہو جاؤ۔'' وہ بولا۔ ''اقبال کے بعد سجاد بیگ ہمارا بھی ٹارگٹ ہے۔ ویسے یہ اچھا ہوا کہ بیگم سکندر کو بھی اپنے بھائی کی بدنیتی کا پتا چل گیا۔ ویسے یہ انکشاف میرے لیے حیرت انگیز ہے کہ وہ اس کا سوتیلا بھائی ہے۔''

''بس، مہربانی سائیں! یہی کہنا تھا میں نے۔''

''پھر وہی بات۔ مہربانی، احسان یہ سب دوستی یاری میں نہیں ہوتا۔ بس، فرض دوستی ہوتا ہے۔'' اس نے کہا اور پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''شاید تمہارے علم میں نہ ہو، اقبال کے دو نئے پالتو کتے سلیم چھالیا اور راجو بوری تمہارے پیچھے پنجاب روانہ ہو چکے ہیں۔ ہمارے ایک مخبر نے اطلاع دی تھی۔ ہوشیار رہنا۔ شاید ان لوگوں کو تمہاری سیالکوٹ روانگی کی خبر ہے۔''

''اطلاع دینے کا شکریہ سائیں! میں محتاط رہوں گا۔'' میں نے کہا۔

رابطہ منقطع ہونے کے بعد میرا دھیان اس نوجوان جوڑے وسیم اور نگہت کی طرف چلا گیا۔

جھگڑے کے دوران پولیس آ گئی تھی اور میں کھسک آیا تھا۔ اب نہ جانے وہاں کیا صورتِ حال تھی؟ آیا پولیس دوسرے حملہ آور لڑکوں کے گروپ کے ساتھ ان دونوں کو بھی پکڑ کر لے گئی تھی یا نہیں۔ مجھے اس کے بارے میں علم نہ تھا۔

اب رات بھی نصف بیت چلی تھی۔ میں اپنے کمرے میں آ کر سو گیا۔

☆☆☆

صبح میں دس بجے جاگا۔ راحیلہ اور فوزیہ جاگ چکی تھیں اور ناشتے کی میز پر میرا انتظار ہو رہا تھا۔ جنت اور رحیم ہماری خدمت میں لگے ہوئے تھے۔ میں نے غسل وغیرہ

کر کے نئی چست پینٹ اور اس کے اوپر ٹی شرٹ پہن لی۔ سیاہ چست پتلون پر ہلکی پرپل ٹی شرٹ بھلی لگ رہی تھی۔ میری کسرتی دراز قامتی اس میں خوب بج رہی تھی۔ سیاہ گھنے بال میں نے جیل لگا کر پیچھے کی طرف بنا رکھے تھے۔

جب میں ناشتے کی میز پر پہنچا تو فوزیہ میری جانب محبت سے دیکھ کر مسکرائی اور راحیلہ نے فقط ایک سنجیدہ سی نگاہ مجھ پر ڈالی۔ اب اس نے میرے ساتھ وہ پرانی روش چھوڑ دی تھی جس سے مجھے چڑ ہوتی تھی۔ شاید اس نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کرلیا تھا کہ اسے میری شکل میں جو منزل دکھائی گئی تھی، اس کا اب حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ اس کا رویہ بھی میرے ساتھ ایسا ہی ہوگیا تھا جیسے کوئی بڑا بزرگ یا بڑی بہن ہوتی ہے۔

ہم ناشتے میں مشغول ہوگئے۔

''رات چھوٹا خان سے تمہاری کیا بات ہوئی؟'' ناشتے کے دوران راحیلہ نے دریافت کیا۔

''یہی کہ ذرا اقبال اور سجاد بیگ پر کڑی نظر رکھے اور سدرہ اور اس کی ماں کو بھی ان سے تحفظ دینے کی کوشش کرتا رہے۔''

''تم اس اجنبی آدمی پر کچھ زیادہ ہی انحصار کرنے لگے ہو۔'' راحیلہ بولی۔

''مجبوری ہے۔''

''جان کا رسک تم نے لے رکھا ہے، پریشانیاں ہم بھگت رہے ہیں۔ ہمارا اور کوئی ٹھکانا رہا نہیں، باوجود اس کے چھوٹا خان کا دم چھلا میری سمجھ سے باہر ہے۔'' راحیلہ نے تلخ لہجے میں کہا۔

شاید یہ حالات کا شاخسانہ تھا کہ وہ بہت تلخ ہوتی جارہی تھی مگر اس کی بات غلط بھی نہیں تھی بلکہ اسے ہی نہیں، فوزیہ کو بھی چھوٹا خان سے ڈر ہی لگتا تھا۔ انہیں خدشہ تھا کہ ہم جس قدر اس آدمی کا احسان لیں گے، وہ مجھے اتنا ہی اپنے کسی غلط کام میں شامل ہونے پر مجبور کرسکتا ہے۔ اگرچہ ابھی تک ایسی کوئی بات اس نے نہیں کی تھی۔

جبکہ میرا خیال ان دونوں سے مختلف تھا۔ میں نے کہا۔ ''تم بلاوجہ چھوٹا خان کی طرف سے بدگمانی یا کسی بے معنی خدشات کا شکار ہو۔ وہ محض میرا اس لیے ساتھ دے رہا ہے یا مدد کررہا ہے کہ اقبال ان کا بھی دشمن ہے اور یہ تو عام سی بات ہے کہ دشمن کے دشمن سے دوستی کا ہاتھ ملانا مصلحت ہے اور ابھی اس سے ہونے والی تازہ ٹیلی فونک گفتگو میں اس نے اس بات کا بھی انکشاف کیا ہے کہ اقبال کا قریبی ساتھی سجاد بیگ بھی ان لوگوں کا ٹارگٹ ہے۔''

''انسان اسی طرح ایک دلدل سے نکل کر دوسری میں جا پھنستا ہے۔'' راحیلہ بولی۔ ''ابھی ہم ایک دلدل سے نکلے نہیں ہیں اور دوسری ہمارے لیے یہ چھوٹا خان تیار کررہا ہے۔''

فوزیہ خاموش تھی۔ میں نے اس کی جانب مدد طلب نظروں سے دیکھا۔ حقیقت یہی تھی کہ وہ دونوں ہی میری فکر میں گھلی جاتی تھیں۔ کبھی ایک کو اعتراض ہونے لگتا تھا تو کبھی دوسری کو۔ فوزیہ کی خاموشی دراصل راحیلہ کی تائید ہی تھی۔

ہم ناشتے سے فارغ ہوکر کمرے میں آگئے۔ ناشتے کے بعد چائے کا ایک دور کمرے میں بھی چلایا گیا۔ شکر تھا کہ دونوں خواتین سمجھ دار تھیں۔ چھوٹا خان والے موضوع کو زیادہ طول دے کر مجھے مزید پریشانی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھیں اسی لیے روئے سخن نئے موضوع کی جانب موڑتے ہوئے راحیلہ نے ان دونوں پڑوسی مشکوک ماں بیٹی کے بارے میں دریافت کیا تو میں نے پوری بات بتانے کے بجائے یہی کہا کہ ابھی ان کی مخبری جاری ہے۔ دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے۔

مزے کی بات یہ تھی کہ راحیلہ اور فوزیہ دونوں ہی میری مزاج آشنا تھیں۔ جان گئی تھیں کہ جب تک میں ان دونوں مذکورہ خواتین کے سلسلے میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ جاتا، کچھ بتانے والا نہیں تھا۔

میں تھوڑی دیر ان کے ساتھ بیٹھنے کے بعد اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کام میں مشغول ہوگئیں۔ میں ٹیلی فون کی جانب کھسک آیا اور مختیار علی کی دکان کا نمبر ملانے لگا۔

اگرچہ سیالکوٹ پہنچ کر میں نے نادو کی ہدایت کے مطابق فون کرکے اسے اپنے اور فوزیہ وغیرہ کے خیریت سے پہنچنے کی اطلاع دے دی تھی پھر کچھ دن بیت چلے تھے اسی لیے میں نے وہاں کی خبر گیری کرنا ضروری سمجھا۔

وجہ اس کی یہی تھی کہ چودھری جی برادران اور اس کے خطرناک گماشتے گگل اور منیرے سمیت میرے اور نادو کے خون کی بو سونگھتے پھررہے تھے۔ ہم نے انہیں بہت زک پہنچائی تھی۔

منیرے کو تو ایک خطرناک موڑ پر نادو نے بھیجا اڑا کر ڈھیر ہی کردیا تھا جبکہ گگل پر بھی اسی نے پستول کی دو گولیاں داغ ڈالی تھیں۔ ایک بازو میں اور دوسری ٹانگ پر...... مگر ہم جانتے تھے کہ وہ بڑا ڈھیٹ ہڈی اور چیلی مٹی کا بنا ہوا ہے۔ پیچھے ہٹنے والا نہیں۔ وہ زخمی سانپ کی طرح بل کھارہا ہوگا۔ منیرا اس کا قریبی یار تھا۔ اس کی ہمارے (نادو کے) ہاتھوں ہلاکت پر ایک الگ خطرہ منڈلا رہا تھا۔ تاہم وہ اتنی

جلدی صحت یاب ہوتے ہی ہمارے پیچھے نہیں آسکتا تھا۔ آتا بھی تو میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ اس سے نمٹ لوں گا۔

البتہ مجھے نادو کی فکر تھی۔ اگرچہ راجن پور سے روانہ ہوتے وقت میں نے اسے ''جی برادران'' سمیت ان کے مقرب خاص کار پرداز گگل کے سلسلے میں خصوصی طور پر محتاط رہنے کا کہہ رکھا تھا۔ نادو بھی جی دار تھی۔ جواب میں مجھ سے بولی تھی......

''تو فکر نہ کر۔ اس مردود مارے گگل نے یہاں آنے کی جرأت کی تو اس کا حشر بھی میں منیرے جیسا ہی کروں گی۔''

مجھے البتہ گگل کے سلسلے میں اس حوالے سے زیادہ فکر وتشویش تھی کہ اسے ہمارے بارے میں اچھی خاصی معلومات بھی حاصل ہو چکی تھیں کہ ہم کہاں کا رخ کیے ہوئے تھے۔ جی برادران نے الگ ہمارے خلاف پولیس میں پرچہ کٹوا رکھا تھا۔ میں تو سیالکوٹ چلا آیا تھا مگر نادو راجن پور میں ہی تھی اور مختیار کے ساتھ بقول اس کے شادی بھی ہونے والی تھی۔

بہرکیف، فون مختیار کی دکان کے کسی نوکر چھوکرے نے اٹھایا تھا۔

''وہ کہیں گیا ہوا ہے......آپ کون؟'' لڑکے نے پوچھا۔

''کتنی دیر میں آجائے گا بھا مختیار؟'' میں نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے دریافت کیا۔

''وڈے چودھری کے ڈیرے پر گیا ہے۔ دیر تو ہوجائے گی۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ میرا خیال تھا کہ اسے یہاں کا نمبر دے دوں مگر کچھ سوچ کر اپنا ارادہ بدل دیا۔

''یہ بتاؤ وہاں سب خیریت تو ہے نا؟''

''سب خیریت ہے۔ پر آپ کون ہیں؟'' لڑکے نے پھر پوچھا۔

''بھا مختیار سے کہنا کہ سہراب کا فون آیا تھا۔''

''اوہ، مجھے انہوں نے آپ کے بارے میں پہلے سے بتا رکھا تھا کہ آپ کا فون آسکتا ہے۔ آپ سیالکوٹ سے بات کر رہے ہیں نا؟'' لڑکا چونک کر بولا۔

میں نے اسے کچھ ہدایات دے کر رابطہ منقطع کر دیا۔ اسے فون نمبر بھی لکھوا دیا اس تاکید کے ساتھ کہ یہ نمبر صرف مختیار کو ہی دے اور کسی کو نہیں۔ لڑکے نے فوراً ہامی بھر لی۔ اس کے بعد میں گھر سے باہر نکل آیا۔

میرا رخ پھر اسی گھر کی جانب تھا۔ مجھے تجسس ہوا کہ رات والے واقعے کے بعد ہوا کیا تھا؟ وہ حملہ آور لڑکوں کا جتھا کیا ان کے کسی مخالف گروپ یعنی جوجی کا تھا؟ آیا پولیس کیا صرف انہیں ہی گرفتار کر کے لے گئی تھی یا پھر وسیم اور نگہت بھی پولیس کے نرغے میں آگئے تھے؟

سچی بات تو یہ تھی کہ خود مجھے اپنا بھی ڈر تھا کہ جن حملہ آور لڑکوں کے جتھے کے لیڈر کا میں نے حشر کیا تھا، ان کے ساتھیوں نے میرے بارے میں بھی پولیس کو بتایا ہوگا۔ اب کہیں پولیس مجھے بھی نہ ڈھونڈتی پھر رہی ہو۔

میں ٹہلتا ہوا مذکورہ گھر کے سامنے سے گزرا۔ وہاں خاموشی تھی۔ دروازے پر یا سامنے کوئی بھی کھڑا نظر نہ آیا۔ محلے داروں کی آوک جاوک دکھائی دیتی تھی۔

دفعتاً ایک بائیک کی گھوں گھوں کی آواز ابھری۔ اگرچہ ایک دو بائیکس والے گزرے بھی تھے مگر اس بائیک کو دیکھ کر میں چونک گیا۔ وہ اچانک ہی میرے قریب ذرا عقب میں آن کھڑی ہوئی اور میں چونک کر اس طرف کو پلٹا۔

اس پر دو لڑکے سوار تھے۔ ایک اجنبی اور دوسرا شناسا...... اجنبی لڑکا کچھ بڑی عمر کا تھا۔ اسے لڑکا تو نہیں کہا جاسکتا تھا مگر وہ ادھیڑ عمر بھی نہیں تھا۔ اس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی جبکہ اس کے پیچھے بیٹھا ہوا لڑکا گزشتہ شب کے حملہ آور جتھے میں شامل تھا۔ گویا یہ وہی تھے۔ یہ سوچ کر میں محتاط ہوگیا۔ میں ان دونوں کے چہروں کو غور سے تکنے لگا۔

شلوار قمیص والے نے دوستانہ انداز میں مسکرا کر میری طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلا دیا۔ یہی کچھ اس کے پیچھے بیٹھے لڑکے نے بھی کیا اور پھر دونوں بائیک سے نیچے اتر آئے۔ ان کی جانب سے خیر سگالی کا ''سگنل'' ملنے کے باوصف میرا انداز محتاط ہی رہا۔

دونوں نے اسی طرح میری جانب دوستانہ طریقے سے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے باری باری ان سے مصافحہ کیا۔

''میرا نام پرویز ہے اور یہ میرا ساتھی زبیر ہے۔ ہمیں استاد جوجی نے خاص طور پر تمہارے پاس بھیجا ہے۔'' بڑی عمر والے نے جس نے اپنا نام پرویز بتایا تھا، دوستانہ انداز میں کہا۔ استاد جوجی کے نام پر میں چونکا۔

''میں کسی استاد جوجی سے واقف نہیں ہوں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''ہم جانتے ہیں۔ کبیر کی ٹھکائی اور اس کے تمہارے ہاتھوں حشر نے استاد جوجی کے دل میں تمہاری قدر بٹھادی ہے۔ آگے تم خود سمجھ دار ہو۔'' اس بار شناسا لڑکے زبیر نے

مجھ سے کہا۔
ان کی گفتگو سے میں سارا ماجرا سمجھ گیا تھا لہٰذا میں نے کہا۔
''میں سمجھ گیا لیکن تمہارے استاد جوجی نے تمہیں میرے پاس کس لیے بھیجا ہے؟''
''تمہیں نہایت عزت و احترام کے ساتھ ان کے پاس لے جانے کے لیے۔'' پرویز نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''اگر میں تمہارے ساتھ چلنے سے انکار کردوں تو؟''
''استاد جوجی بہادروں کی قدر کرتا ہے۔'' اس کے ساتھی زبیر نے مجھ سے کہا۔ ''کیا تم اس بات سے بھی اندازہ نہ لگا سکے ہو کہ ہمارے ایک اہم آدمی کبیر کی ٹھکائی لگانے کے بعد استاد جوجی تم سے دشمنی پر اتر کر ہمیں تم سے اپنے ساتھی کا انتقام بھی لینے کے لیے بھیج سکتا تھا۔ استاد چاہتا تو اس وقت تم ہم دو افراد کو نہیں بلکہ اس وقت پورے جتھے کو یہاں دیکھ رہے ہوتے۔''
مجھے اس کی بات ناگوار دھمکی آمیز محسوس ہوئی۔ اسی لہجے میں بولا۔ ''مجھے بھی اس کی پروا نہیں تھی۔ تمہارا استاد جوجی میرے خلاف جتنے بھی آدمی اتارتا، ان کا حشر بھی میں کبیر جیسا ہی کرتا۔''
''ناراض مت ہو دوست!'' پرویز بولا۔ ''ہم صرف تمہارے دل سے یہ خدشہ دور کرنے کے لیے کہہ رہے تھے کہ ہمارا استاد ایک قدردان آدمی ہے۔ وہ یونہی دشمنیاں نہیں پالا کرتا۔ تم نہیں جانتے کہ کبیر ہمارے گروہ میں کیا حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی استاد جوجی کی نظروں میں کیا قدر و قیمت ہے۔ وہ اکیلا ہی کئی لوگوں پر بھاری پڑنے والا آدمی ہے۔ استاد کے بعد ہم پر کبیر کا ہی حکم چلتا ہے۔''
''مجھے اپنا پتا بتا دو۔ میرا جب موڈ ہوگا میں آجاؤں گا، استاد جوجی سے ملنے۔'' میں نے کہا۔
''لیکن ہمیں استاد جوجی نے......'' زبیر نے کہنا چاہا مگر میں نے اس کی بات کاٹ دی۔
''تم دونوں جا سکتے ہو۔''
''پتا نوٹ کرو۔'' بالآخر پرویز نے کہا۔ میں نے منہ زبانی پتا ذہن نشین کرلیا۔ وہ دونوں چلے گئے۔ میں وہیں ہونٹ بھینچے سوچتا کھڑا رہ گیا۔ پتا ایک قدیمی محلے کی پرانی عمارت کا تھا۔
وہ دونوں جا چکے تھے۔ میں وہیں کھڑا آپا شگفتہ کے مکان کی طرف دیکھتا رہا۔ دفعتاً ایک رکشا گھر کے پاس آکر رکا۔ میں تھوڑا آگے سرک گیا۔
اب میں آپا شگفتہ کے لیے نہیں تو اس کی جوان فائٹر بیٹی نگہت کے لیے ضرور شناسا بن چکا تھا اسی لیے میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھے پہچان کر چونک پڑے۔
میں نے دیکھا کہ رکشے سے وہی لڑکی اتری تھی، نگہت...... وہ خاصی عجلت میں اور پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ رکشے والے کو اندر بیٹھے بیٹھے ہی کرایہ دے کر وہ اسے فارغ کر چکی تھی۔ جلدی سے اتر کر اس نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا اور وہ اندر داخل ہوگئی۔
میں اِدھر اُدھر مٹرگشت کرتا رہا۔ اریب قریب کی مختلف گلیوں سے یونہی گزرنے کے بعد دوبارہ اسی طرف آجاتا اور ایک نظر دروازے پر ڈالتا۔
گزشتہ شب میں ان دونوں کی مدد کے لیے آگے بڑھا تھا جب ان کی بائیک خراب ہوگئی تھی لیکن لڑکی اور اس کے ساتھی نے الٹا مجھے مشکوک جان لیا تھا۔
کسی استاد جوجی نامی گروپ سے ان کی شاید کوئی ٹسل چل رہی تھی اسی لیے وہ بھی مجھے انہی کا ساتھی سمجھ بیٹھے تھے۔ یہ ان کی غلط فہمی تھی۔
میں درحقیقت کسی طرح نگہت کے ساتھ راہ و رسم بڑھانے کا سوچ رہا تھا۔ جب سے مجھے اس بات کا شبہ ہوا تھا کہ وہ باس اقبال کی بیٹی ہے، مجھے اس سے تصدیق کرنا تھی مگر اس طرح کہ اسے شک بھی نہ ہونے پائے کہ روئے زمین پر وہ میرا سب سے بڑا دشمن تھا۔
ایک گھنٹے تک میں یہی عمل دہراتا رہا کہ وہ دوبارہ اپنے گھر سے باہر نکلتی مگر ایسا نہ ہوا۔
ناچار کچھ سوچ کر میں واپس اپنے گھر کی جانب پلٹا ہی تھا کہ اچانک ٹھٹکا۔ گھر کا دروازہ کھلا تھا اور اس کے اندر سے نگہت برآمد ہوئی۔ میں ذرا مزید پرے کھسک گیا کہ کہیں اس کی نگاہ مجھ پر نہ پڑ جائے۔ میں اس کی نگاہوں میں نہیں آنا چاہتا تھا۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی چوراہے تک آئی۔ میں سمجھ چکا تھا کہ وہ کسی رکشے کے لیے آئی ہے۔
میں فوراً اپنے گھر کی جانب دوڑا اور بختیارے کی دی ہوئی پرانے ماڈل کی کرولا میں آن بیٹھا۔
جب تک میں تیزی سے چوراہے تک آیا تو دیکھا نگہت ایک رکشے میں سوار ہو رہی تھی۔ میں نے اس کا تعاقب شروع کردیا۔
رکشا مختلف سڑکوں اور چوراہوں سے گزرتا ہوا تقریباً نصف گھنٹے بعد ایک معروف چوراہے سے دائیں جانب آبادی کی طرف مڑ گیا۔ یہ اقبال چوک تھا۔

میں سمجھ گیا کہ نگہت اپنے اسی اقبال چوک والے بنگلے کا رخ کیے ہوئے تھی جس کے بارے میں اس نے اپنے دوست وسیم کو بتا رکھا تھا اور جہاں وہ اپنے باپ سے ملنے آتی تھی، جب وہ کراچی سے سیالکوٹ آتا تھا۔

نگہت کو متوقع طور پر یہاں کا رخ کرتے دیکھ کر میرے دل میں اچانک ایک خیال ابھرا کہ کہیں اقبال کراچی سے آیا ہوا تو نہیں ہے؟ اگر ایسا تھا تو میں ادھر ہی اس سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے خود کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگا لیکن پہلے اس کے لیے ضروری تھا کہ اس بات کی تصدیق ہو جاتی کہ آیا یہ وہی ''گینگسٹر'' اقبال باس تھا یا کوئی اور اقبال تھا۔

یہاں کی گلیاں چوڑی تھیں۔ اردگرد چھوٹے بڑے مکانات اور خوبصورت بنگلے بھی بنے ہوئے تھے۔ رکشا آخری سرے والے بنگلے کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ وہ نیچے اتری، کرایہ ادا کیا اور بڑے سے گیٹ کی جانب بڑھ گئی۔

میں کار کو آگے لے گیا اور ایک درخت کے نیچے کھڑی کر کے نیچے اتر آیا۔ گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ چند ہی لوگ آتے جاتے دکھائی دیے۔ کچھ اور کاریں بھی بنگلوں کے اندر باہر کھڑی تھیں۔ میں مذکورہ بنگلے کی طرف چل دیا۔

نگہت اندر داخل ہو چکی تھی۔ میں نے سامنے سے گزرتے ہوئے بظاہر سرسری انداز میں بنگلے کی طرف دیکھا اور اس کا نمبر وغیرہ ذہن نشین کر لیا۔ بنگلا ایک منزلہ تھا یعنی ون یونٹ تھا۔ سرخ اور سفید رنگ اور آگے پھلواری سی بنی ہوئی تھی۔ بمشکل چار پانچ کنال کا ہی لگا۔

میں آگے نکل گیا۔ اس کے بعد ایک گلی میں گھوما۔ یہ نسبتاً تنگ گلی تھی۔ وہاں سے گزرتا ہوا میں دوسری جانب آیا تو یہ بنگلوں کے پچھواڑے کی گلی تھی جسے عرفِ عام میں ''گندی گلی'' کہا جاتا ہے۔ اس طرف سیلن اور تھوڑا بہت سیوریج کا پانی بھی جمع تھا۔

میں مطلوبہ بنگلے کی عقبی دیوار کے قریب آ گیا۔ دن کا وقت تھا۔ رات ہوتی تو میں نقب لگانے کی کوشش کرتا مگر ارادہ اب بھی میرا یہی تھا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا کہ اندر کیسے داخل ہوا جائے کیونکہ میرا اندر جا کر سن گن لینا ازحد ضروری تھا۔

میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ زیادہ دیر نہیں رک سکتا تھا۔ سامنے کے مکان والے کمرے کی کھڑکی سے کوئی مجھے دیکھ کر یا دیوار پھاندنے کی کوشش میں شک میں پڑ کر شور مچا ڈالتا یا پولیس کو مطلع کر سکتا تھا۔

اسی لیے میں عام راہ گیر کی طرح چلتا ہوا دوبارہ دوسری جانب بڑھا تو اچانک بنگلے کی جنوبی دیوار میں مجھے پتلی گلی دکھائی دی۔ میں بغیر سوچے سمجھے اس میں جا گھسا۔ یہاں مجھے ایک کھڑکی نظر آ رہی تھی۔ عقدہ کھلا کہ یہ کھڑکی درحقیقت ایک سنگل پٹ والے دروازے کی تھی۔

باہر کی نسبت اس گلیاری میں، میں محفوظ تھا۔ میرے لیے سنگل پٹ کا دروازہ کھولنا چنداں دشوار نہ تھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ کوئی بعید نہیں کہ تالا بھی لگا ہوتا۔ میں نے اس کی لاک والی جگہ پر جیب سے ایک سوا نکال کر زور آزمائی شروع کر دی۔

اس سے اچھی خاصی کھڑبڑ کی آواز تو ابھر رہی تھی مگر میں ایک محتاط اندازہ لگا چکا تھا کہ یہ بنگلے کا بعید ترین سنسان گوشہ ہوگا۔ کسی کا کم ہی اس طرف آنا ہو سکتا تھا۔ باقی باہر والے میری یہ ''کارروائی'' دیکھنے سے قاصر ہی تھے۔ تاہم اس طرف دیکھنے کے لیے اول تو ان کا دھیان کم ہی جاتا۔ ہوتا بھی تو انہیں گردن گھمانا پڑتی۔ پھر یہ گھر کے ساتھ والی عام مستعمل گلیاری تھی جہاں گھر کا مکین کچھ بھی کر سکتا تھا۔

میں دروازہ کھول کر اس کا لاک بیکار کر چکا تھا مگر اس طرح کہ دوبارہ اسے صحیح حالت میں فٹ کر دوں۔

دھڑکتے دل سے میں اندر داخل ہوا تو ہلکی روشنی پڑ رہی تھی۔ میں نے دروازہ اندر سے دوبارہ بند کر دیا۔ اب میں ایک اسٹور کے اندر موجود تھا۔

میں نے سب سے پہلے لاک اور کھانچا درست کر کے دوبارہ لگا دیا۔ باہر سے کنڈی یوں بھی نہیں لگی ہوئی تھی اور اس کی ضرورت بھی شاید نہیں سمجھی گئی تھی کیونکہ دروازہ اندر سے ہی لاک تھا۔ تالا بھی درمیانہ اور زنگ آلود نظر آ رہا تھا۔ لگتا تھا عرصے سے اسے کھولا ہی نہ گیا ہو۔

بہرحال، میں نے بند تالے سمیت کنڈی لگا دی۔ قبضہ درست کیا اور پھر اندر کھلنے والے دروازے کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس کے بعد اس سے کان چپکا کر دوسری جانب کی سن گن لی۔ دوسری جانب گہرا سکوت تھا۔ میں نے آہستگی سے دروازہ کھولا۔ وہ اندر کی جانب کھلا۔ شکر تھا کہ اسے باہر سے کنڈی نہیں لگی ہوئی تھی۔ ہوتی بھی تو میں کوئی نہ کوئی تدبیر اس کی بھی کر ہی لیتا۔

میں ایک کھلے ہال میں تھا۔ یہ لاؤنج کے ساتھ ہی ملحق محسوس ہوا۔ دائیں بائیں اور سامنے کے رخ پر کمروں کے دروازے اور برآمدہ تھا۔ ایک کمرے سے باتوں کی آوازیں سنائی دیں۔

جب نگہت اس بنگلے کے بارے میں اپنے دوست لڑکے وسیم کو بتارہی تھی تو مجھے یہی اندازہ ہوا تھا کہ یہ بنگلا زیادہ تر خالی ہی پڑا رہتا ہے یا کوئی ایک آدھ نوکر یا چوکیدار ہوتا ہو۔

یقیناً اس وقت بھی اسی وجہ سے سناٹا اور خالی پن تھا۔

برآمدے کے ایک بڑے ستون کی جانب کھسک کر میں مذکورہ کمرے کی کھڑکی کے قریب آن کھڑا ہوا۔ یوں کہ اگر کوئی بیرونی دروازے یا اندر سے برآمد ہوتا تو میں آڑ میں جا چھپتا کیونکہ میرے عقب میں اوپر جانے والے زینے کا ایک خلا تھا۔

''انکل! میں نے بتایا نا آپ کو کہ اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں تھا۔'' کان لگانے پر مجھے اسی لڑکی نگہت کی آواز سنائی دی۔ ''یہ جوجی کے بدمعاش لڑکوں کی شرارت تھی۔ اس کے باوجود پولیس وسیم کو بھی ان کے ساتھ گرفتار کر کے لے گئی۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ کبیر کو وسیم نے یا میں نے بالکل بھی نہیں مارا تھا۔ وہ تو کوئی اجنبی لڑکا تھا، ہماری ہی عمر کا۔ کبیر نے سب سے پہلے اسے للکارا تو وہ غصے میں آگیا۔''

''وہ نوجوان کون تھا؟'' ایک مردانہ بھاری آواز آئی۔

''پتا نہیں کون تھا۔ پہلے تو ہم اسے جوجی کا آدمی ہی سمجھے تھے مگر ہم سے شاید غلطی ہوگئی۔ وہ تو ہمارے لیے نیک ثابت ہوا تھا۔ اسی نے کبیر کی ٹھکائی لگائی۔''

''کیا پولیس نے اسے گرفتار نہیں کیا؟'' مردانہ آواز آئی۔

''نہیں۔ وہ نہ جانے اچانک کس طرف کھسک گیا تھا۔'' میں مردانہ آواز پر غور کرنے لگا جو مجھے کسی طور بھی شناسا نہیں معلوم ہوئی تھی۔ لڑکی اس مرد کو ''انکل'' کہہ کر مخاطب کررہی تھی۔

میں ابھی ان کی گفتگو سننے کی کوشش میں تھا۔ اندر جھانکنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

''ہوسکتا ہے وہ جوجی کا ہی آدمی ہو۔''

''ہرگز نہیں انکل! اگر وہ جوجی کا آدمی ہوتا تو ان کے ساتھی کبیر کا اس قدر برا حشر نہ کرتا۔ نہ ہی کبیر اس سے جا بھڑتا۔ انکل! مجھے اس وقت وسیم کی فکر ہورہی ہے۔ پلیز! اس کے لیے کچھ کریں یا پھر پاپا کو انفارم کردیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور کچھ کرسکتے ہیں۔''

''اوکے! ابھی دونوں چلتے ہیں اور متعلقہ تھانے جا کر معلوم کرتے ہیں...... آؤ۔''

مرد نے کہا پھر اندر خاموشی چھا گئی۔ وہ دونوں شاید کمرے سے باہر آرہے تھے۔ میں جلدی سے دبے پاؤں اپنے سابقہ راستے کی جانب کھسک گیا۔ اس کے بعد وہاں سے باہر آگیا۔

میری کار کھڑی تھی۔ میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اس میں سوار ہوا۔ اسے تیزی سے گھما کر بنگلے کی طرف لایا تو اندر سے بھی ایک نئے ماڈل کی کار باہر نکل کر مین شاہراہ کی جانب مڑ رہی تھی۔

میں نے ڈرائیونگ سیٹ کے برابر میں نگہت کو بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ اسٹیئرنگ پر ایک درمیانی عمر کا شخص موجود تھا۔

میری کوشش تھی کہ نگہت کی نگاہ مجھ پر نہ پڑنے پائے ورنہ مرد تو نہیں البتہ نگہت مجھے پہچان سکتی تھی۔

میں ان کا تعاقب کرتے ہوئے ایک تھانے جا پہنچا۔ وہ تو اندر داخل ہوگئے، میں باہر ہی ذرا فاصلے پر ایک گیراج کے پاس اپنی کار لے گیا اور بلاوجہ ہی کار مکینک کو دکھانے لگا۔

پرانی کار تھی اسی لیے چھوٹی موٹی خرابی مکینک حضرات نے نکال ہی لی اور میں نے اسے مرمت کی اجازت دے دی اور خود بھی کھڑا ہو کر کار کی مرمت ہوتے دیکھنے لگا لیکن میرا دھیان تھانے کی عمارت کی طرف تھا۔

وسیم اور ان لڑکوں کو ادھر ہی لایا گیا ہوگا اسی لیے انہوں نے یہاں کا رخ کیا تھا۔

ان دونوں کو واپس نکلنے میں تقریباً ایک گھنٹا لگ گیا اور اتنا ہی مکینک نے میری کار کی جزوی مرمت کرنے میں لگایا۔ میں نے اسے پیسے ادا کیے اور کار اسٹارٹ کرکے دوبارہ ان کے تعاقب میں لگ گیا۔

کار میں اب بھی وہ دونوں ہی موجود تھے۔ وسیم ان کے ہمراہ نہیں تھا۔ شاید وہ اس کی ضمانت نہیں کروا پائے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اب یہ دونوں دوبارہ بنگلے کا رخ کریں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ واپسی کے سفر پر جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ ان کا رخ کسی اور طرف تھا۔

مصروف شاہراؤں سے گزرنے کے بعد ان کی کار مضافات کی جانب گامزن ہوگئی۔

''نہ جانے اب یہ دونوں کہاں جارہے ہیں؟'' میں نے اسٹیئرنگ پر اپنے دونوں ہاتھ اور نظریں ونڈ اسکرین پر جمائے رکھتے ہوئے ہونٹ بھینچ کر خود کلامیہ کہا۔

اس روٹ پر دیگر مسافر گاڑیوں کی آمد و رفت بھی دیکھنے میں آرہی تھی۔ دس، بارہ میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ان کی کار دائیں جانب کے ایک کچے کے علاقے میں اتر گئی۔

میں ایک دم محتاط ہوگیا۔ اب اس راستے پر ان کا

تعاقب کرنا مزید احتیاط کا متقاضی تھا کیونکہ ایک تو یہ راستہ مجھے کسی دیہات کی طرف جاتا ہوا محسوس ہوا، دوسرے یہ قدرے سنسان تھا حالانکہ دن کا وقت تھا۔ چہار اطراف کھیت کھلیان اور کہیں بنجر زمین اور ٹیلے ٹبے نظر آرہے تھے۔ چند ایک تانگے اور ایک آدھ کار گزرتی نظر آئی تھی۔

شکر تھا کہ راستہ بل کھاتا ہوا تھا اسی لیے میں نے بھی مناسب فاصلہ رکھ کر تعاقب جاری رکھا ہوا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق یہ دونوں سیالکوٹ کے مضافات میں واقع کسی گاؤں کا رخ کیے ہوئے تھے۔ یہاں ان کا ضرور کوئی ایسا جان پہچان والا آدمی موجود تھا جس سے یہ دونوں وسیم کے سلسلے میں مدد لینے کے لیے جارہے تھے۔

میرا خیال تھا کہ چند میل کے سفر کے بعد ان کی منزلِ مقصود آجائے گی مگر یہاں تو راستہ جیسے شیطان کی آنت کی طرح طویل ہوتا جارہا تھا۔ راہ میں دو ایک چھوٹے گاؤں آئے تھے مگر یہ انہیں بھی کراس کرتے ہوئے آگے نکل گئے تھے۔ راستہ بھی اب خاصا تنگ پڑنے لگا تھا یعنی اگر سامنے سے کوئی اور گاڑی یا تانگا آجاتا تو آمنے سامنے والی گاڑی کو راستہ دینے کے لیے کسی ایک گاڑی کو کنارے پر اترنا پڑتا۔

اب ہمارے اردگرد سناٹا تھا اور غیر آباد ویرانہ تھا۔ یہاں مجھے مزید محتاط ہو کر تعاقب کرنا پڑ رہا تھا۔ کار رک گئی۔ میں نے بھی اپنی کار روک دی۔ کچھ تنگ سا موڑ تھا۔ بظاہر مجھے بھی ان کے رکنے کی وجہ سمجھ نہ آسکی تاہم میں نے سائڈ کے کچے میں کار روک دی اور سیٹ پر بیٹھا کھڑکی سے ذرا سر نکال کر انہیں دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔

کنارے پر درخت تھے۔ اس کے بعد کچھ سرسبز سا علاقہ، اس کے پار کچھ بنجر زمین تھی۔ مٹی کے ٹیلے بھی دکھائی دے رہے تھے۔

تب ہی میں چونکا۔ مجھے چند ڈھاٹا پوش مسلح افراد کی جھلک نظر آئی۔ یکلخت میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ میں پھرتی سے کار کا دروازہ کھول کے نیچے اترا ہی تھا کہ ایک فائر ہوا۔ ساتھ ہی چیخ کی آواز ابھری۔ میرا دل دہل گیا۔ یہ نسوانی آواز تھی اور اس وقت یہ آواز نگہت کے سوا اور کس کی ہوسکتی تھی۔

میں کنارے کی جھاڑیوں اور درختوں کی آڑ لیتا ہوا دھڑکتے دل کے ساتھ ان کی جانب بڑھتا رہا۔ میرے پاس کوئی آتشیں ہتھیار نہ تھا، ماسوائے ایک خنجر کے جو میری دائیں پنڈلی میں چرمی ڈوری سے بندھا ہوا تھا۔

پھر دوبارہ فائر ہوا۔ اس بار چیخنے کی آواز مردانہ تھی۔

میرا دل دہل سا گیا۔ تو کیا اس خطرناک نقاب پوش گروہ نے نگہت کے ساتھ اس کے انکل کو بھی ہلاک کر ڈالا؟

میں آگے بڑھتا رہا۔ اسی وقت دو گولیاں اور چلیں۔ ایک چیخ ابھری۔ یہ بھی مردانہ تھی۔ میرا ذہن ٹھٹکا۔ گویا ان سے مقابلہ کیا جارہا تھا۔ نقاب پوش اب دو کی تعداد میں نظر آرہے تھے۔ قریب دو موٹر سائیکلیں کھڑی تھیں۔ ان میں سے ایک گری ہوئی تھی۔

تب ہی اچانک میں نے نگہت کو دیکھا۔ دو نقاب پوشوں نے اسے گھیر رکھا تھا اور وہ ان پر اپنی پروفیشنل فائٹنگ کے جوہر آزما رہی تھی۔

آتشیں ہتھیار کے سامنے اس کی کچھ چل نہیں پا رہی تھی۔ اسے زندہ دیکھ کر میں نے کچھ طمانیت کا سانس لیا لیکن اگلے ہی لمحے پھر تشویش میں مبتلا ہوگیا۔ نگہت کے دائیں بازو سے خون رس رہا تھا اور اس کے ایک ہاتھ میں پستول کانپتا دکھائی دیا۔

اسی وقت ایک حملہ آور نقاب پوش نے اس پر نہ جانے کس چالاکی سے وار کیا کہ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

دوسرے نے اپنی رائفل کے کندے سے اس کے سر پر وار کیا۔ وہ بے ہوش ہوگئی۔ پل بھر میں وہاں اچھا خاصا رن پڑ گیا اور ختم بھی ہوگیا۔

میری سانسیں تیز تیز چل رہی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اول تو نگہت اپنے ''انکل'' کے ساتھ اس دور دراز ویرانے میں کرنے کیا آئی تھی، نیز یہ حملہ آور کون تھے؟ وغیرہ۔

میں تیزی سے آگے بڑھا۔ وہ دونوں بے ہوش نگہت کو کچے راستے کے کنارے پر ڈال کر اس کی کار اور اپنی موٹر سائیکلیں سنبھالنے لگے۔ ساتھ ہی ذرا قریب کھسکتے اور جھاڑیوں میں دبک کر دیکھنے کے دوران عقدہ کھلا کہ انکل بھربھری مٹی والی زمین پر خون آلود ایک لاش کی صورت ہاتھ پاؤں پھیلائے پڑے ہوئے تھے۔ ساتھ ہی خطرناک نقاب پوشوں کے ساتھی کی بھی خون میں لت پت لاش پڑی ہوئی تھی۔

اپنے ساتھی کی لاش اور ایک موٹر سائیکل کو انہی کی کار کی ڈکی میں جیسے تیسے ڈالے یہ لوگ نکل بھاگے۔ نگہت زخمی اور بے ہوشی کی حالت میں اپنے انکل کی لاش کے قریب پڑی رہ گئی تھی۔

گویا حملہ آور تین تھے۔ ایک مارا گیا تھا۔ باقی دو

اپنے تیسرے ساتھی کی لاش، کار اور اپنی موٹر سائیکلیں لے کر فرار ہو گئے تھے۔ مجھے یہ معاملہ کسی ڈکیتی کا ہی لگا تھا جو بالآخر خون ریزی اور قتل پر منتج ہوا۔

بہرکیف، میں جلدی سے آگے بڑھا۔ سب سے پہلے میں نے انکل کا جائزہ لیا۔ وہ مر چکا تھا پھر میں نگہت کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کی سانسیں چل رہی تھیں۔ وہ بے ہوش تھی۔ اس کے زخمی بازو سے بھل بھل خون بہے جا رہا تھا۔ میں نے جلدی سے اس کے بے سدھ جسم کو اٹھایا اور اپنی کار کی جانب لے چلا۔

وہاں پہنچ کر میں نے اسے عقبی سیٹ پر لٹا دیا۔ شکر تھا کہ گلوز کمپارٹمنٹ میں مرہم پٹی کا سامان موجود تھا۔ وہ سنبھالے میں نگہت کے بازو کی آستین اوپر تک پھاڑ کر اس کے زخم کا پہلے جائزہ لینے لگا۔ گولی آر پار نہیں ہوئی تھی اور شاید اس نے بازو کی ہڈی کو کسی حد تک متاثر کیا تھا۔ وہ اندر پیوست تھی۔ مجھے تشویش ہونے لگی کیونکہ ایسی صورت میں اس کا آپریشن لازمی تھا۔ صرف پٹی سے کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ تاہم فرسٹ ایڈ تو دینا ہی تھی۔

میں نے زخم صاف کر کے وہاں مرہم پٹی کر دی۔ خون بہنا تو بند ہوا لیکن میں نے دیکھا، اس کا چہرہ سفید پڑ رہا تھا، ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ پانی کی بوتل میرے پاس تھی۔ پانی کے چھینٹے میں نے چہرے پر مارے اور اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگا۔

میری کوشش بارآور ثابت ہوئی۔ اس نے کراہتے ہوئے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ کچھ ہوش میں آتے ہی اس نے سیٹ پر اپنا سر اِدھر اُدھر مارنا شروع کر دیا۔ میں نے اسے سنبھالا دیا اور اس کے ہونٹوں سے پانی کی بوتل لگائی۔

اس نے پانی پیا۔ اس کی حالت کچھ سنبھلنے میں آئی تو اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور پھر اپنی حالت۔ اس کے بعد وہ یکدم اٹھنے کی کوشش کرنے لگی تو میں نے اسے سنبھال کر دوبارہ لیٹے رہنے کا کہا۔

''تم بہت زخمی ہو۔ لیٹی رہو۔''

''تت...... تم......؟'' اس کے لرزتے لبوں سے بمشکل برآمد ہوا۔ اس کی آنکھوں میں خوف اور تشکیک کی پرچھائیاں ڈوبنے ابھرنے لگیں۔

''میری طرف سے کسی غلط فہمی میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے صفائی پیش کرتے ہوئے آہستہ سے کہا اور پھر سر اٹھا کر کار سے باہر گرد و پیش پر نظر ڈالی۔

''انکل...... میرے انکل......! وہ کہاں ہیں؟'' اس

مبارک باد

''یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ تمہاری شادی فائزہ جیسی امیر زادی سے ہو رہی ہے۔ مبارک ہو...... لیکن یہ یاد رکھنا وہ بہت نک چڑھی، جھگڑالو اور اپنی بات منوانے کی عادی ہے۔ اس سے شادی کے بعد تمہیں آوارہ گردی اور شراب نوشی چھوڑنا پڑے گی۔''

''یہ تو پھر بھی غنیمت ہے یار! اگر اس سے میری شادی طے نہ ہوتی تو جلد ہی مجھے دنیا بھی چھوڑنا پڑتی۔''

زباں بندی

شادی سے پہلے مولوی صاحب نے احتیاطاً اعلان کیا۔ ''کسی صاحب کو اس شادی پر اعتراض ہو تو وہ اعتراض بیان کر سکتے ہیں۔''

''مجھے کچھ کہنا ہے۔'' ایک آواز ابھری۔

''تم چپ رہو۔ تم تو دُلہا ہو۔'' مولوی صاحب نے ڈانٹا۔

مرسلہ: ناہید یوسف، اسلام آباد

ترقی

پکڑ دھکڑ شروع ہونے سے پہلے سیاسی اثر رسوخ رکھنے والے ایک صاحب کو بینک نے قرضے کی ادائیگی کے سلسلے میں خط لکھا تو انہوں نے جواب دیا۔

''مکرمی! ہم نے اپنے قرض خواہوں کو تین درجوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ پہلے درجے میں وہ لوگ اور ادارے شامل ہیں جن کے قرضے جلد ادا کر دیے جائیں گے۔ دوسرے درجے میں وہ ہیں جن کے قرضے شاید کبھی ادا کر دیے جائیں۔ تیسرے درجے میں وہ ہیں جن کے قرضے ادا کرنے کا ہمارا کوئی ارادہ نہیں۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ آپ کے خط کے عاجزانہ اور دوستانہ مضمون کی وجہ سے ہم نے آپ کو تیسرے درجے سے نکال کر دوسرے درجے میں شامل کر لیا ہے۔''

مرسلہ: مہتاب احمد، حیدرآباد

نے سوال کیا۔
"مجھے افسوس ہے، ان حملہ آور ڈاکوؤں نے انہیں ہلاک کر ڈالا ہے۔"
"اوہ، میرے خدا......!" وہ غم سے نڈھال ہونے لگی۔
"ان کی لاش باہر زمین پر پڑی ہے۔ خود تمہیں جلد آپریشن کی ضرورت ہے۔ میں پولیس کے چکر میں نہیں پڑسکتا۔" میں نے گومگو سے لہجے میں کہا۔
"میں خود کو سنبھال لوں گی۔ تمہارا شکریہ۔" وہ بولی۔
"میں جانتی ہوں تم پولیس کا سامنا کیوں نہیں کرنا چاہتے۔ اس رات بھی تم خاموشی سے کھسک گئے تھے۔" وہ پھر اشتباہ آمیز لہجے میں بولی۔
"سنو لڑکی! میں کوئی مجرم نہیں ہوں۔ اس رات جو اتفاق ہوا سو ہوا لیکن آج بھی ایسا ہی کچھ اتفاق ہوا تھا۔ افسوس کہ مجھے دیر ہوگئی لیکن مزید دیر ہو جاتی تو وہ ڈاکو تمہاری کار سمیت تمہیں بھی ساتھ لے جاتے۔ وہ اپنے ساتھی کی لاش لے جا چکے ہیں۔"
تب اس نے غور سے اندر کا جائزہ لیا۔ اسے معلوم ہوا کہ یہ اس کی کار نہیں ہے جس میں بیٹھ کر وہ یہاں تک اپنے انکل کے ساتھ آئی تھی اور ڈاکوؤں کے نرغے میں پھنس گئی تھی۔
"یہ تمہاری کار ہے؟"
"ہاں۔"
"مجھے میرے گھر اتار دو۔"
"لاش کا کیا کریں؟" میں نے پوچھا۔
وہ سوچنے لگی پھر بولی۔ "تب تم مجھے گھر کے بجائے انکل والے بنگلے میں ہی لے چلو۔ اقبال چوک میں ہے۔ وہاں ان کے دو اور ساتھی موجود ہیں۔ وہ سب سنبھال لیں گے۔"
ایسے نازک وقت میں مجھے اس کی تجویز بظاہر مناسب لگی۔ کچھ سوچ کر میں نے ہامی بھر لی۔
اس کے بعد میں نے انکل کی لاش اٹھا کر ڈکی میں ڈال دی پھر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور کار اسٹارٹ کر کے تھوڑی ریورس کی پھر واپسی کی راہ لی۔
"کیا یہ لوگ تمہارے کوئی دشمن تھے یا پھر میرے اندازے کے مطابق کوئی راہزن؟" میں نے کار مناسب رفتار سے واپسی کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔
"راہزن تھے۔" وہ مختصراً بولی۔ میری جانب سے اس کا شک دور نہ ہوسکا تھا۔ وہ بولی۔
"تم ہمارا کب سے تعاقب کر رہے تھے اور کیوں؟"
"خاصی ذہین ہو۔ ڈائریکٹ چبھتا ہوا سوال کر ڈالا۔" میں مسکرا کر بولا۔ میری نظریں ونڈ اسکرین کے پار جمی ہوئی تھیں۔
"تم ہو کون؟ ہمارے دشمنوں کے ساتھی بھی نہیں لگتے۔ ہمارے پیچھے بھی لگے ہوئے ہو۔ دو اتفاقات اور وہ بھی متواتر کبھی نہیں ہو سکتے۔"
"میں تمہارے پیچھے لگا ہوا ہوں۔" میں نے صاف گوئی سے کہا۔
"کیوں؟"
"تم مجھے اچھی لگتی ہو۔"
"بکواس نہیں مسٹر......"
"سہراب......!" میں نے اسے اپنا نام بتا دیا۔
"جو بھی ہو۔ مجھے صاف صاف بتاؤ کہ کون ہو تم اور کیوں میری جاسوسی کر رہے ہو؟"
"یہ بتاؤ، وسیم کا کیا بنا؟" میں نے موضوع بدلا۔ "اس رات پولیس جوجی کے بدمعاشوں کے ساتھ کیا وسیم کو بھی گرفتار کر کے لے گئی تھی؟"
"اوہو...... میرا خیال ہے پھر تم جوجی کے مخالف گروپ کے ساتھی ہو۔ تم نے اس کے اہم آدمی کبیر کی خوب ٹھکائی کی تھی۔"
"میں نے کہا نا خاصی ذہین ہو تم، ٹھیک سمجھیں۔" میں نے اندھیرے میں چلنے والے تیر کو اسی کی کمان سے چلتے دینے میں کوئی عار نہیں سمجھا کیونکہ ابھی میں اپنے بارے میں اسے کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا نہ ہی مقصد...... ابھی میں تیل اور تیل کی دھار کا اندازہ کرنا چاہتا تھا۔
"خوب، تو پھر ہم دوست ہوئے۔ خواہ مطلب پرست ہی سہی۔" وہ بولی۔ اس کے ساتھ ہی کراہی۔ "آہ......"
"کیا ہوا؟" میں پریشان ہوگیا اور ذرا گردن موڑ کر چند سیکنڈز کے لیے عقبی سیٹ کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے زخمی بازو کو سہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔
"درد ہو رہا ہے۔"
"کچا راستہ ہے۔ گاڑی ہچکولے کھا رہی ہے حالانکہ میں نے رفتار کم ہی رکھی ہوئی ہے۔"
"تم جوجی کے کون سے مخالف گروہ سے تعلق رکھتے ہو؟" اس نے تھوڑاستانے کے بعد پھر پوچھا۔
"یہ غیر اہم باتیں بعد میں کرلیں گے۔ پہلے مجھے ذرا وسیم کے بارے میں بتاؤ اور یہ بھی کہ تم اپنے انکل کے ساتھ اس دور دراز ویرانے میں کس سے ملنے جا رہی تھیں اور کیوں؟"
"یہ غیر اہم باتیں بھی بنگلے پر چل کر کرلیں گے۔ مجھے

غنودگی سی ہو رہی ہے۔" اس نے کہا اور خاموش ہو گئی۔ میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔

سفر اب خاموشی سے جاری تھا۔

نصف گھنٹے بعد ہم اسی اقبال چوک والے بنگلے پر پہنچ گئے جہاں میں خفیہ طور پر نقب لگا چکا تھا اور اب بغیر نقب کے اندر داخل ہو گیا۔

چوکیدار اور ایک ملازم موجود تھے۔ وہ ظاہر ہے نگہت کو جانتے تھے مگر مجھے نہیں۔ الجھی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھنے لگے اور نگہت کو اس حالت میں دیکھ کر تشویش زدہ بھی نظر آنے لگے۔

نگہت نے ان سے میرا تعارف ایک "محسن" کی حیثیت سے کرایا تو وہ دونوں مجھے ممنون بھری نظروں سے دیکھنے لگے لیکن جب ان پر یہ انکشاف ہوا کہ کار کی ڈکی میں انکل کی لاش جس کا نام بعد میں مجھے عدیل معلوم ہوا، موجود ہے تو ان دونوں کے اوسان خطا ہو گئے۔

بعد میں مجھے اندازہ ہوا کہ انکل عدیل یہاں کیا حیثیت رکھتا تھا۔ وہ اقبال کا قریبی ساتھی تھا۔ یہی نہیں، وہ جگنو کا بڑا بھائی بھی تھا۔ جگنو کے بارے میں پتا چلا تو مجھے ایک نئی پسوڑی پڑتے دکھائی دی۔ جگنو کا اصل نام کچھ بھی ہو مگر وہ ایک بڑا بدمعاش تھا اور سیالکوٹ کی ایک بڑی سیاسی شخصیت کا دستِ راست بھی تھا۔

مجھے تو کیا، خود نگہت کو بھی اپنے مقتول انکل کے بارے میں اس کا علم نہ تھا۔

مقبول اور ارشد کے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے تھے۔ میں نے انہیں آپس میں تشویش زدہ انداز میں کھسر پھسر کرتے بھی دیکھا۔ ایک آواز میرے کانوں میں بھی پڑی۔

"جگنو کو فوراً اطلاع کرنا ہوگی۔"

"ہاں، وہ ہم سے حساب لے گا۔"

"ہم سے کیوں؟ کیا ہم نے مارا ہے؟"

"کچھ بھی ہو، وہ سب کو نرغے میں لے گا۔"

"وڈی کھیڈ پڑ گئی ہے۔ اب تو خود اقبال صاحب ہی آ کر جگنو کی تسلی کرائیں تو کرائیں ورنہ....."

"اللہ خیر ہی کرے۔"

انہوں نے فوراً پولیس کو انفارم کر دیا۔ نگہت نے جیسا کہ مجھ سے وعدہ کر رکھا تھا اسی لیے انہیں بنگلے میں پہنچانے کے بعد میں وہاں سے نکل آیا۔

اب یہاں کئی قباحتیں مرحلہ وار میرے ذہن میں منحوس گدھوں کی طرح منڈلانے لگیں۔

میں نگہت کو اپنا اصل نام بتا چکا تھا۔ وہ اگر کسی مدد کے سلسلے میں، جس کا مجھے پورا یقین تھا، کراچی اپنے باپ اقبال کو فون کرنے..... کی کوشش کرتی تو میرا نام لے کر اسے چونکا سکتی تھی۔

دوسرا یہ کہ اب نگہت نے پولیس کو انفارم کر دیا تھا اور وعدے کے مطابق ان سے میرا نام چھپایا تھا مگر ایسا کب تک ہو سکتا تھا؟ پولیس تو اپنے سائے سے بھی چونک جاتی ہے۔ لاش اور زخمی نگہت کو سیالکوٹ کے مضافات سے یہاں تک اپنی کار میں لانے والا کون تھا؟

بے شک نگہت نے پولیس والوں کو یہی بتایا ہو کہ مدد کرنے والے نے اسی وعدے سے اس کی مدد کی تھی کہ اس نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا اور کار میں یہاں تک چھوڑ کر چلتا بنا۔

نگہت نے بھی بہانہ کر دیا ہو کہ وہ کار کا نمبر نہ دیکھ سکی۔ ظاہر ہے وہ اندر بے ہوش پڑی تھی۔ پولیس بنگلے کے ان دونوں نوکروں سے پوچھ گچھ کر سکتی تھی۔

اسی لیے مجھے اپنا یہ ڈر اپنی جگہ پریشانی اور تشویش کا سبب بنا رہا۔ بعد میں مجھے پچھتاوا ہوا کہ اس طرح میں نے خود کو مزید مشکوک بنا لیا تھا۔ کیا تھا اگر میں ایک عام راہ گیر کی حیثیت سے ہی پولیس کی تھوڑی بہت پوچھ گچھ کا سامنا کر لیتا۔ بہرکیف، بسا اوقات کئی الجھنیں ایک ساتھ آن پڑیں تو ایک آدھ ایسی "اڑچن" رہ ہی جاتی ہے جس پر بعد میں پچھتاوا ہوتا ہے۔

میں انہی پریشان کن خیالات میں واپس اپنے گھر کی جانب جا رہا تھا کہ دفعتاً مجھے ایک موٹر سائیکل سوار پر شبہ ہوا کہ وہ میرا تعاقب کر رہا ہے۔ اپنا شک دور کرنے کے لیے میں اس کی جانب سے انجان بن گیا مگر اس پر اپنی پوری توجہ بھی مرکوز رہنے دی۔

ایک چوراہے پر میں رکا۔ وہ موٹر سائیکل سوار میری کار کے پیچھے آ کر کھڑا ہو گیا۔ سگنل کی بتی سرخ تھی۔ میں بیک ویو مرر سے اسے پہچاننے اور اس کا مقدور بھر جائزہ لینے کی کوشش کرتا رہا۔ تب ہی میں بری طرح چونکا۔ میں اسے پہچان چکا تھا۔

وہ بنگلے کا چوکیدار تھا۔ جس کا نام مجھے ارشد معلوم ہوا تھا اور ملازم کا مقبول۔ میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ وہ دونوں ملازم میری جانب سے شک میں مبتلا ہو چکے تھے۔ یوں مقبول نے اپنے ساتھی ملازم ارشد کو میری جانچ کے لیے میرے

تعاقب میں روانہ کر دیا تھا تاکہ بعد میں پولیس کا معاملہ گمبھیر ہونے لگے تو وہ نگہت کے حکم کی پروا کیے بغیر اپنے ''صاحب'' عدیل کے قتل کے سلسلے میں ان کی مدد کر سکیں۔

سگنل گرین ہوا۔ میں نے کار آگے بڑھا دی۔ اب میرا ارادہ گھر جانے کے بجائے یونہی کسی دوسری جانب ہو گیا۔ میں اسے جل دینے کی کوشش کرتا رہا۔ چاہتا تو اس پر کسی طرح قابو پا کر اسے مار بھگا سکتا تھا لیکن اس طرح معاملہ اور زیادہ خطرناک اور گمبھیر ہو سکتا تھا۔

یہ سب وہ اپنے بڑے مالک اقبال کو بھی بتا سکتے تھے۔ یوں میری، فوزیہ اور راحیلہ سمیت یہاں موجودگی خطرے میں پڑ جاتی۔

میں نے کس قدر کوشش کی تھی کہ خود کو خفیہ رکھتے ہوئے نگہت اور اس کی ماں شگفتہ کی جاسوسی کرتا رہوں اور کھوج لگانے کوشش کروں کہ آیا ان دونوں خواتین کا کوئی رشتہ ناتا واقعی باس اقبال سے تھا یا محض نام کی مماثلت کا شاخسانہ تھا۔

راستے میں اچانک ہونے والی راہزنی کی واردات نے سب کچھ چوپٹ کر ڈالا تھا۔ نگہت بھی شدید زخمی نہ ہوتی یا اس کا انکل عدیل راہزنوں کے ہاتھوں قتل نہ ہوتا تب بھی صورتِ حال کسی قدر قابو میں رہتی مگر اب تو جیسے سب کچھ دوبارہ بکھرنے لگا تھا۔

نت نئے ہنگامے مجھے اب یہاں بھی موت کا رقص کرتے محسوس ہونے لگے۔

دو تین تنگ اور طویل موڑ کاٹنے کے بعد میں بالآخر تعاقب کرنے والے موٹر سائیکل سوار کو جل دینے میں کامیاب تو ہو گیا مگر مجھے یقین تھا کہ میری اس ''مہارت'' نے اسے میری طرف سے مزید شک میں مبتلا کر دیا ہوگا بلکہ اس نے میری کار کا نمبر بھی ایک بار پھر ذہن نشین کر لیا ہوگا۔

میں گھر پہنچ گیا۔ شام ہو چکی تھی۔ راحیلہ اور فوزیہ میری منتظر تھیں۔

''لگتا ہے تم نے یہاں بھی مہم بازیاں شروع کر دی ہیں؟'' راحیلہ نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ فوزیہ ایک طرف کھڑی مسکرا رہی تھی۔

''چھری کے نیچے دم تو لینے دو۔ میں باہر سے تھکا ہوا آیا ہوں۔'' میں نے حسبِ سابق اسے ڈپٹا۔

''یہی سوال میرا بھی ہے تم سے جناب!'' فوزیہ بھی بولی۔

''لو، یک نہ شد دو شد۔'' میں بڑبڑایا۔ اتنے میں جنت نے آ کر چائے کا پوچھا۔ میں نے شکریے کے ساتھ اثبات میں سر کو جنبش دے دی۔

''کھانا کھا لیتے نا، چائے کیوں پی رہے ہو؟ پتا نہیں دوپہر کو تم نے کچھ کھایا بھی ہے کہ نہیں۔'' فوزیہ بولی۔

''کھانے کا موڈ نہیں ہو رہا۔ چائے ہی ٹھیک ہے۔''

''تم گئے کہاں تھے، صبح سے...... خاصے تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔'' راحیلہ نے پوچھا۔ ہم نشست گاہ میں بیٹھ گئے تھے۔

میں نے انہیں تازہ صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ دونوں فکرمند سی نظر آنے لگیں۔

''پریشان ہونے کے بجائے مجھے مشورہ دو، اب کیا کروں؟ ہم تو ایک ڈان کی بیٹی کے محلے دار بھی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اقبال کو تم نے سر پر سوار کر لیا ہے۔ ضروری تو نہیں کہ وہ نگہت کا باپ ہی ہو۔'' راحیلہ بولی۔ تاہم اس کی آواز میں قطعیت نہیں تھی۔

''اشارے یہی بتا رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر نگہت سے صاف صاف بات کیوں نہیں کر لیتے؟'' راحیلہ بولی۔

''ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔''

''کیا اسے تم نے بتایا ہے کہ تم اسی کے محلے میں بلکہ اس کے گھر کے عقب والے بنگلے میں مقیم ہو؟'' اس بار فوزیہ نے کسی خیال کے تحت کہا۔

''ابھی تو نہیں بتایا مگر یہ بات اب زیادہ دیر مخفی بھی نہیں رہ سکتی۔'' میں نے یہ کہا ہی تھا کہ جنت چائے لے آئی۔ فوزیہ نے اسے رخصت کر دیا اور خود چائے بنانے لگی۔

''میرا خیال ہے پھر تمہیں نگہت سے صاف صاف کہہ دینا چاہیے۔'' راحیلہ نے مشورہ دیا۔

''وہ کیا؟''

''یہی کہ وہ کون ہے؟ اس کا باپ اگر وہی اقبال ہی ہے تو ایسے باپ کی بیٹی ہونے پر اسے شرمندہ ہونا چاہیے اور ہماری مدد کرنا چاہیے۔''

راحیلہ نے یہ بات چڑنے والے انداز میں کہی تھی اور میں اسے گھور کر رہ گیا۔ فوزیہ ہنسنے لگی۔ اس نے ہمیں چائے کا ایک ایک کپ تھما دیا اور خود بھی ایک کپ سنبھالے دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئی۔

''میں تو یہی سمجھی تھی کہ تمہارا پھر دونوں مردودوں سلیم چھالیا اور راجو بوری سے ٹاکرا ہو گیا ہے۔'' فوزیہ چائے کا ایک گھونٹ بھرتے ہوئے بولی۔ ''جیسا کہ پھوٹا خان نے فون

پر مطلع کیا تھا کہ وہ دونوں خبیث بھی یہاں پہنچنے والے ہیں۔''
''ابھی تک تو وہ نہیں پہنچے لیکن صادق آباد تو پہنچ ہی چکے ہیں۔ سیالکوٹ میں ان کی آمد سمجھ میں نہیں آرہی۔ کیا انہیں ہم پر شبہ ہوگیا ہے کہ ہم اسی شہر میں فروکش ہیں؟'' میں نے خود کلامیہ سوال کیا۔
''ممکن ہے وہ نگہت کی کسی مدد کے لیے آرہے ہوں۔'' راحیلہ نے خیال ظاہر کیا۔ ''بقول تمہارے نگہت اور وسیم کا کسی جوجی نام کے گروپ سے جھگڑا جو چل رہا ہے۔''
''ہوسکتا ہے، نگہت کو میں اسی لیے نظروں میں رکھے ہوئے ہوں۔ اسی کے ذریعے مجھے ان کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوتا رہے گا۔''
''لیکن اگر تمہارے بارے میں ان دونوں کو پتا چل گیا تو پھر چودھری جی برادران اور اس کے گماشتے خونی بھیڑیوں کی طرح یہاں دوڑے چلے آئیں گے۔'' فوزیہ نے خدشہ ظاہر کرتے ہوئے کہا۔
''عین ممکن ہے۔'' میں نے تائید میں کہا۔
''تو پھر کیا ہم یہاں سے بھی بھاگ چلیں؟ پھر کہاں جائیں گے آخر؟ کیا یہی بھاگا دوڑی ہمارا مقدر بنی رہے گی؟'' فوزیہ نے کہا۔ اس کے لہجے میں مایوسی اور آزردگی عود کر آئی تھی۔
''مقدر سے کیسا گلہ شکوہ۔'' میں نے سر جھٹکتے ہوئے پھیکی سی مسکراہٹ سے کہا۔ ''گردش حیات بعض لوگوں کا مقدر ہوتی ہے اور بعض لوگ شاہی تخت نشینی میں آرام سے بیٹھے وقت گزار رہے ہوتے ہیں۔ وقت کا حساب بہر حال سب کو دینا ہوتا ہے۔ حساب کس کا بھاری اور میزان کس کا ہلکا ہوتا ہے، یہ سب اللہ جانتا ہے لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ تقدیر ہمارے ساتھ ہے۔ ہم کراچی سے سیالکوٹ کے لیے چلے تھے، راستے میں تینوں بچھڑ گئے۔ حالات ہم تینوں کے لیے ایک دم غیر یقینی ہوگئے۔ کسی کو کسی سے دوبارہ ملنے کی کب امید رہی تھی لیکن دیکھو، ہمت، حوصلے اور صبر واستقامت کی راہ پر چلے تو آج ہم تینوں بخیر وعافیت ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہیں۔''
''تم دونوں کیا یہ سنجیدہ اور خشک موضوع لے کر بیٹھ گئے۔'' راحیلہ نے ہمیں ٹوکا۔ ''بات ہو رہی تھی نگہت کی، جو ہمارے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔ یہ ایک خدشہ ہے۔ اگر ہم نگہت کو اس کے باپ کے کالے کرتوتوں سے آگاہ کردیں تو وہ یقیناً اس کے بجائے ہمارا ساتھ دینے پر تیار ہوجائے گی۔''
''تمہاری اچانک درمیان میں مدبرانہ گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ تم کوئی اہم بات کروگی مگر تم نے تو بالکل بچوں والی بات کہہ ڈالی۔'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔
''اس کی بیوی یا مطلقہ کہہ لو، شگفتہ خاتون...... وہ اپنے شوہر کے سب کرتوتوں سے آگاہ ہوگی۔ اسی لیے تو اس نے ابتدا میں ہی اس سے اپنی راہ جدا کرلی تھی۔ بات اس کی بیٹی نگہت کی ہو تو یہ کیسے... ممکن نہیں کہ اسے بھی اپنے باپ کے بارے میں سیاہ وسفید کا علم نہ ہو۔ وہ بھی جانتی ہوگی۔''
''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' فوزیہ نے میری تائید میں کہا۔ ''بیٹیوں کے لیے ماں اپنی جگہ مگر باپ ایک حیثیت رکھتا ہے۔ خواہ وہ کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ نگہت ایک عرصے سے باپ سے دور رہی ہوگی جیسا کہ تم نے بتایا۔ ہوسکتا ہے باپ نے اسے وہ سچ نہ بتایا ہو جو اس کی بیوی یعنی نگہت کی ماں جانتی ہوگی۔ اس نے خود کو مظلوم اور بیوی کو غلط کہا ہوگا۔ نگہت ایک علیحدگی اختیار کیے ہوئے ماں باپ کی اولاد ہے۔ وہ دو پاٹوں کے درمیان پس رہی ہے۔''
''میں خود اسی لیے نگہت کے ہی نہیں بلکہ اس کی ماں شگفتہ خاتون کے قریب ہونے کی کوشش کررہا ہوں۔ اگرچہ اب تک ایسے کوئی ٹھوس شواہد نہیں ملے ہیں جس سے ہمیں یقین ہوجائے کہ اقبال ہی شگفتہ خاتون کا شوہر اور نگہت کا باپ ہے۔'' میں نے کہا۔
اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ہم تینوں چونک پڑے۔ فون صوفے کے ساتھ ہی تپائی پر رکھا تھا۔ میں نے فوراً ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔
''ہیلو۔''
''سس...... سہراب!'' دوسری جانب سے سدرہ کی کپکپاتی آواز ابھری۔
''مم...... مما کا انتقال ہوگیا ہے۔'' اس نے دلدوز خبر سنادی۔ میں سن ہوکر رہ گیا۔ وہ آج ہی کراچی پہنچی ہوگی بلکہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی...... اور یہ خبر اس کو وہاں پہنچتے ہی ملی ہوگی۔ مجھے یہ اطلاع دیتے ہی اس کا دل بھی بھر آیا تھا اور وہ سسک کر رو پڑی تھی۔
''اوہ...... لل...... لیکن کیسے ہوا یہ سب......'' میں ہکلا کر رہ گیا۔ ''وہ تو بقول تمہارے بالکل بھلی چنگی ہونے لگی تھیں؟''
دوسری جانب سدرہ کے سسکنے کی آواز آتی رہی پھر وہ جیسے حوصلہ کرکے بہ مشکل بولی۔ ''ہاں، وہ صحت یاب ہو رہی تھیں لیکن...... جب میں...... وہاں پہنچی تو معلوم ہوا...... کہ ان کی طبیعت پھر اچانک...... بگڑ گئی تھی۔ میرے پہنچنے کے ایک گھنٹے بعد ہی وہ چل بسیں۔''

"حوصلہ کرو سدرہ!" میں بہ مشکل کہہ پایا۔ "شاید اللہ کو یہی منظور تھا۔" میں اور کیا کہتا۔

"میرے دل میں ایک پھانس آ گئی ہے۔ کاش، میں مما کو یوں تنہا چھوڑ کر سیالکوٹ نہ آئی ہوتی مگر...... مم...... مجھے انکل مشتاق پر پورا بھروسا تھا کہ وہ میری غیر موجودگی میں مما کا پورا خیال رکھیں گے لل...... لیکن وہ بھی دو دنوں سے غائب ہیں۔"

"کیا......؟" اس انکشاف پر میں چونکے بنا نہیں رہ سکا۔ "وہ بھلا کہاں غائب ہوگئے؟ تم نے کچھ اتا پتا کیا ان کا؟"

"ہاں، لیکن کسی کو نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں؟"

"سجاد سے پوچھا؟" میں نے کسی خیال کے تحت اس کے نام نہاد ماموں کے بارے میں سوال کیا۔

"وہ بھی اپنی سازش کی کامیابی کے بعد کل سے غائب ہے۔" بتاتے ہوئے یکایک اس کا لہجہ نفرت انگیز ہوگیا پھر وہ بولی۔ "میں اس کے خلاف مما کے قتل کا پرچہ کٹوانے والی ہوں۔"

"اس کا کوئی ٹھوس ثبوت ہے تمہارے پاس؟" میں نے کہا۔

"ثبوت تو نہیں لیکن......" سدرہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ میں اس کے بولنے کا منتظر رہا۔ چند لمحے خاموشی چھائی رہی اور دوبارہ دوسری جانب سے سدرہ کی سسکی ابھری۔ ایسی سسکی جس میں غم بھی تھا، مایوسی بھی اور بے بسی بھی۔

"تم اس مردود کے خلاف کوئی بھی قانونی کارروائی نہیں کرسکتیں۔ تمہیں اب ہمت اور حوصلے سے کام لینا ہوگا سدرہ!"

"سہراب...... ا م...... مجھے یقین نہیں آرہا ہے کہ میں اس بھری دنیا میں بالکل تنہا رہ گئی ہوں۔" وہ غم سے لرزتی آواز میں بولی۔ "پہلے پاپا گئے، اب مما بھی ساتھ چھوڑ گئیں۔ ہمارے دشمن اتنے طاقتور کیوں ہیں سہراب؟ کیا میری تقدیر اس قدر ظالم ہے کہ اسے مجھ پر رحم بھی نہ آیا؟" وہ پھر رونے جیسی ہوگئی۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ میں بولا۔

"اگر تم اس طرح حوصلہ ہارتی رہیں تو دشمن اپنی سازشوں میں کامیاب ہوتے رہیں گے۔ تمہیں شاید اس بات کا احساس نہیں کہ سجاد اور دشمنوں کے لیے اب صرف تم رہ گئی ہو۔ سجاد قانونی طور پر اپنا رشتہ ڈکلیئر کرچکا ہے۔ اگر خدانا خواستہ تمہیں بھی کچھ ہوگیا تو جانتی ہو تمہارے پاپا کی چھوڑی ہوئی دولت، کاروبار، جائداد کا کون وارث ہوگا؟"

شاید سدرہ کو اس تلخ حقیقت کا اندازہ نہ تھا۔ میری بات سن کر وہ یکدم سکتے میں آگئی۔ اس سے کافی دیر تک تو کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

"معافی چاہتا ہوں۔ حالات ہی ایسے ہیں کہ تم سے یہ بے رحمانہ اور کڑوی بات کہنا پڑی۔"

"میں آج ہی ان سے ہر طرح کی لاتعلقی کا اعلان اخبار میں دے دیتی ہوں۔" سکتے کی کیفیت سے گزرنے کے بعد وہ جیسے فوراً جوش میں آکر بولی۔

"اس کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ وہ الٹا تم پر کوئی کیس بنا ڈالے گا۔" میں نے کہا۔ "وہ کس قدر مکار اور چالاک آدمی ہے، اسے تم سے زیادہ میں جانتا ہوں۔ اقبال جیسے ایک بڑے ڈان نے ایسے ہی نہیں اسے اپنا دستِ راست بنا رکھا ہے۔ وہ حال، ماضی اور مستقبل پر نظر رکھنے والا آدمی ہے۔ اسے سیٹھ سکندر کی ہلاکت سے پہلے اور اب تک سارے حالات کا ادراک ہوگا۔ تمہارے اور میرے تعلقات کا بھی وہ خبیث بہ خوبی علم رکھتا ہوگا۔ اسے یہ بھی یقیناً معلوم ہوگا کہ تم ایک دو روز کے لیے کراچی سے کہاں غائب رہی ہو۔"

میں نے اسے تصویر کے دونوں رخ دکھانے کے بعد ذرا ٹھہر کر دوبارہ کہا۔

"اپنے انکل مشتاق کی فکر کرو اور ان کی گمشدگی کی پولیس کو فی الفور رپورٹ کرو۔ خود بھی محتاط رہو۔ ہوسکے تو ایک ذاتی باڈی گارڈ رکھ لو اور اپنی سیکیورٹی بڑھا دو۔"

"تم کراچی کب آرہے ہو؟" اس نے فوراً پوچھا۔ "ان دونوں خواتین کا کیا بنا؟ ان کی کچھ حقیقت سامنے آئی؟"

میں نے ایک گہری ہنکاری خارج کی اور بولا۔

"ابھی وہ معاملہ درمیان میں ہے۔ رہی بات میرے کراچی آنے کی، تو وہ میں کسی بھی وقت آسکتا ہوں لیکن اقبال کی جڑیں میرے سامنے ہیں۔ میں ان میں گھسنا چاہتا ہوں۔ تم اپنا خیال رکھو اور ہاں، چھوٹا خان سے میرے حوالے سے رابطہ کرنا مناسب سمجھو تو کرسکتی ہو۔ ان حالات میں وہ بھی تمہارا وہاں بہترین مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔ میں یہاں اقبال کی جڑیں کاٹنے میں مصروف ہوں۔ جیسے ہی یہ کام کافی حد تک پایہ تکمیل کو پہنچا، میں فوراً کراچی کا رخ کروں گا۔ مجھ سے رابطے میں رہنا اور مجھ سے مشورہ کیے بغیر کوئی اہم قدم مت اٹھانا۔"

میں نے رابطہ منقطع کردیا۔ راحیلہ اور فوزیہ پر یہ خبر بجلی بن کر گری تھی۔

"اس کا مطلب ہے وہ خبیث سجاد اپنی زہریلی

سازشوں میں کامیاب جا رہا ہے۔'' راحیلہ نے تبصرہ کیا۔

''ہاں۔'' میرے منہ سے گومگو سے انداز میں برآمد ہوا۔ ''اسے جیسے ہی اندازہ ہوا کہ سدرہ کی ماں پر اس کی اصل حقیقت آشکار ہو چکی ہے، اس رذیل نے اسے مروا دیا۔''

''ان کا انتقال کیسے ہوا؟'' فوزیہ نے دکھی لہجے میں پوچھا۔

''طبیعت اچانک بگڑ گئی تھی۔'' میں نے کہا۔

''طبیعت بگاڑنے کا تو بہانہ تھا۔ وہ تو بے چاری اب صحت یابی کی طرف گامزن تھی۔'' راحیلہ بولی۔

''مشتاق بھی پراسرار طور پر غائب ہے۔'' میں نے بتایا۔

''اوہ، کہیں وہ سجاد کے ساتھ کسی ساز باز میں تو شریک نہیں؟'' فوزیہ نے شبہ ظاہر کیا۔

''ہرگز نہیں، وہ ایک قابلِ اعتماد آدمی ہے۔ سیٹھ سکندر ایک جوہر شناس آدمی تھے۔ اس کے دونوں آدمی مشتاق اور محمود جان دے سکتے ہیں مگر دھوکا دینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

چند لمحے ٹھہر کر میں نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

''مجھے لگتا ہے وہ ضرور سدرہ کی ماں کی ہلاکت کے بارے میں کچھ جانتا ہوگا، جس کا علم بروقت اس خبیث سجاد کو ہو گیا اور اس نے نہ جانے اسے کہاں غائب کر دیا یا.... خدانخواستہ اس کا بھی قتل کر ڈالا ہو۔''

کمرے میں چند ثانیوں کے لیے خاموشی طاری ہو گئی اس کے بعد میں باہر نکل گیا۔

رات ہونے لگی تھی۔ محلے میں متر گشت کے انداز میں ایک چکر لگانے کے بعد میں نے نگہت کے گھر کا رخ کیا۔ وہاں پہنچا تو تالا لگا ہوا تھا۔

نگہت کا تو مجھے علم تھا کہ وہ کہاں تھی مگر شاید اس کی ماں شگفتہ خاتون کو پتا نہیں تھا کہ اس کی بیٹی کہاں تھی اور اس کے ساتھ کیا کچھ بیت چکی تھی۔ ہو سکتا ہے نگہت نے اقبال چوک والے بنگلے سے انہیں فون کر کے کچھ بتا دیا ہو یا پھر شگفتہ خاتون پریشانی کے عالم میں خود ہی اس کی تلاش میں نکل چکی ہوں۔

میں ہونٹ بھینچے کچھ سوچتا رہا اور بالآخر میں نے گھر میں نقب لگانے کا ارادہ کیا۔ اس گھر میں نقب لگانا آسان تھا۔ اگلے چند منٹوں بعد میں اندر تھا۔ صحن اور برآمدے کی بتی جلتی چھوڑی گئی تھی۔ باقی دو کمروں میں اندھیرا تھا اور ان کے دروازے بھی بند تھے۔ مکان زیادہ کشادہ نہ تھا تاہم دو افراد کے لیے بہت تھا۔

بڑے سے صحن میں ہی باورچی خانہ اور ایک جانب غسل خانہ تھا۔ برآمدے میں چند کرسیاں اور ایک چھوٹی میز رکھی تھی۔ اس پر کچھ معمول کے برتن پڑے تھے۔ میں دبے پاؤں ایک کمرے کی جانب بڑھا۔ دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

اندھیرے میں سوئچ بورڈ ٹٹول کر لائٹ آن کر دی۔ کمرا دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ نگہت کا کمرا تھا کیونکہ دیوار پر اس کی ایک بڑی سی فائٹ ایکشن والی تصویر لگی ہوئی تھی جس میں اس نے خاصا چست لباس پہنا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ کارنس میز پر بھی فریم لگی اس کی تصاویر موجود تھیں۔ کہیں میڈل لیتی ہوئی تو کہیں کوئی سند تھامتی ہوئی۔ ایک دو گروپ فوٹوز بھی تھے جہاں وہ اپنے فائٹر کلب کے ساتھیوں کے ہمراہ تھی۔ ان میں لڑکے لڑکیاں بھی شامل تھے۔

میں نے اس کی میز کی درازوں کی تلاشی لینا شروع کر دی۔ کوئی قابلِ ذکر شے برآمد نہیں ہوئی۔ الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد میں نے دوبارہ اسی طرح ساری چیزیں رکھ دیں جیسی پہلے رکھی ہوئی تھیں البتہ نچلی دراز سے مجھے ایک موٹی جلد والی ڈائری دکھائی دی۔

میں نے اسے کھولا۔ اس میں شاعری کے کچھ مصرعے اور چند ایک آزاد نظموں کو روشنائی کی خوب صورت کڑھائی اور حاشیہ سے بنا کر نقل کیا گیا تھا۔ یہ معروف شاعروں اور شاعرات کے مجموعۂ کلام کو نقل کیا گیا تھا۔

میں ابھی وہ ڈائری بند کر کے دوبارہ رکھنے ہی لگا تھا کہ اچانک کوئی شے اندر سے نکل کر میرے پیروں پر گری۔ میں نے جھک کر اسے اٹھایا تو چونک پڑا۔

وہ پوسٹ کارڈ سائز تصویر تھی۔ ایک جوان عورت اور ایک مرد کی۔ عورت کی گود میں شیر خوار بچی تھی۔ مرد کی شبیہہ ...... باس اقبال پر پڑتی تھی۔ خاتون یقیناً نگہت کی ماں اور اقبال کی بیوی شگفتہ تھی۔ شیر خوار بچی نگہت کے سوا کون ہو سکتی تھی۔

یہ ان کی پرانی اور بلیک اینڈ وائٹ تصویر تھی۔ میں نے ڈائری کو دوبارہ اچھی طرح چیک کیا تو اس میں سے ایک تصویر بھی برآمد ہوئی۔ یہ نئی اور کلر تصویر تھی۔ اس نئی تصویر میں باس اقبال اپنی موجودہ شکل میں تھا مگر اس کے ہمراہ خود نگہت تھی۔ یہ تصویر یقیناً نگہت نے خود باپ کے ساتھ اتروائی ہوگی۔

نگہت کی ماں اپنے شوہر اقبال کے مقابلے میں زیادہ حسین نظر آ رہی تھی جبکہ اقبال کا ناک نقشہ میں پہلے ہی بیان کر چکا ہوں۔ وہ ایک سیاہ رو اور گہری سانولی رنگت، پھولے چہرے اور موٹی ناک والا شخص تھا۔

بہرطور، میں نے یہ سب سنبھال کر اسی طرح ڈائری دوبارہ نچلی دراز میں رکھ دی۔ یوں اب اس امر کی تصدیق ہوچکی تھی کہ باس اقبال کی ہی یہ وہ مختصر فیملی تھی جس کا شیرازہ بہت پہلے بکھر چکا تھا یا یوں کہہ لیں دونوں میاں بیوی کے درمیان بہت پہلے ہی علیحدگی ہوچکی تھی اور تب سے غالباً دونوں ماں بیٹی اکیلی ہی رہ رہی تھیں اور یقیناً شگفتہ خاتون نے ہی بعد میں نگہت کو پال پوس کر بڑا کیا تھا۔

میں کمرے سے نکل آیا۔ اب میرا رخ شگفتہ خاتون کے کمرے کی جانب تھا کہ اچانک ٹھٹک گیا۔

دروازے پر کھڑبڑ سی ہونے لگی۔ شاید کوئی آ گیا تھا اور اب دروازے پر لگے تالے کو کھول رہا تھا۔ میں کمرے کی لائٹ پہلے ہی بجھا کر نکلا تھا اسی لیے جلدی سے ایک تاریک گوشے میں جا چھپا۔

مجھے معلوم تو تھا کہ اس گھر میں دونوں ماں بیٹی کے سوا اور کوئی نہیں رہتا۔ نگہت کو تو شاید اب تک اسپتال پہنچا دیا گیا ہوگا جبکہ اس وقت آنے والی اس کی ماں ہی ہوسکتی تھی۔ اسے اطلاع مل گئی ہوگی اور وہ بیٹی سے ہی مل کر آ رہی ہوگی۔

وہی ہوا۔ دروازہ کھلا اور میری نظروں نے برقع پوش شگفتہ خاتون کو دیکھا۔ پہلے دو ایک بار بھی میں نے اسے چادر نما برقعے میں ہی دیکھا تھا۔

وہ اکیلی ہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں باسکٹ تھی۔ کچھ برتن تھے۔ یہاں پہلے ہی ایک بلب روشن تھا۔ اس نے برآمدے کے سامنے صحن میں بچھی چارپائی پر باسکٹ رکھ دی اور تھکی تھکی سی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

میں سوچتا رہا کہ کیا کرنا چاہیے؟ شگفتہ کو اکیلے دیکھ کر میرے ذہن میں ایک عجیب خیال سرایت کر گیا۔ میں سردست یہاں سے نکلنے کے بجائے وہیں دبکا رہا۔

ذرا دیر بعد شگفتہ خاتون کمرے سے برآمد ہوئی تو گھریلو قسم کے کپڑوں میں تھی اور برقع بھی اترا ہوا تھا۔ بلاشبہ اس عمر میں بھی وہ خاصی خوب صورت تھی۔ چالیس سے زیادہ کے پیٹے میں ہونے کے باوجود اپنی عمر سے چند سال کم ہی دکھائی دیتی تھی۔

وہ سرو قد تھی اور رنگت ستھری اور گوری۔ جسم تھوڑا ابھرا ابھرا تھا۔ وہ ایک پردہ دار اور شریف خاتون لگ رہی تھی اور میں نے جو فیصلہ کر رکھا تھا اس پر یہ خطرہ بھی تھا کہ کہیں وہ ناراض یا خوفزدہ ہوکر چیخنا چلّانا ہی نہ شروع کردے۔

اگر باس اقبال کی تصدیق نہ ہوئی ہوتی تو میں خاموشی سے نکل جاتا مگر اب معاملہ دوسرا ہوگیا تھا۔

وہ کافی پریشان اور متوحش بھی نظر آ رہی تھی۔ اس نے پہلے غسل خانے کا رخ کیا اس کے بعد باورچی خانے میں چلی گئی۔ میں تاریک گوشے میں دبکا کسی موقع کا منتظر رہا۔

بالآخر ذرا دیر بعد وہ برآمد ہوئی تو اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا۔ موسم اچھا تھا۔ وہ برآمدے میں ہی کرسی پر بیٹھ کر چائے پینے لگی۔

رات کے اس وقت مجھے اس کے چائے پینے کی تک سمجھ نہ آسکی ماسوائے اس کے کہ وہ بے چاری پریشان تھی اور کسی گہری سوچ میں مستغرق بھی۔

میں اس کے سامنے آ گیا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی یوں چونکی جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ چائے کا کپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ وہ چیخنا چاہتی تھی مگر ایک اجنبی کو یوں اچانک سامنے اکیلے گھر میں دیکھ کر چند لحظے کے لیے وہ سکتے میں آگئی تھی۔

میں اسی موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لپک کر اس کی جانب بڑھا اور اسے تھام لیا۔ میرا انداز احترام والا تھا۔

''خدا کے لیے مجھے غلط آدمی مت سمجھیے۔ آپ ایک عزت دار اور باپردہ خاتون ہیں۔ میں ایسا کرنے پر مجبور ہوں۔ آپ وعدہ کریں، خاموشی سے پہلے میری بات سنیں گی؟''

میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور ان میں خوف سرسرا رہا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ میری بات سن کر ان تاثرات میں واضح کمی ہوئی تھی۔

اس نے دبے ہوئے منہ سمیت ہولے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔ وہ ایک بڑی عمر کی عورت تھی۔ زندگی کے بیشتر تلخ و شیریں تجربات سے گزری ہوگی۔

میں نے آہستگی سے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔ وہ گہرے گہرے سانس لینے لگی۔

''مجھے افسوس ہے کہ آپ کی چائے کا کپ ٹوٹ گیا۔'' میں نے ہولے سے ندامت تلے کہا۔

''کون ہو تم؟'' اس نے پوچھا۔

''تسلی رکھیں۔ جیسا کہ میں نے کہا، میں آپ کو کوئی نقصان پہنچانے کا ارادہ قطعی نہیں رکھتا۔'' میں نے اسے تسلی دینا چاہی۔

معاشرتی ناسوروں اور درندوں کی خون ریز سازشوں اور زخم زخم ہونے والے ایک جنگ باز کی دلدوز داستان کے مزید واقعات اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

غیروں کا زخم تو زخم ہوتا ہے مگر... درد صرف اپنا محسوس ہوتا ہے... ان کا بھی یہی حال تھا۔ اپنا دکھ... اپنا غم... اپنا بچہ لیکن جانے کیسی چبھن تھی جس کے حصار میں قید ہوکر سب کے زخم اور سب کے غم اپنے ہی لگے...

تباہ کاریوں میں مبتلا عناصر کی بے حسی کا عجیب انداز

میرا بچہ

صفدر علی حیدری

کان پھاڑ دینے والا دھماکا ہوا اور کچھ دیر کے لیے تو اسے یوں لگا جیسے اس کا وجود ریزہ ریزہ ہوکر فضا میں بکھر گیا ہو پھر یوں لگا جیسے سپر اسٹور کی چھت ریزہ ریزہ ہوکر اس کے اوپر آن گری ہو۔ دھماکے کی بازگشت کان پھاڑ رہی تھی۔ کچھ دیر وہ یونہی بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ اب کبھی اٹھ نہیں پائے گا۔ وہ ہوش میں تھا اور اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا تھا، بس یہی اس کے زندہ ہونے کی واحد دلیل تھی۔

کئی منٹ گزر گئے۔ بم دھماکے کی بازگشت ختم ہوئی تو انسانی چیخوں، آہوں، سسکیوں اور بھاگنے دوڑنے کی آوازوں نے پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے کر ایک دم خوف ناک سا بنا دیا تھا۔
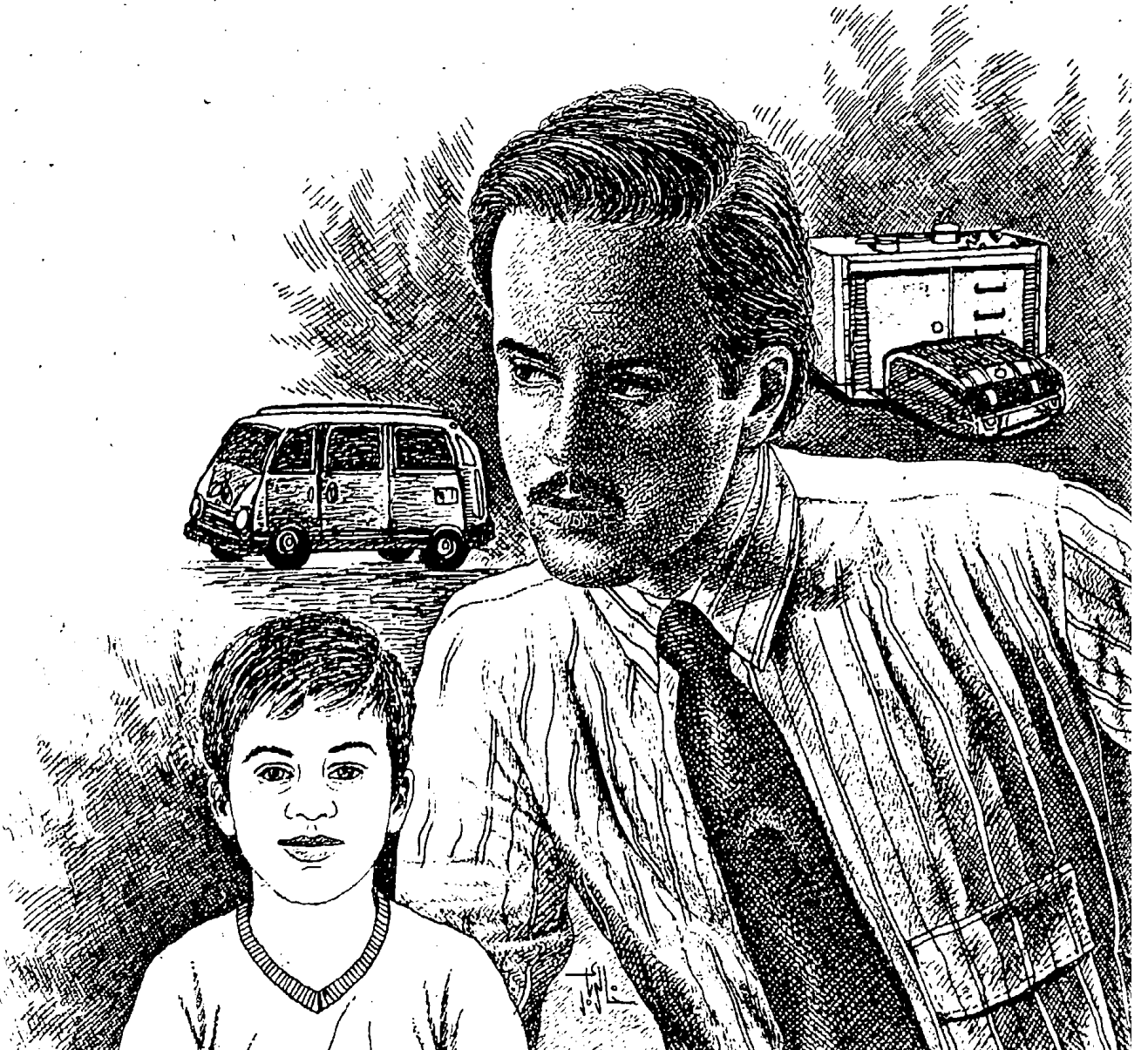
اس نے دوسرے لوگوں کو بھاگتے دوڑتے دیکھا تو اس نے بھی ہمت مجتمع کی کہ شاید وہ بھی اٹھ کر بھاگ دوڑ سکے پھر یہ دیکھ کر اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ وہ اپنے جسم کو اپنی مرضی سے حرکت دے سکتا تھا۔ اس نے آہستہ آہستہ اٹھنے کی کوشش کی تو ٹانگوں نے اس کا بھرپور ساتھ دیا۔

اس نے اٹھ کر حالات کا جائزہ لیا تو یہ دیکھ کر دل ہی دل میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر بجا لایا کہ اس کا گرنا اسے بچا گیا تھا ورنہ شیشوں کے ٹکڑے اس کا وجود چھلنی کر دیتے۔ سپر اسٹور شیشوں سے گھرا ہوا تھا اور اب ہر جگہ ان کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔

کئی ایک لوگ اس نے ایسے دیکھے جن کی حالت دیکھ کر اس کی بے ساختہ چیخ نکل گئی۔ وہ کوئی کم ہمت یا بزدل آدمی نہیں تھا مگر ان لوگوں کی حالت ہی ایسی تھی کہ اس کے منہ سے بے ساختہ چیخیں نکل گئیں......

☆☆☆

محمد سلیم کا تعلق کراچی کے ایک متوسط گھرانے سے تھا۔ اس کے دادا تقسیم کے وقت بھارت سے پاکستان آئے تھے۔ کراچی میں آکر اپنا کاروبار شروع کیا اور یہاں کے ماحول میں رچ بس گئے۔

انہوں نے سبزی منڈی میں آڑھت کی دکان کھولی تھی۔

اس کاروبار سے ان کا گزر بسر اچھی طرح ہو جاتا تھا۔ ابا جی بڑے ہوئے تو انہیں بھی اپنے ساتھ لگا لیا۔ یہی وجہ ہے کہ دادا جی کی وفات سے گھر کے مالی معاملات پر کچھ خاص اثر نہ پڑا کہ تب تک وہ مکمل طور پر کام سیکھ چکے تھے۔

سلیم نے جیسے تیسے میٹرک کیا تو اسے بھی اس کام کو اپنانا پڑا۔ پھر باپ کی زندگی میں ہی اسے اس میں اچھی خاصی مہارت ہو گئی۔ ماں باپ نے اپنی پسند سے اس کی شادی کر دی مگر پوتے پوتیوں کو کھلانے کی حسرت دل میں لیے وہ اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ ایک ٹریفک حادثے نے دونوں کی زندگی کا چراغ گل کر دیا۔

شادی کے کوئی دس سال بعد اس کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا تو گھر میں گویا خوشیوں کے جلترنگ سے بج اٹھے۔ وہ تو مایوس ہو چکے تھے کہ شاید اولاد ان کے مقدر میں نہیں۔ اس کی بھلی مانس بیوی نے دبے دبے لفظوں میں دوسری شادی کا بھی کہہ دیا مگر وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اپنی بیوی سے پیار ہو گیا تھا اور وہ یہ قدم اٹھا کر اسے تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا۔

عرفان کیا گھر آیا گھر کی تو قسمت ہی بدل گئی۔ جہاں ہر وقت اداسی کا پہرا تھا اب وہاں خوشیوں کا راج تھا۔ کہتے ہیں خوشی میں وقت گزرنے کا پتا نہیں چلتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے عرفان چھ سال کا ہو گیا اور اسکول جانے لگا۔ اس کی باتیں انہیں سرشار کر دیا کرتیں۔

وہ لاڈلا بھی تو بہت تھا۔ کسی کام کا ارادہ کر لیتا تو منوا کر چھوڑتا۔ اس دن بھی اس نے ضد کی کہ شاپنگ پر ساتھ جائے گا۔ ماں روکتی رہی مگر وہ جلدی سے بائیک پر سوار بھی ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اچانک اسے یاد آیا کہ عرفان بھی اس کے ساتھ تھا۔

''میرا بچہ...... میرا بچہ...... عرفا......ن...... عرفان...... عرفان۔''

وہ پوری شدت سے چلایا تھا۔

مگر وہ اسے کہیں دکھائی نہ دیا۔ پھر اسے خیال آیا کہ وہ کہیں باہر نہ ہو۔ باہر آیا تو بہت سے لوگ جمع تھے۔ ایمبولینس کے سائرن بج رہے تھے۔ شور ایسا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی تھی، باہر بھی کم تباہی نہ ہوئی تھی۔

بلکہ اصل تباہی تو باہر ہی ہوئی تھی کہ وہاں بم پھٹا تھا۔

ایک آدمی نے اسے پریشان دیکھا تو اس سے حال چال پوچھنے لگا۔

''بھائی میرا بیٹا کھو گیا ہے......اس کی عمر کوئی چھ برس ہے۔''

''اس کا لباس سفید تو نہیں تھا؟''

''ہاں ہاں، اس نے سفید کرتہ پہن رکھا تھا۔''

''وہ......تو...... اسے تو ایمبولینس میں لے گئے ہیں، وہ زخمی تھا......مگر اس کی سانس چل رہی تھی۔''

اور اسے یوں لگا جیسے زمین کی گردش ایک دم تیز ہو گئی تھی۔ وہ کسی لٹو کی طرح گھوم گیا اور اگر وہ اجنبی اسے تھام نہ لیتا تو وہ زمین پر گر گیا ہوتا۔

''آپ پریشان نہ ہوں، دعا کریں...... اللہ تعالیٰ اسے زندگی دے۔ چلیں میں آپ کو اسپتال لیے چلتا ہوں۔ ایسی حالت میں آپ کا ڈرائیو کرنا ٹھیک نہیں۔''

''بہت شکریہ......''

وہ کوئی آدھے گھنٹے میں اسپتال کے گیٹ پر تھے۔ وہاں پولیس کے افراد بکثرت موجود تھے، میڈیا کی گاڑیاں بھی پہنچ چکی تھیں۔

مگر اسے ہوش ہی کب تھا کہ ان پر غور کرتا۔ اس کا تو رُواں رُواں دعا کر رہا تھا کہ اس کا عرفان خیریت سے ہو۔

☆☆☆

"آئیں ناظرین آپ کو اس حادثے کے عینی شاہد سے ملواتے ہیں۔ آپ تو اس وقت دھماکے سے سو گز کے فاصلے پر تھے۔ آپ بتائیں کہ جب دھماکا ہوا تو آپ کو کیا محسوس ہوا۔"

"میں اس وقت سپر اسٹور کے اندر تھا۔ دھماکے کی وجہ سے میں فرش پر گر گیا۔ اوسان بحال ہوئے تو ہر طرف تباہی کی تصویریں دیکھیں۔ میں اگر گر نہ جاتا تو آج شاید زندہ نہ ہوتا۔ اس بم دھماکے میں میرا بیٹا عرفان بھی زخمی ہوا ہے۔ میں اسے ڈھونڈنے اسپتال آیا ہوں۔ ہائے میرا بچہ...... کہاں ہے میرا بچہ...... عرفان، عرفان......!" اور اس کے ہاتھ سے چائے کی پیالی گر گئی۔

"بی بی جی کیا ہوا؟ کیا ہوا آپ کو؟ آپ ٹھیک تو ہیں۔

م...... میں ڈاکٹر کو فون کرتی ہوں۔"

"م...... میرا عرفان...... میرا عرفان......"

"ارے یہ تو سلیم صاحب ہیں...... ارے یہ اسپتال میں کیا کر رہے ہیں؟"

"تت...... تم میرے ساتھ اسپتال چلو، اسی وقت......"

"مگر آپ کی طبیعت......"

"کچھ نہیں ہوا میری طبیعت کو۔ ٹھیک ہوں میں۔ بس تم چلو میرے ساتھ ابھی اسی وقت......"

اور وہ دونوں تیزی سے ایک ٹیکسی میں اسپتال پہنچیں۔ وہاں ایمرجنسی روم کے باہر اس کا شوہر ادھر سے اُدھر چکراتا پھر رہا تھا۔

"کہاں ہے میرا بچہ...... کہاں ہے؟ وہ تمہارے ساتھ کیوں نہیں ہے...... کہاں ہے وہ؟ تم کچھ بتاتے کیوں نہیں ہو......؟"

اپنی بیوی کو اپنے سامنے دیکھ کر اس کے چھکے چھوٹ گئے۔ اس نے تو جان کر اسے کال بھی نہیں کی تھی کہ وہ اسے کیا جواب دے گا پھر پتا نہیں اسے کس نے بتایا اور وہ کیسے یہاں پہنچ گئی۔

"وہ...... وہ ایمرجنسی میں ہے۔ اس کا آپریشن ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر تسلی دلا رہے ہیں۔ تم فکر نہ کرو ہمارے عرفان کو کچھ نہیں ہوگا۔ تم دیکھ لینا آج ہی وہ گھر جائے گا۔"

جانے اس نے بیوی کو تسلی دی تھی یا خود کو......

"م...... میں ملوں گی اس سے۔ ابھی تم لے کر چلو اسے میرے ساتھ۔"

وہ بے قابو ہو رہی تھی۔ اس کی مامتا مچل رہی تھی، تڑپ رہی تھی۔

آخر اس کی اکلوتی اولاد تھی اور کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ زندہ بھی بچے گا یا......

"تم ادھر بیٹھو...... میری بات سنو پلیز! اس کے لیے دعا کرو، ماں کی دعا تو عرش ہلا دیتی ہے۔ خدا کے لیے میرے بیٹے کے لیے، اپنے عرفان کے لیے دعا کرو۔" اور وہ اسی وقت فرش پر بیٹھی اور سجدے میں گر گئی۔ اس کو سجدے میں گرتا دیکھ کر وہ بھی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ پایا اور سجدے میں گر گیا۔

"اے رب تو نے دس سال بعد ایک پھول دیا تھا جس کی خوشبو سے میرے گھر کا ایک ایک کونا معطر ہو گیا۔ اس کو سلامت رکھنا، لمبی عمر عطا کرنا۔ ہر مصیبت سے بچانا۔ وہ بستر مرگ پر ہے اور ڈاکٹر اسے بچانے میں لگے ہیں۔ تو اگر

چاہے تو وہ بچ سکتا ہے۔ زندگی کی طرف واپس لوٹ سکتا ہے۔ ہماری مدد فرما۔ ہماری دعا کو قبول فرما لے۔ ہم پر اپنا کرم کر دے تُو نے جس دولت سے نوازا تھا، اسے ہمارے پاس رہنے دے۔ ایک ہی بیٹا ہے میرا۔ اسے مجھے لوٹا دے، واپس کر دے۔ اس کی جدائی ہمیں مار ڈالے گی۔ ہماری دعائیں ہماری التجائیں سن لے پاک پروردگار......''

جانے کتنی دیر وہ رب کے حضور گڑگڑاتا رہا، روتا تڑپتا اور دعائیں مانگتا رہا کہ اچانک کسی نے اس کا کندھا ہلایا۔ اس نے سجدے سے سر اٹھا کر دیکھا تو سفید کوٹ میں ملبوس ایک آدمی تھا۔ یقیناً ڈاکٹر صاحب ہوں گے۔ وہ فوراً اٹھا اور ڈاکٹر صاحب سے پوچھنے لگا۔

''ڈاکٹر صاحب! میرا بچہ ٹھیک تو ہے نا...... وہ بچ گیا ہے نا؟''

''سوری! ہم نے اسے بچانے کی پوری کوشش کی لیکن...... جو خدا کو منظور......''

''نہیں...... نہیں...... نہیں......'' بے چاری ماں چیخ ہی تو پڑی تھی۔ لگتا تھا اس کا دل کٹ گیا ہو اور پھر وہ بے ہوش ہو کر گر گئی۔ فوراً ہی اسے بیڈ پر لٹایا گیا۔

وہ صدمے سے بے ہوش ہوئی تھی سو گھبرانے کی کوئی بات نہیں تھی۔

''ڈاکٹر صاحب! میں ایک نظر اپنے بیٹے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔''

وہ سسک رہا تھا۔ آنسو تھے کہ اس کے رخساروں کو بھگو رہے تھے۔ اس کا معصوم وجود سفید چادر نے ڈھانپ لیا تھا۔ وہ زندگی کی بازی ہار چکا تھا اور اس کی یہ ہار ایک ایسا بھاری پتھر تھی کہ اس کے والدین اسے اٹھا نہیں پا رہے تھے۔ وہ آگے بڑھا...... اور کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے چادر کا کونا پکڑ لیا...... مگر چیخ مار کر اسے چھوڑ دیا۔ وہ بھلا کیسے اس کا مرا ہوا منہ دیکھ سکتا تھا پھر وہ دھاڑیں مارتا ہوا فرش پر بیٹھ گیا۔ اسے لگا جیسے وہ اب کبھی اٹھ نہیں پائے گا۔ اس کی کمر ٹوٹ چکی تھی۔ ہمت کے پُرزے پُرزے ہو گئے تھے۔ کچھ دیر کے بعد اس نے پھر ہمت کی اور کپکپاتے ہاتھوں سے اس نے چادر کا کونا ہٹایا اور پھر اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کی چیخ نکل گئی۔

☆☆☆

''مم...... میں کک...... کہاں ہوں؟''

''تم میرے پاس ہو اپنے شوہر کے پاس۔''

''اور عرفان کہاں ہے...... میرا عرفان...... عرفان......''

اچانک اسے یاد آیا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو کھو چکی ہے۔

''عرفان...... عرفان...... عر...... فا...... ن۔''

''جی امی! میں آپ کے پاس ہی تو ہوں...... یہ دیکھیں۔''

''عرفان...... میری جان...... میرے بچے...... تم...... تم زندہ ہو...... یا میں خواب دیکھ رہی ہوں؟''

''کیا ہوا...... کیوں چلّا رہی ہو؟'' اچانک اس کی آنکھ کھلی تو سامنے اپنے شوہر کو پایا۔

''وہ...... وہ...... عرفان...... میں نے عرفان کو خواب میں دیکھا۔ وہ یہیں تھا میرے پاس...... کاش وہ خواب نہ ہوتا۔ اے کاش میری آنکھ کبھی نہ کھلتی...... اے کاش۔''

وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ ''کیوں رو رہی ہو......'' وہ بولا ''یہ دیکھو تمہارا عرفان تمہارا پاس ہے۔''

ہیں...... اور وہ عرفان کو اپنے پاس دیکھ کر حیرت اور خوشی سے اچھل پڑی۔

''میرے بچے...... میری جان......''

وہ جلدی سے اس سے لپٹ گئی۔

عرفان بھی زخمی ہوا تھا اور ایک اور لڑکا بھی جو اسی کی عمر کا تھا۔

عرفان کو معمولی سی چوٹ آئی تھی اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

''جسے ہم اپنا بچہ سمجھ کر دعائیں مانگتے رہے وہ بے چارہ ہمارا بیٹا نہیں تھا۔ میرا خدا کتنا مہربان ہے کتنا رحیم و کریم ہے اس نے ہمارے بچے کو بچا لیا۔ ہم اس کا جس قدر شکر کریں کم ہے۔ کاش ہماری دعائیں اس بچے کو بھی لگ جاتیں...... کاش وہ بچہ بھی زندہ رہ جاتا۔''

''ہاں میرا رب بڑا کریم ہے...... بڑا رحیم ہے...... تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے میرے رب کہ تُو نے میرا بچہ مجھے لوٹا دیا۔''

میاں بیوی دونوں کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھی تھے اور افسردگی کے بھی۔ انہوں نے اپنے بچے کو اپنی بانہوں میں سمیٹ رکھا تھا۔

''یا اللہ! جو لوگ تیرے بندوں کو ایسی آزمائشوں میں ڈالتے ہیں، اے میرے پاک پروردگار! تو انہیں یا تو نیک ہدایت دے یا پھر اس زمین کو ان کے بوجھ سے آزاد کر دے تاکہ تیرے مزید بندے اس آزار سے بچ جائیں۔ ایسے ظالم لوگوں کو تباہ و برباد کر دے۔''

⌘⌘⌘

شہر کا سب سے بڑا اور مشہور تاجر الیاس پاشا مہدی سوڈانی سے جاملا اور محمد سعید پاشا پر بہت جلد یہ راز کھلا کہ بیشتر شہریوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا ہے اور وہ تنہا رہ گیا ہے۔ جو لوگ اب بھی شہر میں موجود تھے وہ محمد سعید پاشا کے لیے ناقابلِ اعتبار تھے۔ وہ خود کو غیر محفوظ سمجھ رہا تھا۔ شہر کا یہ مشہور تاجر الیاس پاشا اپنے ساتھ کچھ فوجی بھی لے گیا تھا۔

مہدی سوڈانی

ضیا تسنیم بلگرامی

انیسویں صدی کے آٹھویں عشرے کی وہ شخصیت جس نے سلطنتِ برطانیہ کو بے بس کردیا تھا۔ بڑے بڑے تجربہ کار اس کے مقابلے میں ناکام رہے۔ ذوقِ یقین کے اس پیکر کا نام تھا محمد احمد جو اچانک مہدی بن گیا اور مصر اور برطانیہ کو سوڈان سے نکال باہر کیا۔ ایک ایسے شخص کے محیر العقول کارنامے جو سو سال پہلے اپنے عزم و حوصلے سے بہت کچھ کرکے رخصت ہوگیا۔ اس کے جھوٹے دعوائے مہدویت کے باوجود اس سے ہمدردی کی گئی اور اس کا نام احترام سے لیا گیا کیونکہ وہ اپنے مقصد میں مخلص تھا لیکن اس نے اپنے جانشین اپنے جیسے نہیں چھوڑے اور اس کا وہی ناخوشگوار انجام ہوا جو متوقع تھا۔

ایک دانا، دین دار اور مخلص انسان کا زندگی نامہ
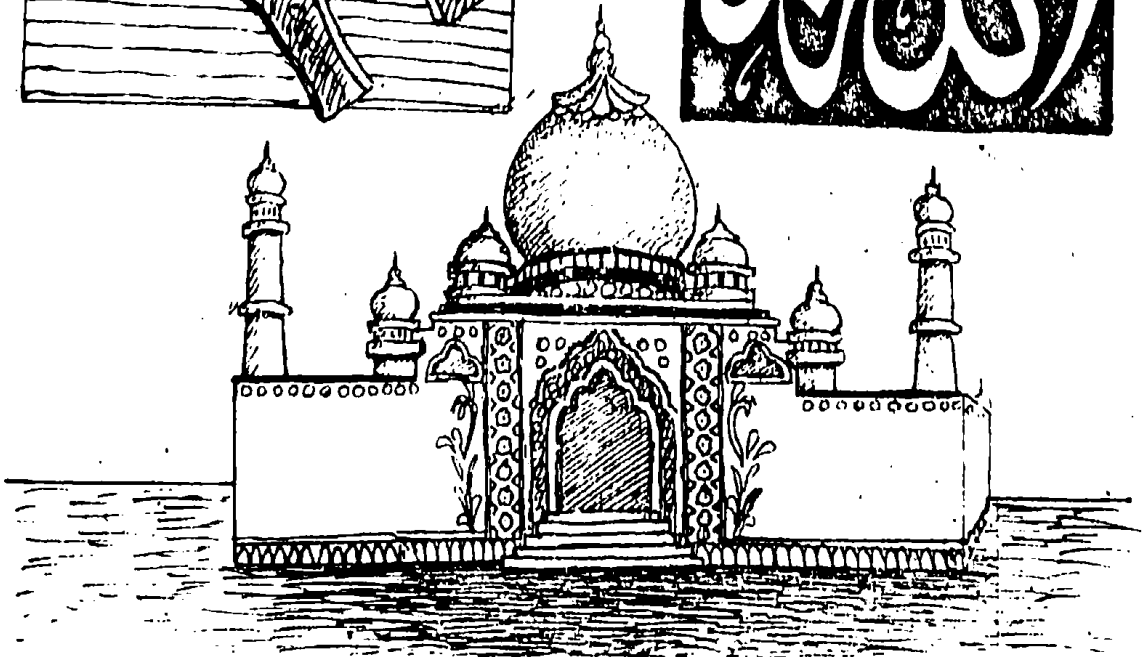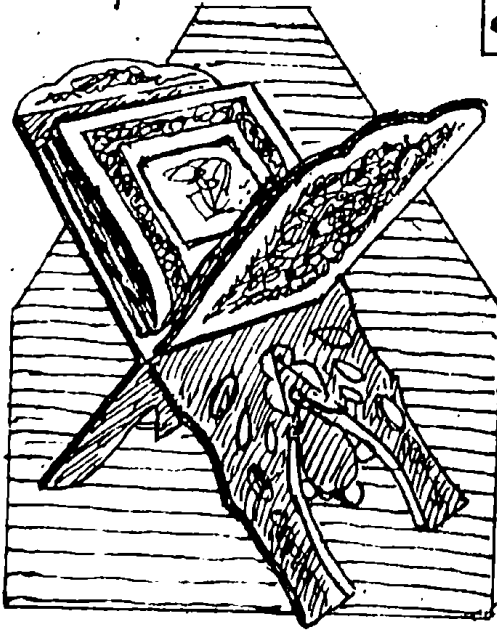
محمد سعید پاشا کے پاس جو فوج تھی وہ کُل دس ہزار تھی اور باہر مہدی سوڈانی کے پاس صرف چھ ہزار درویش تھے۔ ان سب کے پاس نیزے بھی تھے، تلواریں بھی اور بندوقیں بھی۔ یہ بندوقیں دشمن سے چھینی گئی تھیں۔

اب تک مہدی سوڈانی نے جو فتوحات حاصل کی تھیں ان کا تعلق کھلے عام میدانی جنگوں سے تھا لیکن ایک فصیل رکھنے والا شہر کس طرح فتح کیا جاسکتا ہے، مہدی سوڈانی کو اس کا کوئی خاص تجربہ نہ تھا۔ کافی دن محاصرے میں گزارنے کے بعد اسے اندازہ ہوا کہ ابیض کو فتح کرنا آسان کام نہیں ہے۔

اب مہدی سوڈانی نے اپنے درویشوں سے پوچھا۔ ''ہم بظاہر ان چھ ہزار درویشوں کی مدد سے ابیض کو فتح نہیں کرسکتے۔ تم سب حساب لگا کر بتاؤ کہ ہمارے درویشوں کی کُل تعداد کتنی ہے اور اگر ان سب کو یہاں بلوالیا جائے تو کیا شہر ابیض کی تسخیر آسان ہوجائے گی؟''

درویشوں نے حساب کرکے بتادیا کہ درویشوں کی کُل تعداد ساٹھ ہزار تک پہنچ چکی ہے۔

مہدی نے ابیض پر حملہ کردیا۔

شہر بند فوج کو آسانی تھی کہ وہ فصیلوں پر سے فائرنگ بھی کرسکتی تھی اور سنگ باری بھی اور تیروں کی بوچھاڑ بھی کی جاسکتی تھی جبکہ درویشوں کے لیے ہر طرف خطرہ ہی خطرہ تھا۔ ان کی تعداد بھی کم تھی اور سامانِ جنگ بھی محدود۔

شروع میں معمولی جھڑپیں ہوئیں مگر مہدی سوڈانی کو بہت جلد اندازہ ہوگیا کہ یہ جنگ اسے فائدہ نہیں پہنچاسکتی لیکن وہ اس جنگ کا خطرہ مول لے چکا تھا۔

محمد سعید پاشا نے بے دریغ فوجی طاقت استعمال کی اور درویشوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ درویشوں نے تیر چلائے اور فائرنگ کی تو اس سے ان کو فائدے کے بجائے نقصان اٹھانا پڑا۔ اس کے درویشوں کی تعداد کم ہوتی چلی گئی۔ تیروں کا ذخیرہ بھی ختم ہوگیا اور بندوقوں کی گولیاں بھی جواب دے گئیں۔

محمد سعید پاشا نے جب یہ دیکھا کہ درویشوں کی حالت پتلی ہے تو اس نے شہر کے باہر درویشوں پر فیصلہ کن حملہ کردیا۔

اب درویشوں کو احساس ہوچکا تھا کہ وہ یہ جنگ نہیں جیت سکتے۔

اس جنگ میں مہدی سوڈانی کا حقیقی بھائی محمد اور اس کے خلیفہ عبداللہ التعایشی کا بھائی یوسف بھی مارے گئے۔

دوسری طرف مصری فوج کے صرف تین سو آدمی مارے گئے تھے۔

مہدی سوڈانی نے پسپائی اختیار کی اور یہ فیصلہ کیا کہ آئندہ مستحکم اور مضبوط فصیلوں والے شہروں پر حملہ نہیں کیا جائے گا بلکہ ایسے شہروں کا محاصرہ کرکے محصورین کو بھوکوں مار کر حوالگیٔ شہر پر مجبور کردیا جائے گا۔

مہدی نے مختلف علاقوں سے کمک طلب کرلی اور ابیض کا ایک بار پھر محاصرہ کرلیا۔ یہ محاصرہ ساڑھے چار ماہ جاری رہا۔ شہر کے لوگ بھوکوں مرنے لگے اور اس بار محمد سعید پاشا کی ہمت بھی جواب دے گئی۔

شہر والوں نے بغاوت کردی اور محمد سعید پاشا کو مجبور کردیا کہ وہ شہر کو مہدی سوڈانی کے حوالے کردے۔ شہر کے دروازے کھل گئے اور مہدی اپنے درویشوں کے ساتھ شہر میں داخل ہوگیا۔ سرکاری عملہ گرفتار کرلیا گیا۔ ان گرفتار ہونے والوں میں محمد سعید پاشا بھی شامل تھا۔

ابیض شہر پر قابض ہوتے ہی پورے کردوخان پر قبضہ مکمل ہوگیا۔ اب مہدی سوڈانی نے اپنے مقبوضہ علاقے کے انتظام کی طرف توجہ دی۔ انتظامی صیغوں کو تین محکموں میں تقسیم کیا۔

(1) سپاہ (2) قضا (3) مال۔

سپاہ کا انتظام اپنے خلیفہ عبداللہ التعایشی کے سپرد کیا۔

محکمۂ قضا احمد بن علی کے سپرد کیا۔ یہ شخص پہلے بھی قاضی رہ چکا تھا۔ اس کے عہدے کا نام قاضی الاسلام رکھا۔

محکمۂ مال کا افسرِ اعلیٰ احمد بن سلطان کو مقرر کیا۔ یہ مہدی کا بہت قریبی دوست تھا۔ مالی معاملات کے انصرام کے لیے بیت المال قائم کیا گیا۔ بیت المال میں ہر قسم کی آمدنی جمع ہوتی تھی مثلاً مالِ غنیمت، زکوٰۃ، عشور، فطرہ اور جرمانوں کی رقمیں۔ یہ جرمانے ان سے وصول کیے جاتے تھے جو قانونِ شریعت کی خلاف ورزی کے مرتکب قرار پاتے تھے۔

مہدی کے اس نظامِ حکومت سے رعایا بہت خوش ہوئی کیونکہ ہر شخص کو اس کی بدولت آسائش، راحت اور سکون نصیب ہوا تھا۔ کوئی کسی پر ظلم نہیں کرسکتا تھا۔

مہدی کے اپنے لباس، خوراک اور طرزِ معاشرت میں سادگی پائی جاتی تھی۔ وہ انتہا درجے کی زاہدانہ زندگی بسر کرتا تھا۔ اسے ہر وقت احکامِ شریعت کے اجرا کی دھن سوار رہتی تھی۔ اس نے اپنے قلمرو میں وہ تمام حدیں جاری کر دی تھیں جو شریعت اسلام نے مقرر فرمائی ہیں اور اس نے اسی سال اپنا ایک منشور شائع کیا۔ اس منشور سے اس کی پابندیٔ مذہب اور زاہدانہ خیالات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

حمد و صلوٰۃ کے بعد اس نے مسلمانوں کو مخاطب کیا۔

''اے بندگانِ خدا! اپنے ربِ بزرگ و برتر کی حمد کرو۔ اس کا شکر ادا کرو کہ اس نے تم کو مخصوص نعمت سے سرفراز فرمایا۔ جانتے ہو وہ نعمت کیا ہے؟ میرا بحیثیت مہدی ظاہر ہونا اور یہ تمہارے لیے دوسری امتوں پر شرفِ خاص ہے۔

''میرے دوستو! میرا مطمحِ نظر یہ ہے کہ تم کو راہِ ہدایت دکھاؤں تو تم بھی خدا کے رستے میں مہاجرت اختیار کرو۔ جہاد فی سبیل اللہ کو اپنا نصب العین بناؤ۔ دنیا اور اس کی تمام چیزوں سے منقطع ہو جاؤ یہاں تک کہ راحت و آسائش کا خیال تک دل سے نکال دو۔ اگر دنیا کوئی اچھی چیز ہوتی تو خدا اس کو تمہارے لیے آراستہ کر دیتا۔ ان لوگوں کو دیکھو جن کو ہر قسم کی دنیاوی آسائشیں حاصل تھیں لیکن ان پر ایک وقت ایسا آیا کہ ان کی تمام راحتیں مصائب سے بدل گئیں اور آسائشِ زندگی کی شراب تکلیفوں کا زہر بن گئی تھی۔

''اگر دنیا کی راحت میں کوئی بھلائی ہوتی تو ایسا کیوں ہوتا؟ اور اسی پر بس نہیں بلکہ ابھی آخرت کا دردناک عذاب ان کے لیے باقی ہے۔ مجھے تعجب ہے کہ تم یہ سب دیکھتے ہو اور پھر بھی دنیاوی راحت و آسائش کی تمنا اور دنیاوی زندگی کی آرزو کرتے ہو۔ خدا سے ڈرو اور دنیا کی آسائشوں کو ٹھکرا دو۔ اللہ کے سچے بندوں کی رفاقت اختیار کرو۔ اس کی راہ میں جہاد کرو کہ سچی زندگی یہی ہے۔ اللہ کی راہ میں ایک مسلمان کا تلوار کو حرکت میں لانا ستر برس کی عبادت کے ثواب سے بڑھ کر ہے۔

''عورتوں پر بھی خدا کی راہ میں جہاد فرض ہے۔ جو عورتیں میدانِ جہاد میں خدمات انجام دے سکتی ہیں ان کے لیے گھر سے باہر نکلنے میں شرعاً کوئی مضائقہ نہیں۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں سے جہاد کریں۔

''جوان اور پردہ نشین عورتوں کا جہاد یہ ہے کہ وہ گھروں میں پاک زندگی بسر کریں اور اپنے نفس سے جہاد میں مصروف رہیں۔ بلا ضرورتِ شرعی گھر سے باہر نہ نکلیں۔ اونچی آواز سے باتیں نہ کریں کہ غیر مرد ان کی آواز سنیں۔ نماز پابندی کے ساتھ وقت پر ادا کریں۔ اپنے شوہروں کی اطاعت فرض سمجھیں۔ اپنے جسموں کو کپڑوں سے چھپائے رکھیں۔ جو عورت ستر پوشی نہ کرے اسے سزا دی جائے۔

''شراب پینے والے کو اسی کوڑے لگائے جائیں۔ اگر شراب خور کا ہمسایہ اس کو سزا دینے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو امیرِ شہر کو اطلاع دے ورنہ اس کو اخفائے جرم میں اسی کوڑوں اور سات دن قید کی سزا دی جائے۔

''میرے دوستو! تم مخلوقِ خدا پر شفقت کرو۔ احکامِ خداوندی کی مخالفت نہ کرو۔ اوامر کی پابندی لازمی ہے۔ میرے احکام کو سنو اور اطاعت کرو۔ تبدیل و تحریف کا خیال بھی دل میں نہ آنے دو۔ خداوند تعالیٰ نے جو نعمت تم کو دی ہے، اس کا شکر ادا کرو اور کفرانِ نعمت سے باز رہو۔''

محمد احمد نے اپنے بعض معتمد افسروں کو سوڈان کے اطراف میں تبلیغ دعوت کے لیے روانہ کیا۔ عثمان دغنہ جو مہدی کا معتمدِ خاص تھا، مشرقی سوڈان میں پہنچا اور وہاں کے قبائل کو اپنے زیر اثر لانے کی کوشش شروع کر دی۔ اس نے اپنے متبعین کو یکجا کیا اور ایک سپاہ تیار کی اور مہدی کا مذکورہ بالا منشور شائع کیا۔ اس شخص کو یہاں غیر معمولی کامیابیاں حاصل ہوئیں اور مشرقی سوڈان کے قبائل جوق در جوق مہدویت کا حلقہ اپنے گلوں میں ڈالنے لگے۔ عثمان دغنہ نے یہاں بھی ایک بیت المال قائم کیا اور زکوٰۃ و عشور کی رقمیں اس بیت المال میں جمع ہونے لگیں۔

گورنر عبدالقادر پاشا خرطوم میں یہ خبریں سن رہا تھا اور پریشان تھا کہ اس پر کس طرح قابو پایا جائے۔ آخر دولتِ انگلشیہ سے مشورے ہونے لگے۔ مصری حکومت بھی سوڈان کے معاملے میں خود کو بے بس محسوس کر رہی تھی اور وہ دیکھ رہی تھی کہ آہستہ آہستہ پورا سوڈان مصری حکومت کے اقتدار سے نکلتا جا رہا ہے۔

اب مصری حکومت کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ اگر مہدی سوڈانی اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا اور سوڈان سے مصری گورنر اور دوسرے اعلیٰ حکام کو نکال باہر کیا تو پھر اس کا دوسرا ہدف مصر ہو گا اور قاہرہ سوڈان سے کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔

خدیو مصر یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ مہدی سوڈانی کی تعلیمات مکمل طور پر اسلامی ہیں اور یہی تعلیمات عام مسلمانوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔ حکومت کو اندیشہ عوام کی طرف سے تھا کہ اگر عوام میں اسلامی روح دوڑ گئی تو حکومت ان کے سامنے بے

بس ہوجائے گی اور یہ بے بسی پورے مصر کو اقتدار اعلیٰ سے محروم کردے گی۔
خرطوم کے گورنر عبدالقادر پاشا نے مصری حکومت کو رپورٹ دی۔ ''سوڈان کے حالات سنگین ہیں اور جس قدر ملک میرے قبضے میں ہے، اس کے نکل جانے کا خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔ اگر اس فتنے کی روک تھام کے لیے کوئی مؤثر اور نتیجہ خیز کارروائی نہ کی گئی تو پورے سوڈان پر مہدی کا قبضہ ہوجائے گا۔''
خدیو مصر نے یہ رپورٹ انگلستان روانہ کردی اور اس مسئلے میں انگلستان سے مدد چاہی پھر جس طرح مصری حکومت کو تشویش لاحق ہوگئی تھی، اسی طرح دولتِ انگلشیہ بھی فکرمند ہوگئی۔
برطانوی حکومت مہینوں اس پر غور کرتی رہی۔ اربابِ حکومت اس موضوع پر بحث و مباحثے کرتے رہے اور آخرکار یہ طے پایا کہ برطانیہ کو بھی مصر کے ساتھ مل کے مہدی سوڈانی کے خلاف فوجی کارروائی کرنا چاہیے۔ انگلستان کے مشہور جنرل ہکس کو اس مہم کے لیے نامزد کیا گیا۔
جنرل ہکس نے اپنی مدد کے لیے نو دوسرے جنگ آزمودہ انگریز فوجی افسروں کا انتخاب کیا۔
چونکہ عبدالقادر پاشا ہمت ہار چکا تھا اس لیے اس کو خرطوم سے واپس بلا لیا گیا تھا اور اس کی جگہ علاؤالدین پاشا کو خرطوم کا گورنر مقرر کیا گیا۔
علاؤالدین پاشا نے خرطوم پہنچتے ہی اس مہم کے لیے نیل ارزق کے مشرقی حصے سے اونٹ جمع کرنے شروع کردیے اور فوج بھی تیار کی گئی۔
علاؤالدین پاشا کا کام اگست 1883ء تک مکمل ہوگیا اور 8 ستمبر کو جنرل ہکس نے متحدہ فوج کا جائزہ لیا۔ اس سپاہ میں چار مصری دستے، پانچ سوڈانی دستے اور ایک دستہ توپچیوں اور سواروں کا تھا۔ مصری فوج سلیم بک عونی، سید بک عبدالقادر، ابراہیم پاشا حیدر اور رجب بک صدیق کے ماتحت تھی۔
سپاہ کی کل تعداد گیارہ ہزار تھی جس میں سے سات ہزار مصری پیدل فوج تھی اور اونٹوں کی تعداد ساڑھے پانچ ہزار تھی اور پانچ سو گھوڑے تھے۔ جرمنی کے مشہور ادارے کرپ کی توپیں، دس پہاڑی توپیں اور دس دوسری قسم کی توپیں تھیں۔ 20 ستمبر کو یہ سب دوئم پہنچ گئے۔ یہاں علاؤالدین پاشا کی ایک بہت بڑی فوج ان کا انتظار کررہی تھی۔
جنرل ہکس نے اپنی فوج کو دوئم سے ابیض کی طرف لے جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ فاصلہ ایک سو چھبیس میل تھا۔ اس نے راستے میں چند چوکیاں قائم کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس خطرے کے پیشِ نظر کہ اگر اسے شکست ہوجائے تو واپسی میں دشمن اس کا راستہ نہ منقطع کردے۔
جنرل ہکس آگے بڑھا۔ اس کا خیال تھا کہ تیس میل کے فاصلے پر پہلی چوکی قائم کردی جائے گی لیکن مہدی سوڈانی نے انگریز جنرل کے اس منصوبے کو خاک میں ملا دیا۔
مہدی سوڈانی چھیانوے میل کا فاصلہ طے کرکے یہاں پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ جنرل ہکس، مہدی سوڈانی کے عزائم سے بےخبر جیسے ہی یہاں پہنچا تو چاروں طرف سے درویشوں میں گھر گیا۔ درویشوں کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی اور انہوں نے انگریز جنرل کو اتنا موقع ہی نہ دیا کہ وہ مہدی سوڈانی کے خلاف مورچابندی کرتا۔ چشم زدن میں لشکر کا صفایا کردیا گیا۔ اس قیامت خیز معرکے میں اخباری نمائندے بھی مارے گئے۔ یہاں تک کہ جنرل ہکس کی لاش بھی مقتولوں میں شامل تھی۔ آلاتِ حرب پر درویشوں کا قبضہ ہوگیا۔
کہتے ہیں کہ صرف تین سو آدمی جان بچانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ ان میں سے کچھ بوڑھے تھے اور انہیں رحم کھا کر چھوڑ دیا گیا تھا۔ بقیہ وہ لوگ تھے جو لاشوں کے نیچے چھپ گئے تھے۔ ان زندہ بچ جانے والوں میں جنرل ہکس کا خانساماں محمد نور بارودی شامل تھا اور اسی شخص نے جنرل ہکس کی ہزیمت اور تباہی کے تمام واقعات مصری حکومت تک پہنچائے تھے۔
درویشوں کو اپنی فتح کے نتیجے میں بہت کچھ ملا۔
سوڈان کے اکثر قبیلے ابھی تک تذبذب کا شکار تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جنرل ہکس، مہدی اور اس کے درویشوں کا قصہ ہمیشہ کے لیے ختم کردے گا۔ چنانچہ انہیں جب یہ معلوم ہوا کہ جنرل ہکس مارا گیا، اس کی فوج برباد ہوگئی، مہدی سرخرو ہوا اور درویش اپنے دشمنوں پر غالب آئے تو ان خبروں نے سوڈان کے مرتد قبیلوں کو محمد احمد کی مہدویت پر ایمان لانے پر مجبور کردیا۔

☆☆☆

مہدی کو ایسی شاندار فتح حاصل ہوئی تھی کہ اس کا اثر مصری فوج پر پڑا۔ یہ مصری سپاہی ملازمتیں چھوڑ چھوڑ کر مہدی سوڈانی کے پاس پہنچنے لگے۔ یہ پہلے مہدی پر ایمان لاتے اس کے بعد مہدی کے درویشوں میں شامل ہوجاتے۔

یہ خبریں قاہرہ اور لندن پہنچیں تو صفِ ماتم بچھ گئی اور ایک بار پھر مصری حکومت اور دولتِ برطانیہ کے درمیان صلاح مشورے ہونے لگے۔

درویشوں کے حوصلے اتنے بڑھ گئے تھے کہ مہدی سوڈانی نے عثمان دغنہ کو حکم دیا کہ وہ درویشوں کا لشکر لے کر سواکن کی طرف بڑھے۔ یہ علاقہ مصر اور سوڈان کے درمیان بحیرۂ قلزم پر واقع ہے۔

عثمان دغنہ نے سنکات اور توکر کا رخ کیا تو مصری فوج اس کا راستہ روک کر کھڑی ہوگئی۔ سواکن ابھی دور تھا۔

عثمان دغنہ نے دونوں جگہ مصری فوج کو شکست دی۔

خطرات کے پیشِ نظر محمد پاشا طاہر پانچ سو سپاہیوں کے ساتھ سواکن سے چلا۔ انگریز سفیر ڈاک مانکرف اس کے ساتھ ہولیا۔ وہ اس مخدوش علاقے سے نکل جانا چاہتا تھا۔ ڈیڑھ سو درویشوں نے ایک گھنٹے بعد ہی ان پر حملہ کردیا۔

محمد پاشا طاہر کو شکست ہوئی اور اس کے جن سپاہیوں نے اپنی جان بچائی تھی، وہ بھاگ کر سواکن میں پناہ گزین ہوگئے۔

یہ خبریں مصری حکومت کے لیے بہت تشویش کا باعث تھیں۔ انگریزوں نے مصری حکومت کو تسلی دی اور خدیو مصر کو یقین دلایا کہ وہ ایک نہ ایک دن مہدی سوڈانی اور درویشوں پر قابو پالیں گے اور اس مقصد کے لیے جنرل ویلنٹائن بیکر کا نام پیش کیا۔

ایک بار پھر مصری فوج تیار کی جانے لگی لیکن اب حالات اتنے بدل چکے تھے کہ مصری سپاہی اس جنگ سے بچنے کی کوشش کررہے تھے۔ یہ چپکے چپکے راہِ فرار اختیار کرنے لگے۔ مصری فوج کے جو افسر اور سپاہی کسی وجہ سے انکار نہیں کرسکتے تھے، وہ زار و قطار رونے لگے لیکن ان کا یہ رونا کسی کام نہ آیا اور انہیں مہدی کے مقابلے میں سوڈان جانا پڑا۔ کچھ سپاہیوں نے راستے ہی سے بھاگ کر مہدی کے درویشوں میں شمولیت اختیار کی۔

اس مہم میں دوسرے تجربہ کار فوجی انگریز بھی شامل تھے۔ یہ لوگ جہازوں میں سوار ہوکر سواکن کے جنوب میں بڑھے چلے گئے اور ایک جگہ 4 فروری 1884ء کو جہازوں سے اترے اور خاموشی سے مشرق کی سمت روانہ ہوگئے۔

جنرل بیکر ایک اندازے کے مطابق عثمان دغنہ کی پشت پر پہنچ کر حملہ کرنا چاہتا تھا لیکن اس کو یہ نہیں معلوم تھا کہ مصری اور سواکن کے لوگ درویشوں کے لیے کام کررہے ہیں۔ ان لوگوں نے عثمان دغنہ کو جنرل بیکر کے ارادوں کی خبر پہنچادی اور عثمان دغنہ بھی صرف بارہ سو درویشوں کے ساتھ بیکر کی طرف بڑھا اور اچانک دونوں میں مڈبھیڑ ہوگئی۔

جنرل بیکر کو درویشوں کی تعداد کا کوئی اندازہ نہ تھا اس لیے وہ پیچھے ہٹا اور اپنی پیدل فوج کے ذریعے مقابلہ کرنے کی کوشش کی۔

مصری تو پہلے ہی سے مہدی اور اس کے درویشوں سے خوفزدہ تھے۔ انہوں نے بے دلی سے مقابلہ کیا اور کچھ نے مقابلے کے بغیر ہی راہِ فرار اختیار کی۔

جنرل بیکر کو اس صورتِ حال کا پہلے سے کوئی اندازہ نہ تھا پھر بھی اس چالاک جنرل نے راہِ فرار اختیار کی اور خاص سواکن پہنچ کے دم لیا۔ دوسرے انگریز فوجی افسر مارے گئے۔

درویشوں کو مالِ غنیمت میں چار توپیں، پانچ لاکھ کارتوس اور تین ہزار بندوقیں ہاتھ لگیں۔

اس شکست نے برطانیہ اور مصر کو ایک بار پھر بہت زیادہ تردد اور انتشار میں مبتلا کردیا۔

درویشوں نے سواکن کو چاروں طرف سے گھیر لیا جبکہ سواکن کی حفاظت کے لیے بہت تھوڑی سی مصری فوج رہ گئی تھی۔

کرودخان اور دارفور پہلے ہی مہدی کے قبضے میں جاچکے تھے۔ گویا اب مہدی کی حکومت خرطوم کے قریب سے چھ سو میل کے فاصلے تک پھیل گئی تھی۔

مشرق میں حبشہ تک سنار کا تمام علاقہ اس میں شامل تھا۔

مغرب میں دارفور اور کرودخان تھے اور شمال مشرق کی طرف سواکن تک اس کی سرحد جاملی تھی۔

کچھ ہی دنوں میں مہدی کا اثر علاقہ الفشیر تک پہنچ گیا تھا۔ ان دنوں وہاں انگریز گورنر سلاٹن موجود تھا۔ وہاں کے مقامی لوگوں نے اس کے نام کو معرب کرلیا تھا اور اسے سلاتین پاشا کہنے لگے تھے۔

سلاتین پاشا سخت بدحواس ہوا۔ اس نے اس صورتِ حال پر اپنے آدمیوں سے مشورہ کیا تو سبھی خوفزدہ اور مایوس نظر

آ ئے۔ سلاتین پاشا نے یہ بھی محسوس کیا کہ اس کے مصری افسر باغیانہ خیالات رکھتے ہیں۔
یہ تو اسے یقین تھا کہ وہ جنگ کر کے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا اور اپنی جان بھی بچانا چاہتا تھا۔ آخر کار یہ فیصلہ کیا کہ وہ مہدی کی طرف ارادت مندی کا ہاتھ بڑھائے اور مصلحت سے کام لے کر مسلمان ہوجائے۔ وہ فی الحال مہدی کی نیاز مندی میں چلا جائے پھر جب بھی فرار ہونے کا موقع ملے تو اپنی جان بچالے گا۔
یہ سارے فیصلے کرنے کے بعد اس نے ایک خط مہدی کو لکھا۔ ”میں آپ کی محترم شخصیت سے متاثر ہوکر آپ کی نیاز مندی اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ آپ واقعی مہدی آخرالزماں ہیں اور آپ کی مسلسل فتوحات اور حیرت انگیز کامیابیاں مجھے آپ پر ایمان لانے پر مجبور کررہی ہیں کہ میں آپ کے دستِ حق پرست پر اسلام قبول کرلوں۔ مجھے امید ہے مسلمان ہونے کے بعد آپ مجھے اپنے خاص درویشوں میں شامل فرمائیں گے۔ میں جس جگہ کا گورنر ہوں اس کے لیے آپ کو فوج کشی نہیں کرنا پڑے گی۔ میں یہ سارا علاقہ جنگ وجدل کے بغیر ہی آپ کے حوالے کردوں گا۔“
اس نے دوسرا خط اوگل نامی ایک انگریز کو لکھا۔ ”میں یہاں مہدی اور درویشوں کے نرغے میں آ گیا ہوں اور زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ میں جان بچانے کی کوشش کررہا ہوں لیکن کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ ذرا معلوم کرکے بتاؤ کہ اب کس جنرل کو مہدی کے مقابلے پر بھیجا جارہا ہے تاکہ میں یہ اندازہ لگاسکوں کہ مجھے مہدی کی نیاز مندی میں کتنے عرصے رہنا پڑے گا۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ میں یہاں سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہوسکوں گا لیکن اپنی سی کوشش ضرور کروں گا۔“
اوگل کے پاس سلاتین پاشا کے لیے واضح جوابات نہیں تھے۔ وہ پہلے تو ادھر اُدھر مارا مارا پھرتا رہا اور آخر ناکام و نامراد واپس آیا۔ مصر اور برطانیہ دونوں ہی مہدی سوڈانی کے مقابلے میں بے بس نظر آرہے تھے۔ اوگل نے سوچا اگر وہ جواب میں سلاتین پاشا کو تفصیل سے کچھ لکھے گا اور اگر یہ خط پکڑا جائے گا تو دونوں مصیبت میں پھنس جائیں گے اور سلاتین پاشا قتل کردیا جائے گا۔
سلاتین پاشا تو پہلے ہی اظہارِ نیاز مندی کرچکا تھا اور اوگل، سلاتین پاشا کو تنہا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ آخر دونوں نے اسلام قبول کرلیا۔ مہدی نے سلاتین پاشا کا نام عبدالقادر رکھا اور اس کو حکم دیا کہ وہ العبید آجائے۔ سلاتین پاشا العبید پہنچا اور وہاں سے مہدی کے ساتھ خرطوم کی طرف روانہ ہوگیا۔
اب انگلستان نے یہ فیصلہ کیا کہ کچھ عرصے جنگ وجدل سے پرہیز کیا جائے اور سیاسی حکمتِ عملیوں سے کام لے کر مہدی کو قابو میں لایا جائے۔
سوڈان میں کئی جگہ مصری اور انگریز فوجیں پہنچی ہوئی تھیں اور ان کو بہ حفاظت وہاں سے نکالنا ایک دشوار کام تھا۔ آخر انگلستان کی نظر جنرل گارڈن پر گئی۔ یہ شخص اس سے پہلے سوڈان میں گورنر جنرل رہ چکا تھا اور اس کی لیاقت اور مستعدی کے مصر اور انگلستان یکساں معترف تھے۔ وہ سوڈان سے اچھی طرح واقف تھا۔ اس کو برطانوی حکومت نے ہدایت کی کہ جس طرح بھی بن پڑے، وہ تمام سرکاری محصور فوجوں کو سوڈان سے نکال لائے اور سیاسی حکمت عملیوں سے مہدی سوڈانی کو زیر دام لائے۔
گو کہ یہ نہایت پُرخطر ذمے داریاں تھیں لیکن جنرل گارڈن نے نہایت دلیری اور استقلال سے یہ ذمے داری قبول کرلی۔
برطانیہ نے جنرل گارڈن کو ہائی کمشنر کی حیثیت سے سوڈان روانہ کردیا اور خدیو مصر کی طرف سے جنرل گارڈن کو سوڈان کا گورنر جنرل بنادیا گیا۔
وہ لندن سے جلد وہاں کے لیے روانہ ہوا اور بروقت پہنچ کے سوڈان کی آزادی کا اعلان جاری کردیا۔ تمام محصولات نصف کردیے گئے۔ تمام باشندوں کی جرم بخشی ہوئی۔
اہلِ سوڈان کو لونڈی غلام رکھنے اور ان کی خرید وفروخت کی اجازت بھی دے دی گئی۔ اسی اعلان کے ذریعے محمد احمد مہدی کو سلطان دار مقرر کیا گیا اور جنرل گارڈن نے چند تحائف بھی مہدی کی خدمت میں بھیجے۔
جنرل گارڈن کا خیال تھا کہ مہدی اور سوڈان کے لوگ ان مراعات سے بہت خوش ہوں گے اور جنرل گارڈن کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائیں گے مگر مہدی نے جنرل گارڈن کی مراعات کو مسترد کردیا اور اس کے تحائف واپس کردیے اور لکھا۔
”میں کفار سے کسی بخشش اور عطا کا روادار نہیں۔ تمہارے لیے بہتر ہے کہ اپنے آپ کو ہمارے حوالے کردو اور سچے دین اسلام کی پیروی اختیار کرو۔ اس سے تمہیں دنیا و آخرت میں سرخروئی حاصل ہوگی اور تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی جان بچ جائے گی ورنہ یاد رکھو، اگر تم نے ہماری بات نہ مانی تو تم سب اپنی عزیز جانیں کھو بیٹھو گے۔“

جنرل گارڈن، مہدی کا خط پڑھ کے آپے سے باہر ہو گیا اور مہدی کو یہ مختصر جواب بھیج دیا۔ ''میں تم سے مزید خط کتابت نہیں کرسکتا۔''

جنرل گارڈن خرطوم پہنچ گیا۔

برطانوی افواج اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئیں کیونکہ جنرل گارڈن کے پہنچنے سے پہلے ان کی حالت بڑی مایوس کن تھی۔

خرطوم میں داخل ہونے کے بعد بہت جلد جنرل گارڈن کو اندازہ ہو گیا کہ اس نے یہاں آ کے غلطی کی ہے اور مہدی کسی وقت بھی خرطوم پر حملہ کردے گا۔ بہ حالتِ محاصرہ وہ کب تک مہدی کا مقابلہ کرسکے گا؟ فی الحال اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہ تھا لیکن اس کے خیال میں ایک بات طے تھی کہ محصور خرطوم میں ضروریاتِ زندگی وافر مقدار میں ہونا چاہئیں۔ کم از کم سال بھر کے عرصے میں جنرل گارڈن کو کہیں سے کمک مل سکتی تھی اور کمک ملتے ہی وہ شہر سے نکل کے مہدی سوڈانی کا مقابلہ کرسکتا تھا۔ چنانچہ اسی منصوبہ بندی کے تحت جنرل گارڈن نے ضروری اشیا کا ذخیرہ کرنا شروع کردیا۔

جنرل گارڈن جانتا تھا کہ شہر خرطوم اپنے جائے وقوع کے لحاظ سے طبعی طور پر ایک قلعہ ہے۔ اس کے دو اطراف یعنی شمال اور مشرق دریائے نیل سے محیط ہیں۔ مغرب اور جنوب کی طرف نہایت مضبوط شہر پناہ ہے اور شہر پناہ کے باہر ایک نہایت گہری خندق ہے۔

یہاں جو برقی سلسلہ تھا اس کا تعلق قاہرہ سے تھا۔ مہدی نے اس سلسلے کو منقطع کردیا اور قاہرہ سے اس کا رابطہ ٹوٹ گیا۔ قاہرہ کو جنرل گارڈن کی کوئی خبر نہ تھی اور جنرل گارڈن قاہرہ سے بے خبر تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریز بھی انتشار میں مبتلا تھے اور مصری بھی پریشان نظر آرہے تھے۔

دریائے نیل میں طغیانی آئی تو جنرل گارڈن نے کشتیوں کے ذریعے قاہرہ سے خط کتابت کا سلسلہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس نے کرنل ہیمل اسٹورٹ کو قاہرہ ایک خط بھیجا۔ اس جہاز میں انگریز سفیر اور فرانسیسی سفیر بھی سفر کررہے تھے۔ جہاز کا نام عباس تھا۔ جنرل گارڈن نے اپنی پریشان حالی کی ایک مفصل روداد قاہرہ بھیجی تھی مگر بدقسمتی سے یہ جہاز ایک چٹان سے ٹکرا کر ٹوٹ گیا۔

کرنل اسٹورٹ اور اس کے ساتھی کشتیوں میں سوار ہو کر کنارے پہنچ گئے۔ اس گاؤں کے لوگ انگریزوں سے بے حد نفرت کرتے تھے چنانچہ گاؤں والوں نے انہیں ''فرنگی بے دین'' کا لقب دیا اور قتل کرڈالا۔ جنرل گارڈن کی رودادِ غم بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نابود ہوئی۔

ان حالات میں مہدی کا لشکر خرطوم کے سامنے پہنچ گیا اور اس نے شہر کا محاصرہ کرلیا۔ اندرونِ شہر لوگوں کی ہمدردیاں مہدی کے ساتھ تھیں۔ جنرل گارڈن ان کے خلاف کوئی کارروائی بھی نہیں کرسکتا تھا کیونکہ اس طرح اس کے خلاف بغاوت ہوسکتی تھی۔

انگلستان یہ خبر پہنچ چکی تھی کہ جنرل گارڈن کا مصر سے رابطہ منقطع ہو چکا ہے اور جنرل گارڈن کو جس مقصد کے لیے خرطوم بھیجا گیا تھا، وہ بھی پورا نہیں ہوا۔ سوڈان میں پھنسی ہوئی انگریزی فوجوں کو نکالنے کا منصوبہ بھی ناکام ہو چکا ہے۔

ان دنوں برطانیہ کے وزیراعظم گلیڈ اسٹون تھے۔

گلیڈ اسٹون نے اپنے دوستوں سے مشورے کے بعد ایک سب سے زیادہ تجربہ کار شخص کو اس مہم کو سر کرنے کے لیے منتخب کیا۔ یہ شخص اپنے غیر معمولی کارناموں کی وجہ سے لارڈ کا خطاب حاصل کرچکا تھا۔ اس کا نام تھا لارڈ ویلزلی۔

وزیراعظم برطانیہ نے لارڈ ویلزلی کو حکم دیا کہ وہ جس طرح بھی ممکن ہو، اپنی فوج اور جنرل گارڈن کو صحیح سلامت نکال لائے۔ حتی الامکان کوشش کی جائے کہ مہدی سے جنگ نہ ہو۔

گلیڈ اسٹون نے لارڈ ویلزلی کو اپنی حکومت کا فیصلہ سنایا۔ ''حکومت برطانیہ نے فیصلہ کیا ہے کہ سوڈان کو خالی کر کے اس کی قسمت مہدی کے ہاتھ میں دے دی جائے اور مصر کی سرحد وادی حلفہ تک رہے۔ آپ کا کام یہ ہے کہ مہدی سے جنگ نہ کریں اور حکمتِ عملی سے اپنی افواج اور جنرل گارڈن کو سوڈان سے نکال لائیں۔''

لارڈ ویلزلی لندن سے روانہ ہوا اور اسکندریہ پہنچ گیا۔ اسکندریہ میں اس کے ہم وطن موجود تھے۔ وہ ان سے ملے بغیر ہی قاہرہ چلا گیا۔ یہاں انگریزی افواج کا سپہ سالار جنرل اسٹیفن سن عضوِ معطل کی طرح پڑا ہوا تھا۔ لارڈ ویلزلی نے اس سے ملاقات کی اور اپنے آنے کا مقصد بیان کیا تو اسٹیفن سن نے حکومتِ برطانیہ کے اس فیصلے پر اعتراض کیا کہ مہدی سے جنگ

نہیں ہونی چاہیے۔ اس نے کہا۔ ''جناب! آپ جنگ کے بغیر کس طرح اپنی افواج کو سوڈان سے اور جنرل گارڈن کو خرطوم سے واپس لاسکتے ہیں؟''

لارڈ ویلزلی نے جواب دیا۔ ''فوج تو میرے ساتھ رہے گی۔ جہاں کہیں جنگ کی ضرورت ہوگی، جنگ کی جائے گی اور جہاں کہیں اس کی ضرورت نہیں ہوگی، سیاسی حکمتِ عملیوں سے کام لیا جائے گا۔''

اور دونوں میں سوڈان تک پہنچنے کے راستوں پر بحث ہونے لگی۔

اسٹیفن سن نے لارڈ ویلزلی کو سمجھایا۔ ''اگر آپ خشکی کا راستہ اختیار کریں گے تو سواکن سے بربر تک دشواریوں کے باوجود پہنچنے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ آپ کو بربر سے خرطوم تک نیل کے ذریعے سفر کرنا پڑے گا اور یہ تقریباً چار سو اسی میل کا سفر ہوگا۔''

لارڈ ویلزلی نے بھی اپنا فیصلہ سنایا۔ ''جناب! اب تک ہمارے ساتھ جو کچھ پیش آیا اور ہمیں ہزیمتوں کا منہ دیکھنا پڑا، ان کی وجہ یہی خشکی کے راستے ہیں۔ اس وقت مصری مسلمان اور سوڈانی مسلمان ہمارے لیے ناقابلِ اعتبار ہیں۔ جب ہم خشکی کا راستہ اختیار کرتے ہیں، مہدی سوڈانی کو اس کی خبر ہوجاتی ہے۔ وہ لوگ یہاں کے چپے چپے سے واقف ہیں اور نہایت تیز رفتاری سے سفر کر کے ہمیں راستے میں ہی دبوچ لیتے ہیں۔ خشکی کا راستہ کتنا ہی قریب کا کیوں نہ ہو، میں اس خطرے کو مول نہیں لوں گا۔ مجھے تو تم یہ بتاؤ کہ اگر میں یہ سفر دریائے نیل سے اختیار کروں تو مجھے کتنا فاصلہ طے کرنا پڑے گا؟''

اسٹیفن سن کو لارڈ ویلزلی کے اس فیصلے سے اختلاف تھا کیونکہ اس میں وقت کا زیاں پایا جاتا تھا۔ اس نے مایوسی سے جواب دیا۔ ''اگر آپ دریائے نیل سے یہ سفر اختیار کریں گے تو آپ کو ساڑھے سولہ سو میل کا سفر کرنا ہوگا اور یہ فاصلہ آپ بہت دنوں میں طے کریں گے اور کم از کم میں اس معاملے میں آپ سے اتفاق نہیں کروں گا۔ میں یہاں کی افواجِ انگریزی کا سپہ سالار ہوں اس لیے آپ تنہا اپنی مرضی سے کوئی فیصلہ نہیں کرسکتے۔''

لارڈ ویلزلی نے حکومتِ برطانیہ کا وہ خفیہ فرمان اسٹیفن سن کے سامنے رکھ دیا جس میں اسٹیفن سن کو مطلع کیا گیا تھا کہ لارڈ ویلزلی مشورے کی حد تک تو پابند ہے کہ اسٹیفن سن سے مشورے کرے لیکن لارڈ ویلزلی پر یہ واجب نہیں کہ وہ اسٹیفن سن کے مشورے مان بھی لے۔ لارڈ ویلزلی وہی کرے گا جو خود مناسب سمجھے گا۔

اس خفیہ فرمان نے اسٹیفن سن کو خاموش کردیا لیکن اس نے لارڈ ویلزلی سے پوچھا۔ ''اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے یہ ضرور بتائیں کہ آپ نے خشکی کے مختصر ترین راستے پر آبی طویل ترین راستے کا انتخاب کیوں کیا؟''

لارڈ ویلزلی نے جواب دیا۔ ''مجھے اصولاً اس سوال کا جواب نہیں دینا چاہیے لیکن جواب دینے میں کوئی حرج بھی نہیں۔ مہدی سوڈانی کی طاقت خشکی کی حد تک ہے جس سے وہ متواتر فائدے اٹھا رہا ہے۔ اب ہمیں اس سے مقابلے کے لیے اس محاذ کا انتخاب کرنا چاہیے جو اس کے لیے نیا اور کمزور تر ہو۔ ہم دریائے نیل میں ساڑھے سولہ سو میل کا فاصلہ بے خوف و خطر طے کرجائیں گے۔ مہدی سوڈانی کے پاس ہمارا راستہ روکنے کے لیے نہ تو جہاز ہیں نہ کشتی ہے اور نہ بحری فوج...... اور میرے خیال میں ہم اس طرح اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائیں گے۔ مہدی سوڈانی کو ہمیں الجھائے رکھنا چاہیے اور اس کے لیے ہم چھوٹی موٹی جنگوں کا سلسلہ جاری رکھیں گے تاکہ اسے ہمارے اصل عزائم کا پتا نہ چلے۔''

اسٹیفن سن نے کہا۔ ''لیکن آپ کو تو مہدی سے جنگ کرنے سے روکا گیا ہے اور آپ مسلسل جنگ کی باتیں کیے جارہے ہیں؟''

لارڈ ویلزلی نے جواب دیا۔ ''لیکن میں اپنے مقصد کی حصولیابی کے لیے ہر وہ کارروائی کروں گا جس سے مجھے میرا مقصد حاصل ہوجائے۔''

لارڈ ویلزلی بحری راستے سے خرطوم روانہ ہوگیا اور 3 نومبر کو ڈنگولہ شہر کے کنارے پہنچ گیا۔

یہاں کا حاکم محمد یاور تھا اور لارڈ ویلزلی کی معلومات کے مطابق اس شخص نے مہدی کے خلاف زبردست مزاحمت کی تھی اور ڈنگولہ کو مہدویوں سے بچائے رکھا تھا۔

محمد یاور، لارڈ ویلزلی کے استقبال کے لیے ساحل پر آیا۔ ساحل پر ہی لارڈ ویلزلی کے اعزاز میں شامیانے کھڑے کیے گئے اور انہی شامیانوں کے نیچے لارڈ ویلزلی نے محمد یاور کی پذیرائی کی اور کہا۔ ''بظاہر یہ میرے استقبال کی خوشی میں اہتمام ہوا ہے لیکن میں حکومتِ برطانیہ کی طرف سے ڈنگولہ کے لوگوں کو یہ بتانے آیا ہوں کہ ان کا حاکم محمد یاور بہت بہادر اور باتدبیر انسان ہے۔ اس نے ڈنگولہ کو مہدی اور درویشوں سے اب تک بچائے رکھا ہے۔ حکومتِ برطانیہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ

میں محمد یاور کو بہادری کا تمغا دوں اور کے سی ایم جی کا خطاب دوں۔''

محمد یاور نے لارڈ ولیزلی کا شکریہ ادا کیا اور حکومت برطانیہ کی قدر افزائی کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔''میں اس عزت افزائی کا مستحق تو نہ تھا لیکن جو کچھ مجھے عطا ہوا ہے اس کا بے حد شکر گزار ہوں۔ میں نے یہاں جو کچھ کیا ہے، اپنا فرض سمجھ کر کیا ہے۔ کسی تمغے یا خطاب کے لالچ میں نہیں کیا۔''

محمد یاور نے محل میں جا کے غسل کیا اور دوسرا لباس پہنا۔ جس لباس میں اس نے لارڈ ولیزلی سے ملاقات کی تھی اور اس سے ہاتھ ملایا تھا، اس لباس کو اس نے آگ میں ڈلوا دیا کیونکہ اس کے خیال میں لارڈ ولیزلی سے ملنے اور ہاتھ ملانے اور اس سے لباس کے مس ہونے سے محمد یاور کا لباس ناپاک ہو گیا تھا۔ وہ پکا مسلمان تھا اور جو کچھ اب تک ہوا تھا، اس پر شرمندہ تھا۔ وہ مہدی اور اس کے درویشوں کو پکا مسلمان سمجھتا تھا۔

لارڈ ولیزلی یہاں سے آگے روانہ ہو گیا۔

خرطوم میں جنرل گارڈن کو کچھ پتا نہ تھا کہ اس کی مدد کے لیے لارڈ ولیزلی بڑھا چلا آرہا ہے۔ اسی لیے اس نے کسی ترکیب سے قاہرہ ایک پیغام بھیجا۔ یہ پیغام 13 جولائی کو روانہ کیا گیا اور یکم نومبر کو پہنچا۔ اس پیغام میں لکھا تھا۔''ہم خیریت سے ہیں اور چار مہینے تک خرطوم کو اپنے قبضے میں رکھ سکتے ہیں۔''

حساب لگایا گیا تو چار مہینے گزر چکے تھے۔ اب اسٹیفن سن اور دوسرے انگریزوں کو فکر لاحق ہو گئی کہ معلوم نہیں جنرل گارڈن اب کس حال میں ہوگا۔

دسمبر کے آخر میں لارڈ ولیزلی کورٹی نامی شہر کے سامنے پہنچ گیا۔ ابھی یہاں سے خرطوم بہت دور تھا۔ لارڈ ولیزلی نے یہاں سے حکومت کو لکھا۔''یہاں سے میں کچھ توقف سے سفر کروں گا کیونکہ مجھے سامان رسد جمع کرنے میں دشواریاں پیش آرہی ہیں۔ یہ سامان رسد میں جنرل گارڈن اور اس کے حامیوں کے لیے جمع کر رہا ہوں۔ وہاں رسد کی سخت قلت ہے اور گرد ونواح کا سارا ملک ویران ہو چکا ہے۔ ہماری سامان رسد کے بغیر خرطوم جانا کسی طرح مناسب نہیں۔''

کورٹی میں لارڈ ولیزلی نے اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اس کی معلومات کے مطابق کورٹی سے متمہ تک خشکی کا راستہ بالکل محفوظ تھا۔ متمہ سے کشتیوں کے ذریعے خرطوم پہنچا جا سکتا تھا۔ اس طرح راستے کی طوالت کم ہو جاتی۔ وہ خود تو دریائے نیل کے ذریعے خرطوم کی طرف روانہ ہو گیا اور کچھ حصہ براہ خشکی متمہ بھیج دیا۔ جو دستہ خشکی سے سفر کر رہا تھا وہ میجر جنرل سر ہربرٹ اسٹورٹ کے زیر احکام تھا۔

سر ہربرٹ نے دور اندیشی سے کام لیتے ہوئے بارہ سو سپاہی اور دو ہزار اونٹ کورٹی سے غدکل نامی بندرگاہ کی طرف روانہ کر دیے کیونکہ اس بندرگاہ سے متمہ نامی بندرگاہ تک زیادہ فاصلہ نہ تھا اور اگر راستے میں کہیں درویشوں سے مڈبھیڑ بھی ہو جاتی تو ایک حصہ تو محفوظ رہتا۔

دوران سفر لارڈ ولیزلی کو جنرل گارڈن کی طرف سے ایک پرزہ موصول ہوا۔ لانے والا کشتی میں آیا تھا۔ اس پرزے پر لکھا تھا۔''بہمہ وجوہ خرطوم میں خیریت ہے۔ سی۔ جی۔ گارڈن 14 دسمبر 1884ء۔''

اس شخص نے لارڈ ولیزلی کو بتایا۔''پرزے کی عبارت مغالطے کے لیے ہے کہ اگر میں پکڑا جاؤں اور میرے پاس سے یہ پرزہ برآمد ہو جائے تو مہدی اور اس کے درویش اس غلط فہمی کا شکار ہو جائیں کہ جنرل گارڈن اور اس کی فوج کے حوصلے بلند ہیں ورنہ آپ کے نام جنرل گارڈن کا زبانی پیغام یہ ہے۔''جنرل گارڈن اور فوج کو قلتِ خوراک کی وجہ سے انتہائی مشکلات کا سامنا ہے۔ خوراک کا سامان ختم ہونے کے قریب ہے۔ کسی قدر میدہ اور تھوڑے سے بسکٹ باقی رہ گئے ہیں۔ ہماری مدد کو جلد از جلد پہنچو۔''

اس شخص نے بتایا کہ دوسرا پیغام جنرل گارڈن نے اپنے کسی دوست کے پاس قاہرہ بھیجا ہے۔ یہ پیغام بھی مختصر اور زبانی تھا۔''بھائی! بس اب خاتمہ ہے۔ یقین ہے کہ ہفتے عشرے میں ہماری نئی مصیبتوں کا آغاز ہوگا۔ اگر اہلِ ملک ہماری مدد کرتے تو یہ نوبت نہ آتی۔''

☆☆☆

میجر جنرل سر ہربرٹ خشکی کے راستے سفر کر رہا تھا۔ یہاں کہیں انگریزی فوج کا کچھ حصہ پہلے سے موجود تھا اور اس نے روپوشی اختیار کر رکھی تھی۔ یہ فوج کرنل بارڈ کی نگرانی میں تھی۔ اسے کسی طرح یہ معلوم ہو گیا کہ میجر جنرل سر ہربرٹ خشکی کے

راستے سے متمہ کی طرف جا رہا ہے۔ کرنل بارڈ نے سوچا کہ اس کی اطلاع کے مطابق راستے میں جگہ جگہ درویش موجود ہیں۔ انہیں اس نئی انگریزی فوج کی آمد کی خبر ضرور ہو جائے گی اور میجر جنرل سر ہربرٹ لاعلمی میں بلاوجہ مارا جائے گا۔ چنانچہ اس نے سر ہربرٹ کو اطلاع بھیجی کہ آگے انہیں ابوکلیہ نامی ایک قصبہ ملے گا۔ اس قصبے کے شمال مشرق میں پہاڑیاں ہیں۔ ان پہاڑیوں پر مہدی کے درویش دیکھے گئے ہیں۔

جنرل سر ہربرٹ کو جب یہ پیغام ملا تو اس وقت وہ ابوکلیہ پہنچ چکا تھا مگر اس پیغام نے جنرل کو خبردار ضرور کر دیا تھا۔

مہدی سوڈانی کے آدمیوں نے بھی اس لشکر کو متمہ کی طرف جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور وہ اس کی گھات میں بیٹھ گئے تھے۔ ابھی سر ہربرٹ نے مزید تین چار میل کا راستہ طے کیا ہوگا کہ اچانک درویشوں نے حملہ کر دیا۔

17 جنوری کی صبح ان دونوں فوجوں میں جنگ شروع ہوئی۔ اس جنگ میں سر ہربرٹ کو ایسا زخم لگا کہ وہ گھوڑے سے زمین پر آ گیا اور اس کی کمان سر چارلس ولسن نے سنبھال لی۔

جنگ نے خوفناک شکل اختیار کر لی۔ اب سر چارلس ولسن نے فیصلہ کیا کہ اس جگہ کو فوراً چھوڑ دینا چاہیے اور کچھ فوج کو درویشوں کے ساتھ الجھا کر کسی طرح دریائے نیل کے ساحل تک پہنچ جانا چاہیے۔

درویشوں نے بطورِ خاص میجر جنرل سر ہربرٹ پر حملہ کیا۔ وہ اس شخص کو خرطوم کسی طرح بھی نہیں پہنچنے دینا چاہتے تھے۔ اس مہم میں میجر جنرل سر ہربرٹ کی فوج کے ساتھ بہت سے اخباری نمائندے بھی سفر کر رہے تھے۔

درویشوں نے اتنا بھرپور اور جارحانہ حملہ کیا کہ سر ہربرٹ اپنی کامیابی کی طرف سے مایوس ہو گیا۔ زخمی تو وہ تھا ہی۔ درویشوں نے انگریزی فوج کا صفایا کرتے ہوئے سر ہربرٹ کو قتل کر دیا۔

چارلس ولسن مایوسی کے عالم میں مصروف سپاہیوں کو کچھ بتائے بغیر کچھ حصہ فوج کو لے کر وہاں سے نیل کے ساحل کی طرف فرار ہو گیا۔

21 جنوری 1885ء کو چار جہاز مصر کی طرف آتے دکھائی دیے۔ یہ دخانی جہاز تھے۔ مصری سمجھے کہ یہ خرطوم سے فتح کی خبر لے کر آئے ہیں اور انہیں اس خیال سے بے حد خوشی ہوئی لیکن یہ تاجروں کے جہاز تھے۔ ان کے پاس جنرل گارڈن کا ایک رقعہ بھی تھا۔ یہ رقعہ 29 دسمبر 1884ء میں لکھا گیا تھا۔ اس میں جنرل گارڈن نے لکھا تھا۔ ”ہم خرطوم میں بالکل امن و عافیت سے ہیں اور کئی سال تک محفوظ رہ سکتے ہیں۔“

مگر زبانی حقیقی پیغام یہ تھا۔ ”میں نے خرطوم کو بچانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا لیکن اب ماننا پڑے گا کہ ہماری حالت بہت نازک ہو گئی ہے اور ہمیں چاروں طرف سے یاس و قنوطیت نے گھیر رکھا ہے۔ میں یہ بات اپنی حکومت سے ناراضگی کی بنا پر شکایتاً نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ حقیقتِ حال سے آگاہ کر رہا ہوں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر خرطوم دشمن کے پاس چلا جائے تو ہم کسالہ نامی جگہ پر بھی اپنے قبضے کو برقرار نہیں رکھ سکتے۔“

جہاز پر موجود مصری افسر عبدالحمید بے نے کسی طرح سر چارلس ولسن کو یہ پیغام بھیج دیا کہ خرطوم کے محصورین کی حالت بہت نازک ہے اور جنرل گارڈن کی فوج حکومت کی طرف سے بالکل مایوس ہو چکی ہے اس لیے جتنی جلدی ممکن ہو، وہ خرطوم پہنچ جائے۔ یہ کام دس دن کے اندر اگر انجام کو پہنچ جائے تو مناسب ہوگا۔ اس کے بعد کمک کی ضرورت نہیں رہے گی۔

23 جنوری کو سارا دن روانگی کی تیاریاں ہوتی رہیں اور 24 جنوری کو چند جہاز خرطوم کی طرف روانہ ہو گئے۔

25 جنوری کا دن گزرا تو شہریوں نے مہدی سوڈانی کو ایک خفیہ پیغام بھیجا کہ جنرل گارڈن اپنی فوج کو جھوٹے دلاسے دے دے کر خود جھوٹا قرار پا چکا ہے اور اب فوج اس کی کسی بات کا اعتبار کرنے کو تیار نہیں اس لیے اسے ایک فیصلہ کن حملہ کر دینا چاہیے۔

اس پیغام کے ساتھ ہی مہدی کی توپوں نے آگ اگلنا شروع کر دی اور خرطوم کا حملہ زدہ علاقہ کرۂ نار بن گیا۔

شہر کی عیسائی آبادی بہت پریشان تھی اور ایک مشہور تاجر ماروینی حقیقت حال جاننے کے لیے جنرل گارڈن سے ملنے گیا۔ محافظوں نے اسے روک دیا تو مارونیٔ نے اپنے نام اور حیثیت سے محافظوں کو مطلع کیا اور کہا۔ ”تم جنرل گارڈن کو میرے بارے میں بتاؤ کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“

(جاری ہے)

ماخذات

مشاہیرِ مشرق۔ جرجی زیدان۔ محاربات مصر و سوڈان، مطبوعہ دہلی۔ حیاتِ لارڈ کچز، سر جارج آرتھر

چور اگر چور ہی رہے تو اس کے گرد دائرہ تنگ کرنا تھوڑا آسان ہوتا ہے مگر جب چور کو چوکیدار بنادیا جائے تو اس کی خطرناکی میں کوئی شک باقی نہیں رہتا... وہ بھی تو محافظ تھے مگر بدنیتی کے ہاتھوں ذلت اٹھانے پر مجبور ہوگئے کیونکہ اس طرح تو ہوتا ہے پھر اس طرح کے کاموں میں...

انتہائی عقلمندی سے بے وقوفی کے گڑھے کھودنے والوں کی تماشا گری

آڑ

عمران قریشی
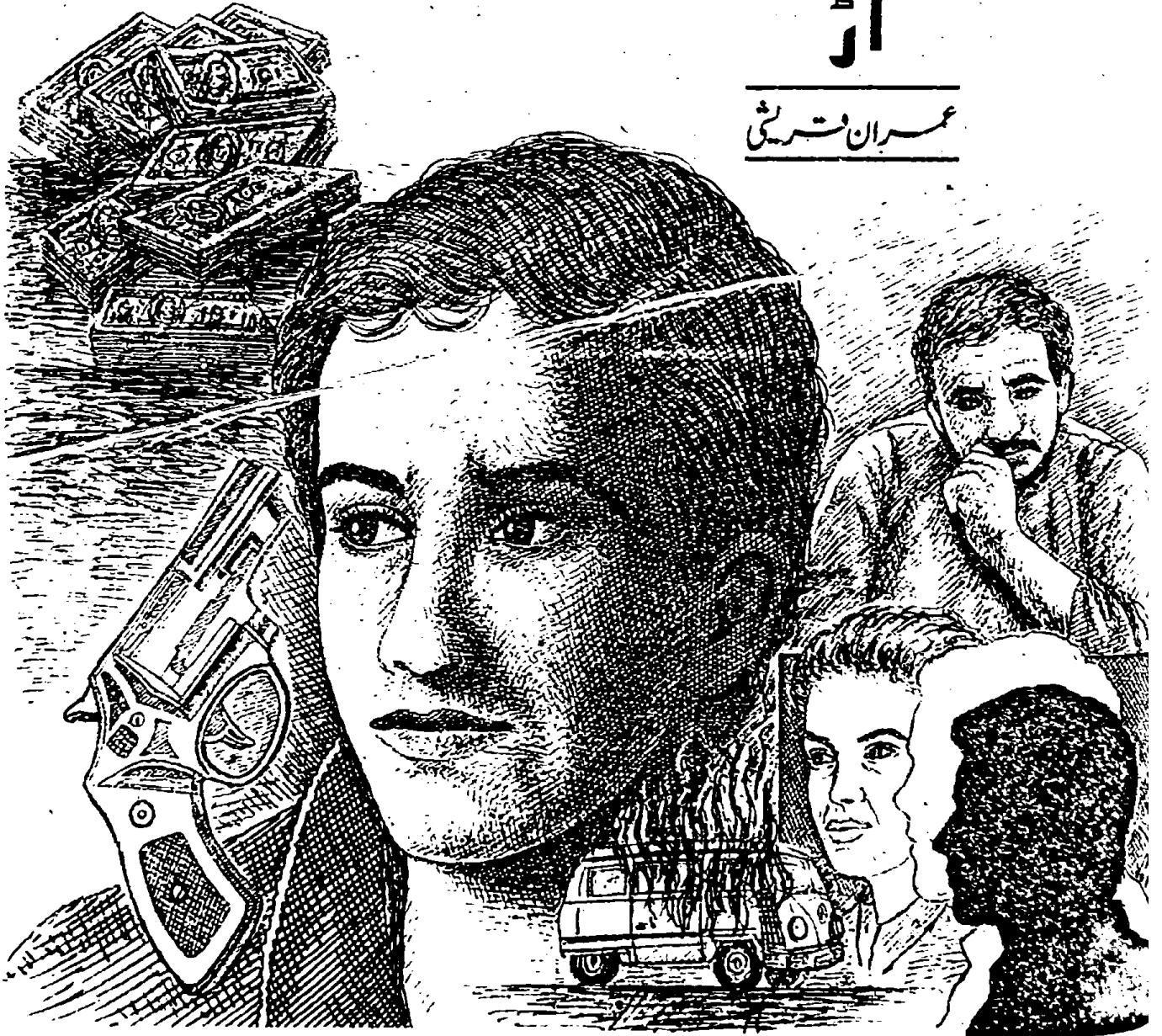
چھوٹی سی فیاٹ کار ساحلی ریسٹورنٹ کے قریب آکر رکی اور پینتالیس سالہ ماریو ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر پینتیس سالہ بیٹلی براجمان تھا۔ اس نے کار سے نیچے اترنے کے بعد اپنی جیب کا جائزہ لیا۔ اس کی جیب میں بچی کھچی رقم رات کے کھانے کے لیے ناکافی تھی اور اسے یقین تھا کہ ماریو ایک ڈالر بھی جیب سے نکالنے والا نہیں تھا۔ گاڑی سے باہر طوفانی ہواؤں کا راج تھا۔ ریڈیو پر بار بار موسلا دھار بارش کی پیش گوئی کی جارہی تھی اس کے باوجود بھی ساحل سمندر پر سرپھرے اور بے فکرے نوجوانوں کی بہتات تھی۔ وہ ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ

ڈال کر گھوم پھر رہے تھے۔
گاڑی سے باہر نکلتے ہی ساحلی ہواؤں نے ان دونوں کا حصار کرلیا اور ماریو کا ہیٹ اڑ کر دور جا گرا۔ بینطلی کا کوٹ بھی بدحواس ہوکر اڑنے والے کبوتر کی طرح پھڑ پھڑایا لیکن اس نے توجہ دیے بغیر پھرتی کے ساتھ بھاگ کر ہیٹ کو دبوچ لیا اور فرمانبردار بچے کی طرح واپس لاکر ماریو کے ہاتھوں میں تھمادیا۔ اس نے ہیٹ کو سر پر خوب اچھی طرح جمایا پھر ریسٹورنٹ کا دروازہ کھول کر ہال کمرے میں آگیا۔ بینطلی اس کے پیچھے تھا۔ اندر داخل ہونے کے فوراً بعد ماحول پر یکلخت سکوت طاری ہوگیا جیسے بٹن گھما کر شور مچاتے ہوئے ریڈیو کی آواز کو یکدم بند کردیا گیا ہو۔ دونوں نے ایک خالی میز کا انتخاب کیا اور بیٹھنے کے بعد ویٹر کا انتظار کرنے لگے۔ ان دونوں کے دماغوں میں ایک چھوٹے بینک میں ڈکیتی کا منصوبہ پنپ رہا تھا۔ ساحلی ریسٹورنٹ میں آنے کا مقصد اس منصوبے پر غور وفکر کرنا تھا۔
کرسی پر بیٹھنے کے بعد بینطلی نے ایک دفعہ پھر جیب میں سے پرس باہر نکالا اور تنقیدی نگاہوں سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ وہ دونوں ہڈسن ٹاؤن کے نیشنل بینک میں سیکیورٹی گارڈ تھے۔ چھٹی والے دن رات کا کھانا کھانے کے لیے ریسٹورنٹ میں آتے تھے اور اپنی جیب کے مطابق خرچہ کرنے کے بعد رات گئے ٹاؤن کی طرف جاتے تھے۔ یہ مہینے کی آخری تاریخ تھی اس لیے بینطلی کی جیب میں رقم کم تھی اور ماریو اس بات پر بضد تھا کہ اگر رات کے کھانے کا بل بینطلی ادا کرے گا تب وہ اسے اپنے منصوبے میں شامل کرے گا بصورت دیگر وہ اپنے آپ کو منصوبے سے علیٰحدہ سمجھے۔
کاؤنٹر کے پیچھے سے ویٹر نکل کر ان دونوں کی طرف آگیا۔ ماریو نے اسے گوشت کے فرائڈ تکلے اور سرخ شراب لانے کے لیے کہا۔ بینطلی کے چہرے پر پریشانی کے تاثرات پیدا ہوئے۔ اس کی جیب اس آرڈر کی متحمل نہیں تھی۔ اب لے دے کر اس کے پاس یہی چارۂ کار باقی بچا تھا کہ وہ ریسٹورنٹ کے مالک کی منت... کرکے اسے ادھار کے لیے راضی کرتا۔ ریسٹورنٹ میں آتے جاتے ہوئے اس سے سلام دعا ہوتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ وہ مان جائے گا۔
ماریو نے جیب میں سے سستے برانڈ کا سگریٹ نکالا اور لائٹر سے جلانے کے بعد طویل کش لیتے ہوئے بولا۔
''تو تمہاری جیب میں بل ادا کرنے کے لیے رقم موجود نہیں۔ ہر مہینے کے آخر میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ تم خود سوچ سکتے ہو۔ اگر ان تاریخوں میں تم پر کوئی آفت ٹوٹ پڑے تو تم اس کا سامنا کیسے کرو گے؟ تمہاری اسی مفلسی کی وجہ سے کوئی بھی لڑکی تمہیں منہ نہیں لگاتی۔ کچھ ایسا ہی حال میرا بھی ہے تو کیوں نا اچھی سی منصوبہ بندی کرکے اتنی رقم حاصل کی جائے جس سے ڈھنگ کے ساتھ زندگی گزارنا ممکن ہوسکے۔''
بینطلی طویل سانس لیتے ہوئے بولا۔ ''یہ دوسری دفعہ ہورہا ہے کہ میری محبوبہ میری مفلسی کو دیکھ کر مجھے چھوڑ کر جارہی ہے۔ بینک کی تنخواہ اتنی محدود ہے کہ اپنے خرچے پورے نہیں ہوتے، محبوبہ کے کیسے برداشت کروں۔ مجھے اپنی آئندہ زندگی کے لیے حتمی اقدام کی اشد ضرورت ہے۔''
''تو پھر منصوبہ بندی کرلیتے ہیں۔'' ماریو دھواں باہر اگلتے ہوئے بولا۔ ''میرے خیال میں سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ میں نوعمری میں قتل کرچکا ہوں۔''
اس انکشاف پر بینطلی کے چہرے پر خفیف حیرت کے تاثرات پیدا ہوئے۔ شدید اس لیے نہیں کیونکہ وہ خود بھی قتل کی سزا بھگت کر آیا تھا۔ اگر اس کی سزا میں تخفیف نہ کی جاتی تو شاید وہ اب بھی جیل میں ہی ہوتا۔ اسے ماریو کی آواز سنائی دی۔
''میرا باپ دوسری شادی کررہا تھا۔ میری عمر ان دنوں بہ مشکل پندرہ سال تھی۔ میں نے چاقو کے ایک ہی وار سے اس کا خاتمہ کردیا۔'' اس کی بات درمیان میں رہ گئی۔ ویٹر آرڈر لے آیا۔ یہ ساحلی ریسٹورنٹ کی خاصیت تھی۔ آرڈر کی تکمیل یکدم کی جاتی تھی۔ ویٹر نے گوشت کے تکلے اور شراب کی بوتل کو میز پر رکھا اور خاموشی کے ساتھ واپس چلا گیا۔
ماریو نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل کر بجھایا پھر بوتل کا ڈھکنا کھولنے کے بعد دو گلاسوں میں شراب انڈیلی اور اپنے گلاس میں سے چسکی بھرتے ہوئے بولا۔
''تنہا تو میں نے ویسے بھی رہنا تھا تو پھر دل کی بھڑاس نکال کر تنہائی کا مقابلہ کیوں نہ کرتا۔ میری ماں میری پیدائش کے کچھ عرصے بعد فوت ہوگئی تھی۔ مجھے میری خالہ نے پالا۔ جب میں پندرہ سال کا ہوا تب خالہ بھی فوت ہوگئی۔ میرا باپ مجھے یتیم خانے بھجوانا چاہتا تھا تاکہ دوسری شادی کرکے گلچھرے اڑا سکے۔ میں نے چاقو کو اس کے سینے میں اتار دیا۔ اس کی موت موقع پر ہی واقع ہوگئی اور مجھے قتل کے الزام میں جیل بھجوادیا گیا۔ جرم کا یہ داغ چھپانے کے لیے ہمیں ایک آڑ کا استعمال کرنا ہوگا۔ اس آڑ کے متعلق میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔ مجھے سرسری طور پر

معلوم ہوا ہے کہ تمہارا واسطہ بھی پولیس سے پڑ چکا ہے۔ مجھے اس کے متعلق بتاؤ۔''

''پولیس اور میرا چولی دامن کا ساتھ ہے۔'' بینطلی مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری طرح میں نے بھی نوجوانی میں قتل کیا ہے۔ تاہم اپنے باپ کا نہیں...... بلکہ محبوبہ کا...... وہ مجھے چھوڑ کر کالج کے پرنسپل کے بیٹے سے شادی کرنا چاہتی تھی کیونکہ وہ صاحب حیثیت تھا، گاڑیوں میں گھومتا پھرتا تھا اور مجھے روزانہ بسوں میں ذلیل وخوار ہوکر کالج آنا جانا پڑتا تھا۔ کالج کے پرنسپل کا بیٹا لنگڑا تھا۔ اس کی ٹانگ حادثے میں ٹوٹ گئی تھی۔ میں اس سے ہر لحاظ سے بہتر تھا، سوائے اس کے کہ میرے پاس دولت کی کمی تھی۔ اس کمی کی پاداش میں مجھے میری محبوبہ سے دستبردار ہونا پڑا جو کہ میرے لیے ناممکن تھا اور میری محبوبہ سے غلطی ہوئی کہ اس نے مجھے اپنی شادی کی اطلاع دینے کے لیے جس اسٹیشن کا انتخاب کیا وہاں مسافروں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی اور اس کی دوسری بدنصیبی یہ تھی کہ جب اس نے مجھے اپنی بے وفائی سے آگاہ کیا تب تیز رفتار ٹرین چھوٹے سے اسٹیشن کا رخ کر رہی تھی۔ میں نے طیش میں آکر پوری طاقت کے ساتھ اسے دھکا دیا۔ وہ پٹڑیوں کے درمیان میں جا گری اور ٹرین نے اس کا قیمہ بنا کر رکھ دیا۔'' بینطلی کے چہرے کے تاثرات اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ واقعہ بیان کرتے ہوئے اسے دوبارہ قتل کرنے کے دوران وہ اپنے احساسات کے مجروح ہونے کی تلافی کر رہا تھا۔

ریسٹورنٹ سے باہر بادل زور سے گرجا اور شیشے کی دیوار میں سے چمک عود کر اندر آئی۔ ماریو نے گوشت کا قتلہ چھری اور کانٹے کے ساتھ کاٹ کر منہ میں رکھا پھر سنجیدہ لہجے میں بولا۔

''یہ سب زندگی کا حصہ ہے۔ لوگ آتے ہیں اور واپس چلے جاتے ہیں۔ بعض طبعی موت مرتے ہیں اور بعض حادثے کا شکار ہوجاتے ہیں لیکن قتل ہونے والے یہ افراد قاتل کی زندگی پر اثر انداز ہوجاتے ہیں۔ میں نے اور تم نے قتل کرنے کی سزا بھگتی لیکن آج بھی ان شہروں کی طرف جانے سے کتراتے ہیں جہاں ہمیں جاننے والے افراد کی تعداد زیادہ ہے۔ اس لیے ہم نے ہڈسن ٹاؤن کا انتخاب کیا اور یہاں ہمیں بینک میں سیکیورٹی گارڈ کی نوکری بھی ... بہ آسانی مل گئی۔''

''بینک میں رقم بہت زیادہ ہے۔ اگر ہمیں مل جائے تو زندگی سہل ہوجائے گی۔'' بینطلی نے شراب کا گلاس حلق میں انڈیلا اور اسے میز پر رکھتے ہوئے بولا۔

''یہ کوئی اتنی آسان بات نہیں۔'' ماریو گوشت کے ٹکڑے کو چباتے ہوئے بولا۔ ''ہر چند کہ بینک کی سیکیورٹی ناقص ہے اور رقم بھی دوسرے بینکوں کی نسبت کم ہے تاہم میری معلومات کے مطابق چند دنوں میں دس لاکھ ڈالرز کی رقم بینک میں منتقل ہونے والی ہے۔ ہم اگر سوچ سمجھ کر منصوبہ بندی کریں تو یہ ناممکن نہیں کہ ہم رقم حاصل کرلیں۔''

بینطلی نے گوشت کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے ماتھے پر لگے ہوئے کلنک کے ٹیکے کی بدولت پولیس کو ہم تک پہنچنے میں چنداں دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ بینک کے اسٹاف میں ہم واحد کام کرنے والے ہیں جن کا تعلق جیل سے ہے۔''

ریسٹورنٹ سے باہر گرج چمک کے ساتھ طوفانی بارش کا آغاز ہوگیا۔ ماریو نے اپنی پلیٹ میں مزید گوشت کے ٹکڑے ڈالے اور ان میں سے ایک کو منہ میں ڈالتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں، ہم ڈکیتی کے لیے ایک آڑ کا استعمال کریں گے۔ تم نے بھی کٹھ پتلیوں کا تماشا دیکھا ہے۔ ان کٹھ پتلیوں کی ڈور کسی اور کے ہاتھ میں ہوتی ہے یا پھر اسٹیج ڈرامے میں کام کرنے والے فنکاروں کی طرح جن کے کردار ڈرامے کا لکھاری تخلیق کرتا ہے۔ ہم بھی آڑ پیدا کرنے کے لیے ایک ڈراما تخلیق کریں گے۔ تم مجھے یہ بتاؤ، بینک میں منیجر کے علاوہ ورکرز کی تعداد کتنی ہے؟''

''صرف تین۔'' بینطلی شراب کا گلاس بھرتے ہوئے بولا۔ ''کیشیئر رچرڈ، کلرک بوبی اور اکاؤنٹنٹ ایلی۔ ان تینوں کے علاوہ سیکیورٹی پر ہم دونوں مامور ہیں۔''

''تو پھر یہ سمجھو کہ واردات یہ تینوں کریں گے۔'' ماریو گوشت چباتے ہوئے بولا۔ ''اور فرینکلن یعنی بینک کا منیجر اپنے بیان میں پولیس کو بتائے گا کہ رچرڈ، بوبی اور ایلی نے رقم چرانے کے بعد فرار ہونے کی کوشش کی اور فرینکلن کی حاضر دماغی کی وجہ سے بینک کی گاڑی کھائی کے اندر جا گری جس کی بدولت نہ صرف ان تینوں کی موت واقع ہوئی بلکہ رقم بھی جل کر راکھ ہوگئی۔''

''لیکن بینک کا منیجر فرینکلن بھلا یہ بیان کیوں دینے لگا؟'' بینطلی نے پُرتجسس لہجے میں پوچھا۔ ''کہ ان تینوں نے رقم چرانے کی ناکام کوشش کی اور وہ تینوں رقم کے ساتھ فرار کیوں ہونے لگے۔''

ماریو مسکراتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں اب کھل کر منصوبے کے متعلق بتاتا ہوں۔ مہینے کے آخر میں

اچھی خاصی رقم بینک میں جمع ہوتی ہے۔ ہم رقم کو ہتھیائیں گے اور عملے سمیت گاڑی کو پہاڑ سے نیچے دھکیل دیں گے۔ اگر تین آدمیوں کی موت سے ہماری زندگیاں سنور سکیں تو میرے خیال میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔" بینظی نے شراب کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ "اگر رقم برباد ہوگئی تو ہمیں کیا حاصل ہوگا؟"

"پہلے میری پوری بات تو سن لو، پھر تنقید کرنا۔" ماریو نے منہ بناتے ہوئے کہا پھر ادھ جلے سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل دیا۔ بادل ایک بار پھر زور سے گرجا۔ ہال کمرے کا ماحول وقتی طور پر روشن ہوا پھر دوبارہ اندھیرا مسلط ہوگیا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد ماریو ہمکلام ہوا۔

"گاڑی کو نیچے دھکیلنے سے قبل ہم کاغذوں سے بھرا ہوا سوٹ کیس گاڑی میں منتقل کردیں گے۔ پہاڑی سے نیچے گرنے کے بعد اس میں آگ لگ جائے گی اور سب کچھ جل کر بھسم ہوجائے گا۔ تم جان سکتے ہو کہ یہ کوئی حادثہ نہیں بلکہ فرینکلن ڈکیتی کو ناکام بنانے کے لیے انتہائی اقدام کے طور پر انہیں پہاڑی سے نیچے دھکیلے گا، بعد میں وہ وہی بیان قلمبند کروائے گا جو ہم اس کے دماغ میں ڈالیں گے۔" بینظی کے چہرے پر حیرت بھرے تاثرات پیدا ہوئے لیکن اس کے کچھ کہنے سے قبل ماریو بولا۔

"پہلے فرینکلن کا بیان غور سے سن لو۔ وہ تفتیشی آفیسر کو بتائے گا کہ رقم چرانے کی منصوبہ بندی رچرڈ، ایلی اور بوبی نے کی۔ وہ تینوں اسے یرغمال بنا کر قصبے سے باہر لے جانا چاہتے تھے لیکن اس نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے گاڑی کے اسٹیئرنگ کو گھما کر گہری کھائی کی طرف موڑ دیا۔ یاد رہے کہ ڈرائیونگ سیٹ فرینکلن کے پاس ہوگی جبکہ وہ تینوں پچھلی سیٹ پر ریوالور تھامے براجمان ہوں گے۔ ان تینوں کے ریوالوروں کا رخ فرینکلن کی طرف ہوگا۔ تفتیشی آفیسر کو بیان کے دوران فرینکلن مزید بتائے گا کہ گاڑی کھائی میں گرنے سے قبل اس نے دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگادی اس لیے اس کی جان بچ گئی لیکن تینوں بینک ورکرز جل کر ہلاک ہوگئے۔ ان کے ساتھ بینک سے چرائی ہوئی رقم بھی بھسم ہوگئی۔ تفتیشی آفیسر اس ڈکیتی کو ان تینوں کے کھاتے میں ڈال کر فائل بند کردے گا اور حالات موافق ہونے کے بعد ہم رقم کے ہمراہ نیویارک چلے جائیں گے۔"

"تمہارے منصوبے میں چند باتیں زیر غور ہیں۔" بینظی شراب کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔ "مثلاً اگر گاڑی کو آگ نہ لگی تو وہ تینوں ہلاک ہونے سے بچ بھی سکتے ہیں یا پھر فرینکلن کی تقلید کرتے ہوئے ان تینوں میں سے کسی نے گاڑی سے باہر چھلانگ لگادی تب بینک منیجر کا بیان فضول ہوگا۔"

ماریو نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ "گاڑی کو کھائی سے نیچے دھکیلنے سے قبل ہم پچھلے دروازے بلاک کردیں گے اور بالفرض اگر گاڑی میں آگ نہ بھی لگی تب ہم خود نیچے جا کر لگادیں گے۔ تفتیش کو آگے بڑھنے میں مدد دینے والے نشانات کو ختم کرنے میں یہ آگ معاون ثابت ہوگی۔"

بینظی نے اثبات میں سر ہلایا۔ "یہاں تک تو سب کچھ ٹھیک ہے لیکن یہ اس وقت ممکن ہے جب منیجر بیان قلمبند کروانے کے لیے آمادہ ہوگا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو، وہ بہت سخت گیر طبیعت کا مالک ہے۔ اگر اس نے انکار کردیا تب کیا ہوگا؟"

"یہ سوال نہایت اہم ہے۔ ہماری ڈکیتی کے اس منصوبے میں جس شخص کے بیان کی اہمیت سب سے زیادہ ہے، وہ بینک کا منیجر فرینکلن ہے۔ اس کے بیان کے بعد پولیس کی توجہ ہم دونوں سے ہٹ کر بینک کے تینوں ورکرز پر مرکوز ہوجائے گی۔ تم خود سوچ سکتے ہو، اگر منیجر بیان دینے سے انکاری ہوجائے تو ہم دونوں کو بھی تفتیش میں شامل کرنے کے بعد معلومات کا آغاز کردیا جائے گا اور انہیں یہ معلوم کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئے گی کہ ہم دونوں نہ صرف قاتل ہیں بلکہ عمر قید کاٹنے کے بعد اس بینک میں ملازمت کررہے ہیں اور یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ تین کے بجائے پانچ افراد ڈکیتی میں ملوث کرلیے جائیں۔" وہ چند لمحوں کے لیے خاموش ہوا۔ بینظی نے شراب کا گلاس اس کے ہاتھوں میں تھمادیا اور وہ گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔

"اب میں تمہیں ایک تیسرے اور اہم شخص کے متعلق بتاتا ہوں۔ اس کا نام ٹرائے ایڈ ہے تاہم ہم اسے ٹرائے کے نام سے مخاطب کریں گے۔ یہ ہڈسن ٹاؤن میں رہائش پذیر ایک انتہائی درجے کا شرابی ہے لیکن اس میں یہ خوبی ہے کہ وہ دماغ پر قابو پالینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ کچھ عرصہ قبل نفسیات کے پروفیسر کی نوکری سے ریٹائرمنٹ لے چکا ہے اور اپنا سب کچھ شراب نوشی کی نذر کرنے کے بعد ان دنوں پائی پائی کا محتاج ہے۔ اسے رقم کی اشد ضرورت ہے۔ میں نے اس سے بات کرلی ہے۔ وہ ایک لاکھ ڈالرز لے کر بینک کے منیجر کو ہپناٹائز کرے گا تاکہ وہ تفتیشی آفیسر کو حسب منشا بیان دے کر ہم دونوں کی جان خلاصی

کرواسکے۔"
بینٹلی نے پوچھا۔"لیکن اگر عین وقت پر ٹرائے کام کرنے سے منکر ہوگیا تب سب کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔"
"وہ منکر نہیں ہوگا۔" ماریو بولا۔"میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ وہ شراب پینے کا عادی ہے اور مفلسی کا یہ عالم ہے کہ دو وقت کی روٹی اسے نصیب نہیں ہوتی۔ ایک لاکھ ڈالرز کے لیے تو وہ اپنی ماں کو بھی بیچنے کے لیے آمادہ ہوسکتا ہے۔ اس کے باوجود بھی ہم احتیاط کے دامن کو تھامتے ہوئے اسے رقم کام مکمل ہونے کے بعد ادا کریں گے۔ کل میں تمہیں ٹرائے سے ملواؤں گا۔ تم اسے اچھی طرح جانچ پرکھ سکتے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارا انتخاب غلط نہیں ہوگا۔"
ویٹر بل لے کر میز کی طرف آیا۔ ریسٹورنٹ سے باہر کہیں قریب ہی بجلی گری۔ ایسی ہی کچھ بجلی بل دیکھنے کے بعد بینٹلی کے دماغ پر بھی گری۔ اس نے بے چارگی کے عالم میں جیب میں سے پرس باہر نکالا۔ ماریو اس کی کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔
"آج کے کھانے کا بل میں دوں گا۔ اگر اگلے ہفتے نوبت آئی تو تم حساب چکتا کر دینا۔" بینٹلی نے اطمینان کا طویل سانس لیا اور دونوں بل ادا کرنے کے بعد گاڑی کی طرف آگئے۔

☆☆☆

ٹرائے ایڈ کی عمر ساٹھ سال سے کچھ اوپر تھی لیکن بلانوشی کی وجہ سے ستر کا دکھائی دیتا تھا۔ اپنی آنکھوں پر عینک لگا کر رکھتا تھا۔ قد غیر معمولی طور پر لمبا اور کاٹھی مضبوط تھی تاہم اس کے باوجود بھی انتہائی درجے کا سست اور کاہل انسان تھا۔ محدود پنشن میں کھینچ تان کر گزارہ کر رہا تھا۔ جوانی میں جو کچھ جمع کیا تھا، وہ ریٹائرمنٹ کے بعد شراب نوشی کی نذر کر چکا تھا۔ اب لے دے کر ولسن روڈ پر دو کمروں پر مشتمل فلیٹ باقی رہ گیا تھا۔ اگر اسے فٹ پاتھ پر مناسب جگہ مل جاتی تو شاید فلیٹ کو بیچ کر وہاں منتقل ہو چکا ہوتا۔
جب ماریو اور بینٹلی نے فلیٹ میں قدم رکھا تو اس ملاقات کے لیے ٹرائے نے دل پر جبر کر کے اس دن شراب نوشی سے پرہیز کیا اس لیے کچھ بہتر حالت میں تھا۔ سٹنگ روم کے صوفے پر بیٹھتے ہوئے ٹرائے مسکراتے ہوئے بولا۔
"مجھے افسوس ہے کہ میں تم دونوں کی خاطر مدارات نہیں کرسکتا۔ مہینے کی آخری تاریخیں چل رہی ہیں اور میرے پاس شراب کے لیے رقم بہت کم بچی ہے۔ میں بھوکا رہ سکتا ہوں لیکن شراب کے بغیر میرے لیے سانس لینا بھی دوبھر ہو جاتا ہے۔"
"ہم یہاں کھانے پینے کی نیت سے نہیں آئے۔" ماریو نے مسکراتے ہوئے کہا۔"آج کی میٹنگ حتمی ہے۔ ہفتے کی رات ہم بینک میں ڈکیتی کریں گے۔ تم سے گفت و شنید کا مقصد یہ ہے کہ اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرلو۔ ہفتے کی شام شراب نوشی سے پرہیز کرنا۔ تھوڑی سی غلطی بھی سارا کام بگاڑ سکتی ہے۔"
"میری شراب نوشی سے تمہیں نقصان نہیں ہوگا، مجھے اپنے اوپر اعتبار ہے۔ میں زیادہ نہیں بتاؤں گا۔ چند ماہ قبل میری گاڑی حادثے کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی اور مجھے بجٹ سے کچھ اوپر خرچہ کرنا پڑا۔ یہ خرچہ شراب کے کوٹے پر بھی اثر انداز ہوا جس کی وجہ سے مہینے کے آخر میں میرے پاس رقم ختم ہوگئی۔ مجبوراً مجھے غیر قانونی ہتھکنڈوں کا استعمال کرنا پڑا۔ تم دونوں یقین کرو، میں نے شراب کے ڈیلر کو ہپناٹائز کر کے بوتلوں کا پورا کریٹ ہتھیا لیا۔" ٹرائے سنجیدہ لہجے میں بولا۔
ماریو اور بینٹلی اچھل پڑے۔ ٹرائے ان کی حیرت سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔"یہ میرے لیے ناممکن نہیں تھا لیکن اگر بات پولیس تک چلی جاتی تو مجھے سزا بھی ہوسکتی تھی اس لیے میں نے دوبارہ اس حرکت کا ارتکاب نہیں کیا۔"
"شراب ڈیلر کو معلوم نہیں ہوا کہ تم نے اس کے ساتھ کیا کیا؟" ماریو نے پوچھا۔"دکان سے شراب کی بوتلوں کا پورا کریٹ گم ہوجانا کوئی عام بات نہیں۔ اسے دوسرے دن ہی معلوم ہوگیا ہوگا۔"
"تمہارا اندازہ درست ہے تاہم وہ یہ معلوم نہ کرسکا کہ چوری کیونکر ہوئی۔ یہ شعور اور لاشعور کا کھیل ہے۔ معمول بننے سے شعور کام آتا ہے اور معمول بننے کے بعد لاشعور حرکت میں آجاتا ہے تاہم وقتی طور پر عامل کا حکم ماننے کے بعد لاشعور واپس سو جاتا ہے لیکن اسے بیدار کرنے کے لیے عامل کی انگلی کی چٹکی کافی ہوتی ہے۔"
"ہمارے منصوبے میں فرینکلن کے بیان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ وہ معاملے کو بنا بھی سکتا ہے اور بگاڑ بھی سکتا ہے۔ تمہارے کہنے کے مطابق معمول وقتی طور پر حکم ماننے کے بعد سو جائے گا اور شعور جاگنے کے بعد کام شروع کردے گا۔ ایسی صورت میں وہ اپنے بیان سے مکر بھی سکتا ہے۔" بینٹلی نے پہلی دفعہ گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے پوچھا۔
"نہیں...... وہ بیان سے نہیں مکرے گا۔" ٹرائے

نے بتایا۔ اس کے لاشعور میں یہ بات محفوظ ہوکر رہ جائے گی کہ ڈکیتی کی جن افراد نے منصوبہ بندی کی، ان کے نام بالترتیب رچرڈ، بوبی اور ایلی ہیں۔ تم اس بات سے بہ خوبی اندازہ لگاسکتے ہو۔ ماریو نے مجھے ان ناموں سے پانچ دن پہلے آگاہ کیا تھا۔ آج بھی یہ نام میرے شعور اور لاشعور دونوں میں محفوظ ہیں۔ میں شراب نوشی کے دوران بھی انہیں بھلا نہیں سکتا۔''

''تمہارے کام میں اہمیت آنکھوں کی ہے۔ تم ان کے ذریعے معمول کے دماغ تک رسائی حاصل کرتے ہو اور یقیناً اس وقت معمول کو تمہارے سامنے ہونا چاہیے۔ ہفتے کی شام معمول بننے والے فرینکلن کو یہاں فلیٹ پر لانا ہوگا۔ ہمیں تفصیل سے آگاہ کرو۔ اس دوران تم کہاں ہوگے؟'' ماریو نے پوچھا۔

''میں تمہیں پہلے بتاچکا ہوں کہ میں نے شراب ڈیلر کو کاؤنٹر پر کھڑے ہوکر معمول بنالیا تھا حالانکہ میں نے اس کے تحت الشعور میں کوئی احکامات منتقل نہیں کیے تھے۔ صرف اپنے ارادے کا اظہار کیا تھا لیکن اگر میں کرنا چاہتا تو بہت کچھ کرسکتا تھا۔ مثلاً میں اسے حکم دیتا کہ وہ روزانہ ایک کریٹ شراب کی بوتلوں کا میرے فلیٹ پر بھجوادیا کرے تو وہ ایسا بہ خوبی کرتا لیکن اس صورت میں شعور اور لاشعور میں جنگ ہوجاتی۔ شعور تفتیش کا آغاز کردیتا اور میں ایسا نہیں چاہتا تھا۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تم بینک منیجر کو میرے فلیٹ پر لاؤ یا پھر مجھے اس کے پاس بینک میں لے چلو، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں اسے آنکھوں کے ذریعے بے حس کردوں گا اور احکامات لاشعور میں محفوظ کرنے کے بعد اسے بیان دینے کے لیے آمادہ کردوں گا اور میرے سامنے سے ہٹنے کے بعد اس کا شعور روزمرہ کے معمولات کے مطابق کام کرے گا لیکن تفتیشی آفیسر کو بیان دینے کے دوران شعور سوجائے گا اور لاشعور جاگنے کے بعد وہی بیان دے گا جس کے متعلق میں اسے حکم دوں گا۔''

''منیجر کو معمول بنانے کے لیے تمہیں اس کی قوتِ مدافعت کو ختم کرنے کے لیے انجکشن کا سہارا لینا ہوگا۔ میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ اگر معمول کی قوتِ مدافعت زیادہ ہوتو وہ عامل پر حاوی بھی ہوسکتا ہے۔'' بینٹلی نے پوچھا۔

''مجھے اپنی قوتِ ارادی پر اعتبار ہے۔'' ٹرائے بولا۔ ''شراب نوشی نے اسے کسی حد تک متاثر کیا ہے لیکن اب بھی آنکھوں کے ذریعے کسی بھی انسان کو بہ خوبی تسخیر کرسکتا ہوں اور اس کے لیے مجھے کسی انجکشن کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں۔'' اس نے یکلخت آنکھوں پر لگی ہوئی عینک کو اتار دیا۔

خدا کی پناہ...... ماریو اور بینٹلی کو یوں محسوس ہوا جیسے ان دونوں نے لاعلمی کے دوران دھوپ کی جانب دیکھ لیا ہو۔ ان کی آنکھیں وقتی طور پر مفلوج ہوکر رہ گئیں۔ انہوں نے جھٹکے کے ساتھ ان کو بند کرلیا۔ کچھ دیر بعد جب کھولا تو ٹرائے عینک لگاچکا تھا۔ انہیں اس کی آواز سنائی دی۔

''میں نے ان پر بہت محنت کی ہے اس لیے اب مجھے قوت مدافعت کو ختم کرنے کے لیے کسی انجکشن کی ضرورت نہیں۔ میں بہ آسانی کسی کے بھی شعور پر قابو پاسکتا ہوں۔''

''مجھے خوف محسوس ہورہا ہے۔ تم کچھ بھی کرسکتے ہو پھر بینک سے اکیلے رقم کیوں نہیں چرالیتے؟ ہمارے شعور تمہاری آنکھوں کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔'' بینٹلی نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

''نہیں......'' ٹرائے نے انکار میں سر ہلایا۔ ''مجھے شعور پر حاوی ہونے کے لیے معمول کے لاعلم ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم دونوں چونکہ میری طاقت سے واقف ہو اس لیے تم پر حاوی ہونا میرے لیے ممکن نہیں اور اس صورت میں مجھے واقعی تم دونوں کی قوتِ مدافعت ختم کرنے کے لیے انجکشن لگانے کی ضرورت محسوس ہوگی۔ اس کے علاوہ میں عمر کے اس حصے میں قدم رکھ چکا ہوں جہاں خواہشات محدود ہوکر رہ جاتی ہیں۔ مجھے شراب کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہیے جیسے ایک ہیروئنچی کے سامنے تم دنیا جہان کی دولت رکھ دو تو وہ اس میں سے صرف اتنی رقم کا انتخاب کرے گا جتنی رقم سے اس کا نشہ بہ آسانی پورا ہوجائے۔ ایک لاکھ ڈالرز میرے نشے کے لیے کافی ہیں۔''

بینٹلی نے تفہیمی نگاہوں سے ماریو کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔ ''تو پھر ٹھیک ہے۔ میں ہفتے کی شام کو فرینکلن کو یہاں لے آؤں گا۔ ایک اچھے اور تگڑے اکاؤنٹ کو حاصل کرنے کی خاطر وہ کہیں بھی جانے کے لیے آمادہ ہوسکتا ہے اور وہ اکاؤنٹ ہولڈر ٹرائے ایڈ ہوگا۔ اس ملاقات کے دوران ٹرائے اس کو ہپناٹائز کرے گا اور یہ عمل ہم دونوں کے سامنے کیا جائے گا۔ بعدازاں بیان ریکارڈ ہونے کے فوراً بعد ہم فرینکلن کو رقم کی ادائیگی کردیں گے۔'' اس بار بینٹلی اور ٹرائے خاموش رہے اس لیے مزید چند پہلوؤں پر غور و خوض کرنے کے بعد میٹنگ کو برخاست کردیا گیا۔

☆☆☆

اگلے دن بینک بند ہونے کے بعد ماریو نے فرینکلن

کے کمرے کا رخ کیا۔ اس کی عمر پینتالیس سے پچپن کے درمیان تھی اور وہ سنجیدہ طبیعت کا مالک تھا۔ قلموں کی سفیدی اور آنکھوں پر لگی نفیس شیشوں والی عینک اسے باوقار دکھائی دینے میں اہم کردار ادا کر رہی تھی۔ اس کی عینک کو دیکھ کر ماریو شش و پنج میں مبتلا ہوگیا۔ شیشہ ہپناٹائز کے عمل میں رکاوٹ پیدا کرتا تھا۔ ٹرائے کی آنکھوں کی طاقت عینک کی وجہ سے اس کی آنکھوں تک محدود رہتی تھی اس لیے فرینکلن کی عینک اسے معمول بننے سے بھی روک سکتی تھی لیکن یہ وقت ایسی باتیں سوچنے کا نہیں تھا۔ اس پر بعد میں بھی غور کیا جاسکتا تھا۔ ابھی تو اسے اس بات پر قائل کرنا مقصود تھا کہ وہ ہفتے کی رات کو ٹرائے سے ملنے کے لیے اس کے فلیٹ پر چلا جائے۔ ہر چند کہ تعطیل والے دن کام کرنا فرینکلن کی عادت میں شمار ہوتا تھا تاہم کسی کے فلیٹ پر جا کر اسے بینک میں اکاؤنٹ کھولنے کے لیے قائل کرنا اس کے مزاج کے خلاف تھا لیکن کوشش کرنے میں کیا حرج تھا۔ اگر وہ انکار کر دیتا تو ٹرائے اس پر ہپناٹائز کرنے کے لیے بینک میں بھی آسکتا تھا۔

ماریو قریبی کرسی پر بیٹھ گیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ بینک بند ہونے کے بعد تم عموماً گالف کھیلنے کے لیے گراؤنڈ جاتے ہو اور ہفتے کی تمام شام تمہارے لیے ٹورنامنٹ کی وجہ سے بہت اہم ہوتی ہے لیکن جہاں کام کی بات ہو، وہاں کھیل کو اہمیت نہیں دی جاسکتی۔''

فرینکلن کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات پیدا ہوئے۔ اس کے سامنے بیٹھا ہوا شخص معمولی گارڈ تھا اور اسے نصیحت کر کے اپنے عہدے سے نیچا دکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ علاوہ ازیں بینک کا وقت بھی ختم ہوگیا تھا اور وہ اسے وقت پر ہی لیکچر دینے پر تلا ہوا تھا اس لیے تلخ لہجے میں بولا۔ ''اپنی نصیحتیں اپنے پاس ہی رکھو اور مدعے کے متعلق بتاؤ۔ میرے پاس وقت کم ہے۔''

''وہی بتا رہا ہوں۔ یہاں سے کچھ دور ولسن روڈ پر نفسیات کا ریٹائرڈ پروفیسر رہائش پذیر ہے۔ وہ اپنی جمع پونجی کو محفوظ کرنے کے لیے بینک میں اکاؤنٹ کھولنا چاہتا ہے اور اس مقصد کے لیے تم سے بات چیت کرنے کا متمنی ہے۔''

''تو ٹھیک ہے۔ اسے کل صبح بینک میں بلالو۔ میں بات چیت کرلوں گا۔'' فرینکلن اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''لیکن وہ یہاں نہیں آسکتا۔'' ماریو نے بتایا۔ ''اس کی کچھ مجبوریاں ہیں۔ تمہیں اس کے فلیٹ پر جانا ہوگا۔ وہ پچاس ہزار ڈالرز بینک میں جمع کروانا چاہتا ہے۔''

''مجھے اس کی مجبوریوں کے متعلق بتاؤ لیکن مختصر الفاظ میں۔ میں گالف کے گراؤنڈ میں کسی کو وقت دے چکا ہوں، وہ وہاں میرا منتظر ہوگا۔'' فرینکلن نے بیزار لہجے میں پوچھا۔

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد ماریو بولا۔ ''وہ دل کا مریض ہے۔ ڈاکٹر نے اسے چلنے پھرنے سے منع کر دیا ہے۔ اگر اس کی طبیعت ناساز نہ ہوتی تو وہ بینک میں رقم کبھی بھی جمع نہ کرواتا۔ اسے بینک کی سیکیورٹی پر اعتبار نہیں ہے۔ اس کا خیال ہے کہ زیادہ تر ڈکیتیوں میں بینک کا عملہ ملوث ہوتا ہے۔ تاہم بیمار ہونے کے بعد اب وہ مجبوراً اپنی رقم کو کسی محفوظ مقام پر منتقل کر دینا چاہتا ہے۔ میں نے اسے تمہارے متعلق بتایا تو وہ ہفتے کی شام کو ملاقات کے لیے تیار ہوگیا۔''

''ہفتے کو ٹورنامنٹ کے بعد میرے پاس بہ مشکل تمام کھانے کا وقت ہی بچتا ہے اور میں کھانے کو کام پر ترجیح دیتا ہوں۔'' فرینکلن نے انکار میں سر ہلایا۔

''تم کھانا ٹرائے کے فلیٹ پر بھی کھا سکتے ہو۔ وہ کافی فراخدل اور مہمان نواز انسان ہے۔ طعام بھی ہوجائے گا اور بینک کے متعلق اس کی بدظنی بھی دور ہوجائے گی۔''

فرینکلن سوچ میں پڑ گیا۔ پچاس ہزار ڈالرز اچھی خاصی بڑی رقم تھی۔ اگر بینک میں منتقل ہوجاتی تو اچھا خاصا فائدہ ہوسکتا تھا۔ اسے اپنی ترقی کے لیے ان دنوں ایک تگڑے اکاؤنٹ کی اشد ضرورت تھی۔ رات کے کھانے کی خیر تھی۔ وہ کچھ تاخیر سے بھی تناول کرلیتا تو مضائقہ نہیں تھا اس لیے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

''ٹھیک ہے۔ میں ملاقات کے لیے تیار ہوں لیکن یہ ملاقات مختصر ہوگی اور میں بات چیت کرنے کے فوراً بعد گھر چلا جاؤں گا۔''

ماریو نے اسے یقین دلایا کہ ٹرائے کا اکاؤنٹ اس کے اور بینک کے حق میں مفید ثابت ہوگا اور وہ کوشش کرے گا کہ فرینکلن کا وقت ضائع نہ ہو۔ اس طرح یہ ملاقات بہ احسن وخوبی اپنے اختتام کو پہنچی۔

کچھ دیر بعد فرینکلن اور بینک کا عملہ عمارت سے رخصت ہوگیا تب ماریو نے بیٹلی کو ساتھ لیا اور درمیانی کمرے کی طرف آگیا۔ یہاں کیشیئر، کلرک اور اکاؤنٹنٹ کے کاؤنٹر بالترتیب بنے ہوئے تھے۔ ان کے دائیں جانب بینک کا پچھلا دروازہ تھا۔ یہاں بیک یارڈ میں بینک کی گاڑی کھڑی تھی۔ وہ اس کے قریب جاتے ہوئے بولا۔

''میں نے اس کا تفصیلی معائنہ کیا ہے۔ ٹینکی پیٹرول سے

فل ہے۔ دھماکے سے پھٹنے کے بعد کچھ باقی نہیں بچے گا۔"

"ہفتہ وار تعطیل کی وجہ سے بینک بند ہوگا۔ انہیں یہاں بلائیں گے کیسے؟" بینفلی نے پوچھا۔

"فون کرکے۔" ماریو بولا۔ "بینک کا منیجر اتوار کے علاوہ تعطیل کو کسی بھی وقت منسوخ کرسکتا ہے۔ اگر خطیر رقم بینک میں منتقل ہونے کی امید ..... ہو تو عملے کو کام کے لیے بلالینا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ کیشیر رچرڈ کے پاس والٹ روم کی دوسری چابی موجود ہے۔ ہم رقم کو بیگ میں منتقل کریں گے اور کاغذوں سے بھرے ہوئے بیگ کے ہمراہ رچرڈ، بوبی اور ایلی کو گن پوائنٹ پر رکھتے ہوئے کار میں منتقل کرکے بڈسن ٹاؤن کے پہاڑ پر لے جاکر ان تینوں سمیت گاڑی کو نیچے دھکیل دیں گے۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ اس ڈکیتی میں ہم دونوں ملوث ہوسکتے ہیں۔ فرینکلن معمول بننے کے بعد پولیس کو بیان دے گا کہ رچرڈ، بوبی اور ایلی نے گن پوائنٹ پر رقم ہتھیانے کے بعد بینک کی گاڑی میں منتقل کی اور اسے گاڑی میں بٹھا کر پہاڑوں کی طرف لے آئے لیکن فرینکلن نے حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے گاڑی کا اسٹیئرنگ کھائی کی طرف موڑ دیا اور خود دروازہ کھولنے کے بعد گاڑی سے چھلانگ لگادی۔ اسے چند خراشیں آئیں لیکن بینک کا عملہ رقم کے ساتھ جل کر خاک ہوگیا۔"

"پولیس ہم سے پوچھ گچھ کرے گی کہ ڈکیتی کے دوران ہم کہاں تھے؟ ہم انہیں کیا جواب دے کر مطمئن کریں گے؟" بینفلی نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

"انہیں مطمئن کرنے کے لیے فرینکلن کا بیان ہی کافی ہوگا۔ رچرڈ، بوبی اور ایلی نے گن پوائنٹ پر جو بھی کیا، وہ بینک کے اندر جانے کے بعد کیا جبکہ ہم بینک کے باہر نگرانی کرتے رہے اس لیے ہمیں کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔ ہماری حیثیت تو اس بات کی بھی مجاز نہیں کہ ان سے یہ پوچھ سکتے کہ چھٹی ہونے کے باوجود بھی وہ بینک میں کیا کرنے آئے تھے اور اندر جانے کے بعد جو بھی ہوا، ہماری لاعلمی میں ہوا۔ انہوں نے کیسے والٹ روم کو کھولا اور کیسے رقم کو گاڑی کے اندر منتقل کیا پھر بیگ کو گاڑی میں ڈال کر کیسے پہاڑوں کی طرف گئے؟ ہم اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔"

"لیکن اس تمام کیے دھرے میں ایک قباحت ہے۔" بینفلی بولا۔ "رچرڈ کے پاس والٹ روم کی چابی موجود ہے۔ وہ فرینکلن کو اغوا کیے بغیر بھی والٹ روم کو کھول کر رقم کے ساتھ فرار ہوسکتا ہے پھر اسے اس تمام دردسری کی کیا ضرورت ہے؟"

"یہ نکتہ میرے دماغ میں بھی موجود ہے اس لیے میں نے فرینکلن کے بیان میں تبدیلی کردی ہے جس کے مطابق والٹ روم کی چابی صرف فرینکلن کے پاس تھی۔ اصولاً ہونا بھی ایسا ہی چاہیے۔" بینفلی نے اس دفعہ کوئی سوال نہیں پوچھا اور ماریو طویل سانس لیتے ہوئے بولا۔

"میرے خیال میں ہم تمام نکتوں پر نظرثانی کرچکے ہیں۔ تم گاڑی کے پچھلے دونوں دروازوں کے لاک خراب کردو۔ کوشش یہ کرنا، دروازے باہر سے کھل جائیں لیکن اندر سے انہیں کھولنا ممکن نہ ہوسکے۔" بینفلی نے اثبات میں سر ہلایا اور گاڑی کے دروازوں میں ردوبدل کرنے لگا۔

☆☆☆

ہفتے کی دوپہر ماریو نے رچرڈ، بوبی اور ایلی کو فون کیا کہ ہیڈ کوارٹر سے خطیر رقم ایک دن کے لیے بینک بھجوائی جارہی ہے اس لیے ان سب کی چھٹی کو وقتی طور پر منسوخ کردیا گیا ہے۔ وہ فوراً بینک آجائیں تاکہ وصولی کے بعد رقم کو والٹ روم میں منتقل کیا جاسکے۔ تینوں تلملا کر رہ گئے تاہم بولے کچھ نہیں اور پانچ بجے بینک آگئے۔ ان کے چہروں پر جھنجلاہٹ کے تاثرات تھے۔ ہال کمرے میں داخل ہونے کے بعد رچرڈ غصیلے لہجے میں بولا۔

"میں اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ ساحلی ریسٹورنٹ میں ڈنر کے لیے جانے والا تھا۔ میں نے جب اسے چھٹی منسوخ ہوجانے کے متعلق بتایا تو وہ نہایت برہم ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ میں بہانہ بنا رہا ہوں اور درحقیقت میری جیب میں رقم نہیں ہے۔"

بوبی بولا۔ "میں نے ہفتہ وار خریداری کے لیے ترتیا شاپنگ سینٹر جانا تھا۔ مجبوراً ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ اب شاید اگلے ہفتے تک مجھے ہمسائیوں سے مانگ کر گزارہ کرنا ہوگا۔"

"تم دونوں کی بہ نسبت میں گھر میں بور ہو رہا تھا۔" ایلی نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ "کام کے دوران میں خوش رہتا ہوں اور مجھے بوریت محسوس نہیں ہوتی۔" اس نے ماریو کی طرف دیکھتے ہوئے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔ "لیکن فرینکلن کہاں ہے..... اسے یہاں موجود ہونا چاہیے تھا؟"

ماریو اور بینفلی قریب کھڑے ان کی گفتگو سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ ماریو بولا۔ "وہ اپنے فلیٹ سے روانہ ہوچکا ہے۔ جلد یہاں پہنچ جائے گا۔"

"اور رقم کہاں ہے؟" رچرڈ نے پوچھا۔ "کیا بینک پہنچ گئی ہے یا پھر آنے کی امید ہے؟"

''کچھ نہیں کہہ سکتے۔'' ماریو نے جواب دیا۔ ''ہیڈ کوارٹر سے فون آیا تھا۔ شاید رات تک آجائے گی۔ انہوں نے حتمی طور پر کچھ نہیں بتایا۔'' وہ تینوں خاموش ہو گئے۔

بینک کے بیک یارڈ میں گاڑی تیار کھڑی تھی۔ صرف رقم کے ساتھ ان تینوں کو اس میں منتقل کرنا تھا۔ گزشتہ روز ماریو قریبی مارکیٹ سے سیاہ رنگ کے دو بیگ خرید لایا تھا۔ کاغذ کی گڈیاں بنانے میں اچھا خاصا وقت لگا۔ اب کاغذوں سے بھرا بیگ گاڑی کی پچھلی سیٹ کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ بینٹلی نے تفہیمی نگاہوں سے ماریو کی طرف دیکھا۔ اس نے جواب دینے کے بجائے جیب میں سے سروس ریوالور باہر نکالا اور سرد لہجے میں تینوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''میرے خیال میں وقت بہت ضائع ہو گیا۔ اب کچھ کام کی بات ہو جائے۔ فرینکلن کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں کہ تم تینوں کی چھٹی منسوخ کر دی گئی ہے۔ وہ تو گالف کھیلنے کے لیے گراؤنڈ کی جانب گیا ہوا ہے۔ ہم دونوں کو والٹ روم کی چابی درکار تھی اس لیے ہم نے فون کر کے تمہیں یہاں بلالیا۔''

''کہیں تم دونوں بینک میں ڈکیتی کے متعلق تو نہیں سوچ رہے ہو؟'' بوبی پریشان لہجے میں بولا۔ ''تو پھر مجھے اور ایلی کو یہاں بلانے کی کیا ضرورت تھی؟ والٹ روم کی چابی تو رچرڈ کے پاس ہے۔ تم اس سے حاصل کر سکتے ہو۔''

رچرڈ نے فوراً جیب سے چابی نکال کر ماریو کے ہاتھ پر رکھ دی اور ہراساں لہجے میں بولا۔ ''میں چند ڈالرز کے لیے اپنی جان کو خطرے میں نہیں ڈال سکتا۔ والٹ روم میں رکھی ہوئی رقم بیمہ شدہ ہے۔ بینک کو نقصان نہیں ہوگا۔ تم رقم نکال لو۔''

''اگر تم تینوں نے یوں ہی تعاون کیا تو ہم وعدہ کرتے ہیں کہ تمہیں نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ یہاں قریب رکھی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ جاؤ اور خبردار! کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش نہ کرنا۔'' بینٹلی مسکراتے ہوئے بولا۔

تینوں خاموشی کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ بینٹلی نے ماریو کے ہاتھ سے چابی لی اور والٹ روم کی طرف چلا گیا۔ والٹ روم کو کھولنے پر اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ وہاں رقم اس کی توقع سے کہیں زیادہ تھی۔ اسے بیگ میں منتقل کرنے کے دوران اسے یوں لگا جیسے ایک مزید بیگ قریبی مارکیٹ سے منگوانا پڑے گا لیکن یہ اس کی خام خیالی ثابت ہوئی اور رقم کھینچ تان کر بیگ میں آ گئی۔ اس تمام عمل کے دوران اس نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ کسی بھی جگہ اس کے ہاتھوں کے نشانات نہ رہنے پائیں۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے والٹ روم کے ہینڈل کو بھی اچھی طرح صاف کر دیا۔ ہال کمرے میں ماریو تینوں پر پستول تانے خاموش کھڑا تھا۔ بینٹلی کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ سب کچھ اتنی آسانی سے ہو جائے گا۔ بینک کا عملہ بھیگی بلی کی طرح ڈرپوک ثابت ہوا تھا۔ انہوں نے پس و پیش کرنے کی قطعاً کوشش نہیں کی۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد ماریو نے تفہیمی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے پُرجوش لہجے میں بتایا۔

''رقم توقع سے زیادہ ہے۔ اندازاً پندرہ لاکھ ڈالرز تو ضرور ہوگی۔''

''پندرہ نہیں، اٹھارہ لاکھ......'' رچرڈ درمیان میں بولا۔ ''چند دن قبل ہائی وے پر پیٹرول پمپ فروخت ہوا تھا اور فروخت سے حاصل ہونے والی رقم کو بینک میں منتقل کر دیا گیا۔ تم دونوں خوش نصیب ہو جو بیٹھے بٹھائے اتنی بڑی رقم کے مالک بن گئے تاہم اگر کچھ صبر کر لیتے تو ایک اور پیٹرول پمپ کی خرید و فروخت کی بات بھی جاری ہے۔ اس کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم بھی ہمارے بینک میں جمع ہونے کی توقع ہے۔''

رقم کے متعلق سن کر ماریو کے ہاتھ میں پکڑا ہوا ریوالور کانپ کر رہ گیا۔ ٹرائے کو ایک لاکھ ڈالرز دینے کے بعد بھی اس کے حصے میں ساڑھے آٹھ لاکھ ڈالرز آنے والے تھے۔ وہ اس رقم سے اپنا پیٹرول پمپ خرید سکتا تھا لیکن اتنی جلدی وہ منظر عام پر نہیں آنا چاہتا تھا۔ اسے چند سال احتیاط سے کام لینا تھا۔ بینٹلی نے بیگ کو بغل میں دبایا اور ماریو نے تینوں کو بیک یارڈ میں کھڑی ہوئی گاڑی کی طرف چلنے کے لیے کہا۔ وہ تینوں ان کے آگے چلتے ہوئے بیک یارڈ میں آ گئے۔ ماریو نے انہیں پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بینٹلی نے گیٹ کھول دیا۔ ہفتہ وار تعطیل کی وجہ سے سڑک سنسان پڑی تھی اس لیے ٹریفک بھی کم تھا۔ گاڑی کے گیٹ سے باہر نکلتے ہی بینٹلی نے گیٹ کو بند کیا اور ماریو کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھنے کے بعد اپنے ریوالور کا رخ ان تینوں کی طرف کر دیا۔ وہ پتھر کے بت بنے خاموش بیٹھے تھے۔ گاڑی اندرونی علاقے سے نکلنے کے بعد مین سڑک پر آ گئی اور تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔

چند لمحے خاموش رہنے کے بعد رچرڈ بولا۔ ''تمہیں اپنے چہروں کو چھپا لینا چاہیے۔ سیکیورٹی گارڈ ہونے کی وجہ

سے یہاں تمہیں سب جانتے ہیں۔ اگر کسی راہ گیر نے تم دونوں کو دیکھ لیا تو پولیس کو بتا سکتا ہے۔''

''ہم اس کے متعلق تم سے بہتر جانتے ہیں۔'' ماریو گاڑی کی رفتار کو مزید بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''لیکن ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔''

بینٹلی نے رقم والے بیگ کو اپنی گود میں رکھا ہوا تھا تب بھی وہ مطمئن نہیں تھا اور کچھ دیر بعد اسے دیکھ لیتا تھا۔ ان دونوں نے ہفتے کے دن کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ عام دنوں میں گاڑیوں کا رش سڑکوں پر زیادہ ہوتا تھا۔ ہفتے کی شام کو صرف وہی افراد باہر نکلتے تھے جنھوں نے خریداری کرنا ہوتی تھی۔

گاڑی شہر سے باہر آ گئی۔ ایلی نے پریشان لہجے میں پوچھا۔ ''تم کیا کرنے والے ہو؟ رقم تمہیں مل گئی ہے اور اب ہم تمہارے لیے بے کار ہیں تو پھر ہمیں جانے دو۔''

''ایسے کیسے جانے دیں۔'' ماریو مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تم ہمارے لیے آڑ ہو۔ دوسرے معنوں میں یرغمال بھی کہہ سکتے ہو۔ اگر ہمیں کسی نے نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو تم تینوں کے وجود ایک ڈھال کی طرح ہمیں اپنے پیچھے چھپالیں گے۔ تاہم تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ کسی محفوظ مقام تک پہنچنے کے بعد ہم تمہیں رہا کر دیں گے۔'' اس نے گاڑی پہاڑ کے اوپر جانے والے راستے پر موڑ دی۔

پیچھے بیٹھے ہوئے تینوں افراد کے چہروں پر تشویش کے تاثرات پیدا ہوئے۔ یہ راستہ پہاڑ کی چوٹی پر جا کر اختتام پذیر ہوجاتا تھا۔ وہاں کوئی ایسا محفوظ مقام نہیں تھا جہاں وہ رقم کے ساتھ چھپ سکتے لیکن اس بار انہوں نے کچھ پوچھنے کی کوشش نہیں کی۔ گاڑی میں گمبھیر خاموشی طاری ہوگئی۔

چوٹی پر پہنچنے کے بعد ماریو نے گاڑی کو ایک ایسے مقام پر روک دیا جہاں سڑک ختم ہو رہی تھی اور نیچے گہری کھائی دکھائی دے رہی تھی۔ یہاں سے اگر ایکسلریٹر کو دبایا جاتا تو گاڑی قلابازیاں کھاتے ہوئے نیچے چلی جاتی۔ ماریو نے بینٹلی کو اشارہ کیا۔ وہ رقم والے بیگ کو لے کر نیچے اتر گیا۔ رچرڈ، ایلی اور بوبی کے چہروں پر تذبذب کے تاثرات پیدا ہوئے۔ انہیں اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہیں آئی کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ بینٹلی کے نیچے اترتے ہی ماریو نے ایکسلریٹر پر پاؤں رکھ دیا۔ گاڑی آگے کی طرف بڑھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور اپنے آپ کو پتھروں پر گرا دیا۔ اسے اپنے پیچھے رچرڈ، ایلی اور بوبی کے چیخنے چلّانے کی آوازیں سنائی دیں پھر یکدم خاموشی طاری ہوگئی۔ وہ پتھروں پر کاندھے کے بل گرا۔ اسے شدید تکلیف کا احساس ہوا اور وہ لڑھکتا ہوا دور تک چلا گیا۔ بینٹلی قریب ہی کھڑا تھا۔ وہ بھاگ کر اس کے قریب آ گیا اور پُرتشویش لہجے میں پوچھنے لگا۔

''تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟ میں مدد کروں؟'' ماریو کپڑے جھاڑتے ہوئے اٹھ کر کھائی کی طرف آ گیا۔ اسی اثنا میں زوردار دھماکا ہوا۔ شعلے کافی اوپر تک آئے۔ ماریو نے نیچے جھانک کر دیکھا، گاڑی میں آگ لگ گئی تھی اور کالا دھواں تیزی کے ساتھ اردگرد پھیلتا جا رہا تھا۔ دونوں پھرتی کے ساتھ کھائی میں اترنے لگے۔ وہاں کوئی معقول راستہ نہیں تھا۔ اونچے نیچے پتھر اور جھاڑیاں تھیں جن کو پھلانگنا آسان نہیں تھا۔ انہیں نیچے اترنے میں آدھا گھنٹا لگ گیا۔ اس وقت تک گاڑی اچھی طرح جل کر راکھ ہو چکی تھی۔ اس علاقے میں مستقل آبادی نہیں تھی۔ دور دور تک خشک پہاڑوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ رچرڈ، بوبی اور ایلی کی لاشیں گاڑی کے اندر بند تھیں اور کاغذوں سے بھرا ہوا بیگ بھی جل کر خاکستر ہو گیا تھا۔ ان دونوں نے تنقیدی نگاہوں سے گاڑی کا جائزہ لیا پھر متبادل راستے کا انتخاب کرتے ہوئے سڑک پر آ گئے۔ کچھ دور آگے جانے پر انہیں بس مل گئی اور وہ طویل سفر طے کرنے کے بعد قصبے میں پہنچ گئے۔

جہاں بس نے انہیں اتارا، وہاں سے ولسن روڈ زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ پیدل چلتے ہوئے ٹرائے کے فلیٹ کی طرف آ گئے۔ دروازے پر سالخوردہ تالا لگا ہوا تھا۔ یہ ناممکن بات تھی۔ آدم بیزار پروفیسر فلیٹ سے باہر جا ہی نہیں سکتا تھا تاہم یہ ہوسکتا تھا کہ اس کی شراب کا کوٹا ختم ہو گیا ہو اور وہ قریبی شراب ڈیلر کے پاس شراب لینے گیا ہو لیکن ماریو نے فلیٹ سے رخصت ہوتے ہوئے کچن میں جھانک کر دیکھا تھا۔ وہاں بوتلوں کا پورا کریٹ رکھا ہوا تھا۔ بات کچھ اور ہی تھی۔ اس نے ساتھ والے فلیٹ پر دستک دی۔ ایک پچیس سالہ لڑکی نے دروازہ کھولا اور تفہیمی نگاہوں سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔

ماریو نے نرم لہجے میں پوچھا۔ ''آپ کے ساتھ والے فلیٹ پر تالا لگا ہوا ہے۔ ہمیں اس کے رہائشی سے چند معلومات درکار ہیں۔ کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ وہ کہاں گیا ہے؟''

''کچھ دیر پہلے وہ شراب نوشی کی وجہ سے سیڑھیوں سے نیچے جا گرا۔ اس کے سر پر چوٹ آئی۔ فلیٹ کے رہائشی

اسے قریبی اسپتال لے گئے ہیں۔'' لڑکی نے افسوس بھرے لہجے میں بتایا۔

ماریو نے پریشان نگاہوں سے بینٹلی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی کچھ کم پریشان نہیں تھا۔ ساڑھے سات بجنے والے تھے۔ فرینکلن آٹھ بجے رات کا کھانا کھاتا تھا۔ ان دونوں کے پاس صرف آدھے گھنٹے کا وقت باقی تھا تاہم دیر سویر کی صورت میں طعام کو نو بجے تک ملتوی بھی کیا جا سکتا تھا۔ جو بھی تھا، انہیں آج رات فرینکلن کو معمول بنانے کے بعد بیان کے لیے تیار کرنا تھا اس لیے عجلت کے عالم میں لڑکی سے اسپتال کا ایڈریس معلوم کرنے کے بعد عمارت سے باہر آگئے۔ وقت کم ہونے کی وجہ سے انہوں نے بس میں جانے کے بجائے ٹیکسی کا انتخاب کیا۔ اسپتال وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ جلد وہاں پہنچ گئے۔ اس اثنا میں ٹرائے کو وارڈ میں منتقل کر دیا گیا۔ وارڈ بوائے نے ان دونوں کو اندر جانے سے روک دیا۔ ڈاکٹر کا کمرا قریب تھا۔ وہ ان دونوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کا اکاؤنٹ بینک میں تھا اور وہ اکثر و بیشتر فرینکلن سے ملاقات کے لیے بینک میں آتا جاتا رہتا تھا۔ یہ جان پہچان ان دونوں کے حق میں خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے وہ ملاقات کے لیے ڈاکٹر کے کمرے میں آگئے۔ اس نے تفہیمی نگاہوں سے دونوں کی طرف دیکھا۔

ماریو نے ٹرائے کے متعلق دریافت کیا تو ڈاکٹر نے بتایا۔ ''اس کی حالت اب قدرے بہتر ہے لیکن دماغ پر لگنے والی چوٹ کی بدولت آنکھوں کی بینائی چلی گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ واپس آجائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے اندھا ہو جائے۔ اس کے متعلق قبل از وقت حتمی طور پر کچھ کہنا ممکن نہیں۔'' ماریو اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر قریبی بینچ پر بیٹھ گیا۔ بینٹلی ہکا بکا قریب ہی کھڑا تھا۔ ان کے تمام منصوبے پر پانی پھر گیا تھا۔ عنقریب جب پولیس بینک کا رخ کرتی تو تمام عملے کے متعلق جانچ پڑتال کے بعد ان دونوں کی حیثیت ابھر کر سامنے آجاتی اور انہیں معلوم ہو جاتا کہ وہ دونوں جیل سے رہا ہونے والے مجرم ہیں جو قتل کی سزا بھگت کر کچھ عرصہ قبل ہی رہا ہوئے ہیں۔ اس کے بعد معاملے کو کھل کر سامنے آنے سے کوئی بھی روک نہیں سکتا تھا۔ تاہم اب بھی وہ فرار ہو کر پولیس کی پہنچ سے دور جا سکتے تھے۔ رقم ان کے پاس محفوظ تھی۔ وہ اسے اپنے حق میں استعمال کر کے حالات کو موافق کر سکتے تھے۔

ڈاکٹر ان سے ٹرائے کے متعلق پوچھ رہا تھا۔ دونوں نے کوئی جواب نہیں دیا اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔ دروازے کے بالکل سامنے پولیس انسپکٹر کھڑا تھا جس کے ساتھ بینک کا منیجر فرینکلن بھی تھا۔ فوراً سے بیشتر ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں اور رقم کا بیگ بینٹلی سے لے کر فرینکلن کو دے دیا گیا۔ ان دونوں کے کچھ پوچھنے سے پہلے فرینکلن نے طنزیہ لہجے میں بتایا۔

''چند دنوں سے ایک پیٹرول پمپ کی خرید و فروخت کی بات چیت چل رہی تھی۔ کل رات کو بات چیت فائنل ہو گئی اور پیٹرول پمپ کے مالک نے کچھ دیر قبل مجھے فون کر کے اپنی رقم بینک میں منتقل کرنے کے متعلق بتایا۔ میں نے رچرڈ کو فون کیا۔ وہ فلیٹ میں نہیں تھا اس لیے میں بینک چلا گیا اور مجھے ڈکیتی کے متعلق قبل از وقت معلوم ہو گیا۔''

ماریو کو یاد آیا کہ رچرڈ نے کچھ دیر پہلے ہی اسے بتایا تھا کہ ایک اور پیٹرول پمپ کے فروخت ہونے کی بات چیت چل رہی تھی اور عنقریب اس کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم کو بھی بینک میں منتقل کیے جانے کی توقع تھی۔ اسے فرینکلن کی آواز سنائی دی۔

''میں نے جب بینک میں قدم رکھا تو والٹ روم کا دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا اور تم دونوں غائب تھے۔ میں نے پولیس کو فون کیا تب مجھے ولسن روڈ پر رہنے والے پروفیسر سے ملاقات کے متعلق یاد آیا۔ میں نے انسپکٹر کو اس کے متعلق بتا دیا اور ہم ولسن روڈ والے فلیٹ کی طرف آگئے۔ وہاں سے ہمیں معلوم ہوا کہ حادثے کی وجہ سے پروفیسر کو اسپتال منتقل کر دیا گیا ہے۔ ہمیں یہ توقع نہیں تھی کہ یہاں ہماری ملاقات تم دونوں سے ہو جائے گی۔ ہم تو پروفیسر کی خیریت معلوم کرنے کی نیت سے یہاں آئے تھے۔ غیر متوقع طور پر تم سے ملاقات ہو گئی۔''

ماریو اور بینٹلی نے بے چارگی کے عالم میں سر جھکا لیا۔ اب وہ تین افراد کے قاتل بن چکے تھے اور یہ سوچ بعید از قیاس نہیں تھی کہ اس بار ان دونوں کو گیس چیمبر کی سزا سنا دی جاتی۔ انسپکٹر نے انہیں گاڑی کی طرف چلنے کے لیے کہا اور وہ بوجھل قدموں کے ساتھ باہر کی طرف چل دیے۔

⌘⌘⌘

دھوپ میں بارش

ناہید سلطانہ اختر

دھوپ اور بارش کا کھیل ہو یا قسمت کی چال... بات برابر... کیونکہ کچھ خبر نہیں کب موسم کے تیور بدل جائیں اور برستی برکھا میں دل کے سارے داغ دُھل جائیں... وہ جو قدم قدم پر زخم کھا رہی تھی اور پل پل بدلتے حالات سے خوفزدہ تھی... ایک روز گرجتے بادلوں کے بیچ برستی رحمت نے کچھ اس طرح اس کے سارے انسو بھی اپنے دامن میں چھپا لیے کہ تمام دکھوں کا مداوا ہوگیا... بے شک گزرا ہوا کوئی بھی لمحہ لوٹ کر نہیں آتا مگر... موسم پلٹ کر ضرور اتے ہیں اور امید کی کونپل مردہ دلوں کو پھر سے زندگی کی نوید دیتی ہے... جیسے اس کی زندگی کی تیز دھوپ مین اچانک خوشیوں کی برسات ہوئی اور اس کے بکھرے خوابوں کو جیسے تعبیر مل گئی...

ٹوٹے دلوں اور بجھے چراغوں کو پھر سے روشن کرنے والی حسینہ کے عزائم اور حوصلوں کی مثال

عجیب شخص تھا...... شکی، وہمی اور تشدد پسند۔

عارفہ کے لیے اس کا رشتہ ایک محلے دار خاتون برجیس آپا نے بتایا تھا۔ امی نے ان دنوں اس کے لیے ضرورتِ رشتہ کا ڈول ڈال رکھا تھا۔ جس سے ملتیں، یہ کہنا نہ بھولتیں کہ عارفہ کے لیے کوئی رشتہ بتاؤ۔ برجیس آپا نے امی سے اس رشتے کا ذکر کچھ اس طرح کیا۔ "میری دیورانی کے پڑوس میں رہتے ہیں۔ اچھے لوگ ہیں۔ باپ برسوں پہلے مر چکے۔ ماں نے بچوں کو ماں ہی نہیں، باپ بھی بن کر پالا۔ چھ بہنیں، تین بھائی...... بس آخری بہن رہ گئی ہے بیاہنے کو۔ بھائیوں میں یہ لڑکا ہی سب سے بڑا ہے۔ تیس بتیس کا ہے۔ بہت شریف، کوئی دوستی یاری نہیں...... نوکری اور گھر...... ماں بہنیں چاہتی ہیں کہ سب سے آخری بہن کی شادی ہونے سے پہلے اس کی شادی ہوجائے تاکہ گھر سنبھالنے والی گھر میں ہو۔ ماں بوڑھی ہے، گھر سنبھالنے کے لائق نہیں۔"

"عارفہ ابھی چوبیسویں میں لگی ہے۔ تم بتا رہی ہو، وہ تیس بتیس کا ہے۔" امی نے کہا۔

"ارے تو کیا ہوا...... ایسا کون سا کوئی لمبا چوڑا فرق ہے...... اور لڑکے کی عمر تھوڑی، اس کی شرافت اور روزگار دیکھا جاتا ہے۔ پکی ملازمت ہے۔ نوکری پکی ہو تو کھڑے بھی چڑھتی ہے، پڑے بھی چڑھتی ہے۔"

"بچوں سے مشورہ کرلوں۔" امی بولیں۔

"ہاں، ہاں...... ضرور کرو۔"

عارفہ کے دو بھائی تھے، دو بہنیں۔ عارفہ بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی اور گھر بھر کی لاڈلی تھی۔ بڑی بہنیں اور بھائی سب شادی شدہ تھے۔ عارفہ اور اس کی امی بڑے بیٹے کے ساتھ رہتی تھیں۔ چھوٹا بیٹا اپنے بال بچوں کے ساتھ کینیڈا میں مقیم تھا۔ عارفہ اور اس کی امی اس کے بلانے پر ایک مرتبہ کینیڈا جا چکی تھیں۔ عارفہ کی شادی کے لیے وہاں بھی کافی کوشش کی گئی مگر خدا کو منظور نہ ہوا۔ امی اور عارفہ جیسے گئی تھیں، ویسے ہی واپس آگئیں۔

برجیس آپا کے بتائے رشتے کو جانچ پڑتال کے لیے مدعو کرلیا گیا۔ لڑکا اپنی ماں بہنوں کے ساتھ عارفہ کے گھر آیا۔ بلند قامت اور مناسب شکل صورت کا حامل تھا۔ گریجویٹ تھا، پکی ملازمت تھی۔ عارفہ کے ساتھ پرفیکٹ نہ سہی، مناسب جوڑ کا لگتا تھا۔

عارفہ دراز قامت، خوبرو اور نکھری رنگت کی لڑکی تھی۔ یونیورسٹی میں چار سالہ تعلیم حال ہی میں مکمل ہوئی تھی۔ ماں، بہنوں سے سلیقہ، نفاست اور شائستگی سیکھ رکھی تھی۔ فنونِ لطیفہ سے اسے خصوصی رغبت تھی۔ فارغ اوقات میں شعراء کا کلام پڑھتی، موسیقی سنتی، پھول گھڑتی، تصویر کشی کرتی اور مجسمہ سازی کرتی۔ گھر کے نزدیک ہی واقع فنونِ لطیفہ سکھانے والے ایک ادارے کی موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے گل سازی، مصوری اور مجسمہ سازی کے کورسز کر رکھے تھے۔

لڑکا اور اس کی ماں بہنیں عارفہ کے گھر والوں کے دل کو لگے۔ بس عمر لڑکے کی تھوڑی سی زیادہ تھی مگر باقی سب ٹھیک تھا۔ رشتہ منظور ہوگیا۔ منگنی ہوگئی اور دونوں طرف شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ دونوں گھرانوں میں روز بہ روز راہ و رسم بھی بڑھنے لگی۔ عارفہ اپنے گھر کی آخری لڑکی تھی تو لڑکا اپنے گھر کا سب سے بڑا بیٹا۔ دونوں گھرانوں میں شادی کے لیے غیر معمولی جوش و خروش تھا۔ عارفہ کے کینیڈا میں مقیم بھائی نے بھی اپنی فیملی کے ساتھ بہن کی شادی میں شرکت کی تیاری کر رکھی تھی۔ شادی کے اخراجات کے لیے اس نے بھاری رقم اپنی آمد سے پہلے ہی بھجوا دی تھی۔ بڑا بھائی بھی بہن کو شاندار طریقے سے رخصت کرنے میں پیچھے نہ تھا۔ گھر والے چاہتے تھے کہ عارفہ کے جہیز میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔

شادی سے دو ہفتے قبل عارفہ کا چھوٹا بھائی اور اس کے بال بچے بھی کینیڈا سے پاکستان آگئے۔

شادی نہایت دھوم دھام سے ہوئی۔ عارفہ رخصت ہوکر سسرال آگئی جہاں اس کے سسرال والوں نے ایک نہیں، کئی رسمیں نہایت جوش و خروش سے ادا کیں۔ عارفہ کے پاؤں دودھ سے دھلائے گئے اور بالآخر اسے آراستہ و پیراستہ کمرائے عروسی میں اس کی سیج پر پہنچا دیا گیا جہاں پہلی رات ہی سے اس کے لیے ایک دورِ ابتلا شروع ہوا۔

☆☆☆

حجلۂ عروسی کے مصنوعی پھولوں کی لڑیاں ہٹا کر وہ اس کے نزدیک آ بیٹھا تھا۔ عارفہ کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور سانسیں اتھل پتھل ہونے لگیں۔ اس نے بیڈ سائڈ بورڈ پر رکھی مخملیں ڈبیا جو کچھ دیر قبل اس کی بہن وہاں رکھ گئی تھی، اٹھائی اور اس میں سے ایک انگوٹھی نکال کر اس کے دائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی میں پہنا دی۔ عارفہ کا سر جھکا ہوا تھا، نظریں نیچی تھیں۔ وہ سرک کر اور نزدیک ہوگیا اور اس کی ٹھوڑی اپنے ہاتھ کی انگلیوں اور انگوٹھے کے درمیان دبوچ کر اس کا چہرہ اونچا کردیا۔ وہ شرمانے لگی۔

"کسی سے دوستی رہی ہے؟"

سہاگ رات کو یہ کیسا عجیب سوال تھا جو قدرے

توقف سے دہرایا بھی گیا۔

''تبسم میری بیسٹ فرینڈ ہے۔'' اس نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

''میں لڑکی کی بات نہیں کر رہا ہوں۔''

عارفہ نے بے ساختہ ہڑبڑا کر اسے دیکھا۔ وہ نہایت معنی خیز انداز میں مسکرا دیا پھر بولا۔ ''کسی لڑکے سے رہا ہے یارانہ؟''

عارفہ کو اپنی سانس ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔

''بولو...... چپ کیوں ہو؟''

وہ گنگ تھی۔

''جواب دو۔''

عارفہ نے اپنے چہرے کا رخ دوسری طرف پھیر لیا۔

''رہی تو ہوگی...... ڈیجیٹل زمانہ ہے...... ہر ہاتھ میں موبائل ہے۔ کسی نہ کسی سے تو تعلق رہا ہوگا؟''

''میں اس قسم کی لڑکی نہیں ہوں۔'' وہ ہمت کر کے دھیرے سے بولی۔

''میں مان ہی نہیں سکتا۔'' اس نے عارفہ کی کلائی اپنے ہاتھ میں بری طرح جکڑ لی۔

وہ بظاہر چپ تھی مگر اندر طوفان امڈا ہوا تھا۔

''کون تھا وہ؟''

''کوئی نہیں۔'' اس نے کچھ ناگواری سے کہا۔

''نخرہ نہیں چلے گا میرے سامنے۔'' اس نے بری طرح اس کی کلائی جھٹکتے ہوئے کہا۔

یہ کیسی سہاگ رات تھی!

''ایک ہی تھا یا......؟''

عارفہ کو سانس لینا دوبھر ہوا۔

''جواب دو۔''

''کوئی نہیں تھا۔''

''کوئی تو ہوگا...... نام کیا تھا اس کا؟''

عارفہ کو ذلت کا احساس ہونے لگا۔

''تمہارا کوئی رشتے دار تھا یا محلے کا؟''

''کوئی نہیں تھا۔'' وہ زچ ہو گئی۔

''جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں۔''

وہ روہانسی ہو گئی۔ ''آپ کو یقین کیوں نہیں آرہا؟''

''کیونکہ یہ یقین کرنے کا زمانہ نہیں۔ چار پانچ لڑکیاں تو اس وقت بھی میری جیب میں پڑی ہیں۔''

وہ دم بخود رہ گئی۔

''اب بولو۔'' اس کے لہجے میں فتح مندی تھی۔

''کیا بولوں؟'' اس نے دل شکستگی سے کہا۔

''میں مان ہی نہیں سکتا کہ آج کے دور میں کسی لڑکی کی کسی لڑکے سے دوستی نہ رہی ہو...... بائی دی وے نام کیا تھا اس کا؟''

''کچھ نہیں۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کچھ نام نہ ہو اس کا۔''

کمرے سے باہر ڈھولک پر تھاپ پڑنے لگی تھی۔ اللہ جانے کس کو رات کے اس سمے ڈھولک بجانے کی سوجھی تھی۔

عارفہ کا جی بھر آیا۔ سسرال پہنچنے پر مختلف رسموں کی ادائیگی کا مرکز بنی وہ کتنی نہال تھی۔ وہ گویا شمع محفل تھی اور سب پروانوں کی طرح اس پر نثار ہوئے جا رہے تھے مگر اس وقت اپنے حجلۂ عروسی کی زرتار لڑیوں کے بیچ بیٹھی وہ خود کو کتنا دل برداشتہ پا رہی تھی۔ سہاگ رات کو بھلا یوں ہوتا ہے جیسے اس کا خدائے مجازی کر رہا تھا۔

وہ رونے لگی۔

''کیا یاد آ گیا وہ؟'' اس نے ایک اور تیر چلایا۔

''کیوں شک کر رہے ہیں آپ مجھ پر۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''کیونکہ میرے نزدیک کوئی لڑکی قابلِ اعتبار نہیں۔''

''ایسی بے اعتباری تھی تو شادی کیوں کی؟''

''ضروری تھی ورنہ لوگ مجھ پر شک کرتے۔''

اس کا جی چاہا حجلۂ عروسی سے نکل بھاگے اور باہر جا کر اس کے گھر والوں سے کہے...... مجھے اپنے گھر واپس پہنچا دو...... مگر ایسا کرنا بھی تو آسان نہیں تھا۔ ہزاروں کہانیاں بنتیں اور اس سمیت سارے گھر والے دنیا کو منہ دکھانے کے لائق نہ رہتے۔ معتوب تو لڑکی ہی ٹھہرتی ہے۔

''اچھا، اس وقت تو چھوڑتا ہوں پھر بات کریں گے اس موضوع پر۔'' وہ احسان جتانے والے انداز میں بولا۔

گویا پھر بھی بات ہونا تھی۔

☆☆☆

اگلی صبح اس کے گھر والے حسب روایت ناشتا لے کر آئے تو وہ اندر سے بہت مضطرب تھی۔ گزشتہ شب اس نے کہا تھا پھر بات کریں گے۔ وہ یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھی کہ اپنے گھر والوں کو بتائے یا نہ بتائے۔ ان سب کو خوش دیکھ کر اس کی ہمت نہ ہوئی کہ انہیں ناخوش کرے۔ شام کو ولیمہ تھا اور وہ جانتی تھی کہ ولیمے کی تقریب میں شرکت کے لیے اس کے میکے والوں نے برات سے بھی بڑھ کر تیاری کر رکھی تھی۔ اس تیاری کو تاراج کرنے کی ہمت نہ ہوئی اسے۔ سب بہت خوش تھے، اسے بھی خوش دکھنا پڑا۔

رات کو تقریب ولیمہ سے واپسی پر اس نے پھر وہی سوال کیا۔ ”اب بتاؤ کس کس سے دوستی رہی ہے تمہاری؟“

کس کس سے!

گزشتہ شب تو اس نے پوچھا تھا کسی سے دوستی رہی ہے تمہاری اور آج وہ پوچھ رہا تھا، کس کس سے دوستی رہی ہے تمہاری؟ کیا سمجھ رہا تھا وہ اسے..... فلرٹ!

”کسی سے بھی نہیں۔“ وہ اسے گھائل نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”زیادہ تڑپنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ اس کا بازو دبوچ کر بولا۔ اس کے ہاتھ کی سختی نے عارفہ کو سسکاری بھرنے پر مجبور کر دیا۔

”سیدھی طرح نہیں بتاؤ گی تو مجھے قبولوانا آتا ہے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غرایا۔

”کیا بتاؤں؟“ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”اپنے یاروں کے نام۔“

اسے سخت تذلیل محسوس ہوئی۔

”کوئی نہیں تھا۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

”کوئی تو ہوگا یار!“ اس نے چمکارا۔

”کوئی نہیں۔“

”کیسے یقین کرلوں کہ تم جیسی خوبصورت بلا کا کوئی چاہنے والا نہ ہوگا۔ آج کل تو معمولی شکل وصورت والیاں بھی ایک بغل میں، ایک جیب میں ڈالے پھرتی ہیں۔ شادی شدہ مردوں سے دوستی گانٹھ کر پیسے اور تحفے اینٹھتی ہیں۔ یونیورسٹی فیلوز اور کولیگز کے ساتھ گھومتی پھرتی اور گلچھرے اڑاتی ہیں۔ کیسے مان لوں کہ تمہاری کسی سے دوستی نہ رہی ہو۔“

وہ بولتا گیا اور عارفہ کا اپنے جبڑوں پر دباؤ بڑھتا گیا۔

”چپ کیوں ہو..... بتاؤ۔“

اس کی چپ نہ ٹوٹی۔

”بتاتی ہو یا.....“ اس نے نہایت بے رحمی سے عارفہ کی کلائی دبوچ لی۔

”آہ!“ عارفہ نے سسکی بھری۔

”بولو۔“ وہ غرایا۔

”کیا بولوں؟“ عارفہ کو خود اپنی آواز بہت دور سے آتی لگی۔

”ایکس وائی زیڈ..... کوئی تو ہوگا؟“

”میں..... میں قسم کھا کر کہتی ہوں، کوئی نہیں تھا۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

”بکواس مت کرو۔ نہ مجھے تمہاری قسم کا اعتبار ہے، نہ میں تمہارے ان آنسوؤں سے پسیجوں گا۔“ اس نے اپنی انگشت شہادت اس کی ایک آنکھ کے کاسہ میں گھونپتے ہوئے کہا۔ وہ تکلیف کی شدت سے بلبلا گئی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”تمہیں بتانا ہوگا..... قبولنا ہوگا۔“ وہ غرایا۔

وہ رونے لگی۔

اس نے اس کے بال پوری قوت سے اپنی مٹھی میں جکڑ لیے۔

”اوہ..... اُف!“

”ڈرامے بازی کی ضرورت نہیں..... سمجھیں۔“

”مجھے واپس بھیج دیں۔“ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر گڑگڑائی۔

”کہاں؟ کہاں بھیج دیں..... یاروں کے ساتھ رات رات بھر فون پر لگے رہنے کو؟“ اس نے نہایت حقارت سے اسے دیکھا۔

”نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں تھی۔“

”سوچ لو۔“

”کیا؟“

”جھوٹ بولنے کا انجام..... کھڑے کھڑے فارغ کروں گا اور ساری دنیا کے سامنے تمہیں ننگا کر دوں گا۔ بتا دوں گا سب کو کہ تم تو شادی سے پہلے ہی خراب تھیں۔“

”نہیں..... پلیز.....!“ وہ ایک بار پھر ہاتھ جوڑ کر گڑگڑائی۔

وہ ہنسا۔ ”آ رہی ہو نا لائن پر..... کس سے تھا چکر؟“

اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یہ کیسی شادی تھی جو اسے خوشی کے بجائے آزار پہنچا رہی تھی اور کیسا شوہر ہے جو اس کے پندار کو خاک آلودہ کر دینے کے درپے تھا۔ وہ تو بڑی صاف ستھری سی لڑکی تھی۔ اپنے والدین کی آخری اولاد ہونے کی وجہ سے اسے ماں باپ اور بڑے بھائی بہنوں کی طرف سے اتنی توجہ، اتنی محبت ملی تھی کہ اسے اِدھر اُدھر دیکھنے اور بھٹکنے کی ضرورت ہی نہ ہوئی تھی۔ توجہ اور محبت کی تلاش میں بھٹکتا وہ ہے جسے محرومی رہی ہو۔ اپنی ماں کی تو وہ جان تھی۔ میری گڑیا کہا کرتی تھیں وہ اسے۔ رات کو انہی کے پاس سوتی تھی، ان کے سینے سے لگ کر۔ اسے بھلا رات کو کسی کے ساتھ فون پر لگے رہنے کی کیا ضرورت تھی۔ اسی لیے اسے اپنے فون پر کبھی پاس ورڈ لگانے کی ضرورت نہ رہی تھی۔ ہمیشہ کھلا رہتا، دعوتِ عام رہتی۔ گھر والوں میں سے جس کے فون کا بیلنس ختم ہو جاتا، اس کا فون استعمال کر لیتا۔ یہ بات نہیں کہ اس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھے تھے یا

کسی نے کبھی اسے پسندیدگی کی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ خاندان میں، خاندان سے باہر اور یونیورسٹی میں بھی کئی تھے جنہوں نے اسے چاہت کی نظروں سے دیکھا تھا مگر اس کے پلو میں امی کی یہ نصیحت بندھی رہی تھی کہ لڑکی کو صبر سے اس آدمی کا انتظار کرنا چاہیے جس کے ساتھ اللہ نے روزِ اول اس کا نصیب باندھ دیا ہوتا ہے۔ اسی میں اس کی اپنی عزت ہوتی ہے اور اس کے گھر والوں کی بھی...... مگر اس کے صبر اور انتظار کا انجام کس قدر روح فرسا تھا۔

یہ آزمائش تھی یا کچھ اور؟

☆☆☆

اگلے روز وہ میکے گئی تو امی نے اس کی اور عمیم کی خوب بلائیں لیں۔ سات عدد سرخ مرچیں اور تھوڑا سا نمک مٹھی میں دبا کر دونوں کی نظر اتاری۔ بھائی، بہنوں اور بھابیوں نے ان دونوں کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ عمیم تمام وقت انسان بنا بیٹھا رہا۔ سب سے اس طرح بات چیت کی کہ وہ اس کے گرویدہ ہو گئے۔

''اچھا لڑکا ہے گڑیا! اس کی قدر کرنا۔'' امی نے آہستہ سے اس سے کہا۔

کتنا اچھا تھا، وہی جانتی تھی۔

''بااخلاق ہے عارفہ! ایک دو دن میں ہی ہم لوگوں سے ایسے گھل مل گیا ہے جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔'' بڑی آپا بولیں۔

وہ انہیں کیسے بتاتی کہ ایک دو دن میں اس نے اس کی کتنی تذلیل کر دی تھی۔ دیوار سے لگا دیا تھا اسے۔

کینیڈا والے بھائی محسن نے اسے عارفہ کے ساتھ کینیڈا آنے کی یوں دعوت دی جیسے کراچی سے لاہور آنے کو کہہ رہے ہوں۔

''آپ کو نیاگرا فال دکھائیں گے۔'' محسن بھائی بولے۔

''سنا ہے وزیٹرز ویزا ابھی مشکل سے ملتا ہے؟'' عمیم نے کہا۔

''جب اللہ چاہے تو ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے۔'' بھائی نے حوصلہ بڑھایا۔

''ان شاء اللہ! کوشش کریں گے۔''

''دونوں کی ویزا پروسیسنگ فیس، ٹکٹس اور باقی سب کچھ میرے ذمے۔'' محسن بھائی نے اپنا ہاتھ عارفہ کے سر پر رکھتے ہوئے مزید کہا۔ ''عمیم! یہ ہماری سب سے چھوٹی اور لاڈلی بہن ہے۔ میں تو اسے اپنی بیٹی سمجھتا ہوں اور اس کی وجہ سے آپ بھی ہمیں پیارے ہو گئے ہو۔''

عارفہ کا جی بھر آیا۔ محسن بھائی کو کیا معلوم کہ جس شخص کو وہ اتنی تکریم دے رہے تھے، اس نے محض دو دن میں اس سے کتنی بدسلوکی کی تھی۔ اس کے پندار کو مٹی میں رول دیا تھا۔

☆☆☆

اگلے چند دن اور اذیت ناک تھے۔ لوگوں کے سامنے وہ انسان بنا رہتا مگر صرف اس کی موجودگی میں وہ اسے چبھتی ہوئی شکی نظروں سے دیکھتے ہوئے ایسے ایسے سوالات کرتا کہ وہ تلملا کر رہ جاتی۔

کہاں کہاں گھومتی پھرتی رہی ہو اپنے یاروں کے ساتھ؟

کیا کیا تحفے ملتے تھے، تمہیں اپنے چاہنے والوں کی طرف سے؟

موبائل میں بیلنس تو مفت لوڈ ہو جاتا ہوگا؟

رات کو کتنے بجے تک باتیں ہوتی تھیں؟

تمہارے گھر والوں کو تو پتا ہوگا سب؟

کینیڈا گئی تھیں، وہاں بھی کسی سے دعا سلام ضرور رکھی ہوگی۔

تمہارے بھائی نے تمہارے لیے کینیڈا ہی میں کوئی رشتہ کیوں نہیں دیکھ لیا؟

یونیورسٹی میں تو ضرور دوستیاں رہی ہوں گی۔

جا کر پوچھوں کسی دن تمہاری یونیورسٹی میں کہ عارفہ مشتاق نام کی ایک اسٹوڈنٹ گزری ہے۔ اس کا کس کس سے سین رہا؟

وہ سانس روکے، دانت بھینچے اس کی لغویات سنے جاتی۔

پھر ایک روز وہ اپنے ہاتھ میں ایک بلیڈ لیے اس کے نزدیک آ بیٹھا اور بلیڈ کی تیز دھار کہنی سے اوپر اس کے بازو سے مس کرتے ہوئے بولا۔ ''میں تھوڑا سا کاٹوں گا، تکلیف ہو تو بس نام بتاتی جانا۔''

اس نے سہم کر اپنا بازو پرے ہٹانا چاہا۔ وہ حیوانیت سے ہنس دیا۔ ''بس! ڈر گئیں۔ یہ تو کچھ بھی نہیں...... جب تک تم ایک ایک نام نہیں اگل دوگی، میں کٹ لگاتا جاؤں گا۔''

''پلیز!'' وہ رونے لگی۔

''شاباش بتاؤ، کتنے تھے تمہارے چاہنے والے؟''

اس نے ایک ہاتھ میں پکڑے بلیڈ کو اس کے بازو سے مسلسل مس کیے رکھا اور دوسرے سے اس کا بازو اتنی قوت سے دبوچا کہ وہ سسک اٹھی۔

وہ ہنسا۔ ''اب بھی نہیں بتاؤ گی۔''

''خدا کی قسم! میری کسی سے کبھی دوستی نہیں رہی۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''جھوٹ۔'' وہ پھنکارا۔ ''تم سمجھتی ہو میں تمہاری جھوٹی قسم کا اعتبار کرلوں گا یا تمہارے آنسوؤں سے ڈر جاؤں گا۔ یہ لو پہلا چرکا۔''

وہ تکلیف سے بلبلائی۔

''بس! یہ تو کچھ بھی نہیں...... میں چپے چپے پر کٹ لگاؤں گا۔''

''میرے اللہ!''

''گلچھرے اڑاتے ہوئے اللہ یاد نہیں آتا تھا۔ رنگین شیشوں والی گاڑیوں میں جاتی ہوگی...... ہوٹلنگ بھی ہوتی ہوگی...... سمندر کی سیر بھی کرتی ہوگی؟''

''نہیں، اللہ کی قسم ایسا کچھ نہیں ہوا کبھی۔''

''کیسے مان لوں۔ دس بارہ کے نام تو میں تمہیں گنواؤں جو میرے ساتھ گھومتی پھرتی رہی ہیں۔ تم نے کسی کو اور تمہیں کسی نے کیسے بخشا ہوگا؟''

''میں ایسی نہیں تھی۔''

''ہونہہ!'' اس نے گردن کو زور سے جھٹکا دیتے ہوئے عارفہ کو حقارت سے دیکھا۔ ''اپنی پاک دامنی ثابت کرنے کے لیے تم جیسیوں کے پاس یہی جملہ ہوتا ہے۔ لو ایک اور کٹ لگا رہا ہوں۔''

وہ پھر تڑپ گئی۔

''فی الحال دو ہی کافی ہیں۔ باتھ روم میں ڈیٹول کی شیشی رکھی ہے۔'' وہ بولا۔

عارفہ نے کرب سے آنکھیں موند لیں۔

یہ کیسی شادی تھی۔

شادی تھی یا ڈراؤنا خواب!

اس شادی سے تو وہ کنواری ہی بھلی تھی۔ یہ عذاب تو نہ تھا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اس کی زندگی میں آنے والا یہ مرد شکی تھا، جنونی تھا یا نفسیاتی۔

بات زبانی کلامی حد تک رہتی تو شاید وہ کچھ عرصہ سہہ جاتی مگر جسمانی تشدد ناقابلِ برداشت تھا۔ اس نے گھر والوں کو بتا دیا۔ سب دم بخود رہ گئے۔ امی تو کلیجا پکڑ کر بیٹھ گئیں، بہنیں حیران، بھائی پریشان، بھاوجیں ہراساں۔ ایسا کہاں سنا کہ مرد اپنی نو بیاہتا بیوی کو محض لایعنی شک کی بنیاد پر بلیڈ سے چرکے لگائے۔ سب کا متفقہ فیصلہ ٹھہرا کہ عارفہ کو اس شکی اور بے رحم شخص کے گھر واپس نہ بھیجا جائے۔ ایسا بے رحم انسان تو اسے تشدد کر کے جان سے بھی مار سکتا تھا۔ قصہ گھر سے نکلا، کوٹھوں چڑھا اور اپنے پرایوں سب میں پھیل گیا۔ جتنے منہ تھے، اتنی باتیں۔

ارے کچھ تو ہوگا جو چار دن میں دُولہا نے دلہن کے ساتھ ایسا کیا۔

عارفہ کے کرتوت چھپا رہے ہیں گھر والے۔ اس کے شوہر کو بلاوجہ تو شک نہیں ہوا ہوگا۔ کچھ نہ کچھ دیکھا سنا ہوگا اس نے۔

کچھ اور ہی کہانی ہے بھئی۔

☆☆☆

عارفہ کو گھر بٹھا لیے جانے پر پہلے تو سسرال والے ہراساں ہوئے۔ عمیم کے گھر والوں کو اس کی خباثتوں کا بخوبی علم تھا۔ بلا کا آوارہ گرد تھا۔ آئے دن نت نئی لڑکیاں پھانستا اور انہیں بے آبرو کردینے کی حد تک لے جاتا۔ دو لڑکیاں تو مختلف اوقات میں اس کے گھر بھی آ پہنچی تھیں، اس دھمکی کے ساتھ کہ اگر اس نے ان سے شادی نہ کی تو وہ تھانہ کچہری جائیں گی مگر عادی مجرم ان کی دھمکی کو خاطر میں نہ لایا۔ لڑکیاں بے چاری چپ ہو کر بیٹھ گئیں۔ خاندان میں شاید ہی کوئی لڑکی ہو جس پر اس نے ڈورے ڈالنے کی کوشش نہ کی ہو۔ ایک دو پر وہ ہاتھ بھی صاف کر گیا مگر باقیوں نے جو اس کے لچھنوں سے آگاہ تھیں، اسے خوب سنائیں۔ ماں، بہنیں بلکہ چھوٹے بھائی بھی اس کی حرکتوں سے نالاں رہا کرتے تھے مگر گھر کی عزت بچانے کو اکثر اس کی پردہ پوشی کرنے کی کوشش کرتے۔ ماں کہا کرتی تھی۔ ''مجھے بیٹیوں کو نہ نمٹانا ہوتا تو کب کی عمیم کی شادی کر چکی ہوتی۔''

ماں اکثر بیٹیوں سے کہتی۔ ''کالے سر والی آکر خود ہی سنبھال لیتی ہے شوہر کو، چاہے وہ کیسا ہی بدقماش ہو۔''

خاندان میں کوئی عمیم کو اپنی بیٹی دینے کو تیار نہ ہوا تو خاندان سے باہر تلاش شروع ہوئی۔ عارفہ کی ایک محلہ دار برجیس آپا کا عمیم کی ایک بہن سے ملنا جلنا تھا۔ انہوں نے عمیم کی بہن سے عارفہ کا ذکر کیا۔ قسمت کی بات، رشتہ ہوگیا۔ عارفہ کا بڑا بھائی نیک فطرت شخص تھا۔ ساری دنیا کو اپنے ہی جیسا سمجھتا۔ عارفہ کی امی نے کہا بھی لڑکے کے بارے میں تھوڑی چھان بین کرلو مگر بھائی نے کہا۔ ''امی! بیٹی کو اللہ پر توکل کر کے دینا چاہیے۔ لوگ شریف لگتے ہیں۔ بسم اللہ کرو۔'' اس کی توکل علی اللہ والی بات میں تو کوئی کلام نہ تھا مگر وہ اس بات سے آگاہ نہ تھا کہ رشتے ناتے کرتے ہوئے لوگ اکثر ایک چہرے پر کئی چہرے سجا لیتے ہیں۔ غیر لوگوں میں بیٹی کا مقسوم باندھتے ہوئے بال کی کھال بے شک نہ نکالی جائے مگر ضروری پوچھ گچھ اور چھان بین لازماً کی جائے۔ بعد کے پچھتانے اور رونے سے پہلے اطمینان کرلینا

بہتر ہے۔ یہ جو بیٹیوں والے بے چاری بیٹی کو بوجھ سمجھتے ہوئے رشتہ آتے ہی آنکھ بند کرکے ہاں کردینے کا شعار رکھتے ہیں، بیٹی کے ساتھ تو زیادتی کرتے ہی ہیں، خود بھی گرفتار بلا ہوجاتے ہیں جیسے عارفہ کے ساتھ اس کے گھر والے ہوگئے تھے۔ عارفہ چار دن کی بیاہی کسی بیوہ کی طرح اجاڑ سوگوار ہوگئی۔

عارفہ کے سسرال واپس نہ جانے پر ہلچل اس کے سسرال میں بھی مچی۔ عمیم اور اس کی ماں بہنوں نے اپنی عزت بچانے کو وہی لوچھا ہتھکنڈا آزمایا جو کھٹو، بدقماش، بدکردار اور شادی کے قابل نہ ہونے والے مرد اور ان کے گھر والے مظلوم لڑکی کے کردار پر انگلی اٹھا کر آزماتے ہیں۔ عمیم اور اس کی ماں بہنوں نے سارے میں یہ مشہور کردیا کہ عارفہ کا کسی اور کے ساتھ چکر تھا۔ اس نے گھر والوں کی زبردستی پر شادی تو کرلی مگر عمیم کے ساتھ بسنے سے انکار کردیا۔ جھوٹ اور غلط بیانیوں کے وہ پلندے تھے کہ خدا کی پناہ! غلط بیانیوں کی یہ داستانیں عارفہ کے میکے تک بھی پہنچیں۔ اس کی امی نے کہا۔ ''سچ کیا ہے، او پر والا جانتا ہے۔ وہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرے گا۔''

اپنی بربادی کا عارفہ کو جو دکھ تھا، سو تھا۔ اس کی امی تو پلنگ سے لگ گئیں۔ لاڈوں پلی چہیتی بیٹی کا یہ نصیب ہوگا، انہوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ کتنی چاہت اور ارمانوں سے اس کی شادی کی تھی۔ بھائیوں نے بہن کو شان سے وداع کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ کینیڈا والا بھائی جو عارفہ کو بیٹی کی طرح عزیز رکھتا تھا، اس نے شادی میں پانی کی طرح پیسا بہایا تھا۔ ڈیڑھ لاکھ کی تو گھڑی باندھی تھی عمیم کے ہاتھ پر۔

مصالحت کا سوال ہی نہ تھا۔ عارفہ کی طرف سے خلع کا مطالبہ کردیا گیا۔ عمیم نے کہا خلع کے لیے عدالتوں کے چکر لگانے ہیں تو شوق سے لگاؤ۔ میں تو طلاق کا داغ لگاؤں گا مگر اس شرط پر کہ مہر کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ گھر والوں کو کسی بھی طرح عارفہ کی جان اس شخص سے چھڑانی تھی۔ مہر سے دستبرداری کی شرط پوری کرکے طلاق لے لی گئی۔ عمیم کا کردار اور کھل گیا۔ جو شخص مظلوم عورت کو اس کے جائز حق سے محروم کرے، وہ اللہ کے نزدیک بھی معتوب، بندوں کی نظروں میں بھی ذلیل...... بہرحال عارفہ کی خلاصی ہوئی۔

عارفہ کی ماں نے بیٹی کی بربادی کا دکھ دل سے یوں لگایا کہ اس حادثے کے بعد زیادہ دن نہ جی سکیں۔ چاہنے والی ماں کا سایہ سر سے اٹھ جانا عارفہ کے لیے اپنی بربادی سے بھی بڑا صدمہ تھا۔ دکھ اور اداسی نے اس کے دل میں مستقل ڈیرا ڈال دیا۔ زندگی اسے بے معنی محسوس ہونے لگی تھی۔ ایسی زندگی کیا جینا بھلا جو جیتے جاگتے انسان کو روبوٹ بنادے۔ امنگوں بھرے دل کو یاسیت کے بلیک ہول میں دھکیل دے۔ عارفہ کو یوں لگتا جیسے اس کا وجود محض ایک مشین تھی جو دوسری ان گنت بے جان مشینوں کی طرح ایک مقام پر پڑی رہنے کے بجائے بس ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کرجانے پر قادر تھی۔ کھوئی کھوئی آنکھوں سے وہ اردگرد دیکھتی رہتی۔ اس کی بڑی بڑی دلکش آنکھوں میں ہمہ وقت یاسیت ہوتی۔ اس نے بات چیت کرنا بہت کم کردیا تھا۔ ضرورت کے تحت ہی بولتی ورنہ چپ رہتی۔ اس نے لوگوں کے سامنے آنا جانا کم کردیا تھا۔ گھر میں کوئی رشتے دار، کوئی مہمان آتا تو اس کی کوشش ہوتی کہ وہ سامنے نہ جائے۔ لوگوں کی نگاہوں میں ڈولتی معنی خیز کیفیت سے اسے کوفت ہونے لگی تھی۔ ہر شخص جیسے یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ خود کتنی مظلوم، کتنی خطا کار تھی۔ صد شکر کہ بھائی اور بھابی دونوں اچھے تھے ورنہ شاید وہ ان سے بھی چھپنے لگتی۔ وہ تو اب اپنی سہیلیوں سے میل جول میں بھی احتیاط برتنے لگی تھی۔ بس ایک ازکی تھی جس سے وہ اپنا دکھ کسی حد تک شیئر کرلیتی تھی۔

ازکی اور وہ کالج کے زمانے سے دوست تھیں۔ دونوں نے ایک ہی کالج سے آئی سی ایس کرنے کے بعد ایک ہی یونیورسٹی سے کمپیوٹر سائنس میں ڈگری لی تھی۔ عارفہ تو ایم ایس بھی کرنا چاہتی تھی مگر امی کو اس کے ہاتھ پیلے کردینے کی جلدی تھی۔ ازکی ایک اسکول میں کمپیوٹر ٹیچر کی ملازمت کررہی تھی اور اپنی ملازمت سے خوش تھی۔ شادی کی نہ اسے جلدی تھی نہ اس کے گھر والوں کو۔ ازکی کی والدہ ایک تعلیم یافتہ اور ملازمت پیشہ خاتون تھیں۔ ان کا کہنا تھا جلدی کے چکر میں غلط آدمی سے شادی کرنے کے بجائے دیر سے سہی مگر صحیح آدمی سے شادی کی جائے اور جب سے انہوں نے اپنی بیٹی کی دوست عارفہ کی شادی کا انجام سنا تھا، تب سے تو وہ اپنی اس رائے پر زیادہ مستحکم ہوگئی تھیں۔

والدہ کے انتقال کے بعد عارفہ کے کینیڈا میں مقیم بھائی محسن نے اس کی کینیڈا امیگریشن کا پروسس شروع کروادیا تھا۔ اس میں کتنا وقت لگتا تھا، یقین سے کچھ نہ کہا جاسکتا تھا تاہم عارفہ کی عمر، تعلیم اور کینیڈا میں اس کے بھائی کی موجودگی امیگریشن کے لیے مددو معاون پوائنٹس تھے۔ پاکستان میں بڑے بھائی اور بہنوں نے عارفہ کو ہر طرح کی سپورٹ فراہم کررکھی تھی۔ بھائی، بہنیں تو یہ چاہتے تھے کہ کوئی مناسب رشتہ دیکھ کر اچھی طرح چھان پھٹک کے بعد

دوبارہ اس کا گھر بسا دیا جائے مگر وہ ایک ہی تجربے سے اتنی خوفزدہ اور مایوس تھی کہ دوبارہ شادی کے بارے میں سوچنا بھی نہ چاہتی تھی۔ اس خوف اور یاسیت سے نکلنے کے لیے ازکیٰ نے اسے ملازمت کرنے کا مشورہ دیا۔ عارفہ خود بھی یہی چاہتی تھی۔ گھر میں بیٹھے رہنے سے تو اس کی سوچ ہی زنگ آلود ہونے لگی تھی۔

ازکیٰ جس اسکول میں ملازمت کر رہی تھی، اس کے سیکنڈری سیکشن میں کمپیوٹر ٹیچر کی اسامی خالی ہوئی تو ازکیٰ نے عارفہ کو اس اسامی کے لیے درخواست دینے کا مشورہ دیا۔ انٹرویو ہوا، ڈیمو لیا گیا اور عارفہ کو تقرری کا مژدہ سنا دیا گیا۔ عارفہ نے فوری جوائننگ دی اور ملازمت کا آغاز کر دیا۔

شروع شروع میں وہ بہت ڈری سہمی اور باقی ساتھیوں سے الگ تھلگ رہی۔ کلاس روم ٹیچنگ کے بعد اپنا زیادہ وقت کمپیوٹر لیب میں ہی گزارتی۔ وقفے میں بھی اسٹاف روم میں بیٹھنے سے گریز کرتی۔ وقت پر اسکول آتی اور چھٹی ہوتے ہی چلی جاتی۔ کولیگز سے بات چیت اور تعلق کی استواری میں بہت محتاط رہتی۔ میٹنگ ہوتی تو سب سے الگ تھلگ بیٹھتی۔ چلتی تو سنبھل سنبھل کر جیسے قدم گن رہی ہو۔ کوئی مخاطب کرتا تو ہڑبڑا جاتی۔

اسکول کی سیکشن ہیڈ مسز فیاض ایک نرم گو خاتون تھیں۔ محنتی اور باصلاحیت ٹیچرز کی قدر کرتیں۔ عارفہ نے چند ہی دنوں میں انہیں اپنے کام سے اپنا قدر دان بنا لیا۔ ملازمت کے لیے انٹرویو دیتے وقت عارفہ اپنی ازدواجی حیثیت مطلقہ ہونا ظاہر کر چکی تھی۔ مسز فیاض کو اس کی غیر معمولی سنجیدگی، محتاط روی اور آنکھوں میں ہمہ وقت اداسی بہت کھٹکتی۔ ایک روز انہوں نے اسے اپنے آفس میں بلایا۔ وہ گھبرائی ہوئی سی آئی۔

''آپ نے بلایا میڈم؟''

''جی ہاں...... بیٹھیے مس عارفہ!''

وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

''فری ہیں اس وقت؟''

''جی...... جی میڈم!''

''جاب سے خوش ہیں؟''

''جی...... بہت۔''

''میں بھی آپ کی پرفارمنس سے بہت مطمئن ہوں بلکہ میں ہی کیا، آپ کے اسٹوڈنٹس، ان کے پیرنٹس سبھی۔''

''تھینک یو میڈم!''

''ایک بات پوچھوں؟''

''جی...... جی میڈم!'' عارفہ نے ہڑبڑا کر مسز فیاض کو دیکھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ خدا جانے وہ کیا پوچھنا چاہتی تھیں۔ کہیں انہیں عمیم اور اس کے گھر والوں کی جانب سے اس کی جھوٹی کردار کشی کی خبر تو نہیں مل گئی تھی کسی سے۔

''مس عارفہ! اتنی ریزروڈ اور سہمی سہمی سی کیوں رہتی ہیں آپ؟'' مسز فیاض نے نہایت نرم لہجے میں پوچھا۔

''نو میڈم...... اے...... ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ گھبرا کر بولی۔

''کیسی کوئی بات نہیں؟'' مسز فیاض مسکرائیں۔

''میں...... میں سہمی ہوئی تو نہیں رہتی۔'' اس نے کچھ اس طرح کہا جیسے چوری پکڑے جانے کا ڈر ہو۔

''مان لیا۔'' مسز فیاض کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

عارفہ نے سر یوں جھکا لیا جیسے چوری پکڑی ہی تو گئی تھی۔ ٹپ، ٹپ دو موٹے موٹے آنسو اس کی آنکھوں سے ڈھلک کر مسز فیاض کی میز کے شیشے پر ٹپک گئے۔ اس نے جلدی سے اپنے دوپٹے سے میز کو صاف کرتے ہوئے بھیگی بھیگی آواز میں معذرت چاہی۔ ''سوری میڈم!''

''کوئی بات نہیں۔'' مسز فیاض نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولیں۔ ''حادثے ہو جاتے ہیں مس عارفہ! ہر شخص دل پر کوئی نہ کوئی زخم لیے پھرتا ہے۔''

اس نے چونک کر مسز فیاض کو دیکھا اور کرب سے بولی۔ ''بعض حادثے ہمیں مار دیتے ہیں میڈم!''

''جینا تو پڑتا ہے۔''

''مرنے کے بعد جینا کیسا؟''

''حوصلے سے...... ہمت سے...... عزم سے۔'' مسز فیاض نے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔ ''کولیگز کے ساتھ مل جل کر رہیں۔''

''مجھے ڈر لگتا ہے میڈم!''

''کولیگز سے؟'' مسز فیاض کے لہجے میں حیرانی تھی۔

''خود سے۔''

''خود سے؟'' اب وہ پہلے سے بھی زیادہ متعجب ہوئیں۔

''میں کیسے ثابت کر سکوں گی کہ......''

''کہ؟''

''کہ میں غلط نہیں تھی۔''

''مس عارفہ! ہمارا غلط یا صحیح ہونا ہم خود ثابت نہیں کرتے، وقت کرتا ہے۔ لوگ بالآخر سمجھ جاتے ہیں۔ حقیقت جان لیتے ہیں اور وہی ہمارے وکٹری اسٹینڈ پر کھڑے

ہونے کا وقت ہوتا ہے۔ خاموشی سے، بردباری سے، شکر گزاری سے۔''

عارفہ کو مسز فیاض سے قربت کا احساس ہوا اور اس احساس نے اسے اعتماد دیا۔

''آپ کو بتایا ہوگا کسی نے شاید کہ میرے ساتھ کیا ہوا؟''

''میں نے جاننے کی کوشش نہیں کی۔''

اس نے چونک کر قدرے بے یقینی سے مسز فیاض کو دیکھا۔

''میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں مس عارفہ جو دوسروں کی زندگی میں جھانکنے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ میں یہاں کام کرنے کے لیے ہوں اور اپنے کام سے غرض رکھتی ہوں البتہ اگر مجھے اپنے ساتھیوں میں سے کوئی کسی پرابلم میں لگے تو میں اس کا ہاتھ تھام کر اسے ایزی کرنے کی کوشش ضرور کرتی ہوں کیونکہ میرا ماننا ہے کہ پرابلم کے ساتھ میں اپنے کسی ساتھی سے اچھی پرفارمنس کی امید نہیں رکھ سکتی۔ کوئی کوئی جی دار ہوتا ہے جو پرابلم میں ہوتے ہوئے بھی پرابلم کو اپنی پرفارمنس پر حاوی نہیں آنے دیتا۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا میری بات۔''

''یس میڈم!'' اس نے دھیرے سے کہا۔

''گڈ!''

عارفہ کا جی چاہا اپنا دل کھول کر اس نرم خو خاتون کے سامنے رکھ دے۔ اس کے ہونٹ کپکپائے۔ ''میڈم! میری شادی ہوئی تھی مگر وہ شخص جو میرا شوہر تھا، خدا جانے اس کے ساتھ کیا مسئلہ تھا۔ پہلے دن سے وہ مجھ پر شک کرتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ میں شادی سے پہلے غیر مردوں سے دوستی میں رہی ہوں جبکہ ایسا کچھ نہیں تھا۔ مجھ سے اعترافِ جرم کرانے کے لیے وہ میرے جسم پر بلیڈ سے کٹس لگاتا رہا۔''

''او مائی گاڈ!'' مسز فیاض نے جھرجھری لی۔

''یس میڈم! یہ دیکھیے۔'' عارفہ نے اپنی آستین اوپر چڑھا کر بازو پر نشانات دکھائے۔

''انسان تھا یا......'' مسز فیاض بڑبڑائیں۔

عارفہ کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

''بہت کم دن رہ سکی میں اس کے ساتھ۔''

''ایک دن بھی نہیں رہنا چاہیے تھا تمہیں ایسے ظالم آدمی کے ساتھ۔''

''میں ڈرتی تھی میڈم کہ امی کو صدمہ ہوگا۔ وہ تو مر جائیں گی اور وہ سچ مچ مر بھی گئیں جب انہیں پتا چلا تو......''

''وہ نہ مرتیں تو تم مر جاتیں۔''

''اچھا ہوتا۔''

''اچھا ہوتا! زندگی اتنی فضول چیز تو نہیں۔''

''اس بدنامی سے تو اچھا تھا۔ آپ کو پتا ہے انہوں نے میرے بارے میں کیا مشہور کیا؟''

''کیا؟''

''ہم خلع لینا چاہ رہے تھے مگر اس نے مجھے ذلیل کرنے کے لیے طلاق دی اور اس نے اور اس کے گھر والوں نے یہ مشہور کر دیا میرے بارے میں کہ اس کا کسی سے شادی سے پہلے افیئر تھا اس لیے ہمارے گھر میں نہیں بسی۔''

''یہی کرتے ہیں کمینے لوگ۔''

''میڈم! مجھے کسی کو منہ دکھانے کا نہیں چھوڑا انہوں نے۔ اپنے گھر والوں اور رشتے داروں سے بھی شرم آتی ہے۔ سوچتے ہوں گے کہ کچھ تو غلط تھا جو اس شخص نے ایسا کیا۔ میں کیسے ثابت کر سکتی ہوں اپنی بے گناہی۔'' وہ رونے لگی۔

مسز فیاض نے دوبارہ اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ''وقت ثابت کرتا ہے ہماری بے گناہی۔''

اس نے سرخ سرخ ڈبڈبائی آنکھوں سے مسز فیاض کو دیکھا۔ ''آئی ایم سوری میڈم! مجھے آپ سے یہ سب کچھ نہیں کہنا چاہیے تھا۔''

''تم نے اچھا کیا۔ کہہ دینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔''

''مجھے تو لگتا ہے یہ بوجھ کبھی کم نہیں ہوگا۔''

''ضرور ہوگا...... جنہیں اپنا ہمدرد سمجھو، ان سے دل کا بوجھ شیئر کرتی رہا کرو۔'' مسز فیاض کے لہجے میں ٹھنڈک تھی۔

''جاؤں میڈم؟''

''ابھی تو بریک ختم ہونے میں کچھ دیر ہے۔ روتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ باہر جاؤ گی تو دیکھنے والے سمجھیں گے ڈانٹ پڑی ہے۔''

وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

''میڈم! ہم ساری زندگی لوگوں کے سمجھنے ہی سے ڈرتے ہوئے گزار دیتے ہیں۔''

''ایک بات بتاؤں تمہیں؟'' مسز فیاض نے اسے ترغیبی نگاہوں سے دیکھا۔ ''جس دن ہم لوگوں کے سمجھنے کی پروا کرنا چھوڑ دیتے ہیں، لوگ ہم سے ڈرنے لگتے ہیں۔ بی بریو...... بہادر بنو...... لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جینا سیکھو۔''

''بہت مشکل ہے میڈم! میں بہت کمزور ہوں۔''

''یہ تمہارا خیال ہے۔ مجھے تو تم بہت مضبوط محسوس ہوتی ہو۔ کمزور ہوتیں تو اس شخص کے اتنے تشدد کے بعد ناکردہ گناہ کا اعتراف کر لیتیں۔ میرا ایک بھائی کرائم رپورٹر

ہے۔ وہ کہتا ہے، ہمارے قانون نافذ کرنے والے اداروں میں اکثر بے گناہ افراد تشدد کی وجہ سے اعترافِ جرم کر کے اپنی جان خلاصی کرتے ہیں۔''

''میڈم! کتنے بھائی ہیں آپ کے؟''

''صرف ایک..... مگر ہم سات بہنوں کی قوت۔''

''بہت بڑا سہارا ہوتے ہیں بھائی اپنی بہنوں کے لیے۔ مجھے بھی میرے بھائیوں نے سپورٹ دی۔ چھوٹے بھائی نے تو مجھے اپنے پاس کینیڈا بلانے کے لیے میری امیگریشن کا معاملہ پروسس میں ڈال رکھا ہے۔''

''اچھا، یہ تو بہت اچھی بات ہے۔''

''میرا دل تو نہیں چاہتا اپنا وطن چھوڑ کر جانے کو۔''

''شاید کسی کا بھی نہ چاہتا ہو مگر مجبوریاں ہوتی ہیں، ترجیحات ہوتی ہیں جو ہمیں اپنی زمین اور اپنوں سے دور کھینچ لے جاتی ہیں۔ کبھی کبھی آدمی اپنا دکھ درد بھلانے کے لیے بھی دوری اختیار کر لیتا ہے۔ آئی وش یو آل دی بیسٹ!''

''تھینک یو میڈم!''

وقفہ ختم ہونے کی گھنٹی بجی۔

''اب جاؤں میڈم؟''

''بالکل جاؤ کیونکہ بریک بھی ختم ہوگئی ہے اور تمہاری آنکھیں بھی اب روئی روئی نہیں لگتیں۔''

عارفہ کے لبوں پر محزون سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''میں نے یہاں آنے سے پہلے سنا تھا کہ آپ بہت اچھی ہیں۔''

''ہر سنی سنائی بات قابلِ اعتبار نہیں ہوتی۔''

عارفہ اب کھل کر مسکرائی۔

''نہیں میڈم! بعض باتیں اعتبار سے بھی زیادہ اعتبار کے قابل ہوتی ہیں۔''

''اوہ!'' مسز فیاض نے اسے قدرے حیرت سے دیکھا۔ ''گویا گہری باتیں بھی کر لیتی ہو۔''

''نہیں میڈم! بس دل کی بات کر لیتی ہوں۔'' اس نے انکساری سے کہا۔

''دل کی بات کا اچھا ہونا دل کی اچھائی کو ظاہر کرتا ہے۔''

''آپ کا تجربہ مجھ سے کہیں زیادہ ہے میڈم!''

''مان لیا۔'' مسز فیاض مسکرائیں۔

''میرے لیے دعا کیجیے گا۔''

''آج سے ڈھیروں۔''

''شکریہ۔''

☆☆☆

عارفہ کا چھوٹا بھائی اسے کینیڈا بلانے کی کوشش کر رہا تھا اور پاکستان میں اس کے دوسرے بہن بھائی دوبارہ اس کی شادی کرنے کی تگ و دو میں تھے۔ بہنیں اپنے ملنے جلنے والوں سے کہتیں، بھائی فطری جھجک کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے حلقۂ احباب میں بہن کی دوبارہ خانہ آبادی کے لیے اپنی تشویش اور خواہش کا اظہار کرتا۔ عارفہ کی دوست ازکیٰ جو کالج کے زمانے سے اس سے بہت اچھی طرح واقف تھی، اپنے بھائی سے اس کی شادی کرانے میں دلچسپی رکھتی تھی مگر اولاً وہ عمر میں عارفہ سے چھوٹا تھا اور دوم اس کا کوئی مستقل اور معقول روزگار نہ تھا۔ ازکیٰ نے عارفہ سے بات کی تو اس نے اپنے گھر والوں تک بات پہنچنے سے قبل خود ہی ازکیٰ سے کہا۔ ''نہیں ازکیٰ! تمہارا بھائی عمر میں مجھ سے چھوٹا ہے۔ میں نے اسے ہمیشہ چھوٹے بھائی کی طرح سمجھا ہے۔''

''مگر وہ اصل میں ہے تو نہیں۔''

''تمہاری بات ٹھیک ہے مگر..... اس کا اور میرا کوئی جوڑ نہیں۔ میں ڈیوورسی ہوں۔''

''کوئی بات نہیں۔ ہمیں فرق نہیں پڑتا۔ میرے گھر والے بھی راضی ہیں۔''

''مگر مجھے پڑتا ہے فرق۔''

''تم اگر اس لیے انکار کر رہی ہو کہ اس کی فی الحال کوئی معقول جاب نہیں تو.....''

''نہیں، نہیں۔'' عارفہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''یہ بات نہیں۔''

''تو پھر؟''

''میں جانتی ہوں ازکیٰ! تم مجھ سے اپنی دوستی کی خاطر اتنا بڑا قدم اٹھانا چاہتی ہو۔ میرے دل میں تمہاری قدر دوستی کی حدوں سے آگے نکل گئی ہے مگر یہ ممکن نہیں۔ دوستی کی خاطر میں اتنی بڑی قربانی نہیں لے سکتی تم سے۔''

''عارفہ! میں اور میرے گھر والے تمہیں ایک عرصے سے دیکھ رہے ہیں۔ تم سے اچھی طرح واقف ہیں۔ ہم دونوں نے کالج اور یونیورسٹی میں کئی سال اکٹھے گزارے ہیں۔ تمہاری ہمراز ہوں میں۔ اچھی طرح جانتی ہوں کہ تم کتنے مضبوط کردار کی لڑکی ہو۔ تم پر شک کرنا یا کوئی تہمت لگانا اس شخص کے اپنے کردار کی کمزوری تھی جس نے تم جیسی اچھی لڑکی کو کھو دیا۔ میری امی، ابو، بہنیں، میں خود اور میرا بھائی بھی تم سے رشتہ جوڑنے میں خوش ہیں۔''

''جزاک اللہ!''

''تمہارے گھر والوں سے بات کریں ہم لوگ؟''

''نہیں، نہیں۔'' عارفہ گھبرا کر بولی۔ ''پلیز، ایسا مت کرنا۔ میری دعا ہے کہ تمہارے بھائی کو کوئی بہت اچھی لڑکی ملے۔''

''ہمارا دل تو تم پر ہے عارفہ!''

''میں ساری زندگی تمہاری اور تمہارے گھر والوں کی شکرگزار رہوں گی کہ جب ایک ظالم شخص نے مجھ پر زندگی کا گھیرا تنگ کر دیا تھا تب تم نے مجھے یہ احساس دیا کہ میں کال کوٹھری میں نہیں ہوں۔''

''اتنی اچھی باتیں کرتی ہو تم۔ وہ شخص بدقسمت تھا جس نے تم جیسی خوبصورت، نیک فطرت، سلیقہ مند، نفاست پسند اور ادبی ذوق رکھنے والی لڑکی کی قدر نہیں کی۔''

''بدقسمت وہ نہیں تھا ازکیٰ...... میں تھی۔''

''میری بات مان لو تا کہ وہ اور اس کے گھر والے تمہاری قدر جانیں۔''

''وہ کیا جانیں گے۔''

''پلیز عارفہ!'' ازکیٰ اس کی منت سماجت پر اتر آئی۔

''مجھے مجبور مت کرو۔ شاید تم نے میری جان مانگی ہوتی تو میں دینے میں تردد نہ کرتی مگر...... یہ ممکن نہیں ہے۔''

''ٹائم لو...... سوچ لو...... ہم انتظار کر سکتے ہیں۔ امی کہتی ہیں گھر میں اچھی لڑکی آجائے گی تو ہمارا گھر جنت کا ٹکڑا بن جائے گا۔''

''جس گھر میں اتنے اچھے، اتنے اعلیٰ ظرف لوگ رہتے ہیں، وہ تو ویسے بھی جنت کا ٹکڑا ہی ہوگا۔''

''مان جاؤ نا۔''

''آج...... آج کے بعد...... اور کبھی بھی...... نہیں۔''

ازکیٰ مایوس دکھائی دینے لگی۔

''بہرحال......!'' عارفہ نے ازکیٰ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔ ''میں تمام عمر تمہاری ممنون رہوں گی۔''

''بہت بے وفا ہو۔'' ازکیٰ نے اسے شاکی نظروں سے دیکھا۔

''اور برا کہو۔''

ازکیٰ فرطِ جذبات سے اس سے لپٹ گئی۔

بعد میں ازکیٰ نے اپنے گھر والوں سے کہا۔ ''عارفہ کی جگہ کوئی اور ہوتی تو اپنے سسرال والوں کو یہ دکھانے کے لیے کہ اسے اب بھی کم عمر، پڑھا لکھا اور کنوارا رشتہ مل سکتا ہے، فوراً ہاں کر دیتی۔''

''بیٹا! اتنے سال سے ہم بھی دیکھ رہے ہیں۔ اچھی لڑکی تھی جسے ان بدبختوں نے بلاوجہ بدنام کیا۔'' ازکیٰ کی والدہ نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

''صرف بدنام ہی نہیں امی......! اس کے شوہر نے اس پر بے رحمانہ تشدد بھی کیا۔ نفسیاتی تھا کمبخت۔''

''اللہ پوچھے گا اس سے۔''

''وہ تو دوسری شادی کر کے بیٹھ گیا۔''

''ہوئی کوئی عارفہ کی طرح کی تو وہ بے چاری بھی سر پکڑ کر روئے گی اور ہوئی اور طرح کی تو دیکھنا کیسا ناچ نچائے گی اسے۔''

☆☆☆

صبح سویرے حسبِ معمول گھر سے اسکول جانے کے لیے عارفہ بس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی کہ عقب سے آنے والی دھیمی سی مردانہ آواز نے اسے ایک لمحے کو اپنا سانس روک لینے پر مجبور کر دیا۔

''سنیئے!'' اس نے فقط ایک ہی لفظ سنا تھا۔

''میں...... آپ سے...... کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

وہ ٹھٹک گئی۔ گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ ایک نوجوان پینٹ شرٹ میں ملبوس پیچھے کھڑا تھا۔

''کیا ہے؟'' عارفہ نے اسے غصے سے گھورا۔ گلی ابھی سنسان تھی۔

''میرا نام...... شہریار ہے۔''

''تو میں کیا کروں۔'' وہ بھبک کر بولی۔

''آپ سے بات کرنا ہے۔''

''بکواس مت کرو۔ ابھی چیخوں گی تو آس پاس محلے کے گھروں سے لوگ نکل آئیں گے تمہاری مرمت کرنے کے لیے۔''

''محلے کے لوگ مجھے اچھی طرح جانتے ہیں۔ دو گلیاں چھوڑ کر رہتا ہوں اور محلے میں اچھی ریپوٹیشن ہے میری۔''

''دفع ہو جاؤ تم اور تمہاری ریپوٹیشن۔''

''اتنا غصہ کیوں کر رہی ہیں؟''

''تم جیسے لفنگوں کو میں اچھی طرح سمجھتی ہوں۔''

''یہ تو پھر اچھی بات ہے۔'' وہ بولا۔

''چلاؤں...... بلاؤں کسی کو؟''

''آپ کی مرضی ہے۔'' اس نے شانے اچکائے۔ ''شوق پورا کرنا چاہتی ہیں تو کر لیجیے۔ میرے لفنگے پن کی آزمائش بھی ہو جائے گی آپ کو۔ الحمدللہ محلے کے لوگ جانتے ہیں مجھے۔ آپ شاید نہیں جانتیں۔''

''مجھے جاننے کی ضرورت بھی نہیں۔'' وہ آگے جانے کو مڑی اور تیز رفتاری سے قدم آگے بڑھائے۔

''آپ مجھے غلط سمجھ رہی ہیں۔'' وہ بھی اس کے پیچھے

پیچھے آتے ہوئے بولا۔
''ایڈیٹ!'' عارفہ نے زور سے کہا۔
''آئی ڈونٹ مائنڈ۔''
وہ پھر ٹھنک گئی۔ اسٹاپ اب قریب ہی تھا۔
''کمینے انسان! تم صبح صبح میرے متھے کیوں لگ رہے ہو؟'' وہ اسے غصے سے دیکھتے ہوئے غرائی۔
''کیونکہ دوپہر کو جب آپ واپس لوٹتی ہوں گی، میں اپنی جاب پر ہوتا ہوں۔ معمولی جاب ہے مگر کیا کروں، اسی پر گزارہ کرنا پڑ رہا ہے۔ آپ اچھی ہیں، صبح گئیں، دوپہر کو گھر واپس آگئیں۔ مجھے تو ٹین ٹو ٹین بارہ گھنٹے کی نوکری کرنا پڑتی ہے۔''
''تب یہ حال ہے۔''
''شکر ہے، ہم بس دو بھائی ہیں اور امی۔ عزت سے گزارہ ہو جاتا ہے۔ کسی سے مانگنا نہیں پڑتا۔''
''تم مجھے اپنی سوانح عمری کیوں سنا رہے ہو؟''
''آپ اپنا موڈ ٹھیک کریں، غصہ چھوڑیں، مجھے لفنگا کٹیگری سے نکالیں تو بتاؤں۔''
اس نے غصے سے اپنا ایک پاؤں زمین پر مارا، گردن پھیری اور دوبارہ تیزی سے بس اسٹاپ کی طرف چلنے لگی۔ مطلوبہ بس آرہی تھی۔ وہ تیزی سے لپکی اور اسٹاپ پر بس کے پہنچتے ہی زنانہ حصے میں سوار ہوگئی۔ دزدیدہ نظروں سے باہر دیکھا تو وہ کچھ فاصلے پر کھڑا ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ بس مسافروں کو اتار چڑھا کر دوبارہ چل دی۔ اس کا ذہن گنجلک ہو رہا تھا۔ کون تھا بھلا وہ؟ پہلے تو اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا اسے اور وہ کہہ رہا تھا دو گلیاں چھوڑ کر رہتا ہے۔ سارا محلہ جانتا ہے اسے...... لفنگا...... لاحول ولا قوۃ......! عارفہ کو کسی اجنبی کا اپنے پیچھے لگنا اور راستے میں اس سے بات کرنا اپنی توہین محسوس ہو رہی تھی۔ محلے میں یہ بات اب کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ وہ شادی کے بعد محض چند دن ہی سسرال میں بس سکی تھی اور یہی نہیں، اس کی سابقہ سسرال کے چند رشتے دار اس محلے میں بھی تو رہتے تھے۔ ان تک اس کے کسی اور میں الوالو ہونے کی خبر ضرور پہنچی ہوگی اور یہاں تو ایک زبان سے نکلی بات کوٹھوں چڑھتی ہے۔ محلے میں نہ جانے کہاں کہاں اور کس کس تک پہنچی ہوئی ہوگی اس کی جھوٹی بدنامی کی خبر...... ہوسکتا ہے اس نے بھی سنی ہو اور اسے ایسی ویسی سمجھ کر ہی اس کے پیچھے آگیا ہو ورنہ اس سے قبل ایسا کب ہوا تھا بھلا کہ کوئی اس کے پیچھے لگا ہو اور اس سے بات کرنے لگا ہو...... اپنی تذلیل کے احساس سے اس کا دل سارا دن بھاری رہا۔ کیسے بدفطرت تھے عمیم اور اس کے گھر والے۔ اگر عمیم اس درجہ شکی یا نفسیاتی مریض تھا تو اس کے گھر والوں کو تو معلوم ہوگا۔ کیوں پھوڑا انہوں نے ایک اچھی بھلی لڑکی کا مقدر اور اگر پھوڑ ہی دیا تھا تو ایک معصوم اور بے قصور لڑکی کو یوں بدنام تو نہ کرتے۔ وہ جتنا سوچتی گئی، اتنا ہی اس کا دل بھاری ہوتا چلا گیا۔ کتنی آسانی سے تہمت لگا دیتے ہیں لوگ دوسروں کی بہنوں، بیٹیوں پر۔ یہ نہیں سوچتے کہ اوروں کی بہنوں، بیٹیوں کی جگہ پر خود ان کی اپنی بہنیں، بیٹیاں بہتان طرازی کی زد میں ہوں تو!

☆☆☆

اگلے دن جب عارفہ اسکول جانے کے لیے بس اسٹاپ کی طرف روانہ ہوئی تو وہ پھر اس کے پیچھے آگیا۔
''مس! میری ایک ریکویسٹ سن لیں۔''
''بکواس مت کرو۔'' عارفہ نے گردن موڑتے ہوئے اسے بھنا کر دیکھا۔ ''مجھے کسی کو پکارنے کی ضرورت بھی نہیں۔ خود ہی اتنے جوتے لگاؤں گی تمہیں کہ تمہارے ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔''
''بڑی مہربانی ہوگی آپ کی۔ میرے ہوش واقعی ٹھکانے نہیں ہیں۔ بائی دی وے، آپ کو کیسے پتا چلا کہ میرے ہوش ٹھکانے آنے کی ضرورت ہے؟''
''یو......'' عارفہ نے دانت بھینچتے ہوئے اس پر آنکھیں نکالیں۔
''کہیے، کہیے جو مرضی میں آئے کہیے، میں مائنڈ نہیں کروں گا۔''
''مائنڈ وہ کرتا ہے جس کے پاس مائنڈ ہوتا ہے۔''
''اچھی بات کی ہے آپ نے۔''
''شور مچا کر اتنا ذلیل کروں گی تمہیں کہ...... تم جو کہتے ہو محلے میں تمہاری بہت عزت ہے، کسی کو منہ دکھانے کے نہ رہو گے۔''
''اچھا دیکھیے...... آپ زیادہ غصہ نہ ہوں اور میں بھی مذاق ختم کرتا ہوں۔'' اس نے توقف کیا پھر بولا۔ ''میں اپنی والدہ کو آپ کے گھر بھیج رہا ہوں...... آپ کا رشتہ مانگنے کے لیے۔''
عارفہ کا اوپر کا سانس اوپر، نیچے کا نیچے رہ گیا۔ قسمت نے یہ دن بھی دکھانا تھا کہ راہ چلتے اس کا رشتہ مانگنے کی بات کرنے لگے تھے۔
''تم ہوش میں تو ہو؟''
''ڈیم سیریس مس!''
''تم نے سمجھا کیا ہے مجھے؟'' عارفہ کو اپنی سانس

پھولنے لگی۔

''میں نے جو بھی سمجھا ہے، ٹھیک سمجھا ہے۔''

''دفع ہو جاؤ۔''

''اونہوں۔'' اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے عارفہ کو فیصلہ کن نظروں سے دیکھا۔ ''میں دفع ہونے کے لیے آپ کے پیچھے نہیں آیا ہوں۔ عمیم کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ شادی سے پہلے اس نے نہ جانے کتنی لڑکیوں کی زندگی برباد کی۔ اس کے گھر والوں کو بھی اس کے کچھنوں کا علم تھا پھر بھی آپ جیسے شریف لوگوں کو پھنسا کر اس سے آپ کی قسمت پھوڑ دی۔ اچھا ہوا کہ آپ نے جلدی اس سے اپنا پیچھا چھڑا لیا۔''

''تمہیں مجھ سے ہمدردی کیوں ہو رہی ہے؟'' عارفہ نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''کیونکہ میں عمیم کو جانتا ہوں۔''

''مت لو اس کا نام بار بار میرے سامنے۔''

''سوری!''

''مجھے اس سے نفرت ہے اور اس سے واقفیت رکھنے والے ہر شخص سے۔'' عارفہ نے تلخی سے کہا۔

''بالکل ہونی چاہیے اس سے آپ کو نفرت لیکن دیکھیے کسی برے شخص سے واقفیت رکھنے والے سے بھی نفرت کرنا میری سمجھ سے بالا ہے۔ دنیا میں بہت سے اچھے لوگ بہت سے برے لوگوں سے واقفیت رکھتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب کب ہے کہ بُرے آدمی کو بُرا سمجھنے کے ساتھ اس سے واقفیت رکھنے والے کو بھی بُرا سمجھا جائے؟''

''میں بیکار باتوں میں اپنا وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی۔ جاؤ اپنا راستہ ناپو ورنہ کل میں اپنے گھر سے کسی مرد کو ساتھ لاؤں گی تمہاری طبیعت ٹھکانے لگانے کے لیے۔''

''قصور آپ کا نہیں، آپ کو پیش آنے والے حالات کا ہے۔ ایک بُرے آدمی کا چہرہ دیکھنے کے بعد آپ کو ہر چہرہ مسخ دکھائی دینے لگا ہے۔ یقین کریں میں برا آدمی نہیں ہوں۔ بائی دی وے کل چھٹی ہے۔ میرا کچھ پروگرام ہے۔''

عارفہ نے اسے گھور کر دیکھا اور اپنے راستے پر چل دی۔ وہ اس کے پیچھے نہیں آیا۔

☆☆☆

اگلے دن ہفتہ واری تعطیل تھی۔ بھابی نے عارفہ سے کہا۔ ''شام کو مہمان آرہے ہیں۔ تم اپنے کپڑے استری کر کے رکھ لو۔ لائٹ کا کچھ بھروسا نہیں، کب چلی جائے۔''

عارفہ سمجھ گئی کہ شام کو کس قسم کے مہمان آرہے ہیں۔ دو تین مرتبہ پہلے بھی ایسا اتفاق ہوا تھا۔ کسی نے خود پلٹ کر دیکھنا گوارانہ کیا، کوئی بھائی بہنوں کے دل کو نہ لگا۔

دن چڑھے عارفہ کی بڑی بہن بھی آگئیں۔ بھابی ایسے موقع پر اپنی دوسراہٹ کے لیے اپنی دو بڑی نندوں میں سے کسی نہ کسی کو بلالیا کرتی تھیں۔ نہ گھر والوں میں سے کسی نے اسے آنے والے مہمانوں کے سیاق و سباق سے آگاہ کیا نہ اس نے پوچھنا مناسب سمجھا۔

شام کو جب مہمان آئے تو وہ یہ دیکھ کر دم بخود رہ گئی کہ ایک معمر عورت کے ہمراہ آنے والا نوجوان وہی تھا جو گزشتہ دو ایام اس کے پیچھے لگا رہا تھا۔

اس کی ظاہری شخصیت میں تو کوئی کلام نہ تھا۔ بلند قامت، مناسب جسامت، خوش لباس اور چہرے پر متانت..... مگر یہ اوصاف تو عمیم میں بھی تھے۔ اس کے ہمراہ آنے والی معمر خاتون اس کی ماں تھی۔ مزاجاً تیز لگتی تھی۔ گفت و شنید ہوئی تو معلوم ہوا عارفہ سے رشتہ کرنے میں اس کی ماں سے زیادہ خود اس کا دخل تھا۔

''دو ہی بیٹے ہیں میرے۔ یہ بڑا ہے۔ اس نے بی کام کیا ہے۔ ایک سپر اسٹور میں ملازمت کرتا ہے۔ تنخواہ تو اتنی زیادہ نہیں مگر اسٹور سے رعایتی قیمت پر گھر کا سودا سلف مل جاتا ہے۔ چھوٹا بیٹا ابھی یونیورسٹی میں پڑھ رہا ہے۔ گھر ہمارا اپنا ہے، عزت سے گزارہ ہو رہا ہے۔ میں اس کی شادی اپنے خاندان میں ہی کرنا چاہتی تھی لیکن اس نے ضد لگالی ہے کہ مجھے اسی گھر سے رشتہ لے کر دو۔''

''آپ لوگوں کو یہ تو پوچھنا چاہیے تھا کہ ایسی آخر کیا بات ہے جو خاتون کے بیٹے نے اسی گھر میں رشتہ کرنے کی ضد پکڑ لی ہے۔'' مہمانوں کے جانے کے بعد عارفہ نے بہن اور بھابی سے کہا۔

''اللہ نے ڈالی ہوگی اس کے دل میں۔'' عارفہ کی بہن آپا حمیرہ بولیں۔

''اللہ نے بھی کسی سبب سے ڈالی ہوگی دل میں۔''

''اچھا خیر، مناسب لوگ ہیں۔ لڑکا دیکھنے میں بھی اچھا ہے۔ پڑھا لکھا ہے، اچھی نوکری بھی مل جائے گی۔ رزق اور پیسا عورت کے نصیب کا ہوتا ہے۔''

''نصیب تو خراب ہے آپا!'' عارفہ نے دل گرفتگی سے کہا۔

''نصیب بدلتے دیر تھوڑی لگتی ہے۔ لڑکی خالی گھر جاتی ہے اور اس کے نصیب سے گھر بھر جاتا ہے۔''

''سب سے بڑی بات یہ کہ لڑکا کنوارا ہے۔ کوئی دم چھلا نہیں لگا ہوا ہے اس کے ساتھ۔ کوئی طلاق والا یا رنڈوا

ہوتا تو پہلی بیوی یا بچوں کا کھٹکا ہوتا۔'' بھابی بولیں۔

''ہاں بھئی، ان حالات میں کنوارا رشتہ ملنا بڑی بات ہے۔'' آپا نے تائید کی۔

''چہرے مہرے سے لڑکا شریف بھی لگتا ہے۔'' بھابی نے مزید کہا۔

عارفہ کا جی چاہا، بھابی کو گزشتہ دو صبحوں کی داستان سنا دے مگر مصلحتاً چپ رہی۔

بھائی نے بھی پسندیدگی اور حمایت ظاہر کردی بلکہ اسے آمادہ کرنے کے لیے سمجھانے بجھانے کا فریضہ بھی اتنی دلسوزی سے ادا کیا کہ اس کا جی بھر آیا۔

کینیڈا سے بھی حوصلہ افزائی ہوئی۔

وہ اپنی والدہ کے ساتھ گھر آنے کے بعد دوبارہ اس کے پیچھے نہیں آیا کہ وہ اسے لتاڑ کر خود سے برگشتہ کرسکتی۔

اسے اپنے انکار پر ڈٹے رہنے کی جا نہ رہی۔

☆☆☆

شہریار سے اس کا عقد ثانی ہوگیا۔

وہ بہت ڈری ہوئی تھی۔ خدشات اور وسوسے اسے سہما رہے تھے۔ پہلی بار کی تلخی ہی نہ گئی تھی...... اس بار نہ جانے کیا ہو۔

''تمہیں پتا ہے میں نے تم سے شادی کیوں کی ہے؟'' پہلی رات شہریار نے اس سے کہا۔

عارفہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ڈرتے ڈرتے اس نے سہمی سہمی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

شہریار نے اس کا حنائی بیل بوٹوں سے مزین ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں کے بیچ لے لیا اور اسے گہری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری سرخروئی کے لیے۔''

چند ثانیے خاموشی رہی پھر اس نے کہا۔ ''سمجھ رہی ہو نا میری بات؟''

عارفہ نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔

''اس الو کے پٹھے نے تم پر زندگی کا دروازہ بند کردینے کی کوشش کی تھی۔ میں نے سارے دروازے، ساری کھڑکیاں کھول دی ہیں۔ کسی کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں...... کسی سے مت ڈرو...... مجھ سے بھی نہیں۔ مجھے اگر کوئی یہ کہے گا کہ مجھ سے شادی کرنے سے پہلے تم فلاں فلاں کے ساتھ تعلق میں رہی ہو...... آئی ڈیم کیئر...... پھر بھلا تمہیں پروا کرنے یا ڈرنے کی کیا ضرورت؟ جو ہوچکا، اسے بھول جاؤ۔ بس یہ سمجھو کہ آج سے ہم دونوں ایک نئی زندگی شروع کررہے ہیں۔ میں کوئی امیر آدمی نہیں ہوں مگر کوشش کروں گا کہ تمہاری ضروریات پوری کرسکوں اور تمہیں خوش رکھ سکوں...... ہاں، میری والدہ کی طرف سے تمہیں تھوڑی پرابلم ہوسکتی ہے۔ وہ تم سے میری شادی کے حق میں نہیں تھیں۔ بڑی مشکل سے منایا ہے میں نے انہیں۔ ہوسکتا ہے شروع میں تمہیں ٹف ٹائم دیں۔ تمہیں ایڈجسٹمنٹ میں پرابلم ہو مگر میری خاطر نظرانداز کردینا۔''

عارفہ حیران تھی کہ یہ دوسرا تجربہ پہلی بار سے کتنا مختلف تھا۔ نہ لہجے میں اکھڑپن، نہ شک کی کوئی پرچھائیں، نہ بے اعتمادی کی جھلک، نہ اسے زمین سے لگادینے کی کوشش...... بلکہ اس بار تو اس کی زندگی میں آنے والا مرد اپنے نرم لہجے میں اسے زمین سے اٹھانے اور اس کا کھویا ہوا اعتماد بحال کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ یہ دوسرا مرد پہلے سے کتنا مختلف تھا۔

وہی نہیں، اس کے گھر والے بھی ایک نئے شخص سے اسے جسم و جاں کے رشتے میں باندھ دینے کے بعد بھی اس تشویش میں تھے کہ خدا جانے اس بار کیا ہو۔ اگلے دن وہ گھر گئی تو ہر آنکھ میں سوال تھا۔ لب بے صدا تھے مگر وہ بے صدا لبوں کی صدا سن سکتی تھی۔ بالآخر بڑی آپا تشویش بھرے لہجے میں سوال کر ہی بیٹھیں۔ ''اتی! کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟''

''نہیں آپا!''

''سچ کہتی ہو؟''

''میں نے پہلے بھی جھوٹ نہیں بولا تھا آپا!''

''خدا نہ کرے کہ اب کوئی مسئلہ ہو۔'' آپا نے اسے ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھا۔

محلے والیاں جوق در جوق ٹوہ لینے چلی آئیں اور اسے عجوبے کی طرح دیکھتی رہیں۔ بھائی نے اسے ایسی دلسوز نگاہوں سے دیکھا کہ اس کا جی چاہا کہ ان کے سینے سے جا لگے اور کہے۔ ''میں ٹھیک ہوں بھائی! آپ پریشان نہ ہوں۔''

دوپہر کو شہریار اسے واپس لے جانے کے لیے آیا تو اس کی خاطر خواہ پذیرائی کرتے ہوئے بھی عارفہ کے گھر والوں کی نگاہوں میں شک و شبہ ڈولتا ہی رہا۔ ردبولس کی طرح اس کے آگے پیچھے گھومتے رہے۔

شام کو ولیمے کی تقریب میں شہریار اپنے رشتے داروں، دوستوں اور ان کی بیویوں سے اسے بے حد گرمجوشی سے متعارف کراتا رہا۔ ''یہ میری بڑی خالہ ہیں...... یہ چھوٹی خالہ اور میرے فیورٹ خالو...... یہ ممانی جان ہیں میرے اکلوتے ماموں کی جان...... یہ میرے بچپن کا دوست شمشیر اور یہ اس کی مسز...... جناب عالی! یہ ہیں ظریف خان......

ان کا اور میرا رزق ایک ہی جگہ بندھا ہے فی الحال۔ ویسے یہ دبئی جانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ یہ میرا یار نام ہی کا نہیں، طبیعت کا بھی ظریف ہے...... اور وہ جو سفید بالوں والی خاتون اسٹیج کی طرف آرہی ہیں، تائی اماں ہیں۔ میں ذرا ان کو سہارا دے دوں......" وہ اسٹیج سے اتر کر تائی اماں کی طرف لپکا۔

عارفہ کو لگ ہی نہ رہا تھا کہ یہ اس کی دوسری شادی تھی۔ تقریب میں شامل لوگوں کی نگاہوں میں اور چہروں پر ملے جلے تاثرات تھے۔ تعجب، رشک، تحقیر، تضحیک، طنز اور بے توقیری! عارفہ دزدیدہ نظروں سے تاثرات تاڑتی رہی۔ اسٹیج کے نزدیک ایک میز کے گرد پڑی کرسیوں پر بیٹھی بنی سنوری خواتین کو اس نے کہتے سنا۔ "بہن! آج کل یہی تماشا ہے۔ شریف اور عزت دار لڑکیوں کو بر نہیں ملتے اور چلتی پھرتیاں ایک کو چھوڑ کر پھر کنوارا لڑکا پھنسا لیتی ہیں۔"

"دلہا کی ماں کی تو ذرا مرضی نہ تھی۔ کنواریوں کی کمی ہے جو غیر شادی شدہ بیٹے کی شادی طلاق یافتہ سے کرتی...... مگر بات وہی کہ جب لڑکا لڑکی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔"

"لڑکی نہیں، فتنی کہو۔ سنا ہے پہلی شادی اسی لیے ختم ہوئی کہ شوہر کو شادی سے پہلے اس کے چکروں کا علم تھا۔"

"اب بے چاری بیوہ ماں کے بیٹے کو پھانس کر بیٹھ گئی...... ہائے! کیسے کیسے ارمان ہوں گے شہریار کی ماں کو اس کی شادی کے لیے۔ اس کمبخت نے بے چاری کے سارے ارمان خاک میں ملا دیے۔ ارے پہلی شادی سے پہلے بھی شہریار سے چکر رہا ہوگا اس کا۔"

"اپنے پرایوں سے منہ چھپاتی پھر رہی ہیں بے چاری آنٹی!"

"بیٹے اور بہو کے ساتھ تصویر کھنچوانے کو بھی نہیں آئیں نا ابھی تک؟"

"کس دل سے کھنچوائیں بے چاری۔"

"اور اس عورت کو دیکھو، کس ٹھاٹھ سے دلہن بنی اسٹیج پر بیٹھی ہے۔"

عارفہ اسٹیج پر بیٹھی تھی مگر اس کے کان مسلسل آس پاس ہی لگے تھے۔

رات کو گھر واپسی کے بعد جب وہ دونوں اپنے کمرے میں آ گئے تو اس نے شہریار سے آہستہ سے کہا۔

"ایک بات پوچھوں؟"

"ایک نہیں، سو۔"

"جب آپ کی امی مجھ سے آپ کی شادی کرنے پر راضی نہیں تھیں تو آپ ان کی مرضی کے خلاف کیوں گئے؟"

"تم سے کس نے کہا کہ امی راضی نہیں تھیں؟"

"کسی نے بھی کہا ہو، اس سے فرق نہیں پڑتا...... بات تو تھی نا۔"

"ہاں تھی۔" وہ اس کے شانوں پر اپنا بازو دراز کرتے ہوئے بولا۔

"تو پھر کیوں کی مجھ سے شادی؟"

"بتا دوں؟" اس نے کہا۔

"میں جاننا چاہوں گی۔"

وہ چپ رہا۔

"مجھ پر رحم کھا کر؟" عارفہ کے لہجے میں دل گرفتگی تھی۔

"نہیں۔" اس نے بلا توقف کہا۔

"تو پھر؟"

وہ چند ثانیے اسے دیکھتا رہا پھر اس کے بالوں میں لگی افشاں اپنی انگشت شہادت کی اگلی پور پر لیتے ہوئے بولا۔ "خدا مرد کو عورت کا نگہبان قرار دیتا ہے...... نگہبان کا کام ہے کہ جو چیز اس کی نگرانی میں دی گئی ہے، اس کا خیال رکھے۔ اگر نگہبانی میں دی جانے والی شے کوئی بشر ہے تو اس کی خطا سے درگزر کرنے کا حوصلہ اور اصلاح کی کوشش کرے۔ مرد کو فراخ دل اور اعلیٰ ظرف ہونا چاہیے۔"

"میری کوئی خطا نہیں تھی۔ آپ جیسی مرضی آئے، قسم لے لیں مجھ سے۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"میں آگے دیکھنے والا آدمی ہوں۔ پیچھے پلٹ کر دیکھنے والا پتھر کا ہو جاتا ہے۔"

"مجھ پر شک ہے آپ کو؟"

"چیزیں میلی اسے نظر آتی ہیں جس کی اپنی آنکھ میلی ہوتی ہے۔ دیکھو، آج کے بعد ہم دونوں میں سے کوئی بھی اس موضوع پر کوئی بات نہیں کرے گا۔"

وہ چپ رہی۔

"ٹھیک ہے نا۔"

"جی۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"جی کا مطلب؟"

"جیسے آپ چاہتے ہیں۔"

"میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ تم خوش رہو۔ لوگ کیا کہتے ہیں، کیا نہیں کہتے، پروا مت کرو۔ ہماری زندگی ہے، ہم جو جی چاہے فیصلہ کریں، جس طرح چاہیں جئیں۔ دنیا کو اس سے مطلب نہیں ہونا چاہیے اور ہمیں دنیا کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ میری تنخواہ کم ہے لیکن کوشش میں ہوں کہ کوئی نائن ٹو فائیو جاب

مل جائے تاکہ میں شام کو کوئی دوسری جاب بھی کرسکوں۔"
"کیوں؟ دوسری جاب کیوں؟"
"کیونکہ بیوی والا ہوگیا ہوں، ضرورتیں بڑھ گئی ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔
"کوئی دوسری جاب واب نہیں۔ میری جاب بھی تو ہے، گزارہ ہوجائے گا۔" عارفہ نے کہا۔
"تمہاری مرضی ہے جاب کرو یا نہ کرو۔ میری طرف سے تم پر کوئی پابندی نہیں لیکن میں بیوی کی کمائی پر نظر رکھنے والا مرد نہیں ہوں۔"
"مگر میں تو آپ کو شام سے پہلے گھر میں دیکھنا چاہوں گی۔ میری امی جب تک زندہ رہیں، بھائی سے ان کی ایک ہی فرمائش ہوتی تھی کہ شام سے پہلے گھر آجانا۔"
شہریار اسے الفت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنے وقت کا مقبول نغمہ دھیمے سروں میں گنگنانے لگا۔
شام سے پہلے آنا
دھوپ ساری ڈھل رہی ہو
پھول سارے کھل گئے ہوں
موسم سارے لے آنا
"ارے واہ! آپ تو بہت اچھا گالیتے ہیں۔" عارفہ پھڑک کر بولی۔
"گالیتا نہیں ہوں، اکثر گاتا ہوں۔"
"زبردست، بہت اچھے۔"
"آداب، آداب! تم نے تعریف کردی، سمجھ لو سرٹیفکیٹ مل گیا مجھے۔" وہ مسکرایا۔
"واقعی بہت سریلے ہیں آپ۔"
"یار! ایک بڑی گڑبڑ ہوگئی ہے۔" شہریار منہ لٹکا کر بولا۔
"وہ کیا؟" عارفہ نے اسے تشویش سے دیکھا۔
"ہماری شادی کو آج دوسرا ہی دن ہے......"
"ہاں تو؟"
شہریار کی آنکھوں میں شرارت ناچی۔ "تو یہ......"
وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اپنے ہونٹوں تک لے گیا۔ "کہ مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔"
عارفہ کا سر جھکتا ہی چلا گیا...... نیاز مندی سے...... تشکر سے...... ربِ لاشریک نے اس کی کلفت کو مسرت میں بدل دیا تھا۔

☆☆☆

عارفہ اپنے گھر میں خوش تھی بلکہ بہت خوش۔ شہریار اس کے لیے ہر اعتبار سے ایک اچھا شوہر ثابت ہو رہا تھا۔ اس سے محبت اور احترام سے پیش آتا، اس کی مادی اور جذباتی ضرورتوں کا خیال رکھتا۔ اسے گھمانے پھرانے کے لیے باہر لے جاتا۔ اس کی کمائی پر نظر رکھنا تو کجا، کبھی یہ بھی نہ پوچھتا کہ اس کی تنخواہ کتنی ہے۔ اس کی سابقہ زندگی کے بارے میں حسبِ وعدہ کبھی کوئی بات نہ کرتا۔ شہریار کے رویّے کا تقاضا تھا کہ وہ بھی ایک اچھی شریکِ زندگی ثابت ہونے کی کوشش کرتی، سو وہ کررہی تھی۔ مختصر عرصے میں ہی شہریار اس کے لیے مرکزِ حیات بن گیا تھا۔ وہ اس کی خدمت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتی۔ ہر معاملے میں شہریار کی خوشی کو عزیز رکھتی۔ گھریلو اخراجات میں برابر سے اس کا ہاتھ بٹاتی۔ تیرے میرے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔
شہریار کے گھر میں اب چار نفوس تھے۔ شہریار، عارفہ، شہریار کی والدہ اور چھوٹا بھائی شہزاد۔ شادی کے بعد شہریار نے اپنی والدہ کے بارے میں عارفہ کو پہلی رات ہی باخبر کردیا تھا کہ ان کا رویہ اس کے لیے مسئلہ بن سکتا تھا، سو وہ ذہنی طور پر تیار تھی۔ بات بات پر ان کا یہ جتانا کہ شہریار کو اچھی سے اچھی لڑکی مل سکتی تھی، اسے آزار پہنچاتا مگر وہ کچھ کہنے سننے سے گریز کرتی۔ ایک خاموشی سو بلائیں ٹالتی ہے کے مصداق شہریار کی والدہ اس کی طرف سے کوئی منفی ردِعمل نہ ہونے پر خود ہی بول بال کر چپ ہوجاتیں۔ شہزاد بھی اپنی والدہ کا ہمنوا تھا۔ بہانے بہانے عارفہ کو یہ احساس دلانے کی کوشش کرتا کہ اس کے بھائی نے ایک طلاق یافتہ لڑکی سے جو بدنام بھی تھی، شادی کرکے اس کی سات نسلوں پر احسان کیا تھا۔ گھر میں بس ایک شہریار ہی تھا جو اس سے ہمیشہ محبت سے بات کرتا، عزت سے پیش آتا۔ نہ کبھی اس کے ماضی کے بارے میں بات کرتا، نہ اس سے شادی کرنے پر احسان دھرتا بلکہ اکثر کہتا۔ "میں خوش قسمت تھا جو مجھے تم جیسی لائف پارٹنر مل گئی۔"
عارفہ کہتی۔ "خوش قسمت میں ہوں۔" کبھی بھولے سے بھی وہ شہریار سے اس کی والدہ اور بھائی کی نازیبا باتوں کا گلہ نہ کرتی۔
عارفہ کے گھر والے اب بھی اسے تشویش سے دیکھتے۔ اس کے بارے میں فکرمند رہتے اور بہانے بہانے سے کھوجنے کی کوشش کرتے۔
"تم خوش تو ہو عارفہ؟" بہنیں پوچھتیں۔
وہ انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کرتی مگر ان کی نگاہوں سے شک رفع نہ ہوتا۔
"کوئی زیادتی تو نہیں کرتا شہریار تمہارے ساتھ؟"

''نہیں، نہیں...... وہ تو بہت اچھے ہیں۔''
''یہ تمہاری کلائی پر نشان کیسا ہے؟''
''تیل کا خالی ڈبا دھو رہی تھی کہ سکھا کر اس میں دال وغیرہ رکھ لوں گی۔ ڈبے کے کنارے سے کلائی پر کٹ لگ گیا۔''
''سچ کہہ رہی ہو؟'' اسے شک سے دیکھا جاتا۔
''ہاں، ہاں...... جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔''
وہ جب میکے جاتی، بھائی اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھتے۔ ''ٹھیک تو ہو بیٹا؟''
''جی بھائی!''
''کوئی مسئلہ تو نہیں؟''
''نہیں بھائی!''
''دیکھو، کوئی بات ہو تو چھپانا مت۔''
''آپ فکر مند نہ ہوں بھائی! سب ٹھیک ہے۔''
''خدا ٹھیک ہی رکھے۔''
چلتے سے بھائی زبردستی اس کی مٹھی میں ہزار دو ہزار دبا دیتے۔
''ضرورت نہیں ہے بھائی۔'' وہ منع کرتی۔
''میں کب کہہ رہا ہوں کہ ضرورت ہے۔ بھائی کے گھر سے بہن کو خالی ہاتھ نہیں جانا چاہیے۔''
''شکریہ بھائی!''
وہ دل ہی دل میں بھائی کی سلامتی کی دعا کرتی۔
بھائی کی ایما پر بھابی ہمیشہ اسے اور اس کے سسرال والوں کو بہانے بہانے کچھ نہ کچھ دیتی رہتیں۔ کبھی اس کے لیے تھری پیس ان سلا جوڑا، کبھی شہریار کے لیے سوٹ کا کپڑا، کبھی اس کی ساس کے لیے گرم چادر، کبھی شہزاد کے لیے سوئیٹر۔ اس کے جہیز کی مسہری کے لیے چادر اور تکیہ، غلافوں کا سیٹ، کبھی گھریلو استعمال کی کوئی چیز تو اکثر گاؤں سے آئی سوغاتوں میں اس کا حصہ۔ بھائی، بھابی یا بہنیں سسرال میں اس کی خیر خبر لینے آتے تو کبھی خالی ہاتھ نہ آتے۔ کبھی شہد کی بوتل، کبھی تازہ پھل۔ سرد موسم میں خشک میوہ جات تو کبھی بلاسبب ہی مٹھائی کا ڈبا۔ آپا عموماً فروزن فوڈز لاتیں۔ ''فریج میں کوفتے، کباب اور سموسے رکھے ہوں تو آسانی رہتی ہے۔'' وہ بڑے پیار سے کہتیں۔ کینیڈا سے بھی کبھی تحائف تو کبھی پیسے آتے رہتے۔ عارفہ رب کی شکر گزار ہوتی کہ اس کے اتنے چاہنے والے رشتے موجود ہیں۔
شہریار دبی زبان سے کہتا۔ ''یار! اپنے گھر والوں سے کہو، اتنا تکلف نہ کیا کریں۔'' وہ ان لوگوں میں سے نہیں تھا جو سسرال والوں سے دامادی کا خراج لینا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اپنے مرحوم و مغفور والد کی طرح غیور اور اپنی عزتِ نفس کا پاس رکھنے والا شخص تھا۔ عارفہ اس کی فطرت و عادات سے خوب واقف ہو چکی تھی۔
''میں منع نہیں کر سکتی شہریار!'' وہ کہتی۔
''کیوں منع نہیں کر سکتیں؟''
''ان کا دل خفا ہوگا۔''
''یار! مجھے اچھا نہیں لگتا۔ ہماری ساری ضرورتیں تو اللہ میاں عزت سے پوری کر دیتے ہیں۔''
''الحمدللہ، شکر ہے رب کا...... مگر میں بھائی، بھابی، آپا کسی کو بھی منع نہیں کر سکتی۔ ان کا دل بھی تو رکھنا ضروری ہے نا شہریار......! ورنہ سوچیں گے یہ شادی کے بعد بدتمیز اور مغرور ہوگئی ہے۔ شادی سے پہلے تو میں خود فرمائشیں کر کر کے مانگا کرتی تھی ان سے چیزیں۔''
''تب کی بات اور تھی، اب تم میری ذمے داری، میری عزت ہو۔ تنگی یا فراخی جیسے بھی ہو، مجھ ہی کو تمہارا خیال رکھنا چاہیے۔''
''آئی لَو یو شہریار!'' وہ اسے محبت سے دیکھتی۔
''لَو یو ٹو۔'' وہ اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے لیتا۔
عارفہ کو اس کی بانہوں کے حصار میں اَن کہا تحفظ محسوس ہوتا۔ وہ بھول جاتی کہ بھائی بہنوں کی سپورٹ کے باوجود زندگی میں پہلے کی سی فراغت نہ رہی تھی۔ انتہائی کفایت شعاری کے باوجود مہینے کے آخری دنوں میں قدرے تنگی ہو جاتی تھی۔ شہریار شادی کے بعد لمبے اوقات کار والی سابقہ ملازمت ترک کر کے اب کم اوقات کار والی ملازمت کر رہا تھا۔ تنخواہ زیادہ نہ تھی مگر عارفہ گھریلو اخراجات میں اس کا پورا پورا ہاتھ بٹاتی۔ اسکول کی ملازمت کے علاوہ اس نے گھر میں بچوں کو ٹیوشن بھی دینا شروع کر دی تھی جس سے اضافی آمدنی ہو جاتی۔ ملازمت اور گھریلو ذمے داریاں اسے تھکا دیتیں مگر وہ شہریار سے کبھی نہ اپنی تکان کا ذکر کرتی، نہ کوئی گلہ کرتی۔ والدہ اور شہزاد کی ذمے داری بھی شہریار پر تھی۔ شہزاد یونیورسٹی میں پڑھ رہا تھا اور خاصا نخریلا اور خرچیلا تھا۔ روزانہ بھائی سے پیسے مانگنے کھڑا ہو جاتا۔ شہریار بھی کبھی کبھی زچ بھی ہو جاتا۔ ''آخر کب تک میں اسے موٹر سائیکل میں پیٹرول ڈلوانے اور یونیورسٹی میں چائے پانی کے لیے پیسے دیتا رہوں گا۔ اسے خود بھی تو کچھ کرنا چاہیے نا۔'' وہ اکثر بڑبڑاتا۔
''کر لے گا شہریار......! تعلیم ختم ہوگی تو اسے خود ہی کرنا ہوگا۔ آپ پریشان نہ ہوا کریں۔'' عارفہ اسے تسلی دیتی۔

''مجھے اچھا نہیں لگتا کہ تمہارے پیسے بھی سارے کے سارے گھر ہی میں خرچ ہو جاتے ہیں۔''

''ہاں تو کیا ہوا۔ میں اپنے گھر کے لیے ہی تو کماتی ہوں۔ آپ ٹینس نہ ہوا کریں۔''

''میرا بس چلے تو تمہیں نوکری ہی نہ کرنے دوں۔ سخت بُرے لگتے ہیں مجھے وہ مرد جو بیویوں کی کمائی پر چلتے ہیں۔ میں بھی انہی میں شامل ہو گیا ہوں۔'' آخری فقرہ وہ کچھ شرمندگی اور ملال سے ادا کرتا۔

''شہریار، پلیز! ایسی باتیں نہ کیا کریں، مجھے کوفت ہوتی ہے۔ میاں بیوی ایک دوسرے کے لائف پارٹنرز ہوتے ہیں۔ جب شریک زندگی بن گئے تو ہر معاملے میں کھلے دل سے شراکت ہونی چاہیے۔ میں جاب کروں اور اپنی مٹھی بند رکھ کر سارا بوجھ آپ پر ڈال دوں تو یہ تو شراکت نہ ہوئی۔ آپ جس قسم کے مردوں کی بات کر رہے ہیں، میں جانتی ہوں آپ اس طرح کے مرد نہیں ہیں۔ یہ ہم دونوں کا گھر ہے۔ آپ کی ماں اور بھائی سے میرا بھی رشتہ ہے۔ خدا جانتا ہے، مجھے اپنے گھر کے لیے کچھ کر کے خوشی اور سکون ملتا ہے۔''

شہریار اسے تحسین و محبت کی نظروں سے دیکھنے لگتا۔

''سدا یہ دن نہیں رہیں گے۔ میرے امیگریشن پروسس میں اب آپ کا نام بھی شامل ہو گیا ہے۔ امیگریشن ہو جاتی ہے تو ہم کینیڈا جا کر امی اور شہزاد کو بھی وہیں بلانے کی کوشش کریں گے۔''

شہریار اسے دیکھنے لگتا۔

''ایسے کیوں دیکھتے ہیں؟''

''بہت بدقسمت تھا وہ شخص۔'' شہریار نے ایسے ہی موقع پر ایک روز کہا۔

''کون؟'' عارفہ نے جانتے بوجھتے انجان بننے کی کوشش کی۔

''جس کا نام بھی میں اپنی زبان پر لانا پسند نہیں کرتا۔ جس نے تم جیسی لڑکی کی قدر نہیں کی...... ایڈیٹ...... باسٹ......'' اس نے دوسری گالی ادھوری چھوڑ دی۔

''بُری بات۔ اچھے بچے زبان گندی نہیں کرتے۔''

''میں اکثر شرمندگی محسوس کرتا ہوں تم سے۔''

''ہیں...... توبہ توبہ! کیوں گناہ گار کرتے ہیں مجھے۔''

''میری ماں تم سے رخ دے کر بات نہیں کرتیں۔ گھر کا سارا کام تمہیں اکیلے ہی کرنا پڑتا ہے۔ صبح کو اسکول جاتی ہو تو سب کو ناشتا دے کر اور امی کے لیے دوپہر کا کھانا بنا کر...... واپس آتی ہو تو گھر کے کاموں میں لگ جاتی ہو۔ گھر کی صفائی، میلے برتنوں اور کپڑوں کی دھلائی، بچوں کو ٹیوشن پڑھانا، شام کی چائے، رات کے کھانے کی تیاری۔ اگلے دن کے لیے کپڑوں پر استری، کبھی اسکول انسپکشن کے لیے چارٹس بنانا تو کبھی مہمانوں کی خاطر مدارات...... اور کبھی خاندان والوں کی غمی خوشی میں جانا۔ اتنے کام، اتنی بھاگ دوڑ اور تم کبھی تھکن کا اظہار بھی نہیں کرتیں، نہ کبھی امی کی بے رخی اور شہزاد کی بدتمیزیوں کا گلہ کرتی ہو۔ مجھے تمہارے ساتھ شہزاد کے انسلٹنگ رویّے کی خبر نہیں ہے کیا۔''

''بس یا کچھ اور؟'' وہ مسکرا کے بولی۔

''نہیں...... ہے تو اور بھی بہت کچھ مگر فی الحال تمہاری سمع خراشی کے لیے اتنا ہی بس۔''

''او کے...... میں صرف اتنا کہوں گی کہ جو میں کرتی ہوں، کسی پر کوئی احسان نہیں۔ اس گھر کو مکان بننے سے بچانا اور گھر بنائے رکھنا میرا فرض ہے۔ مجھے آپ کی امی جی کی بے رخی کا بھی کوئی گلہ نہیں۔ ماؤں کے اپنے بیٹوں کے لیے کچھ ارمان، کچھ خواب ہوتے ہیں۔ یہ ان کا احسان ہے کہ انہوں نے اپنے خوابوں کی قربانی دے کر مجھے اس گھر میں قبول کیا۔''

''یار! کمال کی پازیٹو سوچ ہے تمہاری۔''

''جیتے رہیے...... خوش رہیے۔''

''خوش تو میں بہت ہوں۔ تم جیسی بیوی تو قسمت والوں کو ملتی ہے۔''

''جزاک اللہ!''

وقت کے ساتھ اس کے بارے میں میکے والوں کا تفکر اور خدشات کم سے کم ہوتے گئے پھر بھی بھائی کبھی کبھی پوچھ لیتے۔ ''بیٹا تم خوش تو ہو؟''

''جی بھائی!''

''کوئی مسئلہ؟''

''کوئی مسئلہ نہیں بھائی...... شہریار بہت خیال رکھتے ہیں میرا۔ بہت اچھے ہیں۔''

''خدا ہمیشہ اچھا ہی رکھے۔''

بڑے بھائی ہمیشہ اس پر باپ کی سی شفقت رکھتے تھے تو چھوٹا کینیڈا مقیم بھائی اس کا دوست اور ہمراز تھا۔ جو بات وہ کسی اور سے نہ کہہ پاتی، اس سے کہہ دیتی۔ ہفتے میں ایک دو مرتبہ اس کا فون آ جاتا۔ حال احوال، امیگریشن کی صورت حال، سب پر تفصیلی گفتگو ہوتی۔ وہ ایک ایک بات اس سے ایسے شیئر کرتی جیسے قریبی دوست سے کی جاتی ہے۔ شہریار سے بھی محسن کی خوب گپ شپ رہتی۔ دونوں میں

خاصی بے تکلفی ہوگئی تھی۔
''اسپیکر آن کرنا یار!'' محسن، شہر یار سے کہتا۔
''کر دیا محسن بھائی!''
''عارفہ تمہیں تنگ تو نہیں کرتی شہر یار؟'' محسن مذاقاً کہتا۔
''نہیں محسن بھائی! عارفہ نے تو مجھے بالکل ریلیکس کر دیا ہے۔''
''مذاق مت کرو یار!''
''سچ کہہ رہا ہوں۔''
''اچھا!'' محسن اپنے لہجے سے حیرت کا اظہار کرتا۔ ''میری یہ چھوٹی، پاگل، دیوانی سی بہن ایسی کب سے ہوگئی؟''
''جب سے اس کی مجھ سے شادی ہوئی ہے۔''
''لگی ہے یار کہ تم سے شادی کر کے سنبھل گئی ہے۔''
''چھوٹے بھائی......!'' دونوں کی باتیں سنتی عارفہ شاکی لہجے میں قدرے بلند آہنگی سے کہتی۔ ''مت انڈر ریٹ کریں مجھے، میرے میاں کے سامنے۔''
''پگلی! میں انڈر ریٹ کروں گا تجھے......؟ اور وہ بھی تیرے میاں کے سامنے...... جو تجھے تیری اور ہماری توقع سے زیادہ اوور ریٹ رکھتا ہے۔'' محسن کہتا۔
''بھائی! شہر یار بہت اچھے ہیں۔''
''آئی نو...... آئی نو...... میری بہن کو اللہ نے اس کے صبر کا بہترین اجر دیا ہے۔ ہم سب شہر یار کی بہت قدر، بہت عزت کرتے ہیں۔''
عارفہ جہان بھر کی الفت اپنی نظروں میں سمو کر شہر یار کو دیکھتی۔ بھول جاتی کہ سسرال کے ڈھائی مرلہ مکان میں اسے اپنے میکے کی آسانیاں اور فراغت نہ رہی تھی۔ چھوٹا سا دو منزلہ مکان تھا جس کی بالائی منزل پر تعمیر ادھوری تھی۔ نہ دیواروں پر پلاستر ہوا تھا، نہ فرش پر موزائیک یا ٹائلز لگے تھے۔ رنگ و روغن کا تو سوال ہی نہ تھا۔ پانی نیچے سے بھر کر لانا پڑتا۔ بجلی کی فراہمی بھی عارضی طور پر نیچے ہی سے تھی۔ شادی کے بعد شہر یار کی والدہ نے ہفتہ عشرہ تو بہو بیٹے کو نیچے ہی رکھا پھر اوپر شفٹ کر دیا تھا۔ شہر یار اس سے معذرت خواہ اور شرمندہ ہوا تھا۔ ''گھر چھوٹا ہے عارفہ! امی بے چاری بوڑھی ہیں۔ بار بار اوپر نیچے نہیں جا، آسکتیں اس لیے انہوں نے ہمیں اوپر شفٹ کر دیا ہے۔''
''کوئی بات نہیں۔'' اس نے کہا تھا۔
مگر جلد ہی مشکلات کھل گئیں۔ پکانے اور نہانے دھونے کے لیے نیچے سے پانی بھر کر لانا پڑتا۔ گو یہ کام زیادہ تر شہر یار ہی کرتا لیکن اس کی عدم موجودگی میں اسے بھی کرنا پڑ جاتا تھا۔ زیادہ پانی کی ضرورت ہوتی تو وہ پانی سے بھری بالٹی اوپر لاتے لاتے ہانپ جاتی تھی۔ بجلی کا بل کم رکھنے کی خاطر شہر یار کی والدہ بجلی فراہمی کا مین سوئچ زیادہ تر آف ہی رکھتیں۔ کھانا پکانے اور دوسری بہت سی ضروریات کے لیے عارفہ کو دن میں کئی مرتبہ اوپر سے نیچے اور نیچے سے اوپر آنا جانا پڑتا۔ اچھی خاصی پریڈ ہو جاتی۔ رات بے رات کسی وقت چولہا جلانے کی ضرورت ہوتی تو نیچے ہی جانا پڑتا۔ چولہا جلتے ہی ساس کی آواز آتی۔ ''تم لوگوں کو رات کو بھی چین نہیں۔''
''امی! شہر یار کا گلا خراب ہو رہا ہے۔ غراروں کے لیے پانی گرم کرنے آئی ہوں۔'' وہ عذر خواہانہ لہجے میں کہتی...... یا پھر...... ''شام کو شہر یار نے ٹھیک سے کھانا نہیں کھایا تھا۔ انہیں بھوک لگ گئی ہے۔ سالن گرم کر رہی ہوں۔'' لہجہ عذر خواہی میں ڈوبا ہوتا۔
''تم لوگوں کا تو یہی ہے۔ آرام سے سونے بھی نہیں دیتے۔'' بڑی بی غصیلی آواز میں کہتیں۔
وہ اوپر جا کر شہر یار سے کچھ کہنے سننے سے گریز کرتی مگر رات کے سناٹے میں ماں کی آواز پہلے ہی اوپر پہنچ چکی ہوتی۔
''امی غصہ ہو رہی تھیں نا؟'' وہ آہستہ سے کہتا۔
''بے چاری دن بھر کی تھکی ہوتی ہیں۔''
حالانکہ وہ بے چاری دن بھر بیٹھنے، لیٹنے یا گھر آئی ہمسائیوں سے گپ شپ کے سوا اور کرتی ہی کیا تھیں۔
''اب کیسی ہی ضرورت ہو، کتنی ہی بھوک لگے، رات کو تمہیں نیچے جانے کو نہیں کہوں گا۔''
''او ہو شہر یار! کیوں سر پر سوار کر رہے ہیں اپنے۔''
''تمہیں میری وجہ سے امی کی سننا پڑی۔''
''گھر کے بڑے کہہ سن دیتے ہی ہیں شہر یار!''
''اب نہیں بھیجوں گا تمہیں۔''
مگر پھر کوئی ضرورت مجبور کر دیتی۔ کبھی شہر یار بھی اس کے ساتھ ہوتا۔
''شہری! تیری شادی کر کے تو میرا سکھ چین ہی جاتا رہا۔'' شہر یار کی والدہ باقاعدہ دہاڑتیں اور وہ دونوں چور سے بن جاتے۔
شہر یار اکثر اس سے معذرت خواہ ہوتا۔ ''یار! میں دیکھتا ہوں، امی کا رویہ تمہارے ساتھ اچھا نہیں ہے۔''
''آپ کو کیا پتا...... اپنے گھر میں، میں اللہ بخشے امی سے کتنی ڈانٹ سنتی رہی ہوں۔'' وہ شہر یار کا دل رکھنے کو اپنے

دل کی کلفت دبا کر مسکرانے کی کوشش کرتی۔
''وہ تو تمہاری امی تھیں نا۔''
''یہ بھی میری امی ہی کی جگہ ہیں۔ لائف پارٹنرز ہونے کا مطلب تو یہی ہے نا کہ بیوی اور شوہر ہر شے، ہر رشتہ، ہر دکھ سکھ شیئر کریں۔''
''تم بہت اچھی ہو عارفہ!''
''اپنے بارے میں جناب کا کیا خیال ہے؟''
''میں تو محدود وسائل والا آدمی ہوں۔ تمہیں کچھ نہیں دے سکا۔''
''اتنی محبت مجھے دے کر بھی کہتے ہیں...... کچھ نہیں دے سکا۔''
''خالی خولی محبت سے کیا ہوتا ہے عارفہ؟''
''میرے لیے تو آپ کی محبت ہی سب کچھ ہے شہر یار!''
''گلٹ فیل کرتا ہوں۔'' شہر یار اپنے مؤقف سے دستبردار نہ ہوتا۔
''اچھا تو پھر میرے پیچھے کیوں آئے تھے؟''
''کب؟''
''شادی سے پہلے۔''
''یار! اس وقت تو میں جذباتی ہو گیا تھا۔ بس یہی لگن تھی میری کہ کسی طرح تم سے شادی کرلوں۔''
''اس لگن کو لگن ہی رہنے دیں۔ آپ کی وہ لگن میری زندگی کا سب سے اہم موڑ ہے۔''
''لو یو!''
''لو یو ٹو۔''

☆☆☆

وہ امید سے ہوئی تو کبھی اوپر، کبھی نیچے کی بھاگ دوڑ اسے زیادہ تھکانے لگی۔ اس حالت میں کبھی بالٹی، کبھی ڈبے میں پانی بھر کر نیچے سے اوپر لے جانا اور بھی مشکل ہونے لگا۔ گو شہر یار اس کی حالت کے پیش نظر پانی نیچے سے اوپر لانے کا کام اکثر خود ہی کرتا مگر کبھی اس کی عدم موجودگی میں پانی ختم ہو جانے کی صورت میں عارفہ کو خود ہی نیچے سے پانی بھر کر اوپر لانا پڑتا۔ نہ ساس کو اس پر ترس آتا، نہ شہزاد کبھی ہاتھ بٹانے کی کوشش کرتا۔ دونوں دیکھتے رہتے کہ اسے مشکل ہوتی تھی مگر نہ ساس، شہزاد سے پانی سے بھری بالٹی یا ڈبا اوپر پہنچا آنے کو کہتیں، نہ شہزاد کو خود کبھی احساس ہوتا۔ ان کی بے حسی عارفہ کو ملول کر دیتی مگر شہر یار سے وہ کبھی گلہ نہ کرتی۔
مشکل کیسی بھی ہو، گزر ہی جاتی ہے۔ عارفہ کے مشکل دن بھی گزر ہی گئے۔ بیٹے کی پیدائش نے عارفہ کی زندگی کو ایک نئے رشتے کی خوشبو سے آشنا کیا۔ وہ اور شہر یار دونوں طے کر چکے تھے کہ بیٹا ہوا تو اس کا نام شایان رکھیں گے، بیٹی ہوئی تو عامرہ...... شہر یار کی والدہ نے اس موقع پر بھی سنگ دلی دکھائی۔ بچہ آپریشن سے ہوا تھا۔ بڑی بی چاہتیں تو کچھ دن عارفہ کو گھر کی نچلی منزل پر ہی رکھ سکتی تھیں مگر انہوں نے ایسا نہ کیا۔ بھائی نے تو اسے کچھ عرصہ میکے میں رہنے کو کہا تھا مگر وہ جانتی تھی شہر یار کو سسرال میں رہنا گوارا نہ ہوگا لہٰذا اس نے اسپتال سے چھٹی کے بعد اپنے ہی گھر جانے کو ترجیح دی تھی اور وہاں اسے زینہ چڑھنا مشکل ہوا مگر مجبوری تھی۔
ساس نے تکلفاً دو چار دن تو نیچے سے کھانا بھجوایا پھر ہاتھ جھاڑ دیے۔ اس نے بھائی بہنوں کو نہ بتایا مگر وہ آنکھیں تو رکھتے تھے۔ بھائی نے ٹفن کیریئر میں کھانا بھجوانا شروع کر دیا۔ شہر یار کو اچھا نہ لگا۔
''عارفہ! مجھے اچھا نہیں لگتا۔ اپنے گھر والوں کو منع کر دو کہ تکلیف نہ کریں۔ جب تک تم ٹھیک نہیں ہو جاتیں، میں ہانڈی خود پکا لیا کروں گا اور نان تنور سے لے آیا کروں گا۔''
''شہر یار! مجھے خود بھی اچھا نہیں لگتا۔ دو چار دن برداشت کرلیں پھر میں منع کر دوں گی۔''
اور اس نے ایسا ہی کیا۔ بہت طریقے سے بھائی اور بھابی کو کھانا بھجوانے سے منع کر دیا۔ ''اسکول بھی تو جانا ہے مجھے۔ گھر کا کام شروع کروں گی تو اسٹیمنا بنے گا۔''
اسکول سرکاری تو تھا نہیں کہ اسے بچے کی ولادت سے ڈیڑھ ماہ قبل اور ولادت کے بعد ڈیڑھ ماہ کی چھٹی ملتی۔ پرائیویٹ اسکول تھا اور انتظامیہ کے اپنے قواعد و ضوابط تھے۔ چار ہفتوں کی رخصت ملی اور وہ بھی سیکشن ہیڈ مسز فیاض کی پُرزور سفارش پر مع تنخواہ۔ وہ مسز فیاض کی بہت ممنون ہوئی۔
اسکول سے اس کی رخصت ختم ہونے سے قبل ہی شہر یار کی والدہ نے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ بچے کی دیکھ بھال کی ذمے داری اپنے سر نہیں لیں گی۔ شہر یار نے کہا۔ ''نوکری چھوڑ دو۔''
''کیسے چھوڑ دوں شہر یار؟ ابھی گزارہ مشکل سے ہوتا ہے، نوکری چھوڑوں گی تو اور تنگی ہو جائے گی...... اور اب تو شایان کے خرچے بھی ہیں۔''
''پھر؟''
''آپا اور بھابی دونوں تیار ہیں اسے رکھنے کو مگر صبح کو اسے ان کے پاس چھوڑنا اور واپسی پر لینا بھی مسئلہ ہوگا۔''
''صبح کو میں چھوڑتا ہوا چلا جایا کروں گا۔ واپسی پر تم

لے لیا کرنا۔'' شہریار نے تجویز دی۔

''آپ!'' اس نے قدرے تعجب سے کہا۔ ''اچھا لگے گا بھلا کہ آپ بچے کو اس کے بے بی بیگ کے ساتھ لیے ویگن میں سفر کر رہے ہیں۔''

''تم بھی تو دوپہر کو اسے بے بی بیگ کے ساتھ ویگن میں سفر کر کے گھر واپس لایا کرو گی۔''

''یہ کوئی عجوبہ بات نہیں ہوگی۔ بے شمار ملازمت پیشہ مائیں ایسا ہی کرتی ہیں۔''

''بچہ کیا صرف ماں ہی کی ذمے داری ہے۔ باپ کو بھی ذمے داری اٹھانا چاہیے۔''

''میں اپنی سیکشن ہیڈ سے بات کروں گی۔ اگر انہوں نے اجازت دی تو میں اسے اپنے ساتھ اسکول ہی لے جایا کروں گی۔ واپسی پر اسے لینے جانے کے لیے لمبے چکر سے بھی بچ جاؤں گی۔ اسکول میں آیا ہے، اسے تھوڑے سے پیسے دے دیا کروں گی۔ وہ دیکھ لیا کرے گی اسے۔ فری پیریڈ میں، میں بھی دیکھ لیا کروں گی۔''

''تمہارا کیا خیال ہے، وہ اجازت دے دیں گی؟''

''بات کر کے دیکھوں گی۔''

''انہیں یہ تو معلوم ہوگا کہ گھر میں تمہاری ساس بھی ہیں۔''

''ہاں، یہ تو معلوم ہے انہیں۔''

''وہ یہ نہیں کہیں گی کہ تمہاری ساس نہیں رکھ سکتیں بچے کو؟''

''کہہ دوں گی، بوڑھی ہیں، انہیں مشکل ہوگی۔ ویسے وہ ایسی خاتون ہیں نہیں۔ کسی کی ذاتیات میں زیادہ نہیں گھستیں۔ یا تو وہ اجازت دے دیں گی یا نہیں دیں گی۔''

''تمہاری کولیگز کو بھی اعتراض ہو سکتا ہے۔''

''دیکھتے ہیں شہریار، کیا ہوتا ہے۔''

عارفہ لاکھ مسز فیاض کی گڈ بکس میں سہی، مسز فیاض ایک اصول پسند خاتون اور اچھی منتظم تھیں۔ عارفہ کو انہوں نے بچے کو اسکول لانے اور دن بھر وہیں رکھنے کی اجازت نہ دی کہ باقی ٹیچرز میں بھی بہت سی چھوٹے بچوں کی مائیں تھیں، وہ بھی ایسی ہی کسی سہولت کا تقاضا کر سکتی تھیں۔ انصاف تو یہی تھا کہ سہولت ہو تو سب کے لیے ورنہ کسی کے لیے بھی نہیں۔ علاوہ بریں وہ خود بھی ادارے کی ملازمہ اور قواعد و ضوابط کی پابند تھیں۔ انتظامیہ کے علم میں لائے بغیر کسی ماتحت کو ایسی کوئی سہولت دینا جس سے ادارے کے انتظام و انصرام میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہوتا، انہیں انتظامیہ کے سامنے جوابدہ ہونا ٹھہرتا لہٰذا انہوں نے عارفہ کو بچہ اسکول لانے کی اجازت تو نہ دی البتہ متبادل بندوبست کر دیا۔ اسکول کے نزدیک ان کی ایک دوست رہتی تھیں جن کی ایک ہی بیٹی تھی جسے انہوں نے اس کی ٹین ایج میں ہی اپنے بھانجے سے جو امریکا میں مقیم تھا، بیاہ دیا تھا۔ شوہر سرکاری افسر تھے۔ ایک ملازمہ صبح تا شام ان کے ہاں ہوتی۔ مسز فیاض نے عارفہ کے بچے کو ان کے ہاں رکھنے کی سفارش کی تو انہوں نے تامل نہ کیا۔ بچے کی دیکھ بھال کے لیے عارفہ نے ان کی گھریلو ملازمہ کو ماہانہ کچھ پیسے دینے کا طے کر لیا۔ صبح کو اسکول آتے ہوئے عارفہ بچے کو ان کے ہاں چھوڑ دیتی، چھٹی کے بعد اسے لیتے ہوئے گھر چلی جاتی۔ وقفے میں اکثر وہ شایان کو دیکھنے چلی جاتی۔

ساتھ رہنے سے تو انسان بے زبان جانوروں سے بھی محبت کرنے لگتا ہے۔ مسز فیاض کی دوست شہلا معین کو شایان سے ایسا انس ہوا کہ جس دن چھٹی ہوتی، اس سے اگلے دن عارفہ بیٹے کو ان کے ہاں چھوڑنے جاتی تو وہ نہایت خلوص سے کہتیں۔ ''مس عارفہ! ہم نے کل اپنے دوست کو بہت مس کیا۔''

''میں ساری زندگی آپ کی اور مسز فیاض کی شکر گزار رہوں گی۔'' عارفہ انکسار سے اپنی ممنونیت کا اظہار کرتی۔

''شکر گزاری کیسی؟ تمہارے بیٹے کی موجودگی سے تو میرے گھر میں رونق رہتی ہے۔''

''تھینک یو۔''

مسز فیاض کے توسط سے ملی اس سہولت پر جو بلاشبہ اللہ کی رحمت ہی سے اسے میسر ہو سکی تھی، وہ اپنی آئندہ زندگی میں مسز فیاض اور ان کی دوست کی سدا ممنون رہی۔

☆☆☆

شایان ابھی چھوٹا ہی تھا کہ وہ دوبارہ امید سے ہو گئی۔ ساس نے تنک کر کہا۔ ''ابھی ایک ہی نہیں پلا اور تم دوسرے کی تیاری کر بیٹھیں۔'' اس کے جی میں تو آیا کہ کہے پہلے کی دیکھ بھال میں آپ نے میرا کون سا ساتھ دیا جو آپ دوسرے کی خبر سے پریشان ہو رہی ہیں...... مگر اس نے خاموش رہنے میں عافیت سمجھی۔ امی کہا کرتی تھیں ایک خاموشی سو بلاؤں کو ٹالتی ہے۔

مسز فیاض کو علم ہوا تو وہ محتاط لہجے میں بولیں۔ ''بہت جلدی ہے مس عارفہ!''

''سوری میڈم!'' اس نے یوں سر جھکایا جیسے اعتراف جرم کر رہی ہو۔

مسز فیاض مسکرا دیں اور اس کے کندھے پر ہاتھ

دھرتے ہوئے بولیں۔ ''شرمندہ ہونے کو تو نہیں کہا میں نے۔''
''میڈم! میں خود نہیں چاہتی تھی اتنی جلدی مگر......''
اس نے کہا۔
''اللہ کی مرضی۔'' مسز فیاض نے گرہ لگائی۔
''یس میڈم!''
''میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ ابھی تو تم ایک بچہ ہی پال کر بڑا نہیں کرسکیں۔ صبح کو اسکول آتے ہوئے میں اکثر دیکھتی ہوں تمہیں کہ کندھے پر اپنا اور بے بی بیگ لٹکائے بچے کو گود میں اٹھائے تم کتنی بھاگ دوڑ میں اسکول آرہی ہوتی ہو۔ دو دو بچے کیونکر سنبھالو گی؟''
''میڈم! آپا کہتی ہیں دوسرے کو وہ رکھ لیں گی اپنے پاس۔ چھٹی والے دن میں اسے گھر لے جایا کروں گی۔''
''کتنی مشکلات ہوتی ہیں ملازمت کرنے والی ماؤں کو۔'' مسز فیاض نے اسے ہمدردانہ نظروں سے دیکھا۔
''جی میڈم! ہوتی تو ہیں۔ میرا دل تو ابھی سے اس خیال سے دکھتا ہے کہ کیسے چھوڑوں گی اسے آپا کے پاس۔''
مسز فیاض نے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ کر اسا دینے کی کوشش کی اور بولیں۔ ''خوش قسمت ہو کہ تمہاری بہن تمہیں سپورٹ دینے کو موجود ہیں۔ مسز رحمان کی تین بچیاں ہیں۔ سب سے بڑی کو تو انہوں نے وقت سے پہلے ہی کنڈر گارٹن میں داخل کرادیا تھا۔ دو چھوٹی بچیاں گھر میں ہوتی ہیں جن کی پیدائش میں بہت کم وقفہ رہا۔ ان میں سے ایک غالباً ڈھائی سال کی ہے اور چھوٹی چھ سات ماہ کی۔ چند دن پہلے مسز رحمان نے مجھے بتایا کہ چھوٹی بچی کو وہ دوسری بچی کے رحم و کرم پر چھوڑ کر آتی ہیں۔ دودھ کی بوتلیں وہ تیار کرکے رکھ آتی ہیں۔ بڑی والی بچی کو جو بے چاری خود ابھی ڈھائی سال کی ہے، سمجھادیا ہے کہ جب چھوٹی بہن روئے تو اسے دودھ کی بوتل منہ سے لگادینا۔''
''مائی گاڈ!'' عارفہ نے اپنے دونوں ہاتھ دائیں بائیں رخساروں پر رکھتے ہوئے جھرجھری لی۔ ''بچی کو اچھو لگ جائے...... ناک میں دودھ چلا جائے...... الٹی ہوجائے...... کچھ بھی ہوسکتا ہے میڈم!''
''ہاں...... کچھ بھی ہوسکتا ہے۔'' مسز فیاض نے تائید کی۔ ''کوئی بھی ایمرجنسی!''
''مسز رحمان کو بچیوں کو اس طرح چھوڑ کر نہیں آنا چاہیے۔''
''کیا کریں بے چاری! ہسبنڈ، وائف دونوں جاب کرتے ہیں۔ گھر میں کوئی اور ہے نہیں بچیوں کی دیکھ بھال کرنے والا۔''
''کوئی میڈ رکھ لیں۔''
''میڈز کے نخرے کتنے ہوتے ہیں اور پھر مسز رحمان کی اپنی تنخواہ ہی کتنی ہے۔ جو کمائیں اس میں سے آٹھ دس ہزار میڈ کو دے دیں تو خود انہیں کیا بچے گا۔''
''آپ ٹھیک کہتی ہیں۔''
''ملازمت پیشہ ماؤں کی بہت مشکلات ہیں۔ بالخصوص وہ جن کی نوکریاں کچھ زیادہ نہیں دیتیں، بس آنسو پونچھنے کا ذریعہ ہیں۔'' مسز فیاض نے توقف کیا پھر قدرے دل گرفتگی سے بولیں۔ ''رشتوں میں ایسی خود غرضی آگئی ہے کہ سگے خونی رشتے ایک دوسرے کے مسائل شیئر کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔''
''تھینکس گاڈ میڈم! میرے بہن بھائی تو بہت اچھے ہیں۔ بہت سپورٹ دیتے ہیں۔ مجھے تو شایان کے لیے بھائی اور دونوں بہنوں نے آفر دی تھی کہ وہ شایان کو لک آفٹر کرلیں گی مگر روزانہ چھوڑنے اور لینے کا مسئلہ تھا۔ بھائی نے تو یہ بھی کہا کہ شایان منڈے سے فرائیڈے تک ان کے پاس رہے، ویک اینڈ پر میں اپنے گھر لے جایا کروں مگر میرے ہسبینڈ راضی نہیں ہوئے۔''
''بہر حال، اب دوسرے بچے کے لیے تو تمہیں اپنے گھر والوں ہی سے مدد لینا ہوگی۔ میں شاید شہلا سے دوبارہ نہ کہہ سکوں گی۔''
''جی، جی میڈم...... میں آپ کو کسی تکلیف میں نہیں ڈالوں گی۔''
''میرا خیال ہے تم میری مجبوری سمجھ رہی ہو۔''
''جی میڈم! بالکل سمجھ سکتی ہوں۔''
''ویسے میری عادت تو نہیں کسی کے ذاتی معاملات میں مدخل ہونے کی لیکن چونکہ تم مجھ سے شیئر کرتی ہو اس لیے...... مجھے...... تمہاری مدر ان لاء کا رویہ یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ ساس یہ کیوں بھول جاتی ہے کہ وہ خود بھی کبھی کسی کی بہو، کسی کی بیٹی رہ چکی ہے۔''
''میڈم! میں نے تو سوچ رکھا ہے کہ اپنے بیٹے کی دلہن کی آئیڈیل ساس بنوں گی۔''
مسز فیاض دھیرے سے مسکرادیں۔ ''ساس بننے سے پہلے غالباً ہر بیٹے کی ماں یہی کہتی ہے۔''
''میری ساس کا معاملہ ذرا مختلف ہے میڈم!'' عارفہ کی آواز دھیمی اور لہجے میں قدرے دل شکستگی تھی۔
''کیا مختلف ہے؟'' مسز فیاض نے اسے چونک کر دیکھا۔
''ان کا بیٹا کنوارا تھا اور میں طلاق یافتہ ماں کے اپنے

بیٹے کی شادی کے لیے کچھ خواب تو ہوتے ہیں نا میڈم!''

''بالکل ہوتے ہیں لیکن ہم انسانوں میں ایک دوسرے کا درد شیئر کرنے کی ریت ہونی چاہیے۔ جب آپ کسی دکھی شخص کو دردمندی سے اپنے گلے لگاتے ہیں تو اللہ پاک بھی آپ کے لیے آسانیوں کے در کھولتے چلے جاتے ہیں۔''

عارفہ کا جی بھر آیا۔ اپنی پہلی شادی سے پہلے اس نے کب سوچا تھا کہ زندگی ایسی خارزار بھی ہوتی ہوگی۔ وہ تو اپنی ہی دنیا میں گم رہنے والی لڑکی ہوتی تھی جس کا اس وقت تک کا سب سے بھرپور عشق اس کی ماں تھی۔ فرصت کے اوقات میں وہ کہانیاں پڑھتی، کہانیاں لکھتی تھی۔ شوقیہ شاعری بھی ہو جاتی۔ کبھی بہن بھائیوں کے بچوں کے لیے چھوٹی چھوٹی نظمیں، کبھی دوستوں کی فرمائش پر یونیورسٹی کے سبزہ زار پر موسم سرما کی چمکیلی دھوپ میں تک بندی اور کبھی کسی بڑے شاعر کی کوئی تخلیق دل کو لگ جانے پر اسی بحر میں طبع آزمائی۔

زندگی بدل گئی تھی۔ نہ وہ فرصت رہی تھی، نہ وہ مشاغل۔ کولہو کے بیل کی طرح بس ایک ہی ردھم میں صبح سے شام تک گھومتے رہنا۔ گھرداری، نوکری، بچے کی دیکھ بھال، شوہر کی خوشنودی۔ زندگی جیسے ایک دائرے میں مقید ہو گئی تھی۔ وہ تو کرم تھا خدا کا کہ اس دائرے میں اسے ایک اچھے شوہر کا ساتھ نصیب تھا ورنہ مشکل ہوتی۔ وہ خدا کے اس کرم پر دن میں نہ جانے کتنی مرتبہ خدائے مہربان کا شکر ادا کرتی تھی۔ امی کہا کرتی تھیں...... شوہر اچھا ہو تو عورت ہر مشکل جھیل جاتی ہے...... سو وہ جھیل رہی تھی اور خدا کا شکر ادا کرتی تھی۔

☆☆☆

عامرہ کی پیدائش نے اس کی مصروفیت میں مزید اضافہ کر دیا۔ ماں ہونے کے ناتے بچی کو ہفتے میں پانچ دن کے لیے بھائی یا بہن کے گھر رکھ کر اپنی نظروں سے دور کرنا نہ اسے گوارا ہوا نہ ہی شہریار آمادہ ہوا۔ ساس کا رویہ وہی تھا۔ اب بھی اسے آزار پہنچانے کو ستاتیں۔ ''شہریار کے لیے تو بہتیرے رشتے تھے۔ ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت اور مالدار گھر کی لڑکی۔ بس اس کی اپنی عقل پر پردے پڑ گئے تھے۔''

''امی! میرے لیے تو بہت دیکھ بھال کر لانا۔ کوئی طلاق یافتہ یا خلع والی نہ ہو۔'' شہزاد اسے چڑکا لگانے کو کہتا۔

''بیٹا! تو وقت آنے دے۔ تیرے لیے تو میں صاف ستھری، نیک نام لڑکی لاؤں گی۔''

عارفہ سمجھ جاتی کہ وہ عمیم اور اس کے گھر والوں کی اس کے بارے میں پھیلائی گئی نازیبا باتوں کا طعنہ دے رہی تھیں۔ وہ تلملا تو جاتی مگر زبان سے کچھ نہ کہتی۔ خدا سے لو لگاتی اور ناکردہ گناہوں کے طعن و تشنیع سے چھٹکارے کی دعا کرتی۔

عامرہ کو صبح بھائی کے ہاں چھوڑنے جاتی۔ شایان کو اپنے ساتھ لے جاتی، اسے شہلا معین کے ہاں چھوڑنا ہوتا۔ اچھی خاتون تھیں۔ کبھی ناک بھوں نہ چڑھاتیں۔ عامرہ کے سلسلے میں اس نے ان سے کوئی بات نہ کی تھی پھر بھی ایک روز وہ خود ہی بولیں۔ ''مجھے تمہاری بچی کو بھی اپنے ہاں رکھنے میں کوئی اعتراض نہ تھا مگر میری میڈ کو گھر کے کام نہ کرنے کا بہانہ مل جاتا۔''

''کوئی بات نہیں شہلا آپا! شایان کے سلسلے میں آپ نے میری جو مدد کی، میں زندگی بھر آپ کی احسان مند رہوں گی۔''

''نہیں، نہیں...... احسان مندی کی کوئی بات نہیں۔ سچ بتاؤں تمہیں...... جب تمہاری میڈم فیاض نے مجھ سے تمہاری پرابلم کا ذکر کیا اور میری مدد چاہی تو مجھے اپنی بیٹی کا خیال آیا۔ اس کا ایک ہی بیٹا ہے۔ اس کا شوہر اور وہ خود دونوں ملازمت کرتے ہیں۔ جب بچہ چھوٹا تھا تو اسے اس کی دیکھ بھال میں کافی پرابلم رہی۔ مجھے بلانے کی کوشش کرتی رہی مگر مجھے ویزا نہ ملا۔ بے بی کیسرز ہوتے ہیں مگر وہ چھوڑنا نہیں چاہتی تھی ان کے پاس۔ آخرکار میرے داماد کے ایک کولیگ کی بیوی نے جو ہاؤس وائف تھی، میرے نواسے کی دیکھ بھال میں ان کی مدد کی۔ تمہیں پرابلم میں دیکھ کر میں نے سوچا، آخر کسی نے پردیس میں میری بیٹی کی بھی تو مدد کی۔ مجھے بھی تمہاری مدد کرنا چاہیے۔''

''آپا! سب لوگ اگر اسی طرح سوچنے لگیں تو زندگی کتنی آسان ہو جائے۔'' عارفہ نے ممنونیت سے کہا۔

''بات یہ ہے بی بی کہ دوسرے کے درد کا احساس اسی کو ہوتا ہے جسے خود کبھی ویسا ہی درد ہوا ہو۔''

''ٹھیک کہتی ہیں آپ۔'' اس کی آنکھوں کے گوشے اس خیال سے نم ہو گئے کہ شہریار کی والدہ کو اس کے درد کا احساس شاید اسی لیے نہیں تھا کہ وہ بیٹی کی ماں نہیں تھیں۔ امی کتنا خیال رکھا کرتی تھیں بھابی کا۔ چھوٹی تو خیر تھی ہی کینیڈین نژاد۔ بھائی کے ساتھ ہی کام کرتی تھی۔ ایک دوسرے کے لیے پسندیدگی ہو گئی۔ شادی کینیڈا میں ہی ہوئی۔ ولیمے کے لیے دلہا، دلہن اور دلہن کے والدین اور بہن بھائی چند دن کے لیے پاکستان آئے تھے۔ بڑی بھابی کے ساتھ امی تقریباً پندرہ سولہ سال رہیں۔ جہاں چار برتن

ہوں، وہاں کبھی نہ کبھی کھٹ پٹ ہو ہی جاتی ہے۔ امی کو جب کبھی یہ احساس ہوتا کہ ان سے بھابی کے حق میں کوئی زیادتی ہوگئی ہے، فوراً معذرت کرتیں اور بہو کو گلے لگا لیتیں اور کہتیں میں اگلے جہان کی دین دار نہیں رہنا چاہتی۔ میری بیٹیاں بھی دوسرے گھروں میں ہیں۔ اگر میں بہو کا قرض اپنے سر رکھوں گی تو میری بیٹیوں کو قرض اتارنا پڑے گا۔

شہریار کی والدہ تو بہانے بہانے اسے چرکے لگاتی تھیں۔ نہ کبھی معذرت کرتیں، نہ اس سے محبت کا برتاؤ کرتیں۔

☆☆☆

خبر ملی کہ عمیم کی دوسری بیوی پہلے بچے کی پیدائش کے بعد بچے کو لے کر اپنے میکے چلی گئی تھی اور اس نے طلاق کا مطالبہ کر دیا تھا۔ عارفہ نے تو اپنے اور عمیم کے چند دن کے ساتھ میں اسے شکی اور تشدد پسند ہی پایا تھا مگر اس کی دوسری بیوی کے بقول وہ شکی اور عورت کو مختلف طریقوں سے آزار پہنچانے کے ساتھ بلا کا دشنام طراز، نکما اور نشے باز بھی تھا۔ ایسی ایسی فحش گالیاں بکتا کہ سننے والے کی طبیعت مکدر ہو جاتی۔ نکما ایسا کہ کئی کئی دن کام پر نہ جاتا۔ پکی ملازمت بھی محض فسانہ تھا۔ آئے دن نئی جگہ پر نوکری کرتا مگر اس کی آئے روز کی چھٹیوں سے تنگ آ کر اسے ملازمت دینے والے اس کی چھٹی کر دیتے۔ چرس کا نشہ کرتا تھا۔ عارفہ کو اپنے گھر والوں کے ذریعے سننے میں آیا کہ عمیم کی دوسری بیوی جو اسی محلے کی رہائشی تھی اور اتفاق سے شہریار کی والدہ کے جاننے والوں میں سے تھی، برملا کہتی تھی کہ عمیم کی پہلی بیوی اچھی تھی جو چند دن اس کے ساتھ رہ کر اس سے چھٹکارا لے گئی تھی۔ وہ ایسا مرد تھا ہی نہیں جس کے ساتھ کوئی معقول عورت گزارہ کر سکے۔

عارفہ کو سرخروئی اس وقت ملی جب ایک روز شہریار نیچے سے اوپر آ کر اس کے پاس بیٹھا اور بولا۔ ”آج آخری بار اس شخص کا نام لوں گا تمہارے سامنے...... عمیم کی دوسری بیوی امی کی بہت اچھی ملنے والی کی بیٹی ہے۔ اس نے اپنے گھر والوں کو عمیم کی ایسی ایسی باتیں بتائی ہیں کہ آج تو امی بھی کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہہ رہی ہیں۔ ”خدا بچائے ایسے مردودوں سے۔“

عارفہ کا دل بھر آیا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”کیا ہوا؟“ شہریار نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ عارفہ اس سے نظریں چرانے کی کوشش کرنے لگی۔

”کچھ تو ہے۔“

”پتا نہیں، اب بھی میری بے گناہی ثابت ہو سکے گی کہ نہیں۔“

”بے گناہی!“ وہ چونکا۔ ”کیسی بے گناہی؟“

”اس نے اور اس کے گھر والوں نے تو میرے بارے میں یہی مشہور کیا تھا نا محلے میں کہ میں کسی اور میں انٹرسٹڈ تھی اس لیے اس کے ساتھ گزارہ نہیں کر سکی۔“

”ہاں نا...... انٹرسٹڈ تو تھیں تم۔“ شہریار بولا۔

”کیا مطلب؟“ اس نے ہڑبڑا کر شہریار کو دیکھا۔

وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

”انٹرسٹڈ تو تھیں نا تم اس سے پیچھا چھڑانے اور کسی بہتر آدمی کا انتظار کرنے میں۔“

”جی نہیں۔“ وہ اس کے جواب پر کچھ مطمئن ہو کر بولی۔ ”الزام تراشی سے گریز فرمائیں۔ میں کسی کے انتظار وِنتظار میں انٹرسٹڈ نہیں تھی۔ میں نے تو فیصلہ کر لیا تھا کہ دوبارہ اس بھیانک تجربے سے گزرنے کا خیال بھی نہیں لاؤں گی دل میں۔“

”اب کیا خیال ہے؟“ شہریار نے اسے محبت سے دیکھا۔

عارفہ نے اپنا سر اس کے شانے پر ٹیک دیا۔

”بتاؤ۔“ شہریار نے تقاضا کیا۔

”آئی لو یو شہریار......! آئی رئیلی لو یو۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”غریب آدمی ہوں...... تمہیں کچھ بھی نہیں دے سکا۔“ شہریار کے لہجے میں معذرت تھی۔

”آپ نے مجھے اپنایا...... اس وقت میرا ہاتھ تھاما جب میں دکھ اور مایوسی کے اندھیروں میں گھری ہوئی تھی۔ آپ نے مجھے عزت دی، محبت دی۔ میرے لیے آپ سے بڑھ کر غنی اور دولت مند آدمی اور کون ہو سکتا ہے شہریار!“ وہ اس کے بازو پر دھیرے دھیرے اپنا ہاتھ پھیرتے ہوئے بولتی گئی۔

”آئی لو یو...... اینڈ آئی ریسپیکٹ یو۔“ شہریار اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان لے کر اسے وارفتہ نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”ایک عورت اپنے مرد سے بس اتنا ہی چاہتی ہے شہریار!“ عارفہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

”یار! تمہارے آنسوؤں کو مجھے کسی پٹاری میں بند کرنا پڑے گا۔“

”ممکن نہیں۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو اور لبوں پر

مسکراہٹ نے دھوپ میں بارش کا سماں پیدا کر دیا۔
''کیوں ممکن نہیں؟''
''آپ نے سنا نہیں...... آنسو ہی تو ہم عورتوں کا سب سے بڑا ہتھیار ہوتے ہیں۔''
وہ بے ساختہ ہنسا۔
''سچ کہتی ہو...... دکھی ہوتی ہو تو رو دیتی ہو...... خوش ہوتی ہو تو رو دیتی ہو...... اور تمہارے یہ آنسو ہم مردوں کے لیے کبھی پاؤں کی زنجیر بن جاتے ہیں...... کبھی ہمارا دل پگھلا دیتے ہیں۔''
''لو یو شہریار!''
''لو یو ٹو میری جان!''

☆☆☆

عارفہ کی مع فیملی امیگریشن کا معاملہ خوشگوار انجام پر منتج ہوا۔ اس کے کینیڈا مقیم بھائی نے اس سلسلے میں دامے درمے سخنے اس کی بھرپور مدد کی تھی۔ امیگریشن ہو جانے کے بعد اسی نے عارفہ، اس کے شوہر اور بچوں کے کینیڈا پہنچنے سے قبل ہی ان کے لیے علیحدہ رہائش کا بندوبست بھی کر دیا۔ عارفہ بے پناہ خوش تھی اور اس کے بڑے بہن بھائی بھی جنہوں نے مصیبت اور آزمائش کے دنوں میں اسے تنہا نہیں چھوڑا تھا۔ اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ وہ ان سب کی بھی ممنون تھی جنہوں نے اس کے مشکل وقت میں کسی بھی طرح سے اس کا ساتھ دیا تھا۔ مسز فیاض جنہوں نے اسے اس وقت مورل سپورٹ دی تھی جب وہ نفسیاتی انتشار سے دوچار تھی۔ وہ تھیں جنہوں نے اسے لوگوں کی باتوں سے ڈر کر ایک خول میں سمٹ جانے کے بجائے نڈر ہو کر سامنا کرنا سکھایا۔ مسز فیاض سے اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا مگر انہوں نے اس سے انسانیت کا رشتہ نبھایا تھا۔ شہلا معین سے تو اس کی دور دور تک آشنائی نہ تھی مگر انہوں نے شایان کی دیکھ بھال میں اس وقت اس کا ساتھ دیا تھا جب صبح کو اسے اپنی بہن یا بھائی کے گھر چھوڑنے اور اسکول سے واپسی پر لینے کے لیے جانا اسے نہایت مشکل لگ رہا تھا۔ شہلا معین، شایان کو اپنے ہاں رکھنے کی ہامی نہ بھرتیں تو اسے کتنی مشکل ہوتی۔ ان سب کی ممنون احسان تو وہ تھی ہی، رب کریم کی شکر گزاری میں اس کی آنکھیں بار بار نم ہونے لگتی تھیں۔
اٹھتے بیٹھتے وہ دل ہی دل میں کہتی ...... شکر ہے میرے رب...... پروردگار! مجھ گناہ گار، خطا کار بندی پر آپ کی بے حساب عنایتوں کا بہت شکریہ...... مہربانی میرے اللہ...... وہ دل ہی دل میں گڑگڑائے جاتی اور شکر ادا کیے جاتی۔
شوہر اور بچوں کے ساتھ عارفہ کے کینیڈا جانے کا طبل

کیا بجا، شہریار کی والدہ اور بھائی کا رویہ یکسر بدل گیا۔ کہاں تو یہ حال تھا کہ دونوں اس کی طرف دیکھنے تک کے روادار نہ تھے۔ زبانوں سے طعن و طنز کے تیر چلاتے تھے، اب یہ عالم کہ آگے پیچھے پھرتے۔
''بھابی! مجھے بھی بلانا ہے آپ نے۔'' شہزاد کہتا۔
''ہاں، ہاں...... کیوں نہ بلائے گی بھابی تجھے۔ ایک ہی تو دیور ہے تو اس کا۔'' ساس کہتی۔
''بلاؤ گی نا بھابی؟'' شہزاد خوشامد کرتا۔
''کیوں نہیں شہزاد! جیسے ہی موقع ملا، ضرور کوشش کروں گی میں بھی اور تمہارے بھائی بھی...... کیوں شہریار؟'' عارفہ کہتی۔
''ہاں۔'' شہریار اسے عجیب سی نگاہوں سے دیکھنے لگتا۔
ایک روز تنہائی میں اس سے بولا۔ ''یار! تم ہو بہت عجیب۔''
''کیوں، کیا ہوا؟'' عارفہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔
''امی اور شہزاد نے تمہارے ساتھ کیا کیا اور تم کیا کر رہی ہو۔''
''کیا کر رہی ہوں؟'' وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔
''شہزاد جب خوشامد میں لگا ہوتا ہے تمہاری کہ بھابی مجھے بلائیں گی نا تو تم کتنی آسانی سے اسے آسرا دے دیتی ہو۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتی تو کہتی...... کس منہ سے کہتے ہو تم مجھ سے یہ بات...... کیوں بلاؤں گی میں تمہیں...... کیا اپنی زندگی عذاب کرنے کے لیے۔''
عارفہ دھیرے سے مسکرا دی۔ ''جل ککڑی عورتوں کی سی بات کیوں کروں میں۔''
''کیونکہ اس نے تمہارے ساتھ اچھا نہیں کیا حالانکہ تم نے مجھ سے اپنی زبان سے کبھی شکایت نہیں کی مگر میری آنکھیں نہیں تھیں کیا۔ میں دیکھتا تو تھا اور سنتا بھی تھا کہ امی اور شہزاد تمہارے ساتھ کتنی زیادتی کرتے ہیں۔ شایان کو جب وہ منا سا تھا، تم ٹھٹھرتی سردی اور کڑکتی گرمی میں اپنے ساتھ لے جایا، لایا کرتی تھیں۔ امی کو کبھی رحم آیا تم پر یا اپنے پوتے پر ہی۔''
''میں بھی اگر آج وہی کروں جو انہوں نے کیا تو پھر مجھ میں اور ان میں کیا فرق رہ جائے گا شہریار!'' عارفہ بولی۔
''میں نے کہا نا عجیب عورت ہو۔''
''مجبوری...... اب تو آپ کو اسی عجیب عورت کے ساتھ گزارہ کرنا ہوگا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔
مگر شہریار کی والدہ اور بھائی کی تبدیل شدہ جون پر وہ یہ سوچنے پر مجبور تھی کہ بعض لوگ کتنے موقع پرست ہوتے

ہیں۔ چڑھتے سورج کے پجاری اور ابن الوقت۔ سیانوں کی کہاوت کے بموجب...... جہاں دیکھے توا پرات وہاں گزارے ساری رات...... نہ جانے کیونکر گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیتے ہیں لوگ۔

شہریار کی والدہ ان دنوں ہر آتے جاتے اور محلے والوں کو یہ خبر سناتی پھر رہی تھیں کہ ان کی بہو، بیٹا اور ان کے دونوں بچے کناڈا جا رہے ہیں...... چلو کینیڈا کو کناڈا کہہ کر ہی سہی انہوں نے بیٹے کی بیوی کو بہو تو تسلیم کر لیا تھا۔

☆☆☆

کینیڈا روانگی سے قبل عارفہ، مسز فیاض اور شہلا معین کا شکریہ ادا کرنے کے لیے دونوں سے ملنے گئی۔

''میڈم! میں ساری زندگی آپ کی شکر گزار رہوں گی۔ آپ نے مجھے بہت حوصلہ دیا۔ میرے لیے آسانیاں پیدا کیں۔ جب کبھی میرے امیگریشن کیس کے سلسلے میں مجھے اپنے کنسلٹنٹ سے ملنے کے لیے جانے کی ضرورت ہوتی تھی، آپ مجھے ہمیشہ شارٹ لیو دے دیا کرتی تھیں اور شایان کے سلسلے میں آپ نے مجھے اپنی فرینڈ شہلا آپا کی طرف سے جو سہولت دلوائی، آپ کے اس احسان کا تو میں ساری زندگی بدلہ نہیں اتار سکتی۔'' مسز فیاض کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کی آواز شدتِ جذبات سے مغلوب ہوگئی اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''بس یا کچھ اور؟'' مسز فیاض نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''آئی ایم رئیلی گریٹ فل!'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''نو نیڈ ڈیر۔'' مسز فیاض نے اس کا شانہ تھپتھپایا پھر بولیں۔ ''تم خود اتنی اچھی رہیں عارفہ کہ تمہارے ساتھ اچھا ہی کرنے کو جی چاہتا تھا۔''

''جزاک اللہ میڈم!''

''اور میں تمہیں ایک بات بتاؤں عارفہ جب ہم کسی کے ساتھ کچھ اچھا کرتے ہیں تو اس میں ہمارا کوئی وصف نہیں ہوتا بلکہ اللہ کی رحمت سے ایسا ہوتا ہے۔ اللہ پاک جب اپنے کسی بندے پر مہربانی فرمانا اور اسے آسانی عطا کرنا چاہتے ہیں تو وہ اس بندے کے لیے دوسرے بندوں کے دل میں محبت ڈال دیتے ہیں۔ یہی محبت اللہ کے دوسرے بندوں کو اس بندے کے ساتھ کچھ اچھا کرنے کی توفیق دیتی ہے۔ ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ اچھا کرنے میں اچھا کرنے والے کا کوئی کمال نہیں ہوتا، توفیقِ خداوندی ہوتی ہے۔''

''آپ کتنی اچھی ہیں میڈم!''

''کتنی؟'' مسز فیاض مذاقاً بولیں۔

عارفہ جھینپ گئی۔ ''بہت...... میڈم!''

''آئی وش یو اینڈ یور فیملی آل دی بیسٹ ان لائف!''

''تھینک یو میڈم! کبھی کینیڈا آنے کا پروگرام بنائیے گا۔''

''ویز املا تو۔''

''مل جائے گا میڈم! آپ لوگوں کو آسانی دیتی ہیں تو اللہ پاک آپ کو آسانی کیوں نہ دیں گے۔ میں آپ سے رابطے میں رہوں گی۔ کینیڈا آنا ہو تو آپ میرے پاس ہی ٹھہریئے گا۔''

''اوکے...... اوکے ڈیئر!''

''وعدہ؟''

''وعدہ!''

مسز فیاض نے اسے الوداعی تحفہ بھی دیا۔ شہلا معین کے ہاں وہ مسز فیاض کے ہمراہ ہی گئی۔

''عارفہ! ہم بہت خوش ہیں بیٹا کہ تم جہاں جا رہی ہو، وہاں تمہیں ویلکم کرنے کے لیے تمہارے بھائی پہلے سے موجود ہیں۔'' شہلا معین نے کہا۔

''جی آپا! اسی لیے میں بہت مطمئن ہوں۔''

''بہت محنت کی ہے تم نے اپنی فیملی کے لیے...... ان شاء اللہ پھل پاؤ گی۔''

''شکریہ آپا! آپ نے مجھے شایان کے سلسلے میں جو سپورٹ دی، اس کا بہت شکریہ۔''

''انسان ہی انسان کی دوا ہے بیٹا! سچی بات یہ ہے کہ میں تو تمہیں جانتی تک نہ تھی۔ کسی انجان کے بچے کی ذمے داری لیتے آدمی گھبراتا ہے لیکن مسز فیاض نے تمہارا مجھ سے اس طرح ذکر کیا کہ میں تمہارے بیٹے کو اپنے پاس رکھنے کو آمادہ ہوگئی۔ خدا کا شکر ہے کہ کوئی پرابلم نہیں ہوئی۔ شایان کو تم جتنا عرصہ میرے پاس چھوڑتی رہیں، الحمد للہ خیریت رہی۔''

''آپ نے اس کا خیال بھی تو بہت رکھا۔ میں ہمیشہ آپ کی شکر گزار رہوں گی۔''

''ہم نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ ہماری بیٹی ملک سے باہر رہتی ہے اور ورکنگ وومن ہے۔ آخر اس کے بچے کا بھی تو کسی نے خیال رکھا ہی تھا۔ بات یہ ہے بیٹا کہ جب ہم دوسروں کے مسائل کو اپنے پیاروں کے مسائل کے آئینے میں دیکھنے لگتے ہیں تو ہمارے دل میں دوسروں کے لیے خود بخود دکشادگی پیدا ہو جاتی ہے۔''

ہیں۔ چڑھتے سورج کے پجاری اور ابن الوقت۔ سیانوں کی کہاوت کے بموجب...... جہاں دیکھے توا پرات وہاں گزارے ساری رات...... نہ جانے کیونکر گرگٹ کی طرح رنگ بدل لیتے ہیں لوگ۔

شہریار کی والدہ ان دنوں ہر آتے جاتے اور محلے والوں کو یہ خبر سناتی پھر رہی تھیں کہ ان کی بہو، بیٹا اور ان کے دونوں بچے کناڈا جا رہے ہیں...... چلو کینیڈا کو کناڈا کہہ کر ہی سہی انہوں نے بیٹے کی بیوی کو بہو تو تسلیم کر لیا تھا۔

☆☆☆

کینیڈا روانگی سے قبل عارفہ، مسز فیاض اور شہلا معین کا شکریہ ادا کرنے کے لیے دونوں سے ملنے گئی۔

''میڈم! میں ساری زندگی آپ کی شکر گزار رہوں گی۔ آپ نے مجھے بہت حوصلہ دیا۔ میرے لیے آسانیاں پیدا کیں۔ جب کبھی میرے امیگریشن کیس کے سلسلے میں مجھے اپنے کنسلٹنٹ سے ملنے کے لیے جانے کی ضرورت ہوتی تھی، آپ مجھے ہمیشہ شارٹ لیو دے دیا کرتی تھیں اور شایان کے سلسلے میں آپ نے مجھے اپنی فرینڈ شہلا آپا کی طرف سے جو سہولت دلوائی، آپ کے اس احسان کا تو میں ساری زندگی بدلہ نہیں اتار سکتی۔'' مسز فیاض کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کی آواز شدتِ جذبات سے مغلوب ہوگئی اور آنکھوں میں آنسو آگئے۔

''بس یا کچھ اور؟'' مسز فیاض نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

''آئی ایم ریئلی گریٹ فل!'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''نو نیڈ ڈیر۔'' مسز فیاض نے اس کا شانہ تھپتھپایا پھر بولیں۔ ''تم خود اتنی اچھی رہیں عارفہ کہ تمہارے ساتھ اچھا ہی کرنے کو جی چاہتا تھا۔''

''جزاک اللہ میڈم!''

''اور میں تمہیں ایک بات بتاؤں عارفہ جب ہم کسی کے ساتھ کچھ اچھا کرتے ہیں تو اس میں ہمارا کوئی وصف نہیں ہوتا بلکہ اللہ کی رحمت سے ایسا ہوتا ہے۔ اللہ پاک جب اپنے کسی بندے پر مہربانی فرمانا اور اسے آسانی عطا کرنا چاہتے ہیں تو وہ اس بندے کے لیے دوسرے بندوں کے دل میں محبت ڈال دیتے ہیں۔ یہی محبت اللہ کے دوسرے بندوں کو اس بندے کے ساتھ کچھ اچھا کرنے کی توفیق دیتی ہے۔ ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ اچھا کرنے میں اچھا کرنے والے کا کوئی کمال نہیں ہوتا، توفیقِ خداوندی ہوتی ہے۔''

''آپ کتنی اچھی ہیں میڈم!''

''کتنی؟'' مسز فیاض مذاقاً بولیں۔

عارفہ جھینپ گئی۔ ''بہت...... میڈم!''

''آئی وش یو اینڈ یور فیملی آل دی بیسٹ ان لائف!''

''تھینک یو میڈم! کبھی کینیڈا آنے کا پروگرام بنائیے گا۔''

''ویزا ملا تو۔''

''مل جائے گا میڈم! آپ لوگوں کو آسانی دیتی ہیں تو اللہ پاک آپ کو آسانی کیوں نہ دیں گے۔ میں آپ سے رابطے میں رہوں گی۔ کینیڈا آنا ہو تو آپ میرے پاس ہی ٹھہریئے گا۔''

''اوکے...... اوکے ڈیئر!''

''وعدہ؟''

''وعدہ!''

مسز فیاض نے اسے الوداعی تحفہ بھی دیا۔ شہلا معین کے ہاں وہ مسز فیاض کے ہمراہ ہی گئی۔

''عارفہ! ہم بہت خوش ہیں بیٹا کہ تم جہاں جا رہی ہو، وہاں تمہیں ویلکم کرنے کے لیے تمہارے بھائی پہلے سے موجود ہیں۔'' شہلا معین نے کہا۔

''جی آپا! اسی لیے میں بہت مطمئن ہوں۔''

''بہت محنت کی ہے تم نے اپنی فیملی کے لیے...... ان شاء اللہ پھل پاؤ گی۔''

''شکریہ آپا! آپ نے مجھے شایان کے سلسلے میں جو سپورٹ دی، اس کا بہت شکریہ۔''

''انسان ہی انسان کی دوا ہے بیٹا! سچی بات یہ ہے کہ میں تو تمہیں جانتی تک نہ تھی۔ کسی انجان کے بچے کی ذمے داری لیتے آدمی گھبراتا ہے لیکن مسز فیاض نے تمہارا مجھ سے اس طرح ذکر کیا کہ میں تمہارے بیٹے کو اپنے پاس رکھنے کو آمادہ ہوگئی۔ خدا کا شکر ہے کہ کوئی پرابلم نہیں ہوئی۔ شایان کو تم جتنا عرصہ میرے پاس چھوڑتی رہیں، الحمد للہ خیریت رہی۔''

''آپ نے اس کا خیال بھی تو بہت رکھا۔ میں ہمیشہ آپ کی شکر گزار رہوں گی۔''

''ہم نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا کہ ہماری بیٹی ملک سے باہر رہتی ہے اور ورکنگ وومن ہے۔ آخر اس کے بچے کا بھی تو کسی نے خیال رکھا ہی تھا۔ بات یہ ہے بیٹا کہ جب ہم دوسروں کے مسائل کو اپنے پیاروں کے مسائل کے آئینے میں دیکھنے لگتے ہیں تو ہمارے دل میں دوسروں کے لیے خود بخود کشادگی پیدا ہو جاتی ہے۔''

”مجھے آسانی دینے کا بہت شکریہ آپا!“

”جیتی رہو...... خوش رہو۔“

”رابطے میں رہوں گی آپا!“

”ہمیں اچھا لگے گا۔“

☆☆☆

بڑے بھائی بہنوں کی دعاؤں میں رخصت ہوکر عارفہ کینیڈا پہنچی تو وہاں موجود بھائی نے اسے، شہریار اور دونوں بچوں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ دو دن عارفہ بھائی کے گھر میں رہی پھر اپنے گھر منتقل ہوگئی۔ بھائی کے لیے اس کے روئیں روئیں سے دعا نکلتی۔ اتنا چاہنے والا بھائی خدا ہر بہن کو دے۔

”عارفہ! یہاں ہر شخص اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔ دوسروں کی زندگی میں جھانکنے کی نہ کسی کو عادت ہوتی ہے نہ فرصت۔ یہاں حکومت اپنی رعیت کا پورا خیال رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ ہمارے اپنے وطن کی طرح حکمرانوں کی کوئی لوٹ مار، کوئی نوچ کھسوٹ اور عوام کے مسائل سے بے پروائی نہیں۔ عام افراد کی بنیادی ضرورتیں کما حقہ پوری ہوتی ہیں۔ تعلیم اور صحت کا نظام عمدہ ہے، انصاف کی حکمرانی ہے، غلط کار امیر ہو یا غریب، یکساں قانون کی گرفت میں آتا ہے۔ تعلیم اور صحت ہر فرد کا بنیادی حق سمجھا جاتا ہے۔ ان شاء اللہ تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی...... کوئی کمی محسوس نہیں کروگی سوائے ایک بات کے...... اپنوں کی کمی۔“ بھائی نے عارفہ سے کہا۔

”بھائی! آپ ہیں نا یہاں میرے ا[illegible]۔“ عارفہ بولی۔

”ہاں، تمہارے آنے سے مجھے بھی اپنوں سے دوری کے احساس میں کمی محسوس ہورہی ہے۔“ بھائی نے کہا۔

”ہم دونوں مل کر کوشش کریں گے اپنے اور لوگوں کو بھی یہاں بلانے کی۔“ عارفہ پُرجوش لہجے میں بولی۔

”ان شاء اللہ!“

”یہاں آنے کا ایک مضبوط امیدوار تو ہماری بیگم صاحبہ ٹاپ آف دی لسٹ چھوڑ آئی ہیں۔“ شہریار جو دونوں بھائی بہن کی باتیں سن رہا تھا، عارفہ کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے بولا۔

”کون؟“ بھائی نے سوالیہ نظروں سے عارفہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”شہزاد...... ان کا چھوٹا بھائی۔“

”آئی سی۔“ بھائی نے اپنا ہاتھ شہریار کے کندھے پر رکھتے ہوئے کہا۔ ”خود کو مضبوط بنانے کے لیے اپنوں کا ہاتھ تھامنا ضروری ہوتا ہے شہریار! دیکھو، پاکستان تو ہمارا وطن ہے، ہماری محبت ہے، ہماری اصل پناہ گاہ ہے۔ وہاں آنے جانے سے ہمیں کوئی نہیں روک سکتا لیکن بہتر معاشی حالات اور بہتر معیار زندگی کی تلاش میں ہمیں کبھی کبھی اپنے وطن سے دور جانے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ ضروری ہے کہ دوسری سرزمین پر اپنے قدم جمتے ہی ہم دوسروں کا ہاتھ بھی تھامنے کی کوشش کریں۔ اس سے ہم خود ہی مضبوط نہیں ہوتے، ہمارا وطن بھی اس زرمبادلہ سے مستحکم ہوتا ہے جو ہم یہاں بچت کر کے وہاں بھیجتے ہیں۔“

”بشرطیکہ لوٹ مار کرنے والوں سے بچ جائیں۔“ شہریار نے معنی خیزی سے کہا۔

”کب تک؟ کب تک شہریار...... ! ایک دن یوم حساب بھی تو ہے۔“

شہریار کو تائید میں سر ہلانا پڑا۔

”بھائی! آپ نے بہت محنت کی ہے اپنا، اپنے بچوں اور ہمارا بھی مستقبل بنانے کے لیے۔ ایک اور ایک دو نہیں، گیارہ بھی ہوسکتے ہیں۔ آپ نے ہمارا ہاتھ تھاما ہے...... اب شہریار اور میں بھی اوروں کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کریں گے۔ بھائی! آپ بتائیں ہم دونوں کو کہاں کہاں اور کیسے اپنے لیے جاب تلاش کرنا چاہیے۔“ عارفہ پردیس میں عملی زندگی کے آغاز کے لیے نہایت پُرجوش نظر آتی تھی۔

بھائی کی جانب سے کوئی جواب ملنے سے پہلے ہی شہریار نے عارفہ کو محبت اور ممنونیت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”جاب اب صرف میں [illegible] گا، تم گھر بیٹھوگی۔“

”کیوں؟“ عارفہ نے چونک کر شہریار کو دیکھا۔

”کیونکہ تم اپنی ہمت سے بھی بڑھ کر پاکستان میں کام کر آئی ہو۔ صبح نوکری، شام کو ٹیوشنز، گھرداری، بچوں کی پرورش...... تم نے تو اپنے حصے سے بڑھ کر کام کیا ہے۔ اب تم گھر اور بچے سنبھالوگی بس!“

عارفہ منہ بسورنے لگی۔

”اگر تمہیں کام کرنے کا شوق ہے ہی تو کام تو تم گھر بیٹھ کر بھی کرسکتی ہو۔“ بھائی نے عارفہ کو منہ بسورتے دیکھ کر کہا۔

”ورک فرام ہوم!“ عارفہ چہکی۔

”ہاں، اب تو یہ ٹرینڈ عام ہوگیا ہے۔“

”سلائی اچھی کرلیتی ہوں میں۔ بوتیک شروع کردوں گی۔“ عارفہ بولی۔

”ابھی تو تم آئی ہو۔ دیکھنا کتنے آپشنز ملیں گے تمہیں۔“ بھائی نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

”ڈن!“ عارفہ نے شہریار کو محبت بھری نظروں سے دیکھا۔ ”میں گھر میں بیٹھ کر کام کروں گی اور آپ گھر سے باہر۔“

''ہوسکتا ہے پھر ایسا وقت آئے کہ تم دونوں ہی گھر میں رہ کر کام کر رہے ہو۔'' بھائی نے کہا۔
''پھر تو بہت ہی مزے کی بات ہوگی بھائی!''
''آئی وش یو بوتھ اے ونڈرفل لائف ہیئر۔'' بھائی نے کہا۔
''تھینک یو بھائی......! سو نائس آف یو.....آپ ہی کی وجہ سے ہم یہاں پہنچے ہیں۔'' عارفہ شدتِ جذبات سے مغلوب ہوئی۔
''نہیں عارفہ! صرف خدا کی مہربانی سے۔'' بھائی نے نہایت انکساری سے کہا۔
بھائی کے جانے کے بعد عارفہ اپنے فلیٹ کا دروازہ بند کر کے مڑی تو شہریار کو اپنے روبرو پایا۔ وہ اسے بغور دیکھ رہا تھا۔
''ایسے کیوں دیکھ رہے ہیں؟'' عارفہ اس کے بالکل نزدیک جا رکی۔
شہریار نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیے اور اپنی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں یاد ہے ہماری شادی کے بعد تم نے مجھ سے پوچھا تھا.....آپ نے مجھ سے شادی کیوں کی؟''
عارفہ نے ایک گہری سانس کھینچی۔ ''ہاں...... مجھے یاد ہے.....اور مجھے آپ کا جواب بھی یاد ہے۔''
''آج تمہارے اس سوال کا سچ سچ جواب دے کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولا۔
عارفہ اسے الجھی الجھی نظروں سے دیکھنے لگی۔
''سوری! آج پھر اس شخص کا نام اپنی زبان پر لا رہا ہوں۔'' شہریار نے توقف کیا اور اپنی نظریں بدستور عارفہ کے چہرے پر مرکوز رکھتے ہوئے بولا۔ ''عمیم تو تھا ہی کمینہ.....کچھ بدفطرت میں بھی تھا۔''
عارفہ کی نگاہوں میں حیرت ڈولنے لگی۔
''تمہارے بارے میں نہ صرف تمہارے آس پاس کے گھروں میں بلکہ آگے پیچھے کی گلیوں میں بھی یہ بات اڑی ہوئی تھی کہ فلاں گھر کی لڑکی شادی کے چند دن بعد ہی میکے اس لیے آ بیٹھی ہے کہ شادی سے پہلے اس کا تعلق.....خیر.....میں نے کہا نا، کچھ بدفطرت میں بھی تھا۔ مجھے تجسس ہوا کہ دیکھوں تو وہ کون ایسا شخص ہے کہ ایک لڑکی شادی کے چند دن بعد ہی جس کی خاطر اپنا بسا بسایا گھر اجاڑ کر بدنامی سر پر لیے اپنے خاندان کو بھی رسوا کرنے اپنے گھر آ بیٹھی ہے۔ تمہیں شاید یاد ہو.....تمہیں آزمانے کے لیے میں کچھ دن تمہیں گندے سندے میسیجز بھی کرتا رہا تھا اور تم نے کبھی رسپانڈ نہیں کیا تھا۔ میں نے سوچا الٹی پلٹی لڑکی ایسے میسیجز کے جواب میں کبھی تو رسپانڈ کرتی ہی ہے اور کچھ نہیں تو میسج کرنے والے کو مغلظات تو بک ہی دیتی ہے۔ شریف لڑکی، کمینے مردوں کی خباثتوں پر خاموشی اختیار کر لینا بہتر سمجھتی ہے۔''
عارفہ مزید حیران ہوئی۔
''پھر میں اسکول جاتے ہوئے کئی روز تمہارا تعاقب کرتا رہا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ تم کس سے ملتی ہو مگر تم تو گھر سے نکل کر ناک کی سیدھ میں اپنے اسکول چلی جاتی تھیں۔ تمہارے چہرے کی اداسی اور مرے مرے قدموں نے میرا دل پکڑ لیا۔ اللہ پاک نے میرے دل میں ڈالی کہ مجھے تم سے شادی کرنا چاہیے۔ امی اور بھائی نے بہت مخالفت کی مگر اللہ کی رضا ان کی مخالفت پر غالب رہی۔ شادی کے بعد بھی میں تمہاری لاعلمی میں تمہیں آزماتا رہا۔'' عارفہ چونکی۔
''ہاں، میں نے اپنی امی سے سنا تھا کہ شوہر اپنی بیوی کو پیسا دے کر آزماتا ہے، وقت دے کر پرکھتا ہے۔ میں غریب آدمی تھا۔ پیسا تو میرے پاس تھا نہیں۔ میں نے تمہیں وقت دے کر آزمایا اور جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، میں تمہارے کردار کی مضبوطی کا اسیر ہوتا چلا گیا۔''
''آئی ایم رئیلی شاکڈ شہریار......! تو آپ نے اپنے اس ایڈونچر کے لیے کی تھی مجھ سے شادی؟'' عارفہ حیرتوں میں غوطہ زن تھی۔
''سوری یار! اپنی کمینگی کی معافی چاہتا ہوں لیکن جانتی ہو اس ایڈونچر کا حاصل کیا ہے؟'' اس نے اپنی انگلی سے اس کی ناک کو دھیرے سے چھوتے ہوئے کہا۔
وہ اسے ٹک ٹک دیکھے گئی۔
''آج اگر ساری دنیا بھی یہ کہے کہ شہریار تیری بیوی ایسی ویسی ہے تو میں سینہ تان کر کہوں گا.....تم کیا جانو وہ کیسی ہے..... وہ میرا مان ہے..... میرا ایمان ہے..... میری عزت ہے..... میری محبت ہے..... میری زندگی ہے...... میں اس سے سچا پیار کرتا ہوں۔'' وہ بولتا ہی گیا۔
''بے ایمان!'' عارفہ نے اسے شاکی نظروں سے دیکھا اور اپنا سر اعترافِ جرم کرنے والے مجرم کے سینے پر ٹیک دیا..... یہ زندگی ہے اور زندگی میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مجرم کا گریبان پکڑنے کے بجائے اس کی بانہوں میں پناہ کا احساس ملتا ہے۔

⌘⌘⌘